مولانا ابوالکلام آزادؒ کے
منتشر اور غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ

مکاتیبِ ابوالکلام آزادؒ



مُرتّبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ - کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ

كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ

إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ

كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ

إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

مکاتیب ابوالکلام آزادؒ

مولانا ابوالکلام آزاد کے منتشر اور غیر مرتب خطوط

جلد اول

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مولانا ابوالکلام آزادؒ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ-پاکستان

کراچی

سلسلۂ علمیات ابوالکلام
نمبر ا

کتاب	:	مکاتیب ابوالکلام آزاد-جلد اول
مرتب	:	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری
ناشر	:	مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان-کراچی
پرنٹر	:	المخزن پرنٹرز، کراچی
اشاعت اول	:	اگست ۲۰۱۴ء
بہ اہتمام	:	حافظ تنویر احمد شریفی

واحد تقسیم کار

مکتبۂ رشیدیہ

بالمقابل مقدس مسجد اردو بازار، کراچی

فون: 32767232-21-92+

www.maktaberasheedya.com

E-mail: info@maktaberasheedya.com

فہرست

پیش لفظ

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ جنوبی ایشیا کے مشترک تہذیبی ورثے کی ایک منفرد اور عظیم شخصیت ہیں۔ ان کے سیاسی، ملّی، ادبی، فکری اور مذہبی کارناموں نے آزاد اور جدید ایشیا کی تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ وقت نے ان کے عظیم فہم، گہری فراست اور سیاسی تدبر پر مُہر لگا دی ہے۔ آج بھی جب ہم ان کے تقریباً ایک صدی پہلے کے لکھے ہوئے آثار کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ موجودہ دور کی کوئی خاص شخصیت ہیں۔ درحقیقت عہد حاضر کے سیاسی اور تہذیبی چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ان کی فکر سے استفادہ اور شخصیت کا اتباع وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے۔ اُن کے اپنے عہد میں ہی اُن کی علمی عظمت اور بصیرت کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی اور خود اُن کو بھی اپنے اس مقام کی خوبی وکمال سے انکار نہ تھا۔ حضرت مولاناؒ نے اس حقیقت کو مولانا غلام رسول مہرؒ (وفات: ۱۹۷۱ء) کے نام ایک خط میں بیان کیا ہے:

> ''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی:
>
> ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
> رونقے گشتم واز طالعِ دکاں رفتم!
>
> بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا

ہے۔ مذہب، علوم وفنون، ادب، انشاء، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدأ فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحدے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں:

مازلت انزل فی و دادك منزلا
تتحیر الالباب عند نزولها!

لیکن افسوس، جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اُس نے شاید سر و سامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد و محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کر دیا گیا"۔

(نقشِ آزاد (مولانا ابوالکلام آزادؒ کے خطوط) مکتوب الیہ و مرتب: غلام رسول مہرؒ، لاہور، کتاب منزل، ۱۴؍اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۵۸-۱۵۷)

اگرچہ سیاسی مصروفیات اور ہنگاموں نے حضرت مولاناؒ کو ان کے محبوب علمی اور ادبی ذوق سے دور رکھا تھا، پھر بھی اپنی زندگی میں وہ جتنے علمی اور سائنسی، تعلیمی وادبی آثار بہ طور نمونہ یادگار چھوڑ گئے تھے وہ مستقبل میں وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم اور حضرت مولاناؒ کے دوست پنڈت جواہر لعل نہرو (وفات: ۲۷؍مئی ۱۹۴۵ء، نئی دلّی) سے بڑھ کر اُن کے کاموں کی اہمیت کا نہ کوئی قدر شناس تھا اور نہ مستقبل میں اُن کی اہمیت کا کوئی اندازہ شناس ہوسکتا ہے۔ پنڈت جی ساہتیہ اکادمی کے ڈائریکٹر بھی تھے، اور یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ انھوں نے اکادمی کی رہنمائی کے لیے چند بنیادی نکات کی طرف اشارہ فرما دیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں ایک ادارے کے قیام کا منصوبہ کسی سرکاری ایوان میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے قیام کی ضرورت خود وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل

نہرو کی تجویز تھی۔ اگر اس تجویز کو کسی ایوان میں پیش بھی کیا جاتا تو فیصلہ متّحدہ ہی ہوتا۔ پنڈت جی کی ذاتِ گرامی سے اس ادارے کے قیام میں جس ذوق و دل چسپی کا اظہار ہوا تھا، اس سے اہلِ ذوق کی بہت توقعات وابستہ تھیں، لیکن اس کی ایک وجہ اور بھی تھی، جس کا کریڈٹ بھی انھیں کو جاتا تھا، وہ وجہ تھی ادارے کی سرپرستی اور نگرانی کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریۂ ہند (وفات: ۳ مئی ۱۹۶۹ء، نئی دلّی) کا انتخاب!

حضرت ڈاکٹر صاحب اپنے علم، خصایص، کمالات، خدمات اور مرتبے کے لحاظ سے اپنے عہد کی ایک یادگار شخصیت تھے۔ حضرت مولانا سے اُن کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ذوقِ سلیم اور وسیع القلبی اور اخلاق و شرافت اُن کی شخصیت کی صفات تھیں، اِک دنیا ان کی گرویدہ تھی۔ حضرت مولانا سے متعلق ادارے سے اُن کی وابستگی نے اُن سے بہت اصحابِ ذوق، شایقینِ علم و مطالعہ اور حضرت مولانا کے لاکھوں عقیدت مندوں کے دلوں کو حسین توقعات سے سرشار کر دیا تھا۔

ادارے کا قیام، اس کے مقاصد اور کامیابی کی توقعات کچھ خواب نہ تھا۔ مذکورہ بالا ہر دو شخصیات عزایم سے سرشار تھیں۔ اُن کے صبح و شام قوم و ملک کی خدمت میں گزرتے تھے اور اخلاص کی روشنی سے اُن کے دل معمور تھے۔ انھوں نے قوم و ملک اور علم و فنون کی خدمت اور فروغ کے لیے ایک ادارہ قایم کر دیا تھا۔ اُس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جن مادی وسایل کی ضرورت تھی، اس کا بھی انتظام کر دیا تھا، لیکن اس ادارے اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے رپے پیسے ہی کی نہیں، اہل کاروں کی ضرورت بھی تھی، جو اس کام کے لیے وقت دے سکیں۔ یہ کام اِن دو عظیم شخصیات کے انجام دینے کا ہرگز نہ تھا۔ اُن کی زندگیاں قوم و ملک کی خدمت میں گزری تھیں اور ان کی جگہ لینے والا کوئی نہ تھا، اس لیے اُنھوں نے ہر پہلو سے یہ انتظام بھی کر دیا تھا، لیکن افسوس کہ جنھیں اس خدمت کی انجام دہی کے لیے منتخب کیا گیا تھا اُن کی کارگزاری معیار کے مطابق اطمینان بخش ثابت نہ ہو سکی۔ اس مقصد کے لیے اولاً محمد اجمل خاں

اور اُن کے بعد مالک رام کو مقرر کیا گیا تھا۔ اجمل خاں ابھی سر و سامانِ سفر سے بھی فارغ نہ ہوئے تھے کہ حالات نے انھیں ذمے داریوں کو اٹھانے سے معذور و مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے صاحب کو جو کارنامہ انجام دینا تھا اُس سے وہ کوسوں دور نکل گئے، اور جو کچھ انجام دیا اُس میں جو قدیم ہے وہ افسوس ناک ہے اور جو جدید ہے اُس کے بارے میں کیا کہا جائے کہ اُس کے معیار سے بہت اچھا سرمایہ لاہور، کراچی اور دہلی کے اردو بازاروں میں موجود تھا۔ مالکِ رام نہ تحقیق و تدوین کے آدمی تھے نہ ابوالکلام آزاد ان کا موضوع تھا۔ البتہ وہ تحقیق سے فایدہ اٹھانا خوب جانتے تھے!

خدا کو حضرت مولاناؒ کی یہ ناقدری پسند نہ آئی۔ ہندستان اور پاکستان میں اُن کے سب سے بڑے محقّق مولانا غلام رسول مہرؒ تھے۔ وہ یوں بھی اپنے عہد کے بہت بڑے محقّق، مؤرخ، صحافی اور صاحب علم و نظر کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ خدا نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر کسی نوجوان کو حضرت مولاناؒ پر تصنیف و تالیف کے لیے تیار کر دیا جائے تو کیا ہی خوب ہو! چند دن غور و فکر کے بعد یہ خیال اُن کے دل میں پختہ ہوا۔ اُس زمانے میں حضرت مولاناؒ کے ایک شیدائی اُن کے پاس حضرت مولاناؒ پر تصنیف و تالیف کے شوق میں صلاح و مشورے کے لیے آتے تھے اور کبھی حضرت مولانا کے حالات زندگی، شخصیت اور کمالات، مختلف دایروں میں اُن کی خدمات کی خصوصیات اور اُن کے کارناموں اور اُن کے مطالعہ اور استفادے کے ماخذ کی تلاش میں سوالات کیا کرتے تھے۔ اُس وقت تک حضرت مولاناؒ کے یہ شیدائی اپنے تعلیمی سفر میں انٹرنس کے مقام سے بھی نہ گزرے تھے، لیکن مہر صاحبؒ نے ان کے شوق و فہم اور مستقل مزاجی دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ اگر اس جوان پر توجہ دی جائے تو یہ مقصد ضرور حاصل ہو سکتا ہے۔

مہر صاحبؒ نے اپنے خیال کو توجہ کی شکل دی اور بہت جلد انھوں نے محسوس کر لیا

تھا کہ وہ اپنے اُس مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ بات انھوں نے اپنے دل ہی میں نہ سوچی تھی بلکہ اُن کے زیر تربیت شاگرد نے حضرت مولانا کے منتشر اور غیر مرتب خطوط کا مجموعہ شایع کیا اور اُس وقت تک چٹان - لاہور، برہان - دہلی، مدینہ - بجنور، الرحیم والولی - حیدر آباد، الحق - اکوڑہ خٹک اور کئی دیگر اخبارات و رسایل میں جو پچاسوں مضامین لکھے تھے یا بعض تحریری مباحث میں حصّہ لیا تھا اس سے اندازہ کر لیا تھا کہ تحریر میں زبان و اسلوب معیار کے قریب ہے۔ اب اگر انھوں نے کوئی ٹھوکر کھائی تو اس کا سبب معلومات اور علم کی کمی ہی ہو سکتی ہے، اور یہ کمی مطالعے سے دور کی جا سکتی ہے۔ جس میں روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

پیش لفظ کے اس مقام تک پہنچنے کے بعد خاک سار یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اُس خوش نصیب کے چہرے سے پردہ ہٹا دے، جسے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کا شاگرد بننے کا فخر حاصل ہے۔ میں خود بھی اس حقیقت کو ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اِس خوش نصیب سے طالب علمانہ استفادے اور نیاز مندانہ فیض اٹھانے کا فخر حاصل ہے، اور یہی فیضان حاصل عمر ہے۔ جس طرح اِس خوش نصیب نے مولانا مہر مرحوم کی رہنمائی میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے نسبت کو مضبوط، مطالعے کے حق اور علم کے فیضان سے عام انسانیت کی خدمت کرنے کا عزم کیا ہے اسی طرح خاک سار بھی اس خوش نصیب کی رہنمائی میں افکارِ ابوالکلام سے انسانیت کی خدمت کا عزم رکھتا ہے، اور جس طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی پوری زندگی اسی شغل میں گزاری تھی اسی طرح میں بھی اپنی زندگی کا مقصد خدمتِ انسانیت ہی کو بناؤں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

خاک سار نے قارئین کرام سے ابھی وعدہ کیا تھا کہ میں آپ سے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے شیدائی، مولانا غلام رسول مہرؒ کے شاگرد اور تربیت یافتہ کا تعارف کراؤں گا،

تو میں آپ کو بتاتا ہوں! مطالعہ فرمائیے۔

یہ صاحب شاہ جہان پور (یو پی - ہند) کے ایک پٹھان خاندان کے سپوت اور یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نام ہے تصدق حسین خاں ابن محمد حسین خاں ابن خادم حسین خاں ابن مجو خاں۔ آخر الذکر نے براعظم ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے شاہ جہان پور کے معرکۂ بچپوریہ میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء کے وسط میں پاکستان آ گئے تھے۔ اُس وقت تک تصدق حسین خاں نے چھٹی جماعت کے درجے تک اسکول کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد حفظ قرآن کریم کی سعادت بھی حاصل کر لی تھی۔ بعدہٗ درسِ نظامی کے آغاز کے تھوڑے عرصے کے بعد جب یو پی کے اضلاع میں شاہ جہان پور بھی ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا تو انھیں بھائیوں کے ساتھ پاکستان آنا پڑا۔ یہاں پر پہنچ کر ایک مدت سندھ کے اضلاع کی خاک چھانتے ہوئے کراچی پہنچے۔ تب سے اب تک اسی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ اُن کی شادی ہو گئی تھی، پہلی ولادت ایک بیٹا تھا، جس کا نام حضرت سلمان فارسیؓ کے تقدس میں سلمان ہندی رکھا گیا تھا، لیکن خدا نے اسے چند ماہ کی زندگی بخشی تھی۔ اُس کی وفات سے بیٹے کی ماں بہت متاثر ہوئی، چناں چہ ۱۹۶۱ء میں جب تصدق حسین خاں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے میٹرک کے امتحان کا فارم بھیج رہے تھے تو انھوں نے اپنا نام بدل کر ''ابوسلمان الہندی'' درج کر دیا تھا، اور اس کے بعد پی. ایچ. ڈی کی ڈگری تک ہر امتحان میں یہی نام درج ہوتا رہا۔ کتابوں اور ملازمت وغیرہ کے کاغذات میں بھی یہی نام چلتا رہا۔ اس نام میں صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ ''الہندی'' کو ''شاہ جہان پوری'' سے بدل دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے خاک سار کو بتایا کہ ''الہندی'' کی کنیت پر کسی نے اعتراض کیا تھا، اور یہ بات جب انھوں نے مولانا غلام رسول مہرؒ کو بتائی اور اُن کی رائے دریافت کی تو مولانا مہر نے فرمایا: ''الہندی'' کے استعمال میں کوئی خوبی تو ہے نہیں، اور اس پر

اعتراض کی گنجایش بھی نہیں، لیکن میں نے جو علمی سفر اختیار کیا ہے اس میں ہر منزل پر ہندی کی نسبت پر طعنہ اور اعتراض کیا جا سکتا ہے، اور اس کے علاوہ ان کے مطابق ''الہندی'' سے میرے اخلاف اور خاندان کی تعریف کی بھی کوئی نسبت نہیں، جب کہ ''شاہ جہان پوری'' کے استعمال میں میرے قدیم وطن کی نسبت کا اشارہ ضرور ملتا رہے گا، اور روزمرہ کی زندگی میں اس طرح کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسی وقت سے نام کی اس تبدیلی کو اختیار کر لیا۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے مولانا غلام رسول مہرؒ کی صحبت و مراسلت اور ان کی ہدایت کے مطابق خود مہر صاحبؒ کی اور دیگر کتب کے مطالعے کے ذریعے سے اپنی قابلیت کو بڑھانے کی کوشش کو جاری رکھا۔ مولانا مہر مرحوم کی زندگی کی آخری دُھائی اسی فکر و سعی میں گزری تھی۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر ابوسلمان اُس فرض کی ادائیگی میں ناکام نہیں رہیں گے، اور ڈاکٹر صاحب کی تمنّا اور کوشش بھی یہی رہی کہ مولانا مہرؒ نے انھیں جو کچھ بنانے اور کسی سانچے میں ڈھالنے کی سعی فرمائی ہے وہ اس معیار کو پانے میں شکست نہ کھا جائیں۔ خاکسار نے ڈاکٹر صاحب کو مولانا مہر مرحوم کی بے پناہ عقیدت سے سرشار دیکھا ہے، اور جب بھی ان کا نامِ گرامی آیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کے درجات کی بلندی کی دعائیں کیں۔ مولانا مہرؒ کے انتقال (۱۹۷۱ء) کے بعد ۴۳ سال سے ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مولانا مہر مرحوم کی آرزو کی تکمیل کے لیے مساعی میں گزار رہے ہیں!

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے علمی ہیکل کی شان دار تعمیر کی آرزو مولانا غلام رسول مہرؒ کے حریم دل میں مچلتی رہی اور ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا'' کے مصداق خدا نے اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے ایک دور افتادہ مقام پر اجنبی شہر اور غیر ملک میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کو چن لیا، اور انھیں مولانا غلام رسول مہرؒ کی رہنمائی اور

شورش کاشمیریؒ (وفات: ۲۴/ اکتوبر ۱۹۷۵ء) کے جوش نے اس راہ پر ڈال دیا، جس کے پاکستان میں ہونے کا بہ ظاہر کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ یوں انھوں نے اپنے ذاتی اور محدود وسایل سے حضرت مولاناؒ کے سیاسی، مذہبی، ادبی اور صحافتی آثار کی حفاظت، ترتیب اور تحقیق کے عظیم الشان کاموں کی بنیاد رکھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت ان کے افکار و آثار اور ان کی سیاسی اور ملّی خدمات پر ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کی فہرست بہت طولانی ہے۔ جس کی اہمیت اور قدر کے اعتراف سے ان کا مُبصر صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

اس وقت شایقین کی خدمت میں حضرت مولاناؒ کے مکتوبات کا جو مجموعہ پیش کیا جارہا ہے وہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے پہلے مرتب کردہ مجموعہ مکاتیب ابوالکلام آزادؒ (۱۹۶۸ء) کے بعد تین مجموعوں کی اشاعت اور اس کے بعد مزید تین مجموعوں کے ایک سیٹ کا پہلا مجموعہ ہے، اور امید ہے کہ سلسلۂ کاوش کے دو مجموعے، اور حضرت مولاناؒ کے ابتدائی مضامین اور چند دیگر رسایل کی اشاعت کے علاوہ خطوط کی اشاعت کا یہ کاروانِ تیز رفتار اپنی منزل کو بہت جلد پہنچ جائے گا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ!

ڈاکٹر صاحب کا مرتب کردہ یہ مجموعہ حضرت مولاناؒ کے نادر اور نایاب منتشر، غیر مطبوعہ، اور غلط محل میں شایع شدہ خطوط پر مشتمل ہے، جن کی طرف ابھی تک کسی صاحبِ ذوق نے توجہ ہی نہ کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے اس سے پہلے کے جو چار مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱- مکاتیبِ ابوالکلام آزادؒ (۱۹۶۸ء)

۲- افاداتِ آزادؒ (۱۹۸۴ء)

اس کا مقدمہ جناب اجمل خاں نے لکھا ہے، اور اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۳- مولانا ابوالکلام آزادؒ- آثار وافکار (۱۹۹۰ء)

۴- آثار ونقوش مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۹۹۷ء)

درحقیقت حضرت مولاناؒ کی ہمہ گیر شخصیت اور مختلف دایروں میں ان کی خدماتِ مذہبی، سیاسی، تعلیمی، ادبی اور مختلف علوم، فنون، فلسفہ، تاریخ وغیرہ پر ڈاکٹر صاحب نے جو دیگر کام انجام دیے اُن کی تعداد دھائیوں میں شمار کی جائے گی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صد سالہ جشن (۱۹۸۸ء) کے موقع پر ''آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان'' کے تحت پچیس کتابیں شایع ہوئیں تھیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے مولانا آزادؒ پر تنہا اتنی کتابیں تصنیف وتحقیق اور تالیف وترتیب دے کر شایع کیں اور کرائی ہیں کہ ہند وپاکستان کے تمام اہل قلم کی بھی نہ چھپی ہوں گی۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندستان میں بھی ''ابوالکلامیات'' میں سب سے زیادہ اور مختلف النوع کام انجام دینے والی شخصیت بن گئے ہیں۔

سب سے زیادہ منفرد بات یہ ہے کہ یہ سب کام جیسا کہ عرض کیا ہے انھوں نے اپنے ذاتی محدود وسایل سے سرانجام دیے، اور ان کا آغاز ایک ایسے وقت میں کیا جب پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں دایروں میں حضرت مولاناؒ کی سیاسی مخالفت کا اک طوفان آیا ہوا تھا اور بہ ظاہر حالات ڈاکٹر صاحب کے خلاف جارہے تھے، لیکن ان سخت ترین اور ناموافق حالات میں بھی انھوں نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت، آثار وافکار اور خدمات کی تصنیف وتالیف اور اشاعت کی وہ روایت زندہ کی جن کے تذکرے صرف تاریخ ہی میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت کا آغاز دورِ قدیم کے ادبا وشعرا کے آثار ونقوش سے ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ گو کہ کئی عہد بعد کی شخصیت تھے لیکن

اس فن مکتوب نگاری کو بھی انھوں نے اپنی انفرادیت سے ایک ایسے افق پر پہنچا دیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس مجموعے کے مکتوبات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں بھی حضرت مولاناؒ قدیم حکما کی طرح Eclectic اندازِ فکر سے قدیم وجدید کے حسین امتزاج کے ساتھ ساتھ وقت کے بڑے بڑے سیاسی، فکری، علمی، مذہبی مسایل کے بارے میں محدود دایروں سے بڑھ کر فکر ونظر کی وسعت لیے ہوئے ہیں۔ حضرت مولاناؒ کی اسی بلند فکر ونظر نے پنڈت جواہر لال نہرو کو یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے فرید العصر افراد اور اس کے بعد انقلاب فرانس کے پس منظر میں قاموس نگاروں کی یاد دلائی تھی۔

مکتوبات کے اس پہلے مجموعے کا دورانیہ ۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۰ء پر محیط ہے، اور یہی زمانہ حضرت مولاناؒ کے علمی اور سیاسی کارناموں کا دورِ اول بھی ہے، جس میں ان کی بلند فکری اپنی پوری آب وتاب سے نمایاں ہو چکی تھی۔

پیش نظر مکتوبات مختلف عمر، ذوق، فکر اور خیال کے افراد کو لکھے گئے ہیں۔ ان میں موضوعات اور مباحث کا تنوع بہت نمایاں ہے، لیکن حضرت مولاناؒ کا کمال یہ ہے ہر مکتوب الیہ کے ذہنی اور فکری پس منظر کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں اور کسی مکتوب میں بھی مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا یہ حسن ربط نہیں ٹوٹتا۔

سید حنیف رسول (کاکاخیل)

یکم جنوری ۲۰۱۴ء

مقدمہ:

مکاتیب ابوالکلام آزادؒ

مولانا ابوالکلام آزاد پر میں نے پہلا مضمون مرحوم کے انتقال پر لکھا تھا اور مارچ یا اپریل ۱۹۵۸ء کے ہفت روزہ چٹان لاہور میں شایع ہوا۔ اس کے بعد میں نے بے شمار مضمون لکھے اور پاکستان اور ہندستان کے اخبارات و رسایل میں شایع ہوئے۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد کی شخصیت و سوانح اور افکار و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر جامع تصنیف کا ایک منصوبہ بنایا اور اس سلسلے کی پہلی کتاب ''امام الہند (تعمیر افکار)'' کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت اور ابتدائی ادبی علمی زندگی کے تذکرے میں لکھی اور شایع بھی ہوئی۔ اس کے بعد مولانا پر بہت کتابیں لکھیں اور لکھوائیں بھی۔ مولانا کے ابتدائی، ۱۹۱۲ء سے پہلے کے متفرق و منتشر مضامین اور ان کے کلام کا مجموعہ ''ارمغانِ آزاد''، ان کے رسایل میں ''لسان الصدق'' اور ''پیغام'' (کلکتہ) کے عکسی ایڈیشن مرتب کیے اور مولانا کی تالیفات میں ''جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد''، ''البیرونی اور جغرافیہ عالم'' کو ایڈٹ کیا، ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' کے نام سے مولانا کے غیر مرتب و منتشر خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور ان سب کی اشاعت کا انتظام کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ پینتالیس برس میں کام کرنے کی اتنی ہمت اور توفیق عطا فرمائی کہ کاموں کی نوعیت اور تعداد و مقدار کو حافظے میں لانا چاہوں تو اس کے لیے وقت اور فرصت کی ضرورت ہوگی اور پھر بھی شاید کچھ چیزیں تذکرے سے رہ جائیں۔

میں نے مختصر اور طویل المیعاد، دو طرح کے منصوبے بنائے تھے۔ مختصر میعاد اور وقتی ضرورت واہمیّت کے کام تو مضمون نگاری کے علاوہ حضرت مولانا پر مختلف اہل قلم کے مضامین کے مجموعے یا مولانا کے بارے میں بعض اہل علم کے افادات وافکار کی تالیف کے کام تھے، یا مولانا آزاد کے صد سالہ سالِ پیدائش کے پروگرام کے سلسلے میں چوبیس کتابوں کے ایک یادگار سیٹ کی اشاعت تھی۔

مولانا کے صد سالہ سالِ پیدائش کی یادگار منانے کے لیے ۱۹۸۸ء کو مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن میں نے اپنے عدم وسایل کی وجہ سے ۱۹۸۵ء سے کام کا آغاز کر دیا تھا پہلے ''آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان'' قایم کی، پھر کتابوں کی تالیف وتدوین کا منصوبہ بنایا اور اس پر عمل پیرا ہوا۔ مٹیریل کی فراہمی اور تالیف وتدوین کی محنت خود اٹھائی اور اشاعت کے لیے مختلف پبلشرز کا تعاون حاصل کیا۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں اورنگی ٹاؤن کراچی میں لوٹ مار اور آتش زنی کا ہنگامہ برپا ہوا تو کتب خانے کی تباہی میں چار کتابیں مطبوعات آزاد صدی کی بھی شامل تھیں جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں، آگ کی نذر ہوئیں۔ ان کے کچھ نسخے دھوئیں میں اٹے ہوئے اب بھی اس حادثے کی یاد دلانے کے لیے ذخیرے میں موجود ہیں۔

جولائی ۱۹۸۸ء میں ہندستان کے سفر کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ اتر پردیش اردو اکیڈمی۔ لکھنؤ نے چھوٹی چھوٹی کتابوں اور الہلال، البلاغ کی جلدوں کا ایک عظیم الشان سیٹ شایع کیا ہے۔ جن کی تعداد تیئیس تک پہنچتی ہے۔ چھوٹی بڑی تیئیس کتابیں اس وقت تک ''آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان'' کے تحت، میں بھی شایع کر چکا تھا۔ اتر پردیش اکیڈمی کے منصوبے میں الہلال (۱۴۔۱۹۱۲ء)، البلاغ (۱۶۔۱۹۱۵ء) اور الہلال (۱۹۲۷ء) کی اشاعت، اس کا ایسا کارنامہ تھا، جس کا مقابلہ اور اس پر سبقت لے جانے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا، البتہ مولانا آزاد کے لسان الصدق (۵۔۱۹۰۳ء) اور پیغام کلکتہ (۱۹۲۱ء) کی عکسی اشاعتیں اور چند دیگر کام نیشنل کمیٹی کے

کاموں میں اپنی نوعیت اور خدمت کے اعتبار سے خاص تھے۔

پیغام۔کلکتہ کی اشاعت پر میرے دل میں فخر کا ایک احساس یوں پیدا ہوا کہ پیغام کی اشاعت کا عزم خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ نے بھی کیا تھا لیکن کسی وجہ سے اسے پیغام دستیاب نہ ہوا، آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان اسے پہلے شایع کر چکی تھی۔ میں نے اس کی پریس کاپیاں محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈایریکٹر خدا بخش لائبریری کو ان کی اجازت سے فراہم کر دیں۔اس کی ہندستانی اشاعت بعض خصوصیات، خصوصاً خاکسار کے ذوق و مشاغل کے تذکرے اور کام کے تعارف کی وجہ سے پہلی اشاعت (پاکستانی) سے زیادہ شاندار تھی۔

یہ معلوم ہو کر کہ اتر پردیش اردو اکیڈمی۔لکھنؤ کے منصوبے کے تیئیس ٹائیٹل ہیں۔ آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان کے منصوبے میں ایک ٹائیٹل کا اور اضافہ کر لیا۔ یہ اضافہ انڈیا ونس فریڈم کا مکمّل اردو ترجمہ تھا۔لیکن یہ صرف ترجمہ ہی نہ تھا۔اس پر محترم ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی (علی گڑھ) کے قلم سے ایک بلند پایہ و عالمانہ مقدمہ ہے۔خاکسار نے انڈیا ونس فریڈم کی پہلی اشاعت پر ہندستان پاکستان میں سیاست، تاریخ، صحافت کے دایروں میں اور شخصی سطح پر جو ردعمل ہوا تھا، خاکسار کے قلم سے اس کا تنقیدی جایزہ، اس پر خاص اضافہ ہے۔اس کے مرتب پروفیسر ہمایوں کبیر کا تعارف اور ان کے حوالے سے بعض مسایل پر تبصرہ ہے۔متن کے بعض مجملات کی وضاحت میں ایک خاص تعداد میں حواشی کا اضافہ ہے۔متن کے بیان کے مطابق کیبنٹ مشن پلان ضمیمے میں شامل نہیں تھا، اس میں شامل کیا۔اس قسم کے اہتمام نے ''انڈیا ونس فریڈم (اردو)'' کے اس ایڈیشن میں چند ایسی خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو اسے دیگر تمام اشاعتوں میں ممتاز بناتی ہے۔اس کی تین اشاعتیں اب تک بازار میں آ چکی ہیں۔اب چوتھی اشاعت بعض خصوصیات کے اضافے کے ساتھ ان شاء اللہ شایقین کی نظر سے گزرے گی۔

آزاد نیشنل کمیٹی کا منصوبہ چوبیس کتابوں کی اشاعت پر ختم ہوا۔ لیکن عدم وسایل کی وجہ سے منصوبے کا دورانیہ ۱۹۸۸ء کے سال میں محدود رہنے کے بجائے ۱۹۸۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۰ء کے اختتام تک پھیل گیا۔ اس کے بعد بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں متعدد کام انجام پائے ہیں اور الحمدللہ! خدمت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

قارئین کرام اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ تمام مختصر مدت کے یا وقتی ضرورت ہی کے کام نہ تھے۔ ان میں بعض مستقل اہمیّت کے خالص علمی اور تاریخی و سیاسی مطالعے کی دائمی ضرورت کے کام بھی ہیں۔ لیکن میرے پیش نظر شروع ہی سے طویل المیعاد منصوبوں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے آثارِ علمیّہ و دینیہ و سیاسیہ کی تلاش، فراہمی اور ان کی اشاعت کی اہمیّت زیادہ تھی۔ اس سلسلے میں الہلال کے اجرا سے قبل کے زمانے کے مولانا کے مضامینِ نظم و نثر، مولانا کے متفرق و غیر مرتب خطوط کی فراہمی اور مولانا کے خطبات، تقاریر، بیانات، پیغامات وغیرہ کی تلاش میرا خاص مقصد رہا۔ الحمدللہ! مجھے اس سلسلے میں اس سے بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، جس کی ایک دور افتادہ، علمی مآخذ اور سرچشموں سے ناواقف، دنیاوی وسایل سے محروم طالب علم سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر اس پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہوگا:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے آثار علمیّہ کی فراہمی کے سلسلے میں مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، ارمغان آزاد، کلیات آزاد، افادات آزاد، آثار و نقوش ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد (آثار و افکار)، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، البیرونی اور جغرافیۂ عالم، لسان الصدق (۵۔۱۹۰۳ء) اور پیغام (۱۹۲۱ء)۔ کلکتہ کی عکسی اشاعتیں، مضامین الندوہ (۱۰۔۱۹۰۵ء) لکھنؤ اور علامہ فرید وجدی مصری کی کتاب المرأۃ المسلمہ (مسلمان عورت) پر مولانا آزاد کے تاریخی تبصرے کی ترتیب و تدوین اسی سلسلے کے کام ہیں، جو نہ صرف انجام پائے ہیں، بلکہ شایع بھی ہو چکے ہیں۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب اور خطبات و تقاریر مولانا کے افکار کا بہت

بڑا ماخذ اور سرچشمہ ہیں اور مستند ترین حوالہ! چناں چہ مولانا کے خطبات و تقاریر، بیانات وغیرہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ رفتہ رفتہ جمع ہوگیا اور اس کی موٹی موٹی تقسیم بھی کرلی گئی ہے، لیکن وہ ایک بہت بڑا کام ہے اور فی الحال اس کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔ صرف مولانا کے مکاتیب کی جمع و ترتیب کے بارے میں چند ضروری تفصیلات کی طرف اشارہ کروں گا۔

۳۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کی فراہمی اور جمع و ترتیب کے کام کی اہمیت مولانا کی وفات کے بعد ہی میں نے محسوس کرلی تھی اور ان نوادر کی جستجو میں لگ گیا تھا۔ کامیابی کے آثار نے میری ہمت افزائی کی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ میں نے ۱۹۶۳ء میں مکاتیب کا ایک مجموعہ مرتب کرلیا اور اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی کے مالک مرحوم علاء الدین خالد نے اس کی اشاعت کا عزم ظاہر کیا۔ اگرچہ اس کی اشاعت ان کے حالات اور کاموں کے ہجوم کی وجہ سے ۱۹۶۸ء سے پہلے عمل میں نہ آسکی تھی۔

مذکورہ مجموعۂ مکاتیب میں ۵۹ مکتوب الیہم کے نام مولانا کے ۱۶۴ خطوط اور چند دیگر تحریرات ہیں۔ مولانا کا سب سے قدیم خط جو مولانا عبدالرزاق کان پوری کے نام ۱۹۰۰ء کا یادگار ہے، سب سے پہلے اسی مجموعے میں شامل ہوا۔ یہ مولانا کا واحد خط ہے، جس میں مولانا نے اپنے والد ماجد مولانا خیرالدین کا رکھا ہوا اپنا نام ''غلام محی الدین'' اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔ اس خط سے مولانا کی ابتدائی ادبی زندگی اور علمی ذوق اور تصنیف و تالیف کے شغل پر بہت مفید روشنی پڑتی ہے۔ اسی سے علامہ شبلی سے ان کی واقفیت، مراسلت کے تعلق، اور ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء کو پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے ہونے والے سالانہ جلسے میں شریک ہونے کے عزم کا پتا چلتا ہے۔ پٹنہ کے عزم سفر کا اصل محرک علامہ شبلی سے ملاقات اور مولوی خدابخش کے ذخیرۂ علمی سے استفادے کا شوق بھی تھا۔ یہ لائبریری آج ہندستان کے تاریخی کتب خانوں اور مخطوطات کے اہم ترین ذخایر میں شمار ہوتی ہے۔ اور ''خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری'' کے نام سے مشہور

ہے۔ مولانا محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کے نام مولانا آزاد کے کئی خطوط میں اس سے استفادے کے شوق کا ذکر آیا ہے۔ لیکن مولانا کی کسی تحریر و بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا اس وقت ان کے اس شوق کی تشنگی کے رفع کا سروسامان بھی فراہم ہوا تھا؟

۱۹۶۳ء میں مذکورہ مجموعۂ مکاتیب اشاعت کے لیے پبلشر کے حوالے کر دینے کے بعد میں اپنی مختلف مصروفیات اور گھریلو ذمے داریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس زمانے کی میری سب سے بڑی مصروفیت اور ذمے داری میری اپنی تعلیم تھی۔ ۱۹۶۲ء میں میری پہلی کتاب ''امام الہند (تعمیرِ افکار)'' چھپی تھی، اسی سال میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور ۱۹۶۸ء میں ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' مجموعہ شایع ہوا تو میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی یونی ورسٹی سے مجھے ایم اے کی ڈگری ملی۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے کوشاں رہا اور ۱۹۸۰ء میں خدا کے فضل سے سندھ یونی ورسٹی سے مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ ہوئی۔ یہ ایک ضمنی تذکرہ نکل آیا تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ میری اپنی تعلیمی اور دیگر مصروفیات کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیق اور ان کے آثار کی تلاش بھی جاری رہی۔ اس زمانے میں تحقیق و تصنیف اور آثار کی جمع و فراہمی کے بعض کاموں کی طرف اسی مضمون میں اشارہ کر چکا ہوں۔ یہاں صرف مولانا کے خطوط کی فراہمی کے باب میں کچھ عرض کروں گا۔

۱۹۶۸ء میں مجموعۂ ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' کی اشاعت کے بعد سے اب تک میں خطوط کی تلاش میں مصروف ہوں۔ گزشتہ دنوں عزیز و مخلص (سید خالد جامعی سلمہ، کے توجہ دلانے پر میں نے خطوط کی فراہمی کے سلسلے میں اپنے مساعی کے نتائج معلوم کرنے کے لیے اپنے ذخیرے کا جایزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ خاصا مواد جمع ہو گیا ہے۔ اپنے ذخیرے میں مکاتیب آزاد کے منتشر سرمایے کو جمع کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں تقریباً ایک سال گزر گیا۔ اب نتائج میرے سامنے ہیں۔ میں اپنی معمولی صلاحیتوں کے بارے میں سوچتا ہوں اور عدم وسایل اور بے سروسامانی کو دیکھتا ہوں تو

جو کچھ فراہم ہو گیا ہے، اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔ لیکن پیش نظر کام کی اہمیت اور تگ و دو کے میدان کی وسعت پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں ابھی تو کام کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ مولانا کی ساٹھ سالہ (۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۸ء) ادبی، علمی، صحافتی، مذہبی، سیاسی جدوجہد کی زندگی میں چھوڑے ہوئے آثار ونقوش کا عشر عشیر بھی فراہم نہیں ہوا۔ زندگی کے جن دایروں میں مولانا ابوالکلام نے اپنی تگ و دو کے نقوش اور گوناگوں علمی آثار چھوڑے ہیں، ان تک تو ابھی رسائی بھی نہیں ہو سکی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس طرف توجہ ہی نہیں کر سکا۔ بیرون ہند کے ہر شخص کے لیے وہ دروازے بند ہیں۔ ہندستان کے مآخذ سے تو وہیں کا اسکالر فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ مجھ جیسے طالب علم کو تو بازار میں فروخت ہونے والی کتاب کے لیے بھی برسوں تڑپنا پڑا ہے اور بعض اوقات پھر بھی مایوسی ہوئی ہے۔

میرے دل کو اس بات سے بڑی ڈھارس ملتی ہے کہ یہ کام اتنا بڑا اور علم و عمل کے اتنے گوشوں میں پھیلا ہوا ہے کہ مجھ جیسے ایک بے وسایل و بے سروساماں شخص کا تو ذکر ہی کیا، کوئی صاحبِ وسایل اور باسروسامان شخص بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ مسئلہ صرف وسایل و عدمِ وسایل کا نہیں بلکہ اس راہ میں شوق و ہمت کے سرمایے اور مشکلات میں صبر اور تحمّل کی پونجی کا ہے! طویل المیعاد منصوبوں کی تکمیل میں سب سے زیادہ اہمیّت اس چیز کی ہوتی ہے کہ کسی شخص کا شوق اس کا کہاں تک ساتھ دیتا ہے اور اس کی ہمت کب جواب دے جاتی ہے۔ طویل مدت کے کاموں میں مآخذ تک رسائی میں مشکلات پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پھر اس قسم کے کاموں کے لیے جب تک ماحول میں معاونت کا جذبہ موجود نہ ہو، کسی ایک شخص کے شوق کا اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ نئے مآخذ کی تلاش اور ان سے استفادہ تو دور کی بات ہے، مآخذ بھی ناپید اور تحقیق کے شایقین کی دست رس سے روز بہ روز دور ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں زمانے کی بے ذوقی، ہمرہانِ سفر کی بے دلی اور راہ کی

مشکلات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی قدرت سے یہ بات ہرگز بعید نہیں کہ وہ کسی صاحبِ ہمت کو پیدا کر دے، جس کے عزم کے سامنے مشکلات سر نہ اٹھا سکیں، اس کی راہ میں سمندر آئیں تو پایاب ہو جائیں، پہاڑ جس کی ٹھوکروں کے خوف سے اپنی جگہ چھوڑ دیں اور خوف کے ہول ناک صحرا عازم وقت کے احترام میں سمٹ کر ایک طرف ہو جائیں اور اس کی کامیابی کے لیے راستہ صاف کر دیں۔

بہ ہر حال مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کی فراہمی و ترتیب کے لیے ایک طالب علم اور کوتاہ دست کی کارگذاری خواہ قابلِ ستایش اور لایقِ انعام نہ ہو لیکن اسے بالکل رد نہیں کر دیا جا سکتا!

پیشِ نظر مکاتیب کا یہ سرمایۂ جدید جو مختلف مآخذ سے حاصل کیا گیا ہے، تقریباً دو سو چالیس حضرات کے نام مولانا کے تقریباً آٹھ سو خطوط پر مشتمل ہے۔ اس میں ''غبارِ خاطر'' (مرتبہ مالک رام) اور ''نقوش آزاد'' (مرتبہ و بنام غلام رسول مہر) کے خطوط شامل نہیں۔ یہ خطوط ادبی، علمی، تاریخی، دینی، تعلیمی، سیاسی افکار و مسایل اور نج کے معاملات و تعلقات کے تذکار و بیانات سے معمور ہیں۔ اس میں مجمل، متوسط اور مطول، ہر طرح کے خطوط ہیں۔ ان خطوط کی زبان و بیان کی صحت، اسلوبِ تحریر و نگارش کے حسن اور ہر نوع کے خطوط میں بحث و نظر کے فکری، علمی اور تحقیقی معیار کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دیگر مطبوعہ خطوط کے مطابق ہے۔ یہ تمام خطوط تین جلدوں میں مرتب کیے گئے ہیں، جن کی تقسیم و ترتیب اس طرح ہے:

جلد اول جو ۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۰ء کے دورانیے پر محیط ہے۔ اس میں ۳۵ حضرات کے نام مولانا کے تقریباً پونے تین سو خطوط ہیں۔ اس کے بعد تقریباً دو سو حضرات کے نام پانچ سو خطوط کا ذخیرہ میرے پاس رہ جائے گا۔ اور چوں کہ خطوط کی تلاش سے ہاتھ نہیں اٹھا لیا ہے، اس لیے امید ہے کہ بقیہ خطوط کی اشاعت کے لیے پریس جانے تک مزید خطوط دستیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ تقریباً ایک ہزار صفحات

کی دو مساوی جلدوں میں خطوط کا یہ سارا ذخیرہ سمیٹ لیا جائے گا۔

اس مقام پر ایک اور بات کی صراحت کر دینی چاہیے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' کی اشاعت کراچی، ۱۹۶۸ء کو الگ اور ایک مستقل مجموعے کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے، لیکن جب محترم مالک رام نے اس کے خطوط کی ایک تعداد کو ''خطوط ابوالکلام آزاد''۔ دہلی میں شامل کر لیا تو مرحوم مشفق خواجہ کے مشورے کے بعد اس خیال سے رجوع کر لیا اور اس کے تمام خطوط کو تاریخی ترتیب سے، مذکورہ تینوں جلدوں میں شامل کر لیا گیا۔

مجموعے میں مکاتیب کے تقدم کی بنیاد ہر مکتوب الیہ کے نام مولانا کے پہلے خط کو بنایا گیا ہے اور اس کے نام دیگر خطوط کو تاریخی ترتیب سے مرتب کر دیا ہے۔

ان تین مجموعوں کے مکاتیب کے علاوہ ''افادات آزاد'' اور ''آثار ونقوش'' کے جو مکاتیب کی تلاش وجستجو کی درمیانی مدت میں مرتب کر کے شایع کیے تھے۔ ان میں سے حال ہی میں افادات کا تیسرا ایڈیشن شایع ہوا ہے، اور آثار ونقوش کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری کا سروسامان پیش نظر ہے۔ چوں کہ ان دونوں مجموعوں کو مذکورۃ الصدر منصوبے کا حصّہ بنا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس سلسلے کی چوتھی جلد بنیں گے، اس لیے ان کی خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے؛

ا۔ افادات آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سیکریٹری محمد اجمل خان نے مولانا مرحوم کے ''ملفوظات دینی'' اور ''مختلف ادبی وعلمی استفسارات کے جوابات'' پر مشتمل دو مجموعے دلی سے شایع کیے تھے۔ خاک سار نے ان دونوں مجموعوں کو نئے ملفوظات و جوابات کے اضافوں، مولانا محمد اجمل خان کی طرف سے جوابات کے ترک اور صحت کے خاص اہتمام سے، اجمل خان صاحب کے ''مقدمے'' کے ساتھ ''افاداتِ آزاد'' کے نام سے شایع کیا تھا۔ یہ مجموعہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ۱۱۸ ملفوظات اور ۱۴۱ جوابات پر مشتمل ہے۔ یہ ملفوظات معجز بیانی اور جوابات کے حسنِ

اختصار و معنی آفرینی کی مثال، لیکن عبارت آرائی سے معرا ہیں۔

۲۔ آثارِ ونقوش: یہ تالیف ''آثار'' اور ''نقوش'' دو حصوں اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے دورِ وزارت میں مختلف دفتری ضرورتوں اور اپنے معاصر کانگریسی اور حکومت کے ذمے داروں و اہل مناصب سے صلاح ومشورے کی تقریب سے، نیز اطلاعات وسفارشات کے ضمن میں جو مراسلت فرماتے تھے۔ اس کے مسودات کی خاصی تعداد اجمل خان صاحب کے پاس محفوظ تھی جو انھوں نے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا۔ دہلی میں محفوظ کرا دی تھی۔ جسے اس کے ایک ڈایریکٹر ڈاکٹر راجیش کمار پرتی نے ''آثار آزاد'' کے نام سے شایع کر دیا تھا۔ مولانا کے یہ خطوط و ہدایات ومشورے کسی ایک موضوع اور محدود دایرے کے افکار نہ تھے۔ بلکہ ان کا دایرہ بین الاقوامی روابط، تعلیمی ترقی، ثقافتی سرگرمیوں، سائنسی پیش رفت، بعض مذہبی مسایل انسان دوستی، سماجی بہبود، اقتصادی اور سیاسی و انتظامی مسایل تک پھیلا ہوا تھا۔

مولانا کے افکار و افادات کا یہ نادر اور بیش قیمت مجموعہ زیرِ نظر تالیف ''آثار و نقوش'' کا حصہ اول ہے۔ اس میں مولانا آزاد کے قلم سے ۲۱۴ جواہر ریزے ہیں۔

''آثار ونقوش'' کا حصہ دوم ''نقوش'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے وہ سترہ ہدایات واحکام ہیں، جو انھوں نے ''انڈین کونسل برائے ثقافتی تعلقات'' (آئی سی سی آر) کے صدر کی حیثیت سے مختلف دفتری فائلوں میں تحریر فرمائے تھے۔ اسی حصے میں تین دیگر تحریرات اور مولانا کے افکار وافادات میں ضمیمے ہیں۔ یہ آثار ونقوش کا حصہ سوم ہے۔ اس میں مولانا کے افادات کے ۲۳ یادگار نقوش ہیں۔

مجموعی طور پر تمام مکاتیب کی چار جلدیں بنتی ہیں جن کے مکاتیب کی تعداد تقریباً ۱۲۵۰ تک پہنچتی ہے۔ جن کے مکتوب الیہ تقریباً چار سوتیں ہوں گے۔ سلسلے کی پہلی جلد

جو ۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۰ء کے مکاتیب کا مجموعہ ہے، قارئین محترم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ۵۴۰ صفحات کی ضخامت تک جا پہنچی ہے۔ پیش نظر منصوبے کی آخری اور چوتھی جلد جو ''افادات'' اور ''آثار و نقوش'' کے خطوط پر مشتمل ہوگی ۴۰۰ صفحات میں سمائے گی۔ اس لیے امید ہے کہ چاروں جلدوں کی ضخامت ۲۰۰۰ صفحات تک پہنچ جائے گی۔

ادوار کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام کے مکاتیب کی خصوصیات میرے اندازے اور مطالعے کی روشنی میں اس طرح ہیں؛

☆ ۱۹۲۰ء تک کے خطوط میں ان کی زندگی، ان کے ذوق وشوق، ان کے مشاغل کا تذکرہ اور علمی مسایل اور ادب و مذہب کی رنگ آرائی زیادہ ہے۔

☆ اس کے بعد سیاست میں جوں جوں مولانا کا انہماک بڑھا، خطوط کا رنگ چوکھا ہوتا گیا۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۲ء اور جون ۱۹۴۵ء تا اختتام صدارت کانگریس تقریباً ایک سال کی مدت کے خطوط میں کانگریس کے فکر وفلسفہ کی تشریح، سیاسی مقاصد کے بیان اور مطالبات کے بارے میں صلاح ومشورہ و ہدایات پر مشتمل خطوط کی ایک خاص تعداد درآنی چاہیے تھی۔ چناں چہ یہ بات محسوس کرلی جاسکتی کہ اس دور کے افکار و مسایل کے تذکرے اور ان کے تقاضوں کے اثرات سے ان خطوط کے صفحات خالی نہیں۔ ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۳ء میں غبار خاطر کے خطوط اپنے مضامین اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے مولانا کی خطوط نویسی کی تاریخ میں مستثنیٰ مثال ہیں۔

☆ آزادی کے بعد کے دور کے خطوط میں خصوصاً ''آثارِ آزاد'' کے نوادر میں ملکی و قومی مسایل اور پڑوسی و ایشیائی ممالک سے لے کر عالمی سطح کی سیاسیات تک مولانا آزاد کے اندازِ فکر و رائے کی ایسی جھلکیاں موجود ہیں، جو برِاعظم پاک وہند کے زعما و مدبرین میں مولانا کا خاص امتیاز ہیں۔

ان خطوط کے مطالعے سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوجاتی ہے کہ وزارتِ تعلیم کے

خاص اور ٹیکنیکل مسایل سے لے کر ملک کی انتظامیہ، دفتری نظام اور ملک کی صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو اقلیتوں، قوم کے کم زور اور پس ماندہ طبقات کی فلاح و بہبود، ان کی ترقی اور ان کے حقوق و مفاد کے تحفظ کے درپیش مسایل سے لے کر بین الاقوامی سیاسی مسایل تک کوئی مسئلہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دایرۂ غور و فکر سے باہر، نظر کی گرفت سے دور اور توجہ فرمائی سے محروم نہیں رہا۔ اس خصوصیت میں ان کا کوئی معاصر، مدبر اور سیاست داں ان کا شریک اور ہم سر نہیں تھا!

مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کسی ایک موضوع پر نہیں، نہ کسی ایک ذوق و فکر کے لوگوں کو لکھے گئے اور نہ اخذِ مطالب اور فہم حقایق کے لحاظ سے تمام لوگ یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ مختلف ذہنی پس منظروں میں لوگ اپنے اپنے مسایل کی گتھیوں کو سلجھانے اور مشکلات کے حل تلاش کرنے کے لیے مولانا سے مشورے کرتے تھے اور بعض اوقات تو صرف اپنے قلب کی تسکین کے لیے مولانا سے رجوع کرتے تھے۔ مولانا کے خطوط میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ مولانا نے مرکز، ریاستوں اور ایران، پاکستان وغیرہ کے بعض مسایل میں ان کے ذمے داروں کو خود توجہ دلائی تھی۔

مولانا کسی کے خط کا جواب دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے اور جو لوگ جواب کے لیے ڈاک کے ٹکٹ روانہ کر دیتے تھے، وہ انھیں ہمیشہ واپس کر دیتے تھے۔ مولانا کے ایما یا ان کی ہدایت کے مطابق پرائیوٹ یا ان کے سرکاری سیکریٹری جواب دیتے تھے۔ مولانا کے بہت جوابات میری نظر سے گزرے ہیں، میں نے محسوس نہیں کیا کہ مولانا نے کبھی کوئی جواب بے دلی سے دیا ہو۔ کسی مستفسر نے مولانا کے جواب سے خواہ فایدہ اٹھایا ہو، خواہ نہ اٹھایا ہو! وہ مولانا کے جواب سے خواہ مطمئن ہوا ہو، خواہ نہ ہوا ہو، لیکن مولانا نے اپنے علم ورائے اور ذوق و عقیدے کے مطابق جواب ضرور دیا۔

مولانا کے خطوط میں مطالعہ و نظر کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں کہ قلم ان پر نقد و تبصرہ سے عاجز آجاتا ہے۔ اسی لیے زیرِ نظر مجموعوں کے خطوط پر ہر جلد میں ساتھ ساتھ

تعارف اور نقد و تبصرہ سے قلم کو روک لیا ہے۔ میرے سامنے اس وقت سب سے بڑا مقصد اشاعت کے ذریعے ان خطوط کو محفوظ کر دینا ہے۔ نقد و تبصرے کا کام بعد کے لوگ اپنے ذوق، وسیع مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں حالات و وقت کے مطابق انجام دے لیں گے۔ اور اگر خدا نے مہلت و توفیق عمل دی تو اس سلسلے کی اشاعت کی تکمیل کے بعد، میں خود بھی اپنے ذوق و ہمت اور استعداد کے مطابق یہ خدمت انجام دوں گا۔ موجودہ دور آثارِ علمیّہ کی تلاش اور جمع و ترتیب کا ہے۔ نقد و تبصرے اور کسی بات کا فوراً فیصلہ کر دینے کا نہیں!

ابھی بہت نئی معلومات سامنے آئیں گی، حقایق سے پردے اٹھیں گے اور انکشافات ہوں گے، تاریخ فیصلہ لکھے گی اور وہی فیصلہ تاریخ کا سچّا اور آخری فیصلہ ہوگا۔ خطوط پر نقد و تبصرے کے ساتھ مولانا مرحوم کے مکتوب الیہم پر مختصر سوانحی نوٹس کی تالیف و اشاعت، نیز اس مدت میں جو مزید غیر مرتب خطوط دریافت ہوں گے، ان کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری سے بھی عہدہ برآ ہوں گا۔ اس وقت تو میرے خیال میں نئے دست یاب شدہ خطوط، تمام خطوط پر نقد و تبصرہ اور مکتوب الیہم کے سوانح و تعارف کے لیے ایک دو جلد ہی کافی ہوں گی۔ لیکن بعد میں انجام پانے والے کاموں کے بارے میں اس وقت کسی قطعی فیصلے کا اعلان کر دینا مناسب خیال نہیں کرتا۔ امید ہے کہ اس بات کے حتمی فیصلے کا وقت بھی جلد ہی آئے گا۔

خطوط کی شکل میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی، ادبی، تاریخی، دینی وغیرہ آثار کی اشاعت کا آغاز کرتے ہوئے، میں اپنے ایک شوق کی تکمیل اور فرض کی ادائیگی کی ذمے داری سے سبک دوش ہونے کی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ خدا میری اس کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مکاتیب ابوالکلام آزادؒ

جلدِ اول

(متن)

مولانا عبدالرزاق کان پوری:

(۱) (۱)

حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدفیوضہٗ !

السلام علیکم۔مزاج شریف!

والا نامہ ورود ہوا،شرفِ اعتماد ہمراہ لایا۔خادم آپ کی اس عنایت بے غایت کا حد درجہ ممنون ومشکور ہوا کہ اس نالایق پر نظر مشفقانہ فرمائی اور جوابِ عریضہ سے افتخار و عزت افزائی بخشی:

یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا!

فی الواقع آپ کی ذاتِ بابرکات مغتنماتِ روزگار سے ہے۔اللہ جل شانہٗ آپ کو صدوسی سال سلامت رکھے اور مکروہاتِ زمانہ سے محفوظ:

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تُست

آپ نے جس اہم کام کا بیڑا اُٹھایا ہے،فی الواقع نہایت ہی مشکل ہے۔بلارو رعایت عرض کرتا ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ اس پُرخطر میدان میں بہادرانہ قدم رکھا!ان شاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے اور عن قریب آپ کی بیش بہا تصنیف سے ملک مستفیض ہوگا۔

حجتہ الاسلام امام محمد غزالیؒ کی لائف میں نے تھوڑے عرصے سے شروع کردی ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے،واقع میں ایک بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہے اور وقتِ کثیر درکار ہے،لیکن والسّعی منی والاتمام من اللہ، کا مقولہ ہر وقت پیش نظر ہے۔اور اگر اللہ کی مرضی ہوئی تو اپنے کام میں کامیاب ہوں گا اور ضرور ہوں گا۔اعظم گڑھ میں مولانا شبلی نعمانی کا عمدہ کُتب خانہ ہے۔گذشتہ کانفرنس میں جو کلکتہ میں جلسہ

ہوا تھا(۱) مولانا شبلی صاحب سے نیاز حاصل ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ آپ کے مفید کتب خانے سے خادم بھی مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ فہرست بھیجوں گا۔ شاید فرصت نہیں ہوئی، اس لیے ارسال نہیں کی۔ کل میں نے شبلی صاحب کے یہاں عریضہ لکھا ہے۔ چوں کہ آج کل "رائل ہیروز آف اِسلام" میں سے صلاح الدّین ایوبی کی لائف لکھتے ہیں، کم فرصت ہے۔

پٹنہ کی بابت جو کچھ آں جناب نے تحریر کیا ہے، بجا ہے! ۱۱ر رجب المرجب کو میں پٹنہ جاؤں گا، کیوں کہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہے(۲) اس لیے وہاں کے کُتب خانے کی بھی سیر ہو جائے گی۔ اگر تصنیفاتِ غزالیؒ مل گئیں، دیکھ لی جائیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ابھی صرف احیاء العلوم پر ایک تفصیلی ریویو کیا گیا ہے۔ اور جو کتابیں دستیاب ہوئیں، ان سے امام صاحبؒ کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ مصر وغیرہ سے کتابوں کے لیے خطوط لکھے ہیں۔ طبقات الشافعیہ تو موجود ہے۔ آپ دُعا کیجیے!

تمدنِ عرب، الفاروق، دربارِ اکبری، ترجمۂ قرآن، نظم وغیرہ میں قبل منگا چکا ہوں۔ سُبحان اللہ یہی کتابیں تو ہمارے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔ اللّٰھمّ زد فزد.

دیگر تحریر فرمائیں کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں، ان کے ترجمے اردو میں بھی دستیاب ہوتے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو کہاں ہوتے ہیں؟ تحریر کیجیے گا۔

خادم العلماء
غلام محی الدین آزاد کان اللہ لہٗ(۳)

حواشی:

(۱) آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرھویں اجلاس منعقد کلکتہ ماہ ستمبر ۱۸۹۹ء کی طرف اشارہ ہے۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ مولانا آزاد نے اس اجلاس میں شرکت فرمائی تھی اور اسی موقع پر حضرت شبلیؒ سے مولانا کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

(۲) ۱۴ر اگست ۱۹۰۰ء کو ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں طے کیا گیا تھا کہ ۱۱ر رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء سے پٹنہ

میں سالانہ جلسہ ہوا! اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کا یہ خط ۱۴ر اگست اور ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء کی درمیانی مدت کا ہے۔ مولاناؒ کا یہ سب سے پہلا خط ہے جو اب تک دستیاب ہوا ہے۔

(۳) مولانا آزاد کے والد نے مولانا کا نام غلام محی الدین ہی رکھا تھا، لیکن مولانا کا یہ واحد خط ہے جس میں یہ نام اس طرح نظر آتا ہے۔ اس کے سوا مولانا نے اپنا نام محی الدین احمد استعمال کیا۔ ابوالکلام کنیت اور آزاد تخلص تھا۔ الہلال، تذکرہ، ترجمان القرآن میں صرف ''احمد'' استعمال کیا ہے! ''احمد المکنّی بابی الکلام آزاد دہلوی''

(۲) (۲)

۲۰ر مارچ ۱۹۰۳ء (۱)

مکرمی و محترمی جناب مولوی عبدالرزاق صاحب!

کہیے! مزاج شریف!

جنوری کے اواخر میں، میں نے ایک عریضہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔

ہیچ صدائے نہ برخاست!

پریشان ہو کر میں نے ایک کارڈ تاکید مزید کے خیال سے ارسال کیا۔ اس پر بھی آپ کی نظر توجہ کا مستحق نہ ٹھہرا۔ جنوری، فروری، مارچ، آج مارچ کی بیسویں تاریخ ہے اور یہ تیسرا عریضہ آپ کی خدمت میں حاضر کیا جاتا ہے۔ دیکھیے، آپ تکلیف اور وقت جو خط لکھنے میں صرف ہوگا، اٹھاتے ہیں یا نہیں؟ خط پہنچتے ہیں یا نہیں؟

فرمایئے! آپ کی تصنیف کا کیا حال ہے۔ ''نظام الملک'' کہاں تک لکھی گئی؟ ''الھیئت'' میری الحمدللہ فروری میں تکمیل کو پہنچ گئی۔ (۲)

اب میں ایک اور ضروری تالیف کی تکمیل میں مصروف ہوں، جس کے متعلق مولوی شبلی صاحب کا خیال ہے کہ وہ ان کا موضوع میں نے چھین لیا ہے۔ یہ کتاب ساتھ ساتھ میں نے مرقع عالم پریس۔ ہردوئی میں چھپوانا بھی شروع کر دی ہے۔ کیوں کہ اپنے سابقہ خط میں، میں نے لکھا تھا کہ آپ رعد صاحب سے ''البرامکہ'' طبع کرا چکے ہیں، تجربہ کار ہیں۔ گو میں نے بہت کچھ چھپوایا ہے مگر اور مطابع میں۔ رعد

صاحب کے اصول وطریقے سے بالکل ناواقف ہوں۔ آپ دریافت کر کے لکھیے کہ کیا طریقہ ہے؟ مگر جب جواب نہ آیا تو میں نے مولوی محمد علی ایڈیٹر مرقع عالم کو جو میرے قدیمی کرم فرما ہیں، ان کے بے حد اصرار سے دے دیا۔ یہ کتاب ''العلوم الجدیدة والاسلام'' ہے اور سرسید مرحوم کی ڈیفنس [Defence] میں اپنی طرز کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق ایک دو جملے اور سن لیجیے!...... (۳)

حواشی:

(۱) اس خط پر سنہ تحریر درج نہیں ہے لیکن اس خط کے بعض مطالب رنجور مرحوم کے نام ۱۴؍اکتوبر ۱۹۰۲ء کے خط اور لسان الصدق (نومبر ۱۹۰۳ء) ''نظام الملک سلجوقی'' کے متعلق خبر اور بعض دیگر تحریرات پر غور کرنے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ خط ۲۰؍مارچ ۱۹۰۳ء کا ہے۔ اس وقت مولانا کو اندازہ نہیں تھا کہ کتاب ابھی کتنی لکھنی باقی ہے اور لسان الصدق (نومبر ۱۹۰۳ء) کی خبر کے مطابق اب انھیں اندازہ ہوگیا ہے کہ صرف ایک حصے کی تالیف باقی ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ خط نومبر ۱۹۰۳ء سے قبل (۲۰؍مارچ ۱۹۰۳ء) کا ہے۔

(۲) ''الہیئت ...... جدید علم ہیئت کی ایک مکمل کتاب'' کے عنوان سے خدنگ نظر۔ لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد نے ایک اعلان چھپوایا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اشاعت کے مرحلے میں تھی۔ اس خط اور خدنگ نظر (جون ۱۹۰۳ء) کے علاوہ ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' (صفحہ ۲۷۶۔۲۷۷) اور ''ذکر آزاد'' (صفحہ ۲۸۶) میں مولانا آزاد کی تصنیفات کی جو فہرست ان کے اپنے قلم سے شامل ہے، اس میں بھی مولانا نے اپنی اس تصنیف کا ذکر فرمایا ہے۔
''آزاد کی کہانی ...... (صفحہ ۲۸۱) میں ہے:

''اس کے مختلف ٹکڑے خدنگ نظر میں بھیجتا رہا''۔

لیکن خدنگ نظر میں مولانا آزاد کے نام سے کسی ایسے سلسلۂ مضمون کا پتا نہیں چلتا۔ البتہ ٹھیک اسی موضوع پر اور انھیں خصوصیات کا حامل ایک سلسلۂ مضمون ''عالم اجسام'' کے عنوان سے مولانا کے بھائی مولوی غلام یاسین آہ کے نام سے خدنگ نظر (اگست، ستمبر ۱۹۰۲ء وفروری ۱۹۰۳ء) میں چھپا ہوا ملتا ہے۔

(۳) مولانا کا یہ خط دو ورقوں پر مشتمل تھا لیکن مولانا محمد یوسف رنجور جعفری مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے صرف ایک ورق ہی دستیاب ہوا۔ اس کا دوسرا ورق ضائع ہوگیا اور اس طرح یہ خط نامکمل رہ گیا۔ (جرنل خدا بخش لائبریری، (۴۷)، صفحہ ۵۵، پٹنہ)

مولانا محمد یوسف جعفری رنجور:

مقدمہ

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی

مولانا محمد یوسف جعفری مرحوم کے نام مولانا آزاد کی یہ تحریریں حضرت جعفری مرحوم کے نبیرۂ محترم پروفیسر قدرت اللہ فاطمی صاحب کے پاس محفوظ تھیں اور انھوں نے ''آثار آزاد۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اوایل عمر کی خود نوشت تحریریں'' کے عنوان سے خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ کے شمارہ ۴۷ میں ان کا عکس چھپوادیا تھا اور ان پر ایک مفصّل مقدمہ بھی لکھا تھا، جس میں ان تحریروں کی خصوصیّت و اہمیّت اور ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور خاندان کی روایتی زندگی اور اس کے عقاید کے خلاف ان کی بغاوت اور انقلابِ فکر کے پس منظر، نیز مکتوب الیہ مولانا محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کی شخصیت، ان کے عظیم الشان خاندان کی تاریخ، اسلاف کے خصایصِ فکر و سیرت اور ان کی علمی، دینی و ملّی خدمات پر روشنی ڈالی تھی۔ اب یہ مقدمہ اس مجموعے میں مطالب کی نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

اس مجموعے میں خطوط کو ان کے عکس کی بجاے نستعلیق کمپیوٹر کتابت میں متن کی صحت کے خاص اہتمام، ان پر ضروری حواشی کے اضافے اور تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس اہتمام سے ان کے مطالعے میں سہولت پیدا ہوگئی ہے، حواشی کے اضافے سے ان کے مطالب کی اہمیّت زیادہ واضح ہوگئی ہے اور خطوط کی تاریخی ترتیب کی وجہ سے مکتوب نگار کے ذہنی و فکری ارتقا کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ خطوط کے متن اور حواشی پر محترم پروفیسر قدرت اللہ فاطمی صاحب کی نظر ثانی، تصحیح و اضافہ اور مقدمے کے لیے شکر گذار ہوں۔

محترم فاطمی صاحب کا مقدمہ یہ ہے: ا۔س۔ش

''میرے نانا شمس العلماء خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی مرحوم و مغفور کے ذاتی کتب خانے (واقع محلہ تھمہیہ، گلزار باغ، پٹنہ) میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؔ کے اوائلِ عمر کی چند تحریریں محفوظ تھیں۔ آزادی کے بعد ان کے پوتے عزیزم محمد سحبان جعفری، ایم، بی، اے، (ابن مولوی محمد حسان جعفری مرحوم) نے نقل مکانی کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی اور وہیں یہ نادر خزانہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اور از راہِ سعادت مندی یہ کہتے ہوئے انھوں نے اسے میرے حوالے کر دیا کہ ''بھائی جان! اس کے مستحق آپ ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں، یا مناسب سمجھیں تو اسے شائع کر دیں''۔ مجھے اس سے قبل ان تحریروں کا علم نہ تھا۔ ان کے مطالعے سے پتا چلا کہ ان میں سے اکثر نجی نوعیت کی ہیں۔ بنابریں حضرت مولانا سے پوچھے بغیر ان کی اشاعت کو میں نے روا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن مولانا سے مشورہ لیا کیسے جائے؟

میں نے اپنے بچپن ہی سے انھیں ''آزاد نانا'' کی حیثیت سے جانا تھا۔ آزادی سے پہلے، بالخصوص انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں شملہ مذاکرات کے دوران مجھے ان سے طویل ملاقاتوں کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ (اس زمانے میں ہم لوگ شملہ میں مقیم تھے۔) ۱۹۴۷ء کے بعد تو میرے اور مولانا کے درمیان آگ کا دریا حایل ہو گیا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ حالات بہت دیر تک قایم نہیں رہیں گے اور دونوں نو آزاد ملکوں کے درمیان ہمسائیگی کے رشتے استوار ہوں گے۔ بالآخر حالات نسبتاً بہتر ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے مستفید ہو کر آزاد نانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ وہاں چلے گئے، جہاں ان سے رابطہ قایم کرنا ممکن نہ تھا۔ یوں یہ تحریریں میرے پاس امانت پڑی رہیں۔

۱۹۶۴ـ۶۵ء کی بات ہے کہ مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی کے مستعد

معتمد جناب (اب، ڈاکٹر) ابوسلمان شاہ جہان پوری مولانا غلام رسول مہر کے تعارف کے ساتھ تشریف لائے اور انسٹی ٹیوٹ کی کارگزاریوں اور مستقبل کے منصوبوں کا انھوں نے ذکر کیا۔ میں نے ان کے اصرار پر حضرت مولانا کی تحریروں میں سے منظومات کا حصّہ ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے کسی مستند مجلّے میں عکسی تصاویر کے ساتھ شائع کر دیں۔ میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے وعدے کا بخوبی ایفا کیا اور ان منظومات کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی مُجلّہ ''اردو'' کراچی میں ایک تعارفی مضمون کے ساتھ چھپوایا اور اس کے ساتھ کلام کا عکس بھی شامل کر دیا(۱)۔

حضرت مولانا کے انتقال کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ ان کی وہ یادداشت جو ''انڈیا وِنس فریڈم'' کے تیس غیر مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے، عنقریب واگذار ہو جائے گی اور مولانا کی جامع سوانح عمری لکھنے کا وقت آئے گا۔ یقیناً مولانا کے اوایلِ عمر کی ان تحریروں کو بھی اب منظر عام پر آ جانا چاہیے، اس لیے کہ مولانا کے ذہنی ارتقاء کے بنیادی مراحل کو سمجھنے کے لیے، ان کے فکر کے تشکیلی دور کی ان تحریروں کا مطالعہ ضروری اور اہمیت کا حامل ہے۔ انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات، جن کا اتنا کچھ چرچا ہے، وہ ان کی کتاب زندگی کے خاتمے کے اجزا ہیں، جن کے مطالعے سے ایک شاندار زندگی کے آخری دور کا پتا چلتا ہے اور یہ گم نام تحریریں ان کے سفرِ زندگی میں فاتحۃ الکتاب کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں ان کی زندگی فکر و نظر کے نئے سانچوں میں ڈھلتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ ان تحریروں کے مطالعے سے ان کے انقلاب فکر کے پس منظر اور نئی تعمیر کی بنیاد کا پتا چلتا ہے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار لکھتے ہیں:

''۱۴، ۱۵، سال کی عمر تھی کپل وستو کے شہزادے گوتم کی طرح کلکتے کے اس مرشد زادے کو بھی حقیقت کی تلاش نے بے چین کر دیا، جس کے نتیجے میں اس کے

روایتی عقیدے ایک ایک کر کے تار تار ہو گئے۔(۲)

عین اسی زمانے میں جب کلکتے کے اس مُرشد زادے کے ذہن میں یہ انقلاب آ رہا تھا، اس کے پڑوس میں صادق پور کا ایک خاندان آ بسا، جس کے سربراہ محمد یوسف جعفری تھے۔ ان کے والد (مولانا یحییٰ علیؒ شہیدِ انڈمان)، حقیقی چچا (مولانا احمد اللہ شہیدِ انڈمان) اور سگے ماموں (مولانا عبدالرحیمؒ اسیرِ انڈمان) راہِ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ ''وہابیت'' جس سے اس مرشد زادے کے خاندان کو لِلّٰہی بغض تھا وہ اس نئے پڑوسی کی گھُٹی میں پڑی تھی۔

مولوی محمد یوسف جعفری کی ہمہ جہت شخصیت کی یہ خصوصیّت تھی کہ وہ صرف صادق پوری، وہابی نہ تھے بلکہ سرسیدی علیگ بھی تھے۔ پیش نظر تحریروں کے مصنّف کے قول کے مطابق ''علی گڑھ کالج کے اولڈ اسٹوڈنٹس میں ایک ممتاز شخص'' مولوی محمد یوسف جعفری کی شخصیت کا یہ قِران السعدین تاریخ کے جدلیاتی عمل کا عین تقاضا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت میں سلفیت اور جدیدیت کے حسنِ امتزاج میں اس صاحبِ قِران کے دستِ رہنما کی کارفرمائی کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سفر اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں تقلیدِ محض کو ذرا دخل نہ تھا۔ ابوالکلام کا ذوقِ تحقیق تقلید سے بالکل نا آشنا تھا۔ ان کی شخصیت کا خمیر ذوقِ سلیم کی مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ تقلید کی تاریکی سے تحقیق کی روشنی کی طرف ان کا جو قدم اٹھا تھا۔ اس کا اوّلین رہنما ان کا ذوقِ سلیم ہی تھا۔ ان کا قلبِ سلیم کسی ایسی چیز کو قبول ہی نہ کر سکتا تھا، جس میں تقلید کا شائبہ ہو۔ لیکن اس ذوق کی تربیت میں صادق پور کے علماے حق کے اس فخرِ خاندان کا بھی حصّہ ہے اور بہت بڑا حصّہ ہے۔ یہی وہ فیضانِ الٰہی تھا جس نے ان کے قلبِ سلیم کو توحیدِ خالص کے آشیانے کے لیے چن لیا تھا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے شعور کی اولین منزل ہی میں اپنے باپ کے رکھے ہوئے نام ''غلام محی الدین'' میں شرک کی بو سونگھ لی تھی اور ادبی زندگی کے آغاز کی دو تین مستثنا مثالوں کے

سوا انھوں نے یہ نام کبھی استعمال نہیں کیا اور تحذیف ''غلام'' اور اضافہ ''احمد'' کے بعد اپنا نام ''محی الدین احمد'' پسند کیا۔ جو کنیت، تخلّص اور نسبت وطن کے ساتھ ''ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی'' قرار پایا۔

انقلاب آتا ہے تو اپنے ساتھ کچھ تباہیاں بھی لاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا آزاد کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلابِ فکر پیدا ہوا اور ان کی گھریلو زندگی پر اس کا اثر نہ پڑے۔ ماں کے وجود سے گھر پہلے ہی خالی ہو چکا تھا، اس انقلابِ فکر نے والد (مولانا خیرالدین) اور بھائی (مولوی غلام یاسین آہ) کو بھی ان سے بدگمان کر دیا۔ ان کی شب و روز کی لعن طعن نے آزاد کی زندگی کو اجیرن کر دیا۔ وہ موت کی آرزو کرنے لگے اور اپنے تئیں ہلاک کر دینے کا وسوسہ ان کے دل میں پیدا ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کے وجود کی سلامتی مقصود تھی۔ گھر میں ایک بہن (آبرو بیگم) نے تسلّی دی، ڈھارس بندھائی اور آنسو پونچھے اور گھر سے باہر خدا نے محمد یوسف جعفری رنجور کی شکل میں ایک شفیق اور بزرگ مربی پیدا کر دیا۔ جس نے اپنی شفقتوں اور محبتوں سے ایسا نوازا کے باپ اور بھائی کی محبّت سے پیدا ہونے والا خلا پُر ہو گیا۔ ان کا وجود آزاد کے لیے ایک شجرِ سایہ دار ثابت ہوا، جس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں نے انھیں سکون بخشا۔ ان کی ذات پیغمبرانہ علوم و معارف کا ایک سرچشمہ تھی، جس کی صحبت میں انھوں نے توحید خالص کے جام لنڈھائے تھے اور تعلیم کتاب و حکمت کی تشنگی دور کی تھی۔ ان کی علمی صحبتوں میں روح کی تکلیفیں دور ہوئی تھیں اور ان زخموں کے لیے مرہم میسّر آیا تھا جو گھر کی امن و سلامتی اور بعض بزرگوں کی شرک آمیز زندگی نے اس کے قلبِ سلیم پر لگائے تھے۔ جو نظر نہ آتے تھے لیکن ان کی کسک دل میں محسوس ہوتی تھی۔

مولانا محمد یوسف جعفری ایک عظیم انسان تھے۔ عمر کے لحاظ سے ان میں اور آزاد میں باپ بیٹے کی عمروں کا تفاوت تھا، لیکن انھوں نے دوستی اور برابری کی سطح پر اتر کر آزاد کی نہ صرف دل داری بلکہ ناز برداری کی۔ ان کی ایک شخصیت میں مولانا آزاد

کو باپ کا سایۂ عاطفت، بھائی کی محبّت، دوست کی دل داری و رفاقت، استاد کی شفقت و تربیت اور وہ سب کچھ مل گیا، جس کی انھیں اس وقت ضرورت تھی۔ محمد یوسف جعفری ایک ایسے شفیق انسان اور حکیم و مربی شخص تھے، جنھیں معلوم تھا کہ آزاد کی بے چین روح کی تسکین اور تعلیم و تربیت، قلب کے اطمینان و قرار اور ذہن و فکر کی آسودگی کے لیے کیا کچھ مطلوب ہے۔

کہا گیا ہے کہ آزاد شبلی کی صحبت میں سب سے زیادہ فیض یاب ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ اس پر غور نہیں کیا گیا کہ انھیں جو کچھ بننا تھا وہ تو اس سے پہلے ہی ایک حکیم وقت کی صحبت میں بن چکے تھے۔ ان کی شخصیت کی مضبوط و مستحکم بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ اس بنیاد پر شخصیت کی عظیم الشان تعمیر باقی تھی۔ اس تعمیر میں شبلی کا کتنا حصّہ ہو سکتا ہے؟ ان ''خطوط'' کے آئینے میں ان حالات و کیفیات کو صاف طور پر دیکھ لیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت ''مولانا آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' کے مطابق مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں مولوی محمد یوسف جعفری، سے...... ملاقات بہت بڑھ گئی تھی اور روزانہ دار الاخبار میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ابتدا سے وہ احسن الاخبار، انجمن اور دارالاخبار کی تجویز اور انتظام کے ایک شریک اور معاون رہے تھے''۔(۳)

روزانہ کی ان ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ نصف ملاقات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ خطوط اس کا بین ثبوت ہیں۔ محمد یوسف جعفری رنجور اور محی الدین احمد آزاد کی عمروں میں جتنا زیادہ تفاوت تھا، ان کے ذہنوں میں اتنا ہی تطابق اور فکر میں ہم آہنگی تھی۔ اس لیے آزاد اس تعلّق کے بارے میں کوئی حتمی رائے قایم نہ کر پائے۔ چھوٹائی بڑائی اور برابری کے نشیب و فراز سے ان خطوط کے قاری کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ بمبئی

سے جو خطوط لکھے گئے ہیں، ان میں تو آزاد برابری کی سرحدوں کو بھی پار کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو وہ ان کے خورد نہیں بلکہ بزرگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ "بڑاپن" آزاد کے سوانح نگاروں اور ناقدوں کے لیے ان کی نفسیات کا ایک معمّہ بن کر رہ گیا ہے۔ انگریزی میں کہاوت ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں، کچھ خود اپنی کوشش سے بڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ پر بڑائی تھوپ جاتی ہے۔ مولانا عظمت کی ایک چوتھی صنف کے مالک تھے۔ وہ پیدائشی بڑے تھے اور بہت بڑے۔ والد مولانا خیر الدین کے ددھیال اور ننھیال میں کئی علمی شخصیتیں تھیں۔ خود مولانا کا ننھیال ایک علمی خاندان تھا۔ اس طرح انھوں نے کئی علمی خاندانوں کی عظمتیں ورثے میں پائی تھیں۔ انتہائی ذہانت اور غیر معمولی علم اور فضیلت کے جوہر بچپن ہی میں آشکار ہو گئے تھے۔ وہ بچپن ہی میں پجنے لگے تھے۔ لیکن اس موروثی عظمت پر قناعت کر لینے کے بجائے انھوں نے اپنے لیے اکتسابی عظمت کی نئی منزل کو اپنا مقصود بنایا اور ساری عمر اسی تلاش میں سفر جاری رکھا۔ اس سفر کا نقشہ اور نشان بنانے کے لیے ان کے پاس صرف ایک نسخہ تھا:

نمی رویم زراہے کہ کارواں رفت ست

تنہائی ایسے مسافر کا مقدر ہوتی ہے۔ وہ برابر تنہا رہے۔ باپ نے ان کی شادی لڑکپن میں کر دی تھی۔ لیکن محض ایک بچی کے ساتھ، جس سے ذہنی رفاقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مولوی محمد یوسف جعفری نے تقریباً چار سال حقِ رفاقت ادا کیا۔ لیکن ان کی اپنی بھرپور عائلی زندگی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ اپنے جوان بیٹے بن یامین کے مرنے پر انھوں نے رو رو کر اپنی بینائی گنوا دی تھی اور ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو اس کے ہم نام کی جدائی میں حضرت یعقوبؑ کو پیش آیا تھا۔ یعنی "وَابیضَّت عَینَاهُ مِنَ الحُزنِ وَهُوَ کَظِیم" (۴) ظاہر ہے یہ رفاقت دیرپا نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے ختم ہونے سے پہلے ہی مولانا شبلی نے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ لیکن راہِ

سفرِ عظمت و عزیمت کا ساتھ مولانا شبلی بھی زیادہ دیر تک نہ دے سکے۔ لیکن شبلی کی رفاقت کی مدت اتنے مہینوں کی بھی نہ تھی، محمد یوسف جعفری کی مدتِ رفاقت جتنے برسوں کی تھی۔ ایک اہم فرق یہ بھی تھا کہ حضرت جعفری مرحوم نے آزاد کو سلفیت کے جس رنگ میں رنگ دیا تھا، اسے حضرت شبلی کی شدید حنفی عصبیت بھی نہ اتار سکی۔ اور بالکل اتارنا تو درکنار اس کا رنگ مدھم بھی نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ یہ رنگ کسی خاص رسم و روایت اور وقت کی کسی خاص فقہ کا رنگ نہ تھا، بلکہ کتاب و سنت اور توحیدِ خالص کا رنگ تھا۔ ''صبغة اللّٰہ وَمَن احسنُ مِنَ اللّٰہ صبغة'' (۵)۔

تاہم شبلی کی تھوڑے دنوں کی اس رفاقت نے ندوہ والوں کے ساتھ منافست کا در نہیں تو دریچہ ضرور کھول دیا۔ جس نے شاید آگے کی رفاقتوں کی راہ بند کردی۔

اب آیئے اس ''مجموعۂ آثار'' پر بھی نظر ڈالیں۔ سب سے پہلی تحریر اس مجموعے میں مولانا کا وہ خط ہے جس میں ''تذکرۂ صادقہ کا قطعۂ تاریخ طبع'' ہے (۶) اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے لکھا ہوا ۱۴ مئی ۱۹۰۶ء کا خط اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

نانا ابا حضرت رنجور مرحوم کے نام پہلے خط سے قبل کا صرف ایک خط مولانا عبدالرزاق کان پوری کے نام دستیاب ہوا ہے۔ لیکن مولانا کی ابتدائی زندگی کے اتنے آثار جو ۴۶ خطوط رنجور مرحوم کے نام، ان کے ایک مضمون پر تعارفی نوٹ اور ایک خط بن یامین کے نام کل ۴۸ تحریروں کی شکل میں اور تقریباً چھ ۶ سال کی مدت میں پھیلے ہوئے کسی اور کے نام نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کے نام خطوط کی تعداد ۱۸۳ ہے۔ اس سے زیادہ کسی کے نام نہیں لیکن اول تو یہ ۴۵ برس کے تعلقات کا نتیجہ ہیں، دوسرے یہ کہ اس میں پچاسوں خط مولانا کے سیکریٹری کے قلم سے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے میں حضرت رنجور مرحوم کے نام مشمولات کی تعداد سینتالیس (۴۷) ہے۔ انھیں میں نے حتی الامکان تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ ان میں کچھ شعر و سخن سے متعلق منظوم اور نثری تحریریں ہیں۔ کچھ دینی عقاید سے متعلق خطوط ہیں، کچھ صحافت

سے متعلق اور کچھ دوسرے قسم کے ہیں۔

میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں کہ لڑکپن میں انھیں اپنی وہابیت اور نیچریت (حقیقت پسندی) کی کتنی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کی جھلکیاں ان خطوط میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بالخصوص وہ طویل خط جس پر ''پرائیوٹ'' لکھا ہے، مولانا کے حزن وابتلا کی دردناک دستاویز ہے۔ (دیکھیے: خط نمبر ۳۹)

حضرت مولانا کی ذہنی تشکیل کے دو اہم ترین عنصر تھے: عدم تقلید اور رواداری۔ ان عناصر کا ظہور ان کے نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی اور سماجی رجحانات میں بھی نمایاں تھا۔ روشِ آباء سے انحراف کے نئے نئے جوش نے ان میں شروع زمانے میں عصبیت پیدا کردی تھی۔

۱۹۰۳ء میں ''احسن الاخبار'' میں ان کے ایک مضمون بہ عنوان ''اسلام اور محرم'' کی اشاعت، اس کی واضح مثال ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی راوی ہیں کہ خود مولانا کو یہ اعتراف تھا کہ انھوں نے یہ مضمون

> ''چوں کہ عین جذبات کی برانگیختگی میں لکھا تھا، اس لیے اس میں شک نہیں کہ بحث ونظر کے ایک متحمل اور سامح اسلوب کی جگہ سختی اور شدتِ بیان پر مبنی تھا۔ مضمون کا مقصد تو یہی تھا کہ ان بدعات ورسوم کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور یہ اسلام کو غیروں کی نظر میں بالکل غلط اور مسخ طور پر پیش کرتی ہیں، لیکن ''لوگوں کو مخاطب کرکے ایک شدید لب ولہجہ میں اس پر زجر وتوبیخ بھی کی تھی''۔ (۷)

لیکن غلطی کے اس احساس کے لیے انھیں کن مرحلوں سے گزرنا پڑا، اس کا کچھ اندازہ اس سلسلے کے بعض خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس قضیے کو رفع دفع کرنے میں جناب کاظم شیرازی نے اہم خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہ فاضل بزرگ بورڈ آف ایگزامنرز، کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے سربراہ اور نانا ابّا مرحوم کے رفیق کار اور معترِف و ممنون تھے۔ اس واقعے نے مولانا آزادؒ کو اعتدال پسندی اور میانہ روی کا ایسا سبق دیا

جو زندگی بھر ان کا مسلک رہا۔

صحافت سے متعلق خطوط کا پس منظر میں نے اپنی بڑی خالہ مرحومہ (نجم النساء جن کی شفقت کی گود میں، میں پلا بڑھا ہوں) کی زبانی سنا ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ''لسان الصدق'' کے اجرا کے زمانے میں (۸) گھر میں کارخانہ سا کھل جاتا تھا۔ جس کے دفتری کاموں میں منجھلے ماموں (بن یامین) مرحوم اور وہ خود بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی تھیں۔

فن شعر میں آزاد دہلوی رنجورؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے، لیکن ان کا اثر بہت کم قبول کیا تھا۔ اور چوں کہ یہ کوئی اہم بات نہ تھی، اس لیے انھوں نے اس کا ذکر بھی کہیں نہیں کیا۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کو جن منظومات کے عکسی چربے میں نے فراہم کیے تھے، اور اب ان کی تالیف ''ارمغانِ آزاد'' میں شامل ہیں، ان میں سے بعض پر حضرت رنجور کی اصلاح کے آثار بہت واضح ہیں۔

مولانا آزاد نے انگریزی بھی انھیں سے سیکھی تھی۔ جس کا ذکر مولانا نے ''انڈیا وِنس فریڈم'' میں کیا ہے۔ اس شاگردی کا سُراغ ۵/جولائی ۱۹۰۲ء کے لکھے ہوئے خط نمبر ۸ سے بھی ملتا ہے۔ اس کے ایک سال بعد کے خط نمبر ۲۴ میں انھوں نے اپنا صبح پانچ بجے سے شام کے ساڑھے سات بجے تک کا پروگرام درج کیا ہے۔ اس میں انگریزی کے اسباق کا ذکر نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد و رنجور کے درمیان انگریزی کی تعلیم و تعلّم کے واقعے کا تعلّق جولائی ۱۹۰۲ء سے پہلے کا ہے جو ایک دو سال چلا تھا۔

اس پروگرام میں ایک اور لائق توجہ بات یہ ہے کہ مولانا نے روزانہ شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کا ایک گھنٹہ خطوط نویسی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ خطوط نویسی سے ان کے شغف کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ زیر نظر مجموعے کے اکثر خطوط اور رقعات کلکتے کے ایک محلے سے دوسرے محلے تک بھیجے گئے ہیں۔ میں اُوپر

مولانا کی تنہائی کا ذِکر کر چکا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے خطوط نویسی کا سہارا لیا تھا۔

مولانا آزاد کو اپنی اولوالعزمی اور آزادروی کی بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی تھی، جس کا ذکر پچھلی سطروں میں کر چکا ہوں۔ اس کے سبب مالی لحاظ سے انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اُن کا اندازہ بھی اس مجموعے کے کئی خطوط سے کیا جا سکتا ہے۔

آزاد نا بے اندازہ محبّت کرنے والے اور انتہائی رقیق القلب انسان تھے۔ ان میں اثر اندازی اور اثر پذیری دونوں کی بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ اثر پذیری اور حسّاس طبعی کے آثار ان کے خطوط میں خصوصیّت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ان میں سے دو میں آرہ کے سانحے کا ذکر ہے۔ یہ اشارہ حضرت مولانا ابراہیم آرویؒ کے انتقال کی طرف ہے۔ میری والدہ ماجدہ کے رشتے کے نانا تھے۔ آزاد سوگوار خاندان سے تعزیت کے لیے کلکتہ سے سفر کر کے پٹنہ پہنچے تھے۔ غالبًا حضرت مولانا عبدالرحیمؒ سے ان کی ملاقات اسی موقع پر ہوئی۔ جناب رنجور نے جب بہ وقت رخصت ان کے آنے پر اظہار تشکر کیا تو اس کے جواب میں جس والہانہ انداز میں انھوں نے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے، وہ ان کی عالی ظرفی کی روشن مثال ہے۔ میرے نزدیک یہ خطوط اس خزانے کے بیش بہا جواہر پارے ہیں۔

کچھ خطوط طرفین کی فرمائشات پر مشتمل ہیں۔ مولانا آزادؒ ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کی لطافتوں سے بہ خوبی آشنا تھے۔ ان خطوط سے طرفین کے قلبی اور ذاتی اور گھریلو قسم کے تعلقات اور حد درجے اپنائیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دو خطوط میں ''بانکی پور لائبریری'' (خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری) کی فہرست کے لیے اضطراب کا اظہار ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے عنفوانِ شباب ہی سے انھیں اس عظیم و پرثروت خزینۂ علم سے تعلّق خاطر تھا۔ وہ اپنے ۱۵؍مئی ۱۹۰۳ء کے خط

(نمبر۳۴) میں لکھتے ہیں:

''بانکی پور لائبریری کی فہرست کی تلاش ضروری ہے۔ اس کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ اگر نقل ہو سکے تو نقل ہی کرا لیجیے۔ اجرت دے دی جائے گی''۔

تقریباً ایک مہینے بعد ۱۸؍جون کے پوسٹ کارڈ (نمبر۳۰) میں یاد دہانی کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بانکی پور لائبریری کی فہرست کا خیال رہے۔ اصل ملے تو بہتر ہے ورنہ نقل کرا کے بھیجیے گا۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے''۔

اس سے ان کے علمی و تحقیقی ذوق کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاعری کا شوق ختم ہو رہا تھا۔ اس بات کا ثبوت خدنگ نظر (لکھنو) کے حصّۂ نثر میں منشی نوبت رائے نظر کی معاونت اور نومبر ۱۹۰۳ء میں لسان الصدق کے اجرا سے بھی ملتا ہے۔ باوجود ے کہ مولانا آزاد خدنگ نظر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور لسان الصدق تو ان کی مکمّل ادارت میں نکلا تھا اور وہ ملکیّت بھی انھی کی تھا، لیکن ان دونوں رسالوں میں (مارچ ۱۹۰۳ء میں جب وہ خدنگ نظر کے حصّۂ نثر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے تھے اور اپریل، مئی ۱۹۰۵ء میں جب لسان الصدق بند ہوا)، ان کی کوئی غزل، نظم، قطعہ وغیرہ شایع نہیں ہوا۔

آخر میں عزیزم محمد سحبان جعفری کے لیے دل کی گہرائی سے تشکّر کے جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر اس خوشگوار فریضے کو ٹال نہیں سکتا کہ یہ تو گھر کا معاملہ ہے۔ انھوں نے جس طرح اس خزانے کی حفاظت کی اور جس فراخ دلی سے اسے میرے حوالے کر دیا، اس کے لیے خدا ان کو جزاے خیر دے۔ سحبان اس وقت اچھے بینکر ہیں۔ امانت کے تقاضوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان شاء اللہ وہ اور ترقی کریں گے۔ اس لیے کہ وہ ''القوِی الامین'' ہیں۔

سید قدرت اللہ فاطمی
۲۱۔ عسکری ولاز، چک لالہ اسکیم نمبر ۲۱
راول پنڈی، پاکستان

حواشی:

(۱) سہ ماہی اُردو۔ کراچی: اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۔ ا،

(۲) بیدار، ڈاکٹر عابد رضا، "مولانا ابوالکلام آزاد": رام پور، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۱۹۶۸ء، ص ۵۵

(۳) ملیح آبادی، (عبدالرزاق): آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: دہلی، مکتبۂ اشاعت القرآن، ۱۹۶۵ء، ص ۳۰۳۔

(۴) سورۂ یوسف: ۸۴، (ترجمہ) اور شدتِ غم سے (روتے روتے) اس کی آنکھیں سفید پڑگئیں اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔

(۵) سورۂ بقرہ: ۱۳۸، (ترجمہ) یہ اللہ کا رنگ دینا ہے اور (بتلاؤ!) اللہ سے بہتر اور کس کا رنگ دینا ہو سکتا!

(۶) تذکرہ صادقہ ۱۳۱۹ھ میں طبع ہوا تھا۔ ۱۳۱۹ھ ۲۰/ اپریل ۱۹۰۱ء تا ۹/ اپریل ۱۹۰۲ء کے مطابق تھا۔

(۷) تفصیل کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی ...... از ملیح آبادی، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۷

(۸) لسان الصدق کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۳ء میں اور آخری شمارہ اپریل، مئی ۱۹۰۵ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔ مجموعی طور پر اس کی دس اشاعتوں کی شکل میں کل تیرہ (۱۳) نمبر نکلے تھے۔

سید قدرت اللہ فاطمی

یہ خطوط ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) نے لائبریری کے جرنل (۴۷) میں محترم پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی کی عنایت سے شایع کیے تھے اوران پر مندرجہ ذیل تعارفی شذرہ بھی تحریر فرمایا تھا:

''پروفیسر سیّد قدرت اللہ فاطمی (پ۱۹۱۲ء) خانوادۂ صادق پور (عظیم آباد، پٹنہ) کے چشم و چراغ اور شمس العلماء خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کے نواسے ہیں۔ آپ کے والد مولوی سیّد محمد عبداللہ (فاضلی ابنِ عبدالباسط عرف کفایت حسین، افضل پور، پٹنہ) برطانوی حکومت کے تحت انڈین ممبر بورڈ آف اگزامنرز کے عہدے پر فایز تھے۔ فاطمی صاحب نے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی۔ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب بھی ہوئے لیکن مالی مشکلات مانع آ گئیں۔ چناں چہ انگلینڈ جا کر اس کے زبانی [Viva] امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس طرح سرکاری افسری کے بجائے آپ کی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لیے جو آپ کا خاندانی ورثہ تھی، وقف ہو گئی۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے: جہاں ایک مدّت تک ترکی ایران پاکستان تنظیم، آر۔سی۔ڈی۔(ریجنل کوآپریشن فار ڈویلپ [Reginal Co.Opration for Development] کے کلچرل سنٹر کی پاکستان شاخ کے ڈایریکٹر رہے۔ کئی سال ملائشیا میں پاکستان اسٹڈیز کے پروفیسر رہے۔ (ملائشیا سے واپسی کے بعد چند برس تک مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی (کراچی و اسلام آباد) میں

خدمات انجام دیں اور اس کے علمی ماہنامہ ''فکر ونظر'' کو بھی ایڈٹ کیا۔ پاکستان ٹی وی پر مستقلاً آپ کے علمی شذرات سننے والوں کے لیے دلآویزی پیدا کر رہے ہیں۔ پاکستان اور برصغیر کی تاریخ پر آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ملازمت سے اب ریٹائر ہو کر اسلام آباد میں مقیم اور علمی وادبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں''۔

اب اس مجموعے میں یہ خطوط محترم ڈاکٹر صاحب اور حضرت فاطمی صاحب ہر دو بزرگوں کے شکریے کے ساتھ شامل کیے جا رہے ہیں۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

مکاتیب

﴿۳﴾

(۱)

برادرِ شفیق!

کسی قدر اس وقت بخار چڑھا ہوا ہے۔ طبیعت مضطرب ہے۔ کل اوپر آئے، تاریخیں لکھیں، مگر اب کوئی شخص لے جانے والا نہ تھا۔ بھائی صاحب نے بھی صاف انکار کر دیا۔ ایسی حالت میں کہ گلدستوں کی طرحوں اور اخباروں کے مضامین سے ان کو فرصت نہ ہو کہ وہ اپنے بھائی علیل کی طرف متوجہ ہوں۔ خود میں زینہ دوبارہ طے نہیں کر سکتا تھا۔ یا تو گر پڑتا، یا راہ ہی سے واپس آ جاتا۔ آخر رحمت آئی، جس سے کہا، تو اس نے کہا کہ مولوی صاحب نہیں ہیں۔ میں نیچے دیکھ کر آئی ہوں۔ میں تو باوجود بیمار ہونے کے اس قدر بے بس ہو رہا ہوں۔ بیماری میں ہزار خیال......(۱) موجود ہوئے۔ غرض یہ میری اُنھیں مجبوریوں کے سلسلے میں ایک مجبوری تھی، جس سے میں خود یا جابر واقف ہے۔ اب وہ پُرزہ گم ہو گیا ہے، کیوں کہ میں نے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس لیے جو یاد ہے، اُسے لکھ دیتا ہوں زیادہ کا انتظار نہ فرمائیں:

اس رسالے کی کس سے ہو تعریف

واقعی فیض کا مقالہ ہے
ہر روایت ہے، مستند اس کی
معتبر اُس کا ہر حوالہ ہے
سر سے آزاد لکھ دو ہجری سال

+۱

خیر آفاق یہ رسالہ ہے

۱۳۱۸=۱۳۱۹ھ(۲)

پارسی نہیں (۳) منظور صاحب (۴) سے بے شک لکھوا دیں۔ میری طرف سے بھابی صاحبہ (۵) وغیرہا کو آداب وتسلیم۔

رنجور آزاد

حواشی:

(۱) جملہ پڑھا نہیں گیا۔

(۲) اس خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں، لیکن یہ ''تذکرۂ صادقہ'' کی تاریخ طبع ''۱۳۱۹ھ'' ہے، جو ۲۰/اپریل ۱۹۰۱ء تا ۹/اپریل ۱۹۰۲ء کے مطابق ہے۔ اس لیے یقین ہے کہ یہ خط ۱۹۰۱ء کا ہے۔

(۳) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک فارسی قطعہ یا مثنوی نہیں لکھی گئی تھی۔

(۴) سید منظور احمد شاہو بیگھہ ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ ان کی شادی مولانا رنجور مرحوم کی بڑی صاحب زادی نجم النساء سے ہوئی تھی۔ چوں کہ مولانا کو اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی، اس لیے انھوں نے اپنے داماد کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ سید منظور احمد ڈاکٹر تھے اور گھر ہی پر پریکٹس کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ محترم پروفیسر قدرت اللہ فاطمی صاحبؒ نے بیان فرمایا کہ پریکٹس اچھی نہیں چل رہی تھی۔ اس لیے بددل ہو کر سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی اور برما چلے گئے تھے۔ ۱۳۳۵ھ میں وہیں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال سے مولانا رنجور مرحوم بہت غم زدہ ہوئے، لیکن مشیت ایزدی پر صبر کر لیا۔ مولانا کی ڈائری میں تین قطعاتِ انتقال یادگار ہیں۔ ان میں سات اشعار کے ایک قطعے میں ان کے وطن اور مرض الموت کا ذکر بھی ہے۔ اس کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

آہ منظور احمدِ خوش خو
ساکن شاہو بیگھہ ضلع گیا
مدتوں رہ کے مبتلائے سل
ہوگئے رہ گرائے ملکِ بقا
لکھیے تاریخِ فوت حسب الحال
جب یہ رنجور کو خیال آیا
پانچ بار ''آہ'' کرکے ہاتف غیب

۵×۶=۳۰

''آج منظور چل بسے'' بولا

۱۳۰۵+=۱۳۳۵ھ

ان کی وفات کی تاریخ اور مہینے کا پتا نہیں چلا۔ ۱۳۳۵ہجری سال عیسوی کیلنڈر کے ۲۸/اکتوبر ۱۹۱۶ء تا ۱۶/اکتوبر

۱۹۱۷ء کے مطابق تھا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں رانچی (بہار) میں نظر بند تھے۔ اس لیے شاید انھیں مرحوم کے انتقال کا پتا نہ چلا ہوگا۔ تذکرۂ صادقہ میں ان کے دو بیٹوں سید خلیل احمد اور سید انیس احمد کا نام ملتا ہے۔

(۵) بھابھی سے اشارہ مولانا رنجور کی اہلیہ عظیم النسا بنت حکیم ظہور الحسن آروی مرحوم کی طرف ہے۔ مرحومہ نے ۱۳۳۲ھ (مطابق: ۳۰ رنومبر ۱۹۱۳ء تا ۱۹ رنومبر ۱۹۱۴ء) میں انتقال فرمایا اور مولانا رنجور مرحوم کو چونتیس سال کی رفاقت چھوٹنے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ عظیم النساء محمد حسان جعفری کی والدہ ماجدہ تھیں۔ مولانا رنجور نے اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال پر نو اشعار کا قطعۂ تاریخ لکھا تھا جو حضرت مرحوم کی ڈائری میں موجود ہے۔

(۲) ﴿۴﴾

باسمہ

شفیق من، محبِّ یک رنگ، جناب مولانا رنجور صاحب!

آپ سے ٹریم میں رخصت ہوا اور مکان میں پہنچا تو وی پی لیے ہوئے ڈاکیا موجود تھا۔ آپ کو تکلیف دی اور ایک ضرورت سے نیومین کمپنی چلا گیا۔ لال بازار میں ٹریم ملی نہیں۔ انتظار کے بعد مکان پانوں سے چل کر آیا۔ گرمی (کی) شدت اور حرکت طبعی کی حرارت نے یہاں تک پریشان کیا کہ مکان تک پہنچ نہ سکا۔ خانۂ خدا کی راہ لی اور مسجد میں آکے بیٹھا۔ مکان پہنچا تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ دردِ سر، خفیف بخار، ابخارات کا زور گھیرے ہوئے تھے۔ نیچے اترا ہوا بیٹھا ہوں۔ ہوا چل رہی ہے۔ طبیعت ذرا سنبھل گئی ہے۔ نمازِ مغرب تا ہنوز القط۔ اس لیے گذارش ہے کہ اگر نہیں آسکا، تو خلافِ وعدگی پر محمول نہ فرمایئے گا۔ صبح کو آٹھ بجے بہ حسابِ انگریزی ٹائم حاضر ہوں گا۔

ساقی نامے کی ابتدا کر دی ہے۔ دو شعر لکھ چکا ہوں:

ساقیِ ماہ لقا نیک شیم!
یک نگہ برمنِ محزوں ز کرم
اے فدائے تو شوم، بندہ نواز!

جام دردِہ زمئے راز و نیاز (۱)

کیا یہ بحر مناسب ہے؟ آپ نے اپنے معزز خط میں جس امر کو باعث ندامت سمجھا ہے، در اصل محبّت میں وہ ندامت نہیں ہے۔ پرسوں تمام مبلغات حاضر ہو جائیں گے۔

خادم احباب
آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱) یقین ہے کہ یہ اُس مثنوی کے شعر ہیں جو مولانا تذکرۂ صادقہ کے لیے رنجور مرحوم کی فرمائش پر لکھنا چاہتے تھے۔ یہ دو شعر لکھ کر بحر کی موزونیت کے بارے میں مشورہ کیا ہے۔ رنجور مرحوم نے یقیناً اس کے ترک اور دوسری بحر کے اختیار کا مشورہ دیا ہوگا۔ چناں چہ مولانا نے وہ مثنوی (فارسی) لکھی جو رنجور مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے دستیاب ہوئی تھی اور ''ارمغان آزاد'' (۱۹۷۳ء پہلا ایڈیشن) مرتبہ خاکسار ابوسلمان میں شامل ہے۔ یہ مثنوی تذکرۂ صادقہ میں شامل نہیں ہو سکی تھی۔ مولانا نے اپنی تقریظ مشمولہ تذکرہ میں اس کی طرف بہ ایں الفاظ اشارہ فرمایا ہے:

''اپنے مکرم دوست جناب مولانا محمد یوسف جعفری چیف مولوی بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ کی فرمائش سے میں نے ایک مثنوی فارسی تقریظ میں نظم کی تھی جو وقتِ گنجایش کے سبب سے یہاں درج نہ ہو سکی''۔

اب یہ اندازہ بھی غلط نہ ہوگا کہ یہ خط جس میں یہ دو شعر درج ہیں، ۱۹۰۱ء کا ہے۔

(۳) ﴿۵﴾

باسمہ سبحانہ

برادرِ شفیق، غم گسار، حضرتِ رنجور!

الحمدللہ میں اب پہلے سے اچھا ہوں۔ بخار کم ہو چلا ہے اور طبیعت کی بے چینی جو بخار کے سبب سے تھی، بند ہو گئی ہے۔ مگر ساتھ ہی ہمشیرہ صاحبہ کی علالت نے طبیعت کو سخت مشوش کر دیا ہے۔ اُن کی یہ حالت ہے کہ ایک لقمہ منہ میں جاتا ہے اور استفراغ سے پھر نکل آتا ہے۔ طبیعت ان کی بے چین اور ہر وقت مضطرب رہتی ہے۔ (۱) خیر، آپ اور بھابی صاحبہ بالخصوص ہمشیرہ صاحبہ کے لیے اوقاتِ مخصوصہ میں دعائے صحت

کریں۔ اس لیے اب اگر میری طبیعت کو انتشار ہے، تو اپنی علالت کا نہیں بلکہ ان کی ناگوار حالت کا۔

تمبا کو کی گولیاں تاہنوز نہیں آئیں۔ تعجب ہے، باوجود ے کہ منظور میاں (دام لُطفہ') نے کارڈ بھی لکھا، طلبِ مزید بھی کی گئی، مگر ہیچ جوابے نہ برخاست۔ غالباً آج آجائیں گی۔ اُمید قوی ہے۔

تذکرہ کی تاریخیں تو چھپنے کے لیے چلی گئیں ہوں گی؟ (۲) بھابھی صاحبہ اور دیگر بزرگوں کی خدمت میں آداب وتسلیم فرمادیجیے اور برخوردار حسان اور بن یامین (۳) طول عمرہما کو دعا۔ اور کیا عرض کروں''!

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) اس خط میں اور اس کے بعد متعدد خطوط میں مولانا آزاد کی ایک ہمشیر کی بیماری کا ذکر آیا ہے۔ چوں کہ نام نہیں آیا ہے، اس لیے مولانا کی تین ہمشیرگان میں سے کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ محمودہ بیگم آبرو ہیں جن سے مولانا سب سے زیادہ مانوس تھے اور وہی سب سے زیادہ بیمار بھی رہتی تھیں اور اسی وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تھا۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی)۔

آبرو ۱۸۸۶ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی شادی مولوی احمد ابراہیم سے ہوئی تھی۔ بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ جون ۱۹۴۳ء میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حالات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ''ایک علمی خاندان'' از سید شفقت رضوی''۔ آبرو بیگم اور آرزو بیگم کی ایک تصویر جو انھوں نے مولانا رنجور مرحوم کی اہلیہ کو دی تھی۔ وہ مولانا آزاد کے نوادر کے ساتھ محترم قدرت اللہ فاطمی صاحب کے پاس آگئی تھی۔ اب یہ تصویر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کے ذخیرہ نوادر کی زینت ہے۔ اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے شکریے کے ساتھ ''ایک علمی خاندان'' میں چھپ گئی ہے۔

(۲) تذکرہ سے مراد ''تذکرۂ صادقہ'' ہے۔ اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ اس وقت شائع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یقین ہے کہ یہ خط ۱۹۰۱ء کے اواخر یا ۱۹۰۲ء کے اوائل (قبل از ۹ر اپریل) کا ہے۔

(۳) حسان اور بن یامین:

ا۔ محمد حسان جعفری حضرت رنجور عظیم آبادی کے تیسرے اور چھوٹے بیٹے تھے۔ مولف ''تذکرہ شعرائے بہار'' (حصہ اول) حکیم سید احمد اللہ ندوی کے بقول تقریباً ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ حسان تخلص تھا۔ اپنے والد حضرت رنجور ہی سے تلمذ حاصل

تھا۔ انگریزی میں ایف اے اور مشرقی زبان میں عالم فاضل تھے۔ انھوں نے کچھ انگریزی نظموں اور افسانوں کے ترجمے بھی کیے تھے۔ شاعری کا عمدہ ذوق تھا۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر درج ہیں۔ ان سے ان کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

رواں ہے کشتیِ عمر اپنی امواجِ حوادث میں
جہاں ڈوبے یہ بیڑا ہم وہیں ساحل سمجھتے ہیں
فریبِ ہستیِ دو روزہ اے حسّان کیا کھائیں
کہ ہم تو اس طلسمِ دہر کو باطل سمجھتے ہیں!

محمد حسّان کی شادی ۱۳۳۴ھ (مطابق ۹ر نومبر ۱۹۱۵ء تا ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۶ء) میں ہوئی تھی۔ مولانا رنجور نے اپنے فرزندِ دل بند کی تقریبِ شادی میمنت آبادی کے موقع پر جو قطعۂ تاریخ لکھا تھا یہ ہے:

بنے میرے فرزند حسّان دولہا
خوشا وقت وہ ساعتِ نیک آئی
جو ہو فکرِ تاریخ رنجور تم کو
تو لکھ دو "مبارک ہو یہ کتخدائی"!

محمد حسان محترم قدرت اللہ فاطمی کے سگے ماموں تھے۔ فاطمی صاحب نے ان کی دو بیٹیوں طاہرہ اور ہاجرہ اور چار بیٹوں محمد سحبان، محمد شمعان، محمد نعمان، محمد غسان کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد کے یہ نوادرِ ادبی فاطمی صاحب کو محمد سحبان صاحب نے عطا کیے تھے۔ محمد حسان نے ۱۹۴۸ء میں انتقال کیا۔

۲۔ محمد بن یامین مولانا رنجور مرحوم کے منجھلے بیٹے تھے۔ ان کے نام مولانا آزاد کا ایک خط ہے۔ ان پر نوٹ ان کے نام خط کے ذیل میں ملاحظہ ہو!

(۴) ﴿۲﴾

بسمہ

امرتلہ لین نمبر ۱۱، کلکتہ

۲۸ر مئی ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ

شفیقی عالی جناب مولانا مولوی محمد یوسف صاحب!

السلام علیک وقلبی لدیک

آج غالباً میں وقتِ معہودہ پر نہ حاضر ہو سکوں۔ کیوں کہ مجھے ایک ضروری مقام

پر جانا ہے۔ اس لیے اگر آپ کو اس وقت کہیں تشریف لے جانا ہو، تو میرا انتظار نہ فرمائیے گا۔ اطلاعاً تحریر کیا گیا۔

خادمِ احباب
ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کان اللہ لہٗ

(۵) ﴿۷﴾

باسمہ سبحانہ

۱۲؍جون ۱۹۰۲ء یوم الخمیس

میرے مکرم عنایت فرما! تسلیم

آپ سے مجھ سے محبانہ تعلقات گو قلبی حیثیت سے کیسے ہی قوی کیوں نہ ہوں، مگر مدّت کے لحاظ سے بہت ہی محدود حالت میں ہیں۔ اور اسی لیے مجھے اس وقت اس خط کے لکھنے میں بہت سے حجابات واقع ہوئے ہیں۔ مگر چوں کہ اس بات کا مجھے یقین کلی ہے کہ آپ سچّی محبّت کے اصول سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ عامل بھی ہیں اس لیے یہ گذارش اور یہ بے وقت کی جسارت میری داخلِ لغویت نہ کی جائے گی۔

روپے کے گم ہونے کا حال تو آپ سُن چکے ہیں، اس لیے تمہید کی ضرورت نہیں۔ اصل مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک روپے کا کوئی بندوبست نہ ہوا اور ہوتا نظر بھی نہیں آتا۔ نور محمد (۱) کے روپے رات کو گم ہو گئے اور تین بجے اس کا تقاضا ہے اور آزاد کی ندامت! اس لیے اگر ممکن ہو اور تکلیف نہ ہو تو مبلغ بیس روپے اسی وقت (یا تین بجے تک) بطورِ قرض عنایت ہوں، جو دو تین ہفتوں کے اندر اندر ادا کر دیے جائیں گے۔ کیا ممکن ہے؟ اور بھی احباب تھے، جنھیں اس بارے میں تکلیف دینی ممکن تھی۔ مگر میری نگاہِ انتخاب ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہتی تھی، جو بہ لحاظ اپنے محبانہ وصفوں کے اس

تکلیف کے قابل ہوا اور اسی وجہ سے اس وقت آپ کو تکلیف دی۔

''تکلیف دوستوں ہی کو دی جاتی ہے'' (گولڈ اسمتھ)

اس مقولے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

''تکلیف جب دوستوں کو دی جاتی ہے تو وہ راحت سے بدل جاتی ہے''۔

آزاد کی رائے:

''اگر تکلیف دہی دوستاں را کہ آن تکلیف نباشد'' (سعدی)

حاملِ رقعہ معتبر آدمی ہے۔ آپ روپے اسے دے سکتے ہیں۔

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

امرتلہ لین نمبر ۱۱۔ کلکتہ

حاشیہ:

(۱) نور محمد کون تھا، معلوم نہیں ہو سکا۔

(۶) ﴿۸﴾

اخی الاکرم!

آج چار بجے ایک ضرورت سے نیومین کمپنی میں جانا چاہتا تھا۔ یہاں سے ٹریم میں سوار ہوا۔ لال بازار جنکشن میں اُتر کر دوسری گاڑی کے انتظار میں کھڑا رہا۔ گاڑی جو آئی تو عجیب طور سے! برسات کی وجہ سے دونوں طرف پردہ پڑا ہوا۔ میں اس تشویش میں تھا کہ کیوں کر سوار ہوں کہ وہ کسی بگڑے ہوئے معشوق کی طرح آہستہ خرامی کے ساتھ روانہ ہوئی۔ میں اس کے پیچھے کسی ناکام عاشق کی طرح دوڑا۔ دامنِ یار تک تو آ پہنچا، مگر اب کامیاب ہوں تو کیسے؟

یا مفتح الابواب امددنی! جیسے ہی جلدی میں ہاتھ رکھ کر سوار ہوا، تو چوں کہ دوسرا ہاتھ پردہ کے اُٹھانے میں مصروف تھا، قبضہ ٹھیک نہ ہوسکا، اور میری مضبوط اقامت میں

کچھ تزلزل سا آ گیا۔ گرنے کو تھا کہ میں نے دہنے پاؤں پر زور کیا اور وہ کج ہو کر گرتے گرتے مڑ گیا۔ ٹریم پر سوار تو ہو گیا، مگر گھٹنے میں ضربِ شدید آ گئی۔ اس وقت وہاں سے اُتر کر بڑی مشکلوں سے دوسری ٹریم پر سوار ہوا اور سوار ہو کر لال بازار آیا۔ یہاں آ کر دوسری گاڑی پر سوار ہونا مشکلات میں تھا۔ گاڑی تلاش کی تو کوئی نہیں ملی، اور تلاش کرتا تو کون! ٹریم پر سوار ہوا اور مکان پر آ کر لیٹ گیا۔ واقعی میں قصوروار ہوں۔ مجھے اپنی خطا اور اپنے قصور پر یقین ہے۔ مجھے بایں ہمہ حاضرِ خدمت ہونا تھا۔ مگر وائے غفلت! وائے خواب پریشاں! تیرا (بھلا ہو) کہ تو نے آزادِ ناشاد کو اپنے مخدوم، اپنے مکرم کی خدمت میں آنے سے باز رکھا۔ اس وقت جناب مسلم صاحب(۱) تشریف فرما ہیں۔ اُن سے باتوں میں اپنا درد بھلانا چاہتا ہوں، مگر وہ چوٹ گھٹنے کی چوٹ ہے، دل کی چوٹ نہیں! پاؤں کی چوٹ ذرا بھی سہارا لینے نہیں دیتی، تکلیف کی وجہ سے نہ چل پھر سکتا ہوں۔ ایں ہمہ عنایتِ بے غایتِ اوتعالیٰ وتقدس است۔

مجھے ہمیشہ سے اس قسم کی بیماریوں سے آزردگی رہی ہے، جو چلنے پھرنے کی مانع ہوتی ہیں، گو وہ خفیف ہی کیوں نہ ہوں۔ اب دل میں سمجھ رہا ہوں، اگر اس وقت ذرا صبر کرتا تو اچھا ہوتا۔ دوسری گاڑی پر، جو سامنے آ رہی تھی اور پرداور دا کچھ بھی اور نہ تھا، سوار ہوتا تو میں اس تکلیف سے جو کئی دن تک مجھے چلنے پھرنے سے مانع رہے گی، محفوظ رہتا۔ مگر کردۂ خود را چارہ نیست! اور تقدیر کے کام میں مدبّر کی تدبیر نہیں حارج ہو سکتی۔

پچھلے دنوں سے متواتر جسمانی اور روحانی، صوری، معنوی تکالیف میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے! ہائے عشاق کی تکالیف کا اب یقین ہوتا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے دنوں، مجھ سے ایک ایسا (نا) خوشگوار کام سمجھ کر جان بوجھ کر نہیں، بے اختیاری میں صادر ہوا ہے، جس کے ضمیمے میں تکالیف جثہ ہمیشہ سے رہتا آیا ہے؟ مگر افسوس ہے کہ اب جسمانی تکالیف بھی لاحق ہو رہی ہیں، جو اُس گناہ کے منافی

ہیں۔ بہرِ کیف میرا یہ حال ہے، جو عرض کر دیا۔

آپ کا خادم

ابوالکلام آزاد دہلوی

یہاں آ کر میں نے کہا کہ میں زینے پر گر گیا تھا۔ تاکہ یہاں مجھ پر لے دے نہ ہو۔

حواشی:

(۱) غالباً اشارہ مولوی حافظ محمد مسلم آروی کی طرف ہے۔ مولانا رنجور مرحوم سے تعلقات نے مولانا آزاد سے انھیں متعارف کرایا ہوگا۔ مولانا رنجور مرحوم سے ان کے قریبی اور قلبی تعلق کا اندازہ ان کی وفات پر مولانا رنجور کے چار قطعات سے ہوتا ہے۔ تین قطعات اردو میں اور ایک فارسی میں ہے۔ ایک اردو قطعہ یہ ہے:

حافظِ مسلم گئے سُوے بہشت
بیوی اور بچوں کی کچھ پروانہ کی
عیسوی سال اس طرح رنجور لکھ
"راہ جنت حافظِ مسلم نے لی"

اس قطعے سے ۱۹۱۸ء برآمد ہوتا ہے اور تین دیگر قطعات سے ۱۳۳۶ھ (مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۷ء تا ٦ر اکتوبر ۱۹۱۸ء نکلتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ۱۹۱۸ء میں ان کا انتقال ٦ر اکتوبر سے قبل ہو گیا ہوگا۔ پروفیسر قدرت اللہ فاطمی صاحب نے لکھا ہے: "آرہ سے نسبت مکانی کے باعث قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ رنجور عظیم آبادی کی سسرال سے متعلق ہوں گے"۔

(۷)

﴿۹﴾

باسمہ سبحانہ

میرے سچے غم گسار حضرت رنجور!

میری کل تمام دن جو کیفیت رہی ہے، وہ حد بیان سے باہر ہے۔ زکام اور ریزش وغیرہ کا اس قدر ہجوم تھا کہ صبح سے شام تک سوائے اکل و شرب کے اور کوئی کام نہ

کر سکا۔ یا تو دونوں ہاتھوں سے "سر کو تھامے" (۱) بیٹھا رہا۔ یا بے چین ہو کر لیٹ رہا۔

شام کو اٹھا تو آپ کا تذکرہ بھائی صاحب سے معلوم ہوا۔ حضرت خیر کا خط بھی نظر سے گزرا، جس کا جواب اور جشنِ تاجپوشی کی نظم آج ارسال کر دوں گا۔ (۲)

آپ جشنِ تاجپوشی کی نظم نہ ارسال کریں۔ میں نے جو لکھی ہے، اسے ارسال کیا جائے گا۔ بلکہ مناسب ہوتا، اگر آپ مولوی ابوالحسن صاحب سے وہ منگوا کر دوسری عمدہ نظم ارسال کر دیتے۔

ابنائے زمانہ کی بے مہری اور ستم پر مجھے، گو فطرتِ انسانی کے موافق کچھ نہ کچھ افسوس ہوا، پھر جب اسی کلکتی شاعروں کے سلوک حضرتِ غالب اور حضرت داغ سے یاد آ گئے اور ان کی مثالیں رُوبرو ہو گئیں، تو طبیعت کو ایک گونہ تسلّی اور تشفّی ہو گئی:

یوسف نہ تھا عزیز بچشم برادراں

اچھوں کی ہو گی قدر نہ اس روزگار میں (۳)

کیا ستم ہے کہ طرحی غزل بہ مقابلہ غیر طرحی کے لچر کہی جاتی ہے۔ خاک بچشم دشمناں۔ طرحی غزل تو ایسی لاجواب ہے کہ شاید غیر طرحی بھی بعض مخصوص عمدگیوں کے سوا اس کے پائے تک نہیں پہنچتی۔

کما لا یخفیٰ.

خیر اس مشاعرے اور طرحی اور غیر طرحی غزل کے متعلق اور خطوط کی کیفیت (کی نسبت) اپنی رائے لکھ دیجیے گا۔ (۴)

آج کل میں انجیل کی سیر کیا کرتا ہوں۔ مارک کی انجیل قریب الاختتام ہے۔ اس کی تشبیہانہ عبارات اور استعارانہ اشارات عجب لطف دیتے ہیں۔ اس کے بعد توریت کا مطالعہ کروں گا۔

"عشق کی وجدانی کیفیتیں" اس عنوان پر میں ایک مختصر سلسلہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا پہلا نمبر میں نے ترتیب دیا ہے۔ جو کسی نامی میگزین میں ارسال کر دوں

گا۔ مگر بھیج دینے سے پہلے صاف کر کے آپ کے دیکھنے کے لیے ارسال کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرما کر پرسوں واپس کر دیجیے گا۔ کیا قابلِ اشاعت ہے؟(۵)

میرے درد میں کچھ طولانی لطف پیچیدگی کے ساتھ حاصل ہو رہا ہے۔ دیکھیے! کب اس لطف کا اختتام ہو!

بھابھی صاحبہ اور تمام اہلِ بیت حضرات اور حضرت منظور اور حضرت حسان اور بن یامین کی خدمت میں دعا و سلامِ شوق فرمادیں۔

آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) اصل جملہ سمجھ میں نہیں آیا واوین کے الفاظ انداز سے بڑھائے۔

(۲) مولوی ابوالخیر تخلص خیر، ابن حکیم محمد شفیع الدین موضع قاضی بھیڑہ ضلع دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ اخبار الپنچ بانکی پور کے عرصے تک ایڈیٹر رہے۔ جشن تاج پوشی کی مثنوی مولانا آزاد نے سب سے پہلے انھی کو بھیجی تھی اور الپنچ ۲۴ رجنوری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی بعدہ یہ مثنوی ۲۵ رجون ۱۹۰۲ء کو جشن تاج پوشی کے مشاعرۂ کلکتہ میں پڑھی گئی تھی۔ اس مشاعرے کی روداد بھی الپنچ کی اشاعت ۵ رجولائی ۱۹۰۲ء میں چھپی تھی۔ مولوی ابوالخیر کے حالات کے لیے تذکرہ مسلم شعرائے بہار مؤلفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی (حصہ دوم) اور مثنوی جشن تاج پوشی اور ''رودادِ مشاعرہ'' وغیرہ کے لیے ''ارمغانِ آزاد'' مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری، ملاحظہ کیجیے۔

(۳) مولانا آزاد کا اپنا شعر ہے (ارمغان آزاد)

(۴) اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن جشن تاج پوشی کی جو نظم (مثنوی) مولانا نے خیر صاحب کو بھیجی تھی وہ الپنچ کے ۲۴ رجنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں چھپی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ خط اوائل جنوری ۱۹۰۲ء کا ہوگا۔

(۵) شاید قابل اشاعت نہ ٹھہرا ہو اور خود مصنف نے ضائع کر دیا ہو! اگر حضرت رنجور کے پاس پہنچ جاتا تو شاید محفوظ رہ جاتا۔

(۸) ﴿۱۰﴾

باسمہ

۵؍جولائی ۱۹۰۲ء (یوم السبت)

میرے محترم عنایت فرما جناب مولوی رنجور صاحب!

میں آپ کو اپنا حال کیا لکھوں! افسوس مجھ کو ہے تو اس کا کہ میری پریشانی مجھ تک محدود نہیں رہتی، بلکہ آپ تک اُس کا اثر پہنچتا ہے۔ آپ کو انتظار کی سخت گھڑیاں کاٹنی پڑتی ہیں اور بعینہٖ یہی حال ہوتا ہے۔

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

ابھی آپ سے رخصت ہوا، اُوپر آیا تو دردِ سینہ میں مبتلا تھا۔ رہ رہ کر سینے میں درد اُٹھتا ہے اور یہ کچھ اپنا مزا چکھا کر چلتا ہوتا ہے۔ گھڑی پر میری نگاہ ہے اور نہایت حسرت کے ساتھ میں اُس کی رفتار دیکھ رہا ہوں۔ افسوس کرتا ہوں کہ میرا درد کم نہیں ہوتا اور وقت جارہا ہے۔ اِس وقت دس بج گئے ہیں اور غالباً آپ مکان میں ہوں گے۔ خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اسے میرے حالِ زار پر قیاس کر کے کسی بیرونی اثر پر محمول نہ فرمائیں گے۔

(۱) میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، مگر ایفاے وعدہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کے پہلے بھی آپ اس کی شکایت کیا کرتے تھے، مگر نہ اس قدر! ملاقات ہوتی تھی اور سبق کا بھی سلسلہ رہتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ تین دن سے میں نے آپ کے مکان کی صورت تک نہیں دیکھی۔ آپ اپنی مسلسل عنایت اور پرلے درجے کی مہربانی سے خود عنایت فرماتے ہیں اور خود چاہ کر مجھے سبق دیتے ہیں۔ ہائے! میں بھی کس قدر بدنصیب ہوں کہ آپ ایسا شفیق اور غم گسار اُستاد پڑا چلّا رہا ہے کہ آؤ آؤ! مجھ سے جو کچھ تمھاری قسمت میں ہے، سیکھ جاؤ، سیکھ جاؤ پھر یہ وقت نہیں ملے گا۔ مگر میں اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور، ایسے ایسے عوارضِ قلبیہ اور جسمانیہ میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ باوجود تشنگی

کے اس سرچشمۂ فیض سے سیراب نہیں ہوسکتا! افسوس بر بدبختی ما برسرِ ما خاک!

غرض یہ کچھ میرا حال ہے۔ اس لیے نہایت ہی ادب سے ملتجی ہوں کہ آپ ایک دو دن اس سلسلۂ سبق کو بند رہنے دیں۔ کیوں کہ روز روز کے وعدے وعید غیر ایفائی سے بہتر ہوگا کہ چند دنوں تک میں پچھلا آموختہ بھی دیکھا کروں اور پھر کچھ دنوں بعد سنا کر صاف کروں اور آگے کا سلسلہ شروع ہو جائے (۱)۔ بس! تب تک، جب کہ طبیعت کچھ سنبھل جائے اور عوارضِ جسمانیہ سے کچھ نجات مل جائے۔ پھر اگر میری قسمت میں آپ ایسے چشمہ فیض سے فیض یاب ہونا لکھا ہے تو ہو رہوں گا، ارادۃُ اللہ غالب علیٰ ارادۃِ النّاس۔ فلک در چہ خیالست و من در چہ خیالم۔ این ہمہ خوبی قسمت ماست!

(۲) اور آپ میرے اس بیان کو کسی اور وجہ پر محمول نہ فرمائیں۔

دوستوں کا خادم آپ ایسے شفیقوں کا گناہ گار

آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱) اس خط کی روشنی میں انگریزی کی تحصیل کے زمانے اور معلّم کا مسئلہ قطعی طور پر صاف ہو جاتا ہے۔ زمانہ ۱۹۰۲ء اور استاد حضرت رنجور مرحوم ہیں۔

(۹) ﴿۱۱﴾

باسمہٖ سبحانہ

وقتِ صبح ۷ بجے

تاریخ یاد نہیں (۱)

این دل کہ دارم در برم، وقفِ ہوائے یادِ تست

دانم کہ از جان برکشم، حرفِ مبارکبادِ تست

میرے سچے دوست اور شفیق بھائی حضرت رنجور!

میں آپ سے رخصت ہو کر مع الخیر کلکتہ پہنچا اور وہاں سے دس بجے تک مکان۔ اب میں آپ کے اُس خط کا منتظر ہوں، جس میں لکھا ہو کہ "میں آرہ میں مع الخیر پہنچا اور یہاں پہنچتے ہی میری حالت سنبھل گئی، اب بالکل اچھا ہوں"۔ مجھے امید ہے کہ ایسا خوش آیند خط کل تک مجھ مشتاق کو پہنچ جائے گا۔

آپ نے راہ میں چند اس قسم کے محبانہ الفاظ فرمائے جس طرح کہ آپ اپنے بے مثل اخلاق سے ہمیشہ فرماتے رہتے ہیں۔ مگر اس وقت میں بہ ادب ملتمس ہوں کہ للہ مجھے آپ "محسن" نہ قرار دیا کریں۔ ایسی حالت میں کہ میں ایسے موقعے کا خود متلاشی ہوں کہ مجھ کو اس جملے کی آپ سے نسبت کرنے کا موقع ملے۔ میں نے ہرگز کوئی احسان نہیں کیا، اور نہ میں کسی پر احسان کرسکتا ہوں۔ ہاں! آپ نے مجھے بہت ممنون کیا۔ ایک نہیں پچاسوں احسان کیے۔ میں سرتاپا آپ کے احسانوں کا ممنون ہوں۔

آرہ اس وقت ایک ماتم کدہ ہو رہا ہوگا۔ اور کسی جواں مرگ کے غم میں سب سیاہ پوش ہوں گے (۲)، اس لیے ممکن نہیں کہ آپ وہاں جائیں اور غم و افسوس میں حصّہ نہ لیں۔ چوں کہ آپ کی طبیعت علیل ہے اور نہایت ضُعف ہے، اس لیے آپ کو کسی قدر ضبط سے کام لینا چاہیے۔ طبیعت کو سنبھالنا چاہیے۔ آنکھیں تر ہو گئیں یا اس سے زیادہ یہ کہ رومال تر ہو گیا۔ مگر زیادہ افسوس و غم، علاوہ اس کے کہ آپ کی صحت کے لیے نامناسب ہے، بالخصوص دماغی حالت کے لیے بہت ہی مُضر ہے۔

اچھا، اب رخصت! کل ان شاء اللہ عریضہ حاضرِ خدمت ہوگا۔

آپ کا خادم

ابوالکلام الدہلوی

حواشی:

(۱) تحریر خط کے وقت مولانا کو تاریخ یاد نہ آئی، لیکن اس خط کے آخری اور ۱۳ر جولائی کے خط کے پہلے جملے کے ربط نے یہ

مسئلہ حل کر دیا۔ اس خط کا آخری جملہ یہ ہے: ''اچھا اب رخصت! کل ان شاء اللہ عریضہ حاضر خدمت کروں گا''۔ اور اس کے بعد کے خط مورخہ ۱۳؍جولائی کا پہلا جملہ یہ ہے: ''کل ڈاک میں، میں ایک خط روانہ کر چکا ہوں''۔ اس نے فیصلہ کر دیا کہ یہ خط ۱۲؍جولائی ۱۹۰۲ء کا تحریر کردہ ہے۔

(۲) اس خط میں آرے کے جس سانحے کا ذکر ہے، وہ محترم قدرت اللہ فاطمی کے مطابق مولانا ابراہیم آروی کے انتقال کا حادثہ تھا۔ مولانا آروی حضرت رنجور مرحوم کی اہلیہ کے رشتے کے بھائی تھے۔ مولانا رنجور ان دنوں پٹنہ میں تھے۔ مولانا آزاد تعزیت کے لیے پٹنہ تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپسی پر یہ خط لکھا تھا۔

مولانا ابراہیم آرہ ضلع کے رہنے والے تھے۔ ابومحمد کنیت اور ابراہیم نام تھا۔ آرہ پٹنہ وغیرہ میں تعلیم کے بعد دہلی میں مولانا نذیر حسین محدث کی خدمت میں حدیث کی تکمیل کی۔ آرہ آ کر ۱۸۹۰ء میں مدرسۂ احمدیہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ابویحیٰی امام نوشہروی نے ان کے مدرسۂ احمدیہ کو بہار میں اہلِ حدیث کی یونی ورسٹی لکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک جلسہ۔ مذاکرۂ علمیہ قائم کیا تھا: جو اُن کے بعد بھی ایک عرصے تک جاری رہا۔ اس میں علمی، دینی اور اصلاحی موضوعات پر تقریریں ہوتی تھیں اور ان پر سوالات و جوابات سے مسائل کی وضاحت کی جاتی تھی۔ الہلال میں جلسۂ مذاکرۂ علمیہ کی بعض خبریں یا اعلانات نظر سے گزرے ہیں۔ ۱۴، ۱۵؍فروری کو اس کا جلسہ ہونا قرار پایا تھا۔ یہ اس کا چوبیسواں سالانہ جلسہ تھا (الہلال ۴؍فروری ۱۹۱۴ء)! ۱۳۱۸ھ میں انھوں نے تیسرے حج کے لیے سفر کیا۔ حج کے بعد مزید ایک سال مدینہ منورہ میں قیام کیا اور چوتھے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ ابھی ایک منزل پر تھا کہ ہیضے میں مبتلا ہوئے اور حالتِ احرام میں ۷؍ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ مطابق ۲۸؍مارچ ۱۹۰۲ء بروز پیر انتقال فرمایا۔

مولانا ابراہیم بلند پایہ عالمِ دین تھے۔ تبلیغ و اشاعتِ دین اور مسلمانوں کی اصلاح کا خاص جذبہ رکھتے تھے۔ تمسک بالکتاب والسنۃ کا خاص ذوق تھا۔ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا شریف حسین نے ''الحیات بعد الممات'' میں سب سے پہلا تذکرہ میاں صاحب کے تلامذہ میں انھی کا کیا ہے۔ دسمبر ۱۸۹۴ء تا فروری ۱۸۹۵ء میں مسلمانوں اور علماء کی اصلاح کے مسئلے پر سرسید احمد خاں سے مراسلت بھی یادگار ہے۔

مولانا رنجور نے ان کی موت کو جواں مرگ لکھا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش سامنے نہیں۔ لیکن ان کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے کم کیا ہوگی! مولانا رنجور نے اُن کی وفات پر تیس اشعار کا طویل قطعہ لکھا ہے اور حج کے بعد طائف کے سفر، وہاں کچھ عرصہ قیام، پھر شام و روم کے سفر کے عزم اور اس سے قبل زیارتِ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ولولے، سفرِ مدینہ اور پھر وہیں ٹھہر جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے حج کا زمانہ قریب آ گیا اور مکّہ کے لیے روانہ ہوئے لیکن: حج سے فارغ نہ ہونے پائے تھے

کہ پیامِ خدا انھیں آیا
آ مرے پاس، اے مرے پیارے
گر ہو منظور تجھ کو میری لقا
ہوئی ہیضے سے الغرض رحلت

اور شہیدوں کا درجہ ان کو ملا

اس کے بعد چند شعر ہیں اور پھر یہ دو آخری شعر تاریخ کے ہیں:

لکھ یہ تاریخ فوت حسبُ الحال
''آج گُل ہوگیا چراغِ ہُدا''
مادہ ایک اور بھی لکھ دے
''ہائے اب دین کا چراغ بجھا''

دونوں شعروں کے دوسرے مصرعوں سے ۱۳۱۹ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۱۰) ﴿۱۲﴾

از کلکتہ، امرتلہ لین نمبر ۱۱

۱۳ر جولائی ۱۹۰۲ء یوم الاثنین (وقت آٹھ بجے)

می نویسم نامہ و مشتاقِ دیدارِ توام

میرے غم گسار حضرتِ رنجور!

کل صبح کی ڈاک میں، میں ایک خط روانہ کر چکا ہوں۔ دیکھیے وہ آپ کے پٹنہ جا کر پہنچتا ہے، یا آرہ؟ اُس سے خطوط کی بے عنوانی کا معاملہ آپ کو معلوم ہوگا۔ خط کو ارسال کرنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ آپ نے مصرعِ طرح پوچھا تھا۔ غلطی سے اُس خط میں میں نہ لکھ سکا۔ آج اس خط میں لکھے دیتا ہوں۔ مصرعِ طرح:

یہ ہے بہت بعید حسینوں کی شان سے!

شان، جان قافیۂ سے ردیف

خط مولوی احمد حسن صاحب (۱) کو دے دیا گیا۔ غالباً انھوں نے انگریزی اخبارات منگوا لیے ہوں گے۔ آج بھائی صاحب (مولوی غلام یٰسین آہ مدظلہٗ) نے آپ کا پتا دریافت کیا تھا (۲)۔ میں نے ایک پرچے پر لکھ دیا۔ دیکھیے! خط لکھتے ہیں یا نہیں؟ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ جس میں آپ آڑھت کے لوگوں کی پوری

مشرّح کیفیت لکھیں گے۔ غالباً کل صبح کو مجھے وہ مل جائے گا۔

اپنی چگونگی مزاج سے واقف کریں۔

غالباً آپ پنجشنبہ تک پہنچ جائیں گے۔ ایک ہفتے کا وعدہ ہے۔

میری غزل پر آپ نے اگر مصرعے لگائے ہوں، تو مجھے مطلع کیجیے۔ میں بہت ہی خوش ہوں گا۔ آپ اُس مخمس کو مشاعرے میں ضرور پڑھیں (۳)۔ زیادہ، **یغفر اللہ لنا ولکم ویرحمنا اللہ وایاکم**

میری طرف سے جناب مولانا عبدالرحیم صاحب کی خدمت (میں) تسلیم اور تمام خورد و کلاں کو دعا و سلامِ شوق فرما دیجیے گا۔

آپ ایسے دوستوں کا خادم

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) مولوی احمد حسن فتح پوری مدیر احسن الاخبار، کلکتہ۔ تفصیلی نوٹ خط نمبر ۳۲ کے حاشیے میں آ رہا ہے۔

(۲) ابوالنصر غلام یاسین آہ (۱۸۸۴ء۔۱۹۰۶ء) مولانا آزاد کے بھائی اور ان سے دو برس بڑے تھے۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۰۳ء کی یادداشت میں ان کا نام و تاریخ پیدائش دیکھی جا سکتی ہے۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے ''ایک علمی خاندان'' از سید شفقت رضوی۔

(۳) محترم قدرت اللہ فاطمی کے پاس ان کے نانا مولانا رنجور مرحوم کی ایک بیاض ہے۔ جس میں مولانا آزاد کی غزل پر مرحوم کی ایک تضمین موجود ہے۔

(۴) مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی، ''الدر المنثور فی تراجم اہل صادق فور المعروف بہ تذکرۂ صادقہ'' کے مولف، مولوی فرحت حسین عرف چھوٹے حضرت کے بیٹے تحریک اصلاح و جہاد کی مشہور شخصیات؛ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے بھتیجے اور مولانا یحییٰ علی شہید جزائر انڈمان کے برادرِ نسبتی تھے (مولانا عبدالرحیم کی بہن فاطمہ ان کے حبالۂ عقد میں آ گئی تھیں) ۱۴ر شعبان ۱۲۵۱ھ میں (مطابق ۴ر دسمبر ۱۸۳۵ء بروز ہفتہ) پیدا ہوئے۔ حضرت والد کے علاوہ خاندان اور بیرون خاندان کے نامور اساتذاے وقت سے تحصیل علمی فرمائی۔ چوں کہ صادق پور کے انقلابی خاندان سے قرابت قریبہ اور تحریک انقلاب و جہاد سے دل چسپی رکھتے تھے۔ ۱۴ر شعبان ۱۲۸۰ھ میں (مطابق ۲۴ر جنوری ۱۸۶۴ء بروز ہفتہ) بہ جرمِ عشق اسلام و ملت اسلامیہ بہ سلسلۂ اعانتِ باغیانِ حکومتِ برطانیہ گرفتار کر لیے گئے۔ تقریباً دو سال انبالہ میں مقدمہ

چلا۔ سزائے موت بہ عبورِ دریائے شور کا حکم سنایا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال لاہور میں قید رہے۔ پھر جزائر انڈمان بھیج دیے گئے۔ ۱۸۶۷ء کے آخر میں وہاں پہنچے۔ تقریباً بیس برس کے بعد رہائی ملی۔ یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ (مطابق ۱۰ر مارچ ۱۸۹۳ء) بروز ہفتہ پٹنہ واپس پہنچے۔

مولانا عبدالرحیم عالمِ دین اور علم وتقویٰ کا پیکر تھے۔ جزائر انڈمان سے واپسی کے بعد کئی حج کیے۔ ''تذکرۂ صادقہ'' ان کی علمی یادگار ہے۔ مرحوم کے خصایص سیرت میں اعتراف حق، صاف گوئی، محبت اقربا، شجاعت، استحفاظِ مسلکِ اسلاف کا تذکرہ واعتراف کیا گیا ہے۔ ۱۰ر ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ (مطابق ۲۵ر جولائی ۱۹۲۳ء) بروز منگل پٹنہ میں انتقال فرمایا۔ اللہم اغفرلہٗ (تفصیل وتحقیق حالات کے لیے دیکھیے: تذکرۂ صادقہ' تاریخ عجیب عرف کالا پانی از مولانا محمد جعفر تھانیسری، سرگذشت مجاہدین از مولانا غلام رسول مہر وغیر ہا)

مولانا ابوالکلام آزاد صادق پور کے اس خاندان رفیع الارکان کے بہت معتقد اور اس کی خدمت دینی وملی کے بہت معترف تھے۔ مولانا عبدالرحیم مرحوم سے بھی خاص عقیدت تھی۔ ان کے تذکرۂ صادقہ پر مولانا کی تقریظ مشمولہ تذکرہ اور قطعاتِ تاریخ مطبوعہ رسایل مختلفہ اور مثنوی جور نجور مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے دستیاب ہوئے ہیں (دیکھیے ارمغان آزاد، مولفہ ابوسلمان شاہ جہان پوری)، مرحوم سے مولانا کی عقیدت اور محبت ان کے اعتراف کمال کا ثبوت ہیں۔

(۱۱) ﴿۱۳﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

میرے مخدوم! سلامت

الحمدللہ کہ اب رات سے کچھ درد میں تخفیف ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ ایک بار اور مالش کرنے سے درد بالکل جاتا رہے گا۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ آپ کے انگوٹھے کے زخم نے یہاں تک طوالت کی کہ آپ اسے زخمِ جگر سے تشبیہہ دینے لگے۔ الٰہی! بحق حبیبک ونبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنابِ رنجور را از شفا خانۂ غیب شفائے کامل وصحت عاجل فرما!

واقعی میں سخت نالایق ہوں کہ باوجودے کہ جناب بھابی صاحبہ اس تکلیف میں ہیں، ملازمہ کا ابھی تک انتظام نہ کرسکا۔ یقیناً آج بندوبست کر کے اور اُسے بلوا کر شام تک بھجوادوں گا۔ کم بخت نے وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر کیا کہا جائے، ابھی تک اس نے

کیوں منہ نہ دکھلایا۔ شاید کچھ رونمائی کی ضرورت ہے! خیر اب دیکھ لیا جائے گا۔
(قصوروار آزاد)

''چھوکری'' اور ''کم سنی'' پھر ''آپ کی'' اور اس پر طرہ ایں کہ ''آپ کی رحمت جیسی کم سن ہو'' کیا یہ سب باتیں، ایک وسیع مطلب نہیں رکھتیں؟ گستاخی معاف! ایں ہم طریقِ گفتگو است! بہ عالی خدمت جناب بھابی صاحبہ و دیگر بزرگ وخورد اہلِ بیت آداب وتسلیم از جانبِ آزاد وہمشیرہ اش قبول فرمایند۔

آپ کا خادم
آزاد دہلوی

(۱۲) ﴿۱۴﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

میرے سچے دوست اور میرے سچے مکرم حضرت رنجور!

۱۔ ملازمہ کی تلاش سے میں غافل نہ تھا مگر چوں کہ اِدھر کچھ گفتگو نہ ہوئی، میں نے اس کا ذکر نہ کیا۔ ہمشیرہ صاحبہ یعنی آبرو تلاش میں ہیں (۱)۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عن قریب کوئی نہ کوئی ملازمہ کم عمر منتخب کر لی جائے گی۔

۲۔ آپ نے اس قدر کمسنوں کی کیوں تعریف کی ہے؟ کمسنوں کی تعریف دنیا جانتی ہے۔ کیا میرے خوش کرنے کو حضرت! واقعی آپ کا فرمانا بجا ہے اور درست ہے۔ اس کم بخت عمر میں جو کام ہورہتے ہیں، وہ زیادہ عمر میں نہیں ہوتے! ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی ہی عمر کی انتخاب کی جائے گی۔ آپ مطمئن رہیں۔

آپ کی مقدس لائف ''تذکرۂ صادق پور'' (۲) سے نقل کر لی جائے گی۔ اور باقی اوصاف مخصوصہ جن کی بنا میرے تجربے پر ہے، موقعہ بہ موقعہ تحریر کردوں گا۔ اور اس پرچے سے جو ''کرزن گزٹ'' کے لیے آپ نے عنایت کیا تھا، انتخاب کردہ و

نویسندہ خود۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بعونہٖ وبفضلہٖ۔(۳)

مخدومہ مکرمہ جناب بھابی صاحبہ مدظلہا وزادلطفہا کو میری جانب سے اور جناب آبرو (میری چھوٹی ہمشیرہ) کی طرف سے آداب وتسلیم (قبول) فرمائیں۔ نیز اور ہمشیرہ صاحبوں کی طرف سے۔

اے جناب! یہ تو کہیے کہ دوستی وو داد کے یہی معنی ہیں کہ ایک ''گورا'' دو تین روپیہ کی کتاب کے لیے آپ بار بار گفتگو کریں؟ خط میں تحریر کیا اور پھر بالمشافہ بھی محرک ہوئے۔ آخر وہ ایسی چیز ہی نہ تھی، بمیرے نزدیک۔ لیکن صاف دلوں کے نزدیک (یورپ میں مثل ڈاکٹر مسٹر سموئل اور مسٹر اڈیسن کے) ''کسی دوست کی لمحے بھر کی خوشی دوسرے دوست کی رُوحانی خوشی کے لیے کہیں اس مسرت سے زیادہ ہے جو مالی حیثیت سے ہر ایک دنیا میں رہنے والے کو بالعموم حاصل ہوا کرتی ہے''۔ (آرٹیکل ایڈیسن)۔

اب خیال فرمائیں کہ میں نے گورا (۲ روپیہ) میں خرید کیا۔ سوچیے تو دو روپے کیا چیز ہے! اور میری ایک سچی مشفقہ ومکرمہ کو اس کے مطالعے سے جو مسرت ہوئی ہوگی، غور کیجیے تو ایک دوست کے لیے کتنی بڑی بات ہے؟ گورا! اے حضرت! گر جان طلبی مضائقہ نیست۔

دوستوں کا (مگر سچے دوستوں کا) خادم
ابوالکلام آزاد دہلوی
مقیم کلکتہ، ۳۱ر جولائی ۱۹۰۲ء (۸ بجے شب)

لطیفہ: کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ
میں اس روحانی خوشی کے بخشنے والے وقت کا منتظر ہوں جب کہ جناب بھابی صاحبہ کی طرف سے کسی کارِ لائقہ کی فرمائش کی جائے گی، گو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں

کہ میں کسی کام کے لائق نہیں ہوں۔ مگر بندہ نوازی کے معنی نے مجھے اس کا یقین بڑھا دیا ہے کہ از دوستاں امید لیاقت مدار، لیاقتِ خود بیں! او (شان) ہم لائق شوند۔ بس اس مقولے پر وہ عمل کریں اور مجھے شاد فرمائیں۔

حواشی:

(۱) آبرو بیگم پر حاشیہ خط نمبر ۳ کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

(۲) تذکرۂ صادقہ مؤلفہ مولانا عبدالرحیم مراد ہے۔ مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کے حالات اس میں موجود ہیں۔ بعد کے ایڈیشن میں بہ طور ضمیمہ ان کے آخری دور کے حالات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

(۳) کرزن گزٹ ہفتہ وار اخبار تھا۔ فروری ۱۹۰۰ء میں کلاں محل، دہلی سے مرزا حیرت دہلوی نے نکالا تھا۔ ۱۹۱۲ء تک ضرور نکلتا رہا تھا۔ ۱۹۱۲ء کا فائل مولانا امداد صابری کی نظر سے گزرا تھا۔ اس کی ترتیب و تالیف، اندازِ صحافت اور مضامین کے تعارف میں جنوری، اپریل، مئی وغیرہ کے شماروں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ (تاریخ صحافت جلد سوم) مرزا صاحب کی کتاب ''چراغ دہلی'' پر مولانا آزاد نے لسان الصدق اپریل ۱۹۰۴ء میں تبصرہ کیا تھا، س میں کرزن کے بعض خصایص کا ذکر بھی ہے۔ کرزن گزٹ کے لیے مولانا آزاد کوئی مضمون مولانا رنجور پر لکھنا چاہتے تھے۔ رنجور کے خاندان کے حالات تذکرۂ صادقہ میں تھے، شخصی مطالعہ مولانا آزاد کا اپنا تھا کچھ سوانحی حالات انھوں نے ایک پرچے پر لکھ دیے تھے اور اپنے کلام کا انتخاب انھوں نے خود کر دیا تھا۔ مضمون مولانا آزاد نے ضرور لکھا ہوگا۔ تلاش کرنا چاہیے یہ مضمون اگست ۱۹۰۲ء یا قریبی زمانے کے کرزن گزٹ میں چھپا ہوگا۔

مرزا حیرت دہلوی کا تعلق اہلِ حدیث مکتبِ فکر سے تھا اور علماے ایثار پیشہ گانِ صادق پور کے نیاز مند اور عقیدت کیش تھے۔

(۱۳) ﴿۱۵﴾

بھائی رنجور!

میں آج سات بجے سے آٹھ تک رات کو آؤں گا۔ اب میرا انتظار نہ کریں۔ مجھے اس وقت ناول ''گورا'' کی سخت ضرورت ہے، حاملِ رقعہ کو دے دیجیے، کل واپس کر دوں گا۔ ضرور بالضرور! اگر میرا کوئی خط آیا ہو تو وہ بھی آپ حاملِ رقعہ کو دے سکتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱)۱۵؍جولائی ۱۹۰۲ء کے خط میں ''گورا'' (ناول) کی خرید و ترسیل کا اور ۳۱؍جولائی کے خط میں مولانا نے اظہارِ تشکر پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ اس خط میں مولانا نے ''گورا'' کی واپسی کا گو عارضی ہی سہی، مطالبہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خط مذکور دونوں خطوط کے بعد کا اور ۱۲؍اکتوبر سے یقیناً پہلے کا ہے۔

(۱۴) ﴿۱۶﴾

باسمہ سبحانہٗ

می نویسم نامہ و مشتاقِ دیدارِ توام

برادرِ شفیق جناب مولانا نارنجور صاحب!

اس وقت دس بج چکے ہیں۔ آپ کے خطوط کا انتظار ہے۔ ڈاکیے نے خط دیا اور طبیعت مسرور ہوئی۔ کل صبح کو خط روانہ کر چکا ہوں۔ یقیناً آج آپ کو پہنچ گیا ہوگا۔

میں پہلے ہی سمجھے ہوا تھا کہ اودے پور پہنچ کر ضرور ایک گونہ آپ کی طبیعت مضمحل ہوگی۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ اس ماتم کدہ میں پہنچ کر رنج و افسوس میں کافی حصہ نہ لیں۔ ایک غم نصیب کو دیکھ کر ضرور آنکھیں تر ہوگئی ہوں گی اور اس کی غم ناک باتیں سن کر یقینی آہ وزاری کی نوبت آ پہنچی ہوگی۔ اب امید ہے کہ آپ پٹنہ پہنچ کر بوے وطن سے مسرور رہوں گے۔ اور وہاں کی خوشگوار ہوا آپ کے لیے فرحت بخش ثابت ہوگی (۱)۔

آپ کا سلامِ شوق بھائی صاحب اور ہمشیرہ صاحبہ کو پہنچا دیا گیا۔ جواب میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ از مایاں نیز سلام شوق برسد۔ اتفاق دیکھیے کہ حضرت خیر کا رقعہ آپ سے لے کر میں نے جیب میں ڈال دیا۔ اور تا ہنوز اس کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی:

آپ نے یاد دلایا، تو مجھے یاد آیا

جیب سے خط نکالا اور پڑھا، مضامین نویسی اور جواب دہی کی فکر سے غافل نہیں ہوں۔ کل سے ہمشیرہ صاحبہ دامِ ظلہا کی طبیعت پھر خراب ہو چلی ہے۔ یعنی پھر استفراغ کی شدت ہے۔ علاوہ اس کے اور بھی کچھ پریشانیاں ہیں، جن کی وجہ سے میں نے مضامین نویسی کچھ دنوں کے لیے ترک کر دی ہے۔ رسالہ ''ہیئت جدیدہ'' (۲)، اور ''علوم الجدیدۃ والاسلام'' (۳) کی تالیف میں مشغول رہتا ہوں۔ کیوں کہ ان کا دربارِ دہلی میں شائع ہونا ضروری ہے۔ دن کم رہ گئے ہیں۔ مضامین نویسی کو ترک کرنے پر بھی مجھے ''اپنچ'' کا خیال ہے (۴)۔ لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔

جناب مولانا ادریس صاحب کو میری جانب سے سلامِ شوق عرض کیجیے۔ میں ان کا غائبانہ نیاز مند ہوں (۵)۔

جناب مولوی شعیب صاحب کی خدمت میں بھی سلام و نیاز عرض ہے (۶)۔ پٹنہ میں جائیے گا تو میری جانب سے جناب مولانا عبدالرحیم صاحب کو ضرور سلام کہیے گا۔

پھر کل ان شاء اللہ عریضہ تحریر کروں گا۔ ابھی مجھے سبق لینا ہے۔

آپ کا خادم

ابوالکلام دہلوی

کلکتہ۔ امرتلہ لین نمبر ۱۱، ۱۲/اکتوبر ۱۹۰۲ء

حواشی:

(۱) مولانا نا رنجور مرحوم اس زمانے میں کسی عزیز کی وفات پر تعزیت کے لیے اودے پور تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے انھیں پٹنے آنا تھا۔ مولانا آزاد نے یہ خط انھیں پٹنے کے پتے پر بھیجا تھا۔

(۲) مولانا آزاد نے کیمول فلاماریاں کے رسالے ''سولر سسٹم'' کا اس کے فارسی ترجمے سے اردو ترجمہ کیا تھا اور ڈاکٹر فاندیک اور راجہ رتن سنگھ ہشیار جنگ زخمی کی کتابوں سے مطالب اخذ کر کے ''الہیئت'' کے نام سے اسے ایک بالکل نئی تالیف بنا دیا تھا۔ فروری ۱۹۰۳ء میں یہ کتاب تیار ہو گئی تھی۔ جیسا کہ مولانا نے مولانا عبدالرزاق کان پوری کے نام ۲۰/مارچ کے خط میں تحریر کیا ہے اور جون ۱۹۰۳ء میں خدنگ نظر، لکھنؤ میں اس کا اعلان چھاپ دیا تھا۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۰۲ء

کے اس خط سے بھی معلوم ہو گیا کہ اس وقت یہ کتاب تیاری کے مرحلے میں تھی۔ لیکن ''الھیئت'' کے وجود کا پھر کوئی پتا نہیں چل سکا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''ارمغانِ آزاد'' مولفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔

(۳) ''علوم جدیدہ اور اسلام'' کے نام سے مولانا آزاد نے ایک مضمون لکھا تھا اور مرقع عالم۔ ہردوئی کے ایڈیٹر حکیم محمد علی کو ۱۱/اکتوبر ۱۹۰۲ء کے خط کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ بعد میں مولانا نے اس مضمون کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۰۲ء کے اس خط میں جو رنجور مرحوم کے نام ہے، مولانا نے اس کتاب کی تالیف میں مصروفیت کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن یہ کتاب اتنی مفصل ہوگئی کہ ۱۹۰۴ء تک مکمل نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک باب ہی جو معتزلہ کے بارے میں تھا، ایک مستقل رسالہ بن گیا۔ مولانا نے اسے الگ ایک رسالے کی شکل میں چھاپنے کا فیصلہ کر لیا اور اس پر دیباچہ لکھا۔ مولانا نے دیباچہ ''لسان الصدق'' کے شمارہ اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھاپ دیا تھا۔ اس تذکرے کے بعد ''علوم جدیدہ اور اسلام'' کا کوئی پتا نہیں کہ مولانا کی تصنیف مکمل یا نامکمل کیا ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''ارمغانِ آزاد'' مولفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔

الھیئت، علوم جدیدہ اور اسلام اور المعتزلہ کی عدم تکمیل و اشاعت کی میرے نزدیک ایک وجہ یہ ہوگی۔ اس زمانے میں کثرت مطالعہ سے معلومات میں اضافہ اور غور و فکر کی بنا پر مولانا کے خیالات میں روز بہ روز انقلابات پیدا ہو رہے تھے۔ عقاید و افکار کی ایک عمارت تعمیر نہیں ہو پاتی تھی کہ نئی معلومات کا ایک ریلا اور غور و فکر کا نیا طوفان اسے تہ و بالا کر دیتا تھا۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہوگی کہ اس زمانے میں مولانا آزاد سرسید مرحوم کے افکار اور انداز فکر سے بہت متاثر تھے اور جیسا کہ مولانا عبدالرزاق کان پوری کے نام خط میں مولانا نے لکھا ہے کہ ''علوم جدیدہ اور اسلام'' سرسید کے دفاع میں ایک نئے انداز سے لکھی جا رہی تھی۔ چوں کہ سرسید کے سحرِ افکار سے وہ تقریباً ایک سال متاثر رہے تھے اور پھر یہ نشہ اتر گیا تھا۔ اس لیے ان تالیفات کی تکمیل سے بھی ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور توجہ ہٹ گئی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کہاں تو ان تالیفات میں شب و روز کی وہ مصروفیت اور سرگرمی اور کہاں ایسی خاموشی کہ ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ تالیفات مکمل یا نامکمل کہاں گئیں۔ ''المعتزلہ'' کے بارے میں جو ''علوم جدیدہ اور اسلام'' ہی کا ایک باب تھا، مولانا کے خیالات کی تبدیلی کا اندازہ المعتزلہ کے دیباچے مطبوعہ لسان الصدق اگست ۱۹۰۴ء اور مولانا کے اس مضمون کو سامنے رکھ کر لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ''تاریخ معتزلہ کا ایک ورق'' کے عنوان سے لکھا تھا اور البلاغ کی ۱۷/ اور ۲۴/ دسمبر ۱۹۱۵ء اور ۱۴/ اور ۲۱/ جنوری ۱۹۱۶ء کی دو قسطوں میں چھپا تھا۔

(۴) الپنچ، بانکی پور (پٹنہ) ۵/فروری ۱۸۸۵ء سے ہفتہ وار منشی محمد عظیم نے نکالا تھا۔ کچھ عرصے بعد بند ہو گیا۔ دوبارہ ۱۸۹۵ء میں سید الطاف حسین نے جاری کیا۔ اس کے تیسرے دور میں مولوی سید رحیم الدین کی ملکیّت میں مولوی سید محمد یوسف کے زیرِ اہتمام محلہ دربار پور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ مولوی سید رحیم الدین سے مولانا رنجور کو خاص تعلق خاطر تھا۔ اسی لیے مولانا آزاد کو الپنچ میں لکھنے کی دعوت دی ہوگی۔ کچھ عرصے کے بعد مولوی سید رحیم الدین کا انتقال ہو گیا۔ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں مولوی صاحب مرحوم کی دو بیٹیوں کی شادی ہوئی تھی۔ قطعۂ تاریخ شادی مولانا رنجور نے لکھا تھا۔ قطعے کے

عنوان میں انھیں مرحوم لکھا ہے۔ عنوان یہ ہے:

''قطعۂ تاریخ شادی دختر ان جناب مولوی سید رحیم الدین صاحب مرحوم ومغفور مالک وسابق ایڈیٹر الپنچ، پٹنہ''

(۵) مولانا ادریس صاحب حضرت رنجور کے سسرالی رشتے دار تھے۔ ۱۳۳۶ھ (مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۷ء تا ۶/اکتوبر ۱۹۱۸ء میں انتقال ہوا مولانا رنجور مرحوم نے ان کی وفات پر قطعہ لکھا تھا، جس کے عنوان واشعار سے رنجور مرحوم سے ان کے رشتے، ان کے وطن، اولاد اور مدرسۂ احمدیہ۔ آرہ سے ان کے تعلق کا پتا چلتا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

آج تاریکی سی کیوں آرے پہ ہے چھائی ہوئی
کیا چراغ اس شہر کا بادِ اجل نے گل کیا؟
غم سے کیوں ہیں چور، مسعود وسعود و بوعمیر
ان کے سر سے آج کیا سایہ پدر کا اٹھ گیا؟
آہ! عمّی مولوی ادریس صاحب کیا ہوئے
ہوگئے صد حیف! کیا وہ راہیِ ملکِ بقا؟
احمدیہ مدرسے کی کون اب لے گا خبر؟
فیض جس کا ہند میں ہے چار سو پھیلا ہوا
جنت الفردوس میں دے اے خدا! ان کو جگہ
اور کر توفیق صبر اُن کے اعزہ کو عطا
سالِ رحلت کی ہوئی جب فکر مجھ رنجور کو
غیب سے آواز یہ آئی کہ ''غم ادریس کا''

(۶) مولوی محمد شعیب بھی رنجور مرحوم کے سسرالی رشتے دار تھے۔ پروفیسر قدرت اللہ فاطمی نے لکھا:

''مولوی شعیب کو والدہ مرحومہ ماموں کہتی تھیں۔ عالم گیر جنگ کے زمانے کی بات ہے، مغل سرائے جنکشن پر ان سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ وہاں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر تھے اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھے''۔

(۱۵)

﴿۱۷﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۵/جولائی ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ

حضرت رنجور!

ناول ''گورا'' ارسالِ خدمت ہے (۱)، میرا ذاتی ناول جناب سلیم صاحب لے گئے ہیں۔ اسی لیے یہ اس وقت عبدالقیوم صاحب تاجرِ کتب کے ہاں سے خرید کر ارسال کیا جاتا ہے۔ میری مخدومہ ملاحظہ فرمائیں۔

میری بیاض اگر خالی ہوگئی ہو تو عنایت فرمائیں۔ کیوں کہ اس وقت مجھے اُس میں کچھ تازہ تصنیف رباعیں لکھنا ہیں۔ ممکن ہے، کچھ دیر بعد فراموش کر جاؤں (۲)۔

جناب منظور صاحب کو سلامِ شوق کہہ دیجیے۔ حضرت حسّان اور حضرت بن یامین کو دعا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) جناب مالک رام نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ناول حکیم محمد علی ایڈیٹر مرقع عالم، ہردوئی کا ہوگا۔ اسی نام سے ایک ناول رابندر ناتھ ٹیگور کا بھی، ان کے ابتدائی دور کا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہوا تھا۔ اور اب یہ ترجمہ پاکستان میں چھپ گیا ہے۔ شاید ہندوستان میں اسی وقت چھپ گیا ہو اور خط میں اسی کا ذکر ہو۔

(۲) معلوم ہوتا ہے مولانا آزاد کی بیاض حضرت رنجور مرحوم کے پاس تھی۔ نئی رباعیاں کہیں تو اس میں لکھنے کے لیے منگوائی۔ اس کے جواب میں تازہ رباعیوں کے شوقِ مطالعہ کا اظہار کیا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا کے اس کے بعد والے خط سے ظاہر ہوتا ہے اس مضمون نے اُس خط کے تاخر کا فیصلہ کر دیا۔

(۱۶) ﴿۱۸﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

میرے شفیق بھائی!

آپ کا دوسرا محبّت نامہ پہنچا۔ آج آپ کو میرا دوسرا خط مل گیا ہوگا۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اس وقت تشریف فرما ہیں۔ آپ کے اس جملے سے کہ ''آج اس وقت میری طبیعت نہایت چاق ہے'' بہت مسرور ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

آرے کا دردناک سین دیکھ کر ایک رقیق القلب شخص کبھی قابو میں نہیں رہ سکتا۔ پھر آپ ایسا شخص، جسے علاوہ قربت کے اختلاجِ قلب کا عارضہ بھی باعثِ تکلیف ہو، کیسے صبر کر سکتا ہے!(۱)

آپ نے میری رباعیاں مانگی ہیں۔ وہ تو کچھ عمدہ نہیں۔ خیر! تعمیلِ حکم ضروری ہے۔ وہ اور چند نو تصنیف رباعیات ارسالِ خدمت ہیں۔

غلام محمد حاضر الوقت تسلیم عرض کرتا ہے (۲)، اور میں آپ کی اور حضرت غم (۳) کی خدمت میں تسلیم عرض کرتا ہوں۔

ہر کہ باشد زحالِ ما پُرساں
یک بیک را سلامِ ما برساں

آپ کا خادم
ابوالکلام الدہلوی
امرتلہ لین نمبر ۱۱، کلکتہ

باسمہٖ سبحانہٗ
کلامِ آزاد
نو تصنیف رباعیاں

کیوں طعنۂ خویش و اقربا سہتے ہیں!
ہے بات کوئی کہ آپ چُپ رہتے ہیں!
ہیں کسی کے خیال میں، جنابِ آزاد!
سنتے ہیں کسی کی، اور نہ کچھ کہتے ہیں!

افسوس! وہ بے غمی کی کہانی نہ رہی
افسوس! وہ عیش کی جوانی نہ رہی
لے دے کے رہی تھی ایک پیری (۴) ، اے مرگ!
تو کیا آئی کہ ہائے، وہ بھی نہ رہی!

قطعہ

آزاد! کل جو سیر کو صحرا کی میں گیا
دیکھا کہ ایک شخص وہاں بے قرار تھا
اپنی بنا کے قبر، اُسے دیکھتا تھا وہ
پھر دیکھ کر اُسے وہ بہت زار زار تھا
کہتی تھی اُس کو خلق کہ دیوانہ ہوگیا
دیکھا جو میں نے، ایک ہی وہ ہوشیار تھا!

چھیڑو نہ مجھے کہ ہم صفیرو!
مجھ مست کو مے کی بُو بت ہے
مجھ سے نہ کہو فسانۂ قیس
دیوانے کو ایک ہُو بہت ہے!

کیوں ہے یہ خراب، اور کیوں ہے یہ بُرا!
چاہ اپنی ہے اور شوق اپنا اپنا
ہے وعظ کی لت اُسے، ہمیں شُربِ مدام
اُس کو اُس کا ہے شوق، ہم کو اِس کا

باقی پھر

حواشی:

(۱) مکتوب الیہ ابھی تک آرہ میں تھے۔

(۲) غلام محمد کون ہیں؟ کچھ پتا نہیں چل سکا۔

(۳) محترم فاطمی صاحب کا خیال ہے کہ حضرت غم سے اشارہ آرہ کے حادثے کے اثراتِ الم کی طرف ہے جو اب تک حضرت رنجور کے دل پر مستولی تھے۔

(۴) رباعی کے قلمی مسودے میں لفظ ''جوانی'' ہے لیکن عہد جوانی کا ذکر ہو چکا ہے اور اب موقع جوانی کا نہیں ''پیری'' کا ہے چناں چہ یہاں لفظ ''پیری'' بنا دیا گیا ہے۔

(۱۷) ﴿۱۹﴾

باسمہٖ سبحانہٗ (۱)

بھائی!

کل ''دارالاخبار'' کا جلسہ ہے (۲)۔ تمھارے نام کی اور، اور لوگوں کے نام نوٹسیں ارسال کرتا ہوں۔ ان لوگوں تک یہ نوٹسیں شام تک ضرور پہنچ جائیں، ورنہ گذشتہ جلسے کا سا حال ہو جائے گا۔ مولوی احمد حسن بھی عجیب چیز ہیں! کل جلسہ ہے اور آج نوٹس شایع ہوتی ہے۔ بہر کیف تم اشاعت میں کوتاہی نہ کرنا!

مولوی عبدالباری کا خط براہِ مہربانی تم خود جا کر آج بعد العصر اُنھیں دو۔ جلسے میں آنے کے لیے تاکید کرو (۳)۔ اگر بطورِ خود نہیں تو از جانبِ سیکریٹری، مولوی فاطمی صاحب (۴) کو بھی اِطلاع دو۔ آج دو بجے شاید میں تم سے نہ ملوں (۵)۔ چار بجے ضرور حاضر ہوں گا۔ اُس خط کا جواب آج چار بجے دوں گا۔

تمھارا بے تکلّف

ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی

حواشی:

(۱) یہاں سے چار خط ایسے ہیں جن پر تاریخِ تحریر درج نہیں۔ کسی کے مضمون سے بھی زمانۂ تحریر کا اندازہ نہیں ہوا۔ اس

لیے انھیں ۱۹۰۲ء کے خطوط کے درج کر دیا۔ دارالاخبار کا قیام ۱۹۰۲ء کا واقعہ ہے جو احسن الاخبار کے ساتھ ساتھ ۱۹۰۳ء تک جاری رہا۔ اس لیے یہ خط اور اس کے بعد کے خطوط ۱۹۰۳ء کے بھی ہو سکتے ہیں۔

(۲) ۱۹۰۲ء میں مولانا نے ایک انجمن ''الاصلاح'' کے نام سے قائم کی تھی۔ احسن الاخبار نکل رہا تھا۔ مولوی احمد حسن فتح پوری اس کے سیکریٹری بنائے گئے تھے۔ انجمن الاصلاح کے تحت ''دارالاخبار'' کے نام سے ایک دارالمطالعہ [Reading Room] قائم تھا، جس میں وہ تمام اخبارات و رسایل جو احسن الاخبار کے تبادلے میں آتے تھے، رکھ دیے جاتے تھے اور کچھ اخبار انگریزی وغیرہ کے خریدے بھی جاتے تھے۔ ۱۹۰۳ء کے وسط میں جب احسن الاخبار بند ہوا تو رفتہ رفتہ اس کے تبادلے میں آنے والے اخبارات و رسایل بھی بند ہونے لگے اور دارالاخبار کے بند ہو جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ یہی خطرہ ایک دوسرے رسالے ''لسان الصدق'' کے اجرا کی تحریک بن گیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد دارالاخبار زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' بہ روایت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔

(۳) مولوی عبدالباری عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ میں چرم کا ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ علمی، ادبی اور دینی ذوق رکھتے تھے اور اسی ذوق کی تسکین کے لیے کلکتہ سے دارالسلطنت نامی ہفت روزہ اخبار جاری کیا تھا۔ جو ان کی زندگی ہی میں بند ہو گیا تھا۔ یہ وہی صاحب ذوق ہیں، جن کے مکان پر ۲۵ر جون ۱۹۰۲ء کو ایڈورڈ ہفتم شاہِ برطانیہ کی تاجپوشی کے سلسلے میں مشاعرہ ہوا تھا۔ جنھیں مولانا آزاد نے ''رئیس کلکتہ'' لکھا ہے۔ مولوی عبدالباری کا ذکر مولانا رنجور کے نام مولانا آزاد کے خط نمبر ۳۱ میں بھی آیا ہے۔ ۱۳۲۳ھ (۰۶-۱۹۰۵ء) میں ان کا انتقال ہوا مولانا رنجور مرحوم کے قلم سے ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ یادگار ہے:

مولوی عبدِ باری خوش خو
حیف صد حیف زیرِ خاک بخفت
چوں پے سالِ فوت کردم فکر
دلِ من ''او بخلد رفت'' بگفت

(۴) فاطمی صاحب سے مراد مولانا رنجور کے داماد مولوی سید عبداللہ فاطمی افضلی ابنِ مولوی عبدالباسط عرف کفایت حسین ہیں۔ یہی بزرگ پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی کے والد گرامی قدر ہیں۔ مولوی کفایت حسین خاندانِ سعادت صادق پور کے معتقد اور مولانا عبدالرحیم مولف تذکرۂ صادقہ کے شریک تالیف تھے اور اسی خاندان سعادت کے خصائص توحید اور دعوتِ کتاب و سنت سے متاثر ہو کر اپنا نام عبدالباسط رکھ لیا تھا۔ مولوی سید عبداللہ کو مولانا عبدالرحیم سے خاص ارادت تھی اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض تھے۔ اسی ذوق و تعلّق نے انھیں مولانا عبدالرحیم کے بھانجے مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کی بیٹی حسنیٰ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا تھا۔ مولوی سید عبداللہ فاطمی افضل نے کوئی سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی، لیکن ۱۹۲۰ء کی ترک موالات کے دور میں چھوڑ دی تھی۔ وہ پٹنہ سے دہلی منتقل ہو گئے تھے، جہاں اپنے والد گرامی کی یاد میں مدرسہ باسطیہ قائم کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا آزاد کی کوشش سے بورڈ آف اگزامنرز میں چیف مولوی کے

عہدے پر فائز کیے گئے۔ اس زمانے میں بورڈ کا دفتر کلکتہ سے شملہ منتقل ہو گیا تھا۔ حسن کارکردگی کی بدولت انھیں بورڈ آف اگزامنرز کا ہندوستانی رکن منتخب کر لیا گیا اور ''خان صاحب'' کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔

ان کی پہلی شادی مولانا رنجور مرحوم کی بیٹی حسنیٰ سے ہوئی تھی۔ ان سے تین بیٹے عبداللہ، صبغت اللہ اور قدرت اللہ ہوئے۔ آخر الذکر ہمارے کرم فرما پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی ہیں۔ حسنیٰ کے انتقال کے بعد اور مولانا رنجور کے بڑے داماد سید منظور احمد کے انتقال کے بعد نجم النساء بیوہ ہو گئی تھیں، چناں چہ ان کے بزرگوں نے تحریک احیاے سنت کے تحت نجم النساء کا عقدِ ثانی مولوی عبداللہ سے کرا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے بھی مولوی صاحب کو دو بچوں سے نوازا، جن کے نام سید حمید اللہ اور خیر النساء ہیں۔

(۱۸) ﴿۲۰﴾

باسمہ

میرے شفیق رنجور!

قطعہ فی البدیہہ

گرچہ ہے وعدہ خلافی مری ثابت تم پر
اور وعدہ مرا پورا کبھی ہوتا ہی نہیں
پھر جو وعدہ بھی ہو پورا، تو یہ شکوہ ہے تمھیں
کہ کبھی وقتِ معین پہ میں آتا ہی نہیں
یعنی فی الجملہ نتیجہ یہ نکالا تم نے
میں گیا وقت ہوں، جاتا ہوں، تو آتا ہی نہیں
وقت کہتے ہو مجھے، سچ ہے مگر یہ تو کہو!
پہلے تو ''وقت'' میسّر کبھی ہوتا ہی نہیں
اور میسّر ہو! تو پھر قدر کرو، قدر کرو!
کہ جو جاتا ہے، تو پھر حشر تک آتا ہی نہیں
میں تو ہوں ''وقت'' ملو گر تو غنیمت سمجھو

میں بھی سمجھا ہوں تمھیں ''وقت'' کہ ملتا ہی نہیں
آؤں گا آٹھ بجے ٹھیک میں، ان شاء اللہ
پھر نہ کہنا مجھے رنجور! کہ آتا ہی نہیں

ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی

خاک برسرم باد کہ امروز باز فکرِ شعر کردم۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ!

(۱۹)

﴿۲۱﴾

باسمہ سبحانہٗ تعالیٰ

محبِّ یک رنگ جناب مولانا محمد یوسف صاحب دام لطفہٗ!

سلامِ شوق!

بمبئی سے رجسٹرڈ نمبری نوٹ سَو سَو کے پرسوں آئے تھے، جو وصول کر لیے گئے، مگر آج جو اُنھیں تڑانے لگا، تو معلوم ہو کہ بھیجنے والے نے جن کی تحویل میں روپے آئے تھے، غلطی سے اُوپر دستخط نہ کیے اور اس لیے ہمارا دستخط کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ اب اُسے کوئی صراف نہیں لیتا۔ ناچار اُنھیں پھر واپس کر دیا جائے گا۔ خیال تھا کہ آج روپے آپ کی خدمتِ عالی میں بھیج دیے جائیں گے۔ مگر یہ بیچ میں آ کر خرابی ہوگئی۔

میرا آج ایک وی پی بھی بارہ روپے کا آنے والا ہے۔ پریشان ہوں کہ اُسے کیوں کر وصول کروں گا، ایسی حالت میں انھیں روپوں پر بھروسا تھا۔ اور اُن کتابوں کی بھی ضرورت ہے۔ کیا آپ اس وقت اس پریشانی کو دور کر سکتے ہیں، کچھ دنوں کے لیے؟ حاملِ رقعہ معتبر شخص ہے۔ کچھ دیر بعد حاضر میں بھی ہوں گا۔ حسب الوعدہ!

خادمِ احباب
ابوالکلام آزاد دہلوی

(۲۰) ﴿۲۲﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

میرے مخدوم مولانا رنجور دام لطفہ'!

آپ کے گئے پیچھے، جب میں نے کتابوں کا ڈھیر تلاش کیا، تو ایک کتاب انگریزی نکلی جس کے متعلق خیال کیا گیا ہے کہ وہ سیون (سیونگ) بینک کی رسید ہے۔ مجھے یہ بھی یاد پڑا کہ ناظر (۱) یا منظور احمد نے مجھ سے روپے قرض لیے تھے اور روپے کے بدلے وہ پاس بک مجھے دیا تھا کہ عندالضرورت، تم اپنا مقروض روپیہ بالا جازت ڈاک خانے سے وصول کر لینا۔ چناں چہ وقتِ ضرورت اُنھوں نے فارم پر دستخط کر کے یہاں بھیج دیا اور میں نے اسے وصول کر لیا۔ خیر، رسیدہ بود بلاے ولے بخیر گذشت۔ ان شاء اللہ آج دے دیا جائے گا۔ فالحمد للہ۔

کہیے، مزاجِ اقدس! شب بخیر!! میری جانب سے بعد از دعا حضرت حسان اور حضرت بن یامین کو کہہ دیجیے کہ ذرا مجھے اس پریشانی سے (یعنی ڈاک خانے کی پریشانی) سے نجات مل جائے، پھر میں کلکتہ کی خوب سیر کراؤں گا۔ علی الخصوص چڑیا خانے کی (۲)۔

جناب سلیم رات کو آئے تھے (۳) وہ مجھ سے کچھ روپیہ قرض لینا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی بادیانت اور پابندِ وعدہ ہیں۔ مجھ سے اکثر معاملہ رہا۔ میں انھیں دے دیتا۔ مگر ڈاک خانے کے معاملے میں جو پچاس روپیہ دینے پڑے اس لیے کچھ معاملہ پیچیدہ ہو گیا۔ اس لیے (مجبور ہو کر) میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ اگر موجود ہوں اور تکلیف نہ ہو، تو مبلغ دس روپیہ سلیم صاحب کو میری ضمانت سے قرض دے دیجیے جو ایک ہفتہ میں ادا کر دیے جائیں گے۔ اس کا میں ضامن ہوں اور ایک بار نہیں بلکہ سو بار ''الضمان علیَّ'' ان کو بھیجتا ہوں۔ آپ مجھے دیں اور مجھ سے وصول کریں۔ سلیم سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت وہ بہت پریشان ہیں۔ آپ کے

ممنون ہوں گے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) ناظر سے مراد شاید ''ناظر الحسن بی اے'' ہوں۔ جن کا قطعہ، تاریخِ وفات مولانا رنجور مرحوم کی ڈایری میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان تھے اور انتقال کے وقت شادی کو صرف چھ ماہ کا عرصہ گزرا تھا۔ مولانا رنجور کا قطعہ یہ ہے:

کیا ناظر الحسن نے کیا، آہ! انتقال؟
کیا ہائے بیوہ ہوگئی چھ ماہ کی دلہن
یہ کم سنی، یہ سوگ، رنڈاپے کا اف ستم!
کیوں کر کٹیں گے اس سے یہ ایام پُر محن
مرحوم کو تو جنّتِ فردوس کر عطا
اور صبر ان کی بیوہ کو اے رب ذوالمنن
رنجور نے جو دل سے کہا، کیا ہے سالِ فوت؟
کی چار بار ''آہ'' کہا ''ناظر الحسن''

۴×۶=۲۴+۱۳۰۰=۱۳۲۴ھ

۱۳۲۴ھ کے مطابق عیسوی سال ۲۶ر فروری ۱۹۰۶ء سے شروع ہوکر ۱۴ر فروی ۱۹۰۷ء کو ختم ہوتا ہے۔

(۲) معلوم ہوتا ہے محمد حسان اور محمد بن یامین اس زمانے میں عظیم آباد سے آئے ہوئے تھے اور ابھی تک انھوں نے کلکتے کی سیر نہ کی تھی، مولانا آزاد نے سیر کرانے کا ان سے وعدہ کیا تھا اور وعدہ ابھی چوں کہ ایفا ہونے میں کچھ دن کی دیر تھی، اس لیے ضروری تھا کہ انھیں تسلی دی جائے۔

(۳) سلیم کے بارے میں بھی خط میں کوئی وضاحت نہیں لیکن یہ بھی یقیناً کوئی ایسے صاحب ہیں جو مکتوب نگار و مکتوب الیہ کے مشترک دوست یا ارادت مند ہیں۔ شاید یہ شاہو بیگھہ (گیا) کے سید سلیم شفیق ہوں جن کی شادی کے دو قطعے مولانا رنجور کی ڈایری میں موجود ہیں۔ ایک قطعہ یہ ہے:

کس طرح آج جامے میں پھولے سمائیں ہم
یعنی یہ دن سلیم شفق کے ہے بیاہ کا
تاریخ ازدواج کی تجھ کو اگر ہو فکر!
رنجور لکھ ''وصال ہے خورشید و ماہ کا''

(۲۱) ﴿۲۳﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

بھائی رنجور!

دوسرا حمائل شریف، جس کا میں نے ذکر کیا تھا، ارسالِ خدمت ہے۔ یہ بہ نسبت اُس حمائل کے بہت عمدہ اور خوشخط ہے۔ مگر ابتدا کے دو سیپارے اور آخر کا ایک سیپارہ اس میں نہیں ہے۔ اگر وہ اس کی کافی قیمت، کم از کم بیس یا پچیس روپیہ دینا منظور کریں، تو میں ایک اعلیٰ درجے کے نسخ نویس سے، اسی خط کے موافق، نہایت عمدہ لکھوا دوں گا اور ابتدائی اوراق مطلّا مذہّب بھی عمدگی کے ساتھ ہو جائیں گے۔ بالکل اُسی طرح جیسے عموماً پرانے ہوا کرتے ہیں، مگر ایسی حالت میں پچیس سے کم کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اُنھیں منظور ہو تو آپ اطلاع دیں۔ تقریباً دو ہفتے یہ کام مکمّل (ہونے میں) لگیں گے۔ مطلّا و مذہّب مجلد بنوا کر دے دیا جائے گا۔

دوسرے متوسط درجے کی تقطیع کا قرآن شریف، جو آپ کو میں دے چکا ہوں، اُس کے متعلق بھی یہی گذارش ہے کہ اگر وہ منظور کریں اور قیمت کافی دیں تو اسی قسم کا کام کر دیا جائے۔ ابتدائی خراب اوراق بدل کر عمدہ اوراق مطلّا و مذہّب لکھوا کر شامل کر دیے جائیں۔ آخری اوراق کو بھی بدل کر، یا سورتوں کے سرنامے پورے لکھ کر اور رنگین جدول دے کر ٹھیک کر دیا جائے۔ اگر وہ کم از کم چالیس روپے منظور کریں تو لوح زر افشانی کے ساتھ بن سکتی ہے(۱)۔

والسلام علیک بالمودّۃ والوداد

آپ کا مخلص دوست
ابوالکلام آزاد دہلوی
۹۔۱۔۱۹۰۳ء

حاشیہ:

(۱) اس خط میں اور ۱۱ر فروری کے خط میں کوئی تجارتی معاملہ زیرِ بحث آیا ہے۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد اُس زمانے میں مخطوطات کی خرید و فروخت سے دل چسپی رکھتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ایک کاروباری شخص کی طرح سے کھل کر سامنے بھی نہیں آنا چاہتے تھے۔

(۲۲) ﴿۲۴﴾

بھائی رنجور!

میں یہ خط تمھیں ایسے موقعے میں لکھ رہا ہوں کہ تم اور تمھارے اہلِ بیت دریائے غم میں غوطے کھا رہے ہیں۔ اور کنارے کی تلاش میں دریا کی خونی موجوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ تمھارے میرے تعلقاتِ محبانہ کچھ ایسے قوی ہو گئے ہیں کہ اس بیان کی کوئی ضرورت نہیں کہ تمھارے اس غم اور فکر نے مجھے مقرر غمگین کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا فلسفیانہ مذاق مجھے اکثر اس امر پر آمادہ کرتا ہے کہ میں اپنی طبیعت ایسی بنالوں جسے کسی قسم کے رنج و غم کا احساس نہ ہو۔ اور ہزار کوہِ غم سے کمر خمیدہ ہو جائے، مگر دامنِ تحمّل ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر طبیعت ایسی ہو جائے اور یہ خیال ہی نہ ہو بلکہ عملاً ہو تو پھر انسان دنیا میں نہایت خوشی اور راحت سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس کے لیے تمام غم خوشی ہو جائیں اور تمام ناکامیاں کامیابی کے خوشنما پہلو رکھیں۔ اگر کوئی مر جائے تو اُسے دو آنسو بہانے کی تکلیف نہ ہو اور اگر کوئی چھٹ جائے تو ہجر کی تکلیفیں نہ اٹھانی پڑیں۔

مگر ہائے افسوس کہ انسان میں یہ قدرت سرے سے ہے ہی نہیں کہ وہ اپنی طبیعت ایسی بنالے اور اپنا دل موم سے پتھر کر لے۔ انسان کے پہلو میں قدرت نے ایک ایسی چیز رکھ دی ہے کہ وہ درد سے غمگین اور مسرت سے خوش ہوتی ہے اور اس کا اثر طبیعت انسانی پر ہوتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی بنا ہی اس حسِ انسانی پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ

ہو نہیں سکتا کہ انسان خود چاہ کر اپنی طبیعت سے یہ حس کھودے۔ بس میرا بھی یہی حال ہے۔

آج کل میرا وقتِ عزیز زیادہ اسی کوشش میں صرف ہوتا ہے کہ میں اپنی طبیعت ایسی بنالوں جسے کسی قسم کا نتیجہ خیز حسِ نہ ہو۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال مجھے اپنی کوشش سے باز بھی رکھتا ہے کہ یہ ایک انہونی بات ہے اور اس کے لیے کوشش فضول اور بے فایدہ ہے:

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رُلائے کیوں! (۱)

مگر دیکھو، تم کو ہم کو خدا ہی نے رُلا دیا۔ قدرت ہی نے سوگوارِ غم بنا دیا، اب کیسی شکایت اور کہاں کا شکوہ! الصبر ! الصبر !الان الصبر مفتاح الفرح!

تو خیر؛ میں تمھیں بحیثیت ناصح نہیں، بلکہ بحیثیت دوست نصیحت کرتا ہوں کہ اب تم بھی اس امر کی کوشش کرو کہ یہ ''احساسِ غم'' طبیعت سے جاتا رہے۔ گو اس کا نتیجہ ناکامی ہے۔ مگر یہ ضروری ہے (جیسا کہ مجھے تجربہ ہو چکا ہے) کہ ایسی کوشش سے غم کے موقعے میں عمل کرنے کا خیال آجاتا ہے اور گو عمل نہ کیا جائے، مگر خیال سے ایک ایسی تسکین اور ایک ایسا صبر طبیعت میں پیدا ہو جاتا ہے جو شاید تقدیر کے مسئلے سے بھی ایک پابندِ مذہب طبیعت میں نہ پیدا ہوتا ہوگا۔

بہر کیف! میں تمھارے غم میں شریک ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کرتا جاتا ہوں کہ عدمِ احساس کی کوشش کرو۔ فلسفۂ مادی کا بھی شیوہ یہی ہے، اگرچہ فلسفۂ اخلاق اس کے مخالف ہو۔ اچھا! اب رخصت، پھر پرسوں خط لکھوں گا۔

تمھارا مخلص

ابوالکلام آزاد دہلوی

۱۲-۱-۱۹۰۳ء

حاشیہ:

(۱) غالب کا شعر ہے۔ اصل میں ''رُلائے'' کی جگہ ''ستائے'' ہے۔

(۲۳) ﴿۲۵﴾

باسمہٖ

بھائی رنجور!

کل تم نے میرا بہت انتظار کیا ہوگا۔ مگر نہ میں آیا اور نہ میرا خط پہنچا۔ واقعی تمھارا کہنا ٹھیک ہوا۔ چار بجے میں خوابِ غفلت میں مست پڑا تھا۔ چھ بجے اٹھا تو طبیعت بے مزا پائی کہ آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

کل میں نے عرب صاحب (۱) سے نہیں، قدیر صاحب (۲) سے ستر روپیہ کہہ دیے تھے۔ انھوں نے کہا: ''مولوی صاحب ننانوے روپیہ کہیں، جب بھی نہیں ہوسکتا۔ سو روپیہ اس کی قیمت یقینی ہے۔ آپ قرآن شریف واپس کر دیجیے''۔

اس حالت میں تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اب معاملہ بگڑ گیا ہے۔ اور سوائے اس کے کہ روپے دے دیے جائیں اور کوئی صورت نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مجھے اس معاملے میں ناکامیابی ہوئی۔ اور سوائے فضول تضیع اوقات کے اور کچھ نہیں حاصل ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ کچھ دنوں سے میری مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ چند در چند خرابیں ایسی واقع ہوئی ہیں کہ حالت بالکل خراب ہوگئی۔ حیدر آباد کے معاملے میں اکتیس روپے کا نقصان ہوا ہے۔ روپے یوں برباد بھی بہت ہوئے ہیں، جن سے تم خوب واقف ہو۔ اس لیے میں نے یہ زحمت اپنے سر لی تھی کہ خیر، کچھ نہ کچھ روپے اگر اس ذریعے سے ہاتھ لگ جائیں تو کام آئیں گے۔ ابھی مجھے بعض لوگوں کو روپے دینے ہیں۔ دو گھڑیں بنوانے کو دی ہیں، جن کی چودہ روپے بنوائی دینی ہے۔ اس لیے (سوچا تھا) یہ روپے میرے بہت کام آئیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے اس

معاملے میں کامیابی نہ ہوئی اور سوائے محنت اور پریشانی کے، جس میں تم بھی شریک ہو اور کچھ نہیں حاصل ہوا۔ خیر! سوائے صبر چہ چارہ است! الخیر فی ما وقع۔

سو روپے ارسال خدمت ہیں۔ انھیں وصول کرو اور رسید دو۔ آفس سے واپس ہوتے ہوئے تم عرب صاحب سے ملنا، میں ہوں یا نہ ہو، مگر تم ان سے کہنا کہ

"کل ہمارے صاحب کے پاس قرآن شریف لے کر صاحب آئے تھے اور اُن سے اُنھوں نے مشورہ لیا کہ یہ قرآن شریف واپس کیا جائے یا نہیں؟ ہمارے صاحب نے قرآن شریف کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کو پھر ایسا نہیں ملے گا۔ خیر صاحب ستر روپے پر راضی ہوئے۔ میں نے کل آزاد سے کہا، وہ آپ سے پوچھنے جا رہے تھے کہ راہ میں میر باب اللہ مل گئے۔ (۳) اُن سے اُنھوں نے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ سو سے کم نہ دو، چاہے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ چناں چہ میں نے صاحب سے کہہ دیا، تو صاحب نے یہ روپے آج بھجوا دیے۔ آپ لے لیجیے اور باضابطہ رسید دے دیجیے۔ تم ان سے یعنی عرب صاحب سے یہی کہنا۔ میں بھی یہی کہوں گا۔ تمھارے کہنے میں کوئی برائی نہیں ہے، میرا کہنا بوجوہ مناسب نہیں ہے"۔

میں تم سے ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور چار بجے ملوں گا۔ اس وعدے میں فرق نہ ہوگا۔ اگر دو بجے تم ملنا چاہو تو "دارالاخبار" میں مل سکتے ہو۔ عرب صاحب سے تمھارا میری عدم موجودگی میں یہ باتیں کرنی مناسب ہے۔ اس میں فرق نہ ہو!

والسلام مع الاکرام

ابوالکلام آزاد دہلوی

۱۱۔۲۔۱۹۰۳ء

حواشی:

(۱) عرب صاحب کا نام معین الدین تھا اور عرب صاحب کے عرف سے معروف تھے۔ مولانا آزاد کی منجھلی بہن فاطمہ بیگم آرزو کی ان سے شادی ہوئی تھی۔ لیکن شاید یہ بعد کی بات ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "ایک علمی خاندان" از شفقت

رضوی۔

(۲) خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیر صاحب کوئی تاجر تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے قرآن شریف کا کوئی نادر نسخہ خرید اتھا۔

(۳) حیدر آباد کا کیا معاملہ تھا، جس میں اکتیس روپے کا نقصان ہوا تھا؟ ''ہمارے صاحب'' سے اشارہ کس طرف ہے؟ اور میر باب اللہ کی شخصیت پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔

(۲۴) ﴿۲۶﴾

باسمہ سبحانہ

واقعی میں بہت نالائق آدمی ہوں۔ تم سے کتنے وعدے کر چکا، مگر ایک خط بھی نہیں بھیجا۔ بے شک یہ میرا قصور ہے! بے شک یہ میری غلطی ہے!! بے شک میں تقصیروار ہوں!!! اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ مگر ساتھ ہی کچھ باتیں اور بھی ہیں۔ اُنھیں بھی سُن لو!

ا۔ میری کچھ دنوں سے عجیب حالت ہے۔ لکھنا بالکل بھول گیا ہوں۔ اور سوائے پڑھنے کے کوئی علمی شغل نہیں کرسکتا۔ اکثر لوگوں کے ضروری خطوط مدت سے پڑے ہوئے ہیں، مگر میں نے ابھی تک جواب نہیں لکھا۔ مولوی رشید احمد سالم (۱)، مولوی عبدالرزاق، (۲) قاضی حمید الدین (۳) وغیرہ اشخاص، جن کو خط لکھنے کی سوائے قلبی ضرورتوں کے علمی اور مالی ضرورت بھی لاحق ہورہی ہے، میں نہیں لکھ سکا اور اسی سلسلے میں ایک تمھارا بھی نامہ ہے، جس کا جواب میں تاہنوز نہ لکھ سکا۔ تمھارا خط لکھنے کا کئی بار ارادہ کیا۔ دو چار سطریں لکھیں اور پھر مٹادیں، حال آں کہ میں بسیط مضامین بھی اس طرح نہیں لکھتا۔ قلم اٹھایا اور لکھتے گئے۔ کل میں نے صبح کو خط لکھا تھا۔ مگر تم سے وعدہ کرکے شام کو جب تلاش کرنے لگا، تو خط ہی نہیں ملا۔ اور اب یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔

۲۔ میں یہاں اپنا وہ دوامی پروگرام لکھتا ہوں جو ہمیشہ میری میز کے سامنے ..

آویزاں رہتا ہے۔ اور جس پر آج سے تقریباً ایک ماہ پیشتر میں کامل طور سے عمل کرتا تھا۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھے خط لکھنے کا وقت کہاں تک ملتا ہے۔

۵۔۶ نماز وغیرہ

۶۔۸ سبق

۸ ۱/۲ ناشتہ

۸ ۱/۲ ۔ ۹ ۱/۲ سبق دیگر

۹ ۱/۲ ۔ ۱۱ ۱/۲ الہیئت نوشتن

۱۱۔۱۲ خوردن

۱۲۔۲ دیگر مضامین ورسالۂ دیگر

۲۔۴ ملاقات وغیرہ

۴۔۵ خط نوشتن

۵۔ ۷ ۱/۲ تفریح

ایک گھنٹہ اس میں خط لکھنے کا وقت ہے، جس میں زیادہ تر ضروری خطوط لکھا کرتا ہوں۔ میری اس پروگرام اور اس تمہید کے لکھنے سے یہ غرض نہیں ہے کہ میں اب خدا نخواستہ تمھیں خط نہ لکھوں گا۔ حاشا! اگر یہ خیال ہو بلکہ یہ التماس ہے کہ اگر خط لکھنے میں غیر معمولی توقف ہو جائے تو تم معذور سمجھ کر (معاف کر دینا)۔

نوٹ وحواشی:

نوٹ: یہ خط القاب وآداب اور خاتمہ کے رسمی انداز، دعا، تسلیم، دستخط وغیرہ سے عاری ہے اور اس پر تاریخ تحریر بھی درج نہیں۔ لیکن اس کے بعد والے خط نے یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ خط ۲۰ر فروری ۱۹۰۳ء سے چند دن پہلے کا ہے۔

(۱) مولانا رشید احمد سالم کا وطن انبیٹھہ ضلع سہارن پور تھا۔ عالم دین اور علم کے شائق، عربی اور فارسی کے ادیب، قلمی کتابوں کے شوقین ومتجسس تھے۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے، ترک موالات میں کالج چھوڑا اور جامعۂ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہو گئے۔ علامہ فرید وجدی کی تصانیف المدنیۃ والاسلام اور النصرانیۃ والاسلام، شیخ الاسلام عبدالوہاب نجدی کی تالیف ''کتاب التوحید'' امام ولی اللہ دہلوی کی ''الفوز الکبیر فی اصولِ التفسیر'' کے تراجم ان کی علمی یادگار ہیں۔ مولانا آزاد

''ان کے مابین علمی ذوق قدر مشترک اور مراسلت کا رشتہ استوار تھا۔

(۲) عبدالرزاق سے مراد مولوی عبدالرزاق کان پوری مشہور مورخ اور سوانح نگار ہیں۔ ان کے بارے میں نوٹ تراجم مکتوب الیہم کے ضمن میں آئے گا۔

(۳) قاضی حمید الدین علی پور نواح کلکتہ کے باشندہ تھے۔ شاعر تھے اور حمید تخلص کرتے تھے۔ ''بنگال میں اردو'' کے مصنف ڈاکٹر وفا راشدی نے ان کے حالات کی دستیابی سے اپنی معذوری کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ان کی ایک غزل کے تین شعر نقل کیے ہیں۔

لسان الصدق کے قدردانوں میں سے تھے۔ انھوں نے نہ صرف لسان الصدق کا حلقۂ اشاعت وسیع کرنے میں سعی کی تھی، کچھ خریدار فراہم کیے تھے، بلکہ اس کی مالی مدد بھی کی تھی۔ مولانا آزاد نے اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

(۲۵) ﴿۲۷﴾

بھائی رنجور!

پچھلے خط میں، میں نے جو ابتدا میں تمھیں کسی لقب سے یاد نہیں کیا تو یہ قصداً نہ تھا، بلکہ ہوا یہ کہ بعض لوگوں کو میں ایسا ہی خط لکھا کرتا ہوں۔ لکھتے وقت خیال نہیں رہا۔ بہر کیف میری غلطی کو معافی کی نگاہ سے دیکھو!

پانچ روپے کی مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ کیا اس وقت میری ضرورت رفع ہوسکتی ہے؟ حامل رقعہ کو تم صرف روپے دے سکتے ہو، نہ کہ خط۔

میں آج ٹھیک چار بجے حاضر ہوں گا، کل وعدہ خلافی ہوگئی۔ اس کا حساب نہیں۔ اگر آج سے میرے وعدوں میں فرق آیا کرے، تو پھر واقعی میں سخت مجرم ہوں گا۔

ابوالکلام آزاد

۲۰۔ا۔۱۹۰۳ء

(۲۶) ﴿۲۸﴾

باسمہٖ سبحانہ

بھائی!

میں آپ سے سخت نادم ہوں۔ میرے ذریعے سے آپ نے اچکن سلوانے کو دی اور تا ہنوز سلِ کر نہیں آئی۔ یہ تو آپ کو کل معلوم ہوگیا ہے کہ بٹن چوں کہ غلطی سے نہیں دیے گئے تھے، اس لیے کل اچکن باوجود تیار ہو جانے کے نہیں ملی۔ کل شام کو بٹن دے دیے گئے۔ اور یقینی امید ہے کہ دو بجے تک سلی سلائی شیروانی اور تین پائجامہ بھی مل جائیں گے۔

کل میں نے، آج چار بجے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر یہ میری سخت غلطی تھی کیوں کہ آج چار بجے ''جوبلی اسکول'' میں میرا ''اسلامی اتفاق'' پر لیکچر ہے۔ اس لیے میں ٹھیک ڈھائی بجے حاضر ہوں گا تا کہ جیسے ہی آپ آفس سے تشریف لائیں، آپ سے باطمینان مل کر ساڑھے تین بجے چلا جاؤں۔ کیا راے اقدس؟

اچھا، اب ڈھائی بجے ملوں گا۔ خط بھی کل ضرور لکھوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ابوالکلام محی الدین آزاد

۸۔۳۔۱۹۰۳ء، یوم الاثنین

(۲۷) ﴿۲۹﴾

برادرم!

میں آپ کو خط نہیں لکھتا کہ آپ مجھے نہیں لکھتے! کلکتہ کس دن پہنچیے گا؟ کس وقت یا ابھی پٹنہ میں کچھ اور رہنے کا ارادہ ہے؟ مطّلع فرمائیے!

میں بخیریت ہوں۔ والسلام

آپ کا

ابوالکلام
۱۱۔امرتلہ لین۔کلکتہ
۲۰رمئی ۱۹۰۳ء(۱)

ڈاک خانہ گل زار باغ، محلّہ نھموہیہ، میر شکارٹولہ
مکان مولوی عبدالرحیم صاحب
مولوی محمد یوسف صاحب ملاحظہ فرمائیں

حاشیہ:
(۱)اس پوسٹ کارڈ کے عکس میں پتے کے حصے پر۲۰، ۲۱، ۲۲رجون کی مہریں صاف نظر آتی ہیں۔شاید اسی لیے مالک رام نے اس کی تاریخ تحریر ۲۰رجون قرار دی ہے۔لیکن یہاں تو مولانا آزاد کے قلم سے صاف ۲۰رمئی ۱۹۰۳ء درج ہے۔

(۲۸) ﴿۳۰﴾

برادرم!
حضرت سے اچھی طرح گفتگو ہوئی (۱) انھوں نے اجازت دی اور فرمایا کہ ''بہتر! خط لکھ کر روپے منگوالو۔'' لہٰذا آپ جناب کاظم سے کہہ دیجیے کہ وہ خط لے کر کرایہ اور سو روپے پیشگی منگوالیں۔ہاں! آج آفس میں آپ دو کام ضرور کریں؛
۱۔ویبسٹرس ڈکشنری [Vebster's Dictionary] سے اہرامِ مصر کا فوٹو نکالیے۔
۲۔ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست ملاحظہ ہو۔کتاب ''رسالہ ملک شاہ سلجوقی، یعنی سفرنامۂ ملک شاہ سلجوقی فارسی'' (۲)۔

مرزا کاظم صاحب (۳) سے میرا اسلامِ شوق کہہ دیجیے گا۔اور فرمایئے گا کہ چند اور رسایل اور اخبار ہیں، جن میں ''سہل آموز فارسی'' پر ریویو ہونا ضروری ہیں۔اس لیے وہ مجھ سے کہیں ملاقات فرمائیں اور چار نسخے ''سہل آموز'' کے لائیں، تاکہ میں وہاں بھیج دوں۔

بعدِ مغرب کل یا پرسوں دار الاخبار میں مل سکتے ہیں۔

ابوالکلام

۲۶۔۵۔۱۹۰۳ء (سہ شنبہ)

حواشی:

(۱) ''حضرت'' سے مراد مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین (۱۸۳۰ء۔۱۹۰۸ء) ابنِ محمد ہادی دہلوی ہیں۔ مولانا آزاد، ان کے بہن بھائی اور مریدین وغیرہ سب انھیں ''حضرت'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ وہ عالمِ دین، واعظ اور مصنف تھے۔ دہلی میں ولی اللہی خاندان کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۷ھ کے بعد حجاز تشریف لے گئے۔ علماے حجاز سے استفادہ کیا۔ وہیں ایک عالم خاندان میں شادی کی اور مکہ مکرمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ عراق، شام، ترکی وغیرہ کے کئی سفر کیے۔ تقریباً ۱۸۹۸ء میں ہندوستان تشریف لائے'' بمبئی میں اور بیشتر کلکتہ میں قیام کیا۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: ''ایک علمی خاندان'' از سید شفقت رضوی۔

(۲) احسن الاخبار اس زمانے میں نکل رہا تھا اور اس کی بڑی ذمہ داری مولانا آزاد ہی پر تھی۔ اسی کے لیے مضمون کی تالیف کے سلسلے میں ان چیزوں کی ضرورت پیش آئی ہوگی یا خدنگ نظر لکھنو میں آثارِ قدیمہ کا جو سلسلہ مولانا نے شروع کیا تھا اور اس سلسلے میں ''آثارِ قدیمہ'' کی تاریخی اہمیت پر مولانا کا ایک تمہیدی مضمون فروری ۱۹۰۳ء میں اور دنیا کے مشہور آثارِ قدیمہ کے تعارف کے سلسلے میں ''منارِ خسرو گر'' پر مولانا کا پہلا مضمون مارچ ۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع بھی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مولانا کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا یا خدنگ نظر کا وہ پرچہ ابھی کسی محقق کی نظر میں نہیں آسکا جس میں سلسلے کا کوئی اور مضمون شائع ہوا ہو۔ شاید یہ ضرورت اسی سلسلے کے مضمون کے لیے ہو۔

(۳) مرزا کاظم کے بارے میں مولانا آزاد نے فرمایا ہے کہ مرزا کاظم شیرازی شمس العلما شیخ محمد جیلانی کے خویش اور کلکتہ بورڈ آف اگزامنرز میں فارسی کے مدرس اور بہت غیر متعصب اور روشن خیال آدمی تھے ''سہل آموز فارسی'' ان کی تالیف تھی اور اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ص ۲۸۸) محترم قدرت اللہ فاطمی نے ان کے حالات میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ''وہ بورڈ آف اگزامنرز میں شعبۂ فارسی کے سربراہ اور نانا ابا (حضرت رنجور مرحوم) کے رفیق کار اور معترف و ممنون تھے''۔ (خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۴۷، ص سولہ)۔

(۲۹) ﴿۳۱﴾

بھائی رنجور!

میں آج ٹھیک ۴/۱ ۱۱ بجے آفس میں ملوں گا۔ رات کا لکھا ہوا ہے۔

میں مغرب کے بعد نہیں آیا۔ تم نے بہت انتظار کیا ہوگا۔ مگر کیوں نہیں آیا، اس کی وجہ بھی سُن لو!

''اسلام اور محرّم'' (۱) نے شیعوں میں ایک سخت جوش پیدا کر دیا ہے۔ **الحق مُرٌّ** ضروری امر ہے اور اسی کا یہ سب نتیجہ ہے۔ اگرچہ سارے مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس میں شخصیت یا ذاتیت کا مضمون ہو، لیکن صاف صاف اور سچّے لفظوں نے ایک جاہلانہ جوش پیدا کر دیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فوجداری ہتکِ مذہب کی کریں گے۔ کوئی کہتا ہے کہ مفخم السّلطان (۲) کے ذریعے سے کوشش کریں گے۔ مگر یہ ایران نہیں ہے، بلکہ انڈیا ہے، جس پر برٹش پھریرا اُڑ رہا ہے۔ جب تک قانونی گرفت نہ ہو، کچھ نہیں ہوسکتا۔ سلف کی کتابیں اس سے سخت لفظوں سے بھری پڑی ہیں۔ مگر ان پر کوئی اعتراض اس لیے نہیں کرتا کہ مذہبی پیرائے میں ہے، اور اس لیے قابلِ تردید ہے، نہ کہ قابلِ غضب وغصّہ۔ بعض حضرات اس امر پر تُلے ہیں کہ ذاتیات سے پیش آئیں۔ مجھے اس امر کا یقین ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، حق لکھا ہے اور صرف مذہبِ اسلام کی تائید اور بالخصوص مخالفینِ اسلام کے اعتراض کے دفعیے کے لیے۔ اور جب مجھے میرا کانشنس [CONCIENCE] کہہ رہا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، محض احقاقِ حق وابطالِ باطل کے لیے، تو مجھے کچھ ڈر نہ ہونا چاہیے۔ گو کچھ ہی کیوں نہ ہو، مجھے دنیا کے مشہور ریفارمروں کی لائف پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مگر افسوس ہے اور ہائے سخت افسوس ہے، اور ایسا افسوس ہے کہ میں اُسے ضبط نہیں کرسکتا کہ میں اپنے ساتھ ایک خاندان بھی لیے ہوئے ہوں، جو اس قسم کی اصلاح کو غیر ضروری، بلکہ ناجائز، مصلحت اور تقیہ کو حق سمجھتا ہے۔

اس لیے آج شام سے، جب سے کہ چند جاہل عورتوں نے آکر کچھ کہا ہے، گھر میں ایک عجیب جوش پیدا کر رکھا اور ملامت کی بوچھاڑ (نے) خودکشی کی سی ناجائز اور تکلیف دہ چیز کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اگر میں ان سے کہوں کہ جس بات کو میرا

کانشنس اور ساتھ ہی مذہبِ اسلام ناجائز کہتا ہے، اُسے زبان سے (ناجائز) کہنے (سے) میں باز نہیں (رہ) سکتا۔ میرا ضمیر مجھے مجبور کرتا ہے۔ تو مصلحت، مصلحت کی آواز لگاتے ہیں۔

میرے دل سوز بھائی! میں مصلحت کو تقیہ سمجھتا ہوں اور اس لیے میں کر نہیں سکتا۔ میں اپنے خاندان سے مخالفت کرنے پر، باوجود بہت ضبط کے اپنے کانشنس کے ہاتھوں مجبور ہوں، تو اوروں کے آگے کیوں نہ کہوں! بھائی ایسی مصلحت مجھ سے قیامت تک نہ ہوگی۔ گو دار ورسن ہی کا مضمون کیوں نہ ہوا!

تمھارے خاندان کی حالت میرے پیشِ نظر ہے اور ثابت قدمی کی بہت سی مثالیں اور حق گوئی کی بہت سی نظیریں دماغ میں موجود ہیں، اور اس لیے کبھی مجھ سے ایسا نہیں ہوسکتا۔ بھائی! ان لفظوں کو میری آپ باتیں ہی باتیں نہیں سمجھیے گا۔ واللہ یہ میں نہیں کہتا، بلکہ میرا وہ سچّا کانشنس کہہ رہا ہے، جو مذہب اسلام اور توحید کی سچّی محبّت سے پیدا ہوگیا ہے۔ میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہے! طبیعت اُمڈی آتی ہے اور بے اختیار رو رہا ہوں۔ بار بار افسوس آتا ہے کہ اگر آج میں آزاد ہوتا، اور میری حالتوں اور عقاید کا کوئی روک نہ ہوتا، میری مصیبت پر کوئی غم کرنے والا نہ ہوتا، تو مجھے کچھ افسوس نہ ہوتا اور میں اپنے عقاید کو صاف طور سے للکار (کر) کہہ سکتا۔ اگر مجھ پر مصیبت آتی، اسلام کی حمایت کی بدولت، تو میں اسے بخوشی قبول کرتا اور ذرہ بھر اس میں بے عزتی نہیں سمجھتا۔ مگر اب تو میرے افعال کا سلسلہ اوروں تک پہنچ گیا، اور وہ اسے باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ سلف کے کارنامے بھول گئے ہیں اور اس سے مجھ پر جانکنی کی حالت طاری ہورہی ہے کہ میری وجہ سے ان کی، ان کے خیال کے موافق بے عزتی ہوگی۔ حال آں کہ میں تو اسے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ اور قسم خدا کی میں اسے کبھی باعثِ عار نہیں سمجھتا۔ ہاں اگر کچھ کہتا ہوں، تو اس اسلام اور اس خیالِ توحید کو، جس کی محبّت میں یہاں تک دیوانہ ہوگیا ہوں:

بجرمِ عشقِ توام می کشند غوغائیست

تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست (۳)

کیا غضب کی بات ہے کہ اس قسم کی ہزاروں کتابیں لکھی جائیں۔ شیعہ مصحفِ عثمانی کو کہیں کہ اس قرآن کو جلا دو، اور ہمارے آباؐ واجداد پر تبرا بھیجیں! مگر ہم اگر کہیں کہ اس تماثیل پرستی کو ترک کرو، تو ہم سے لڑنے اور فوجداری کے لیے آمادہ ہو جائیں! فوجداری وغیرہ تو غالباً نہ ہوگی۔

اب رہا ان کے ذاتیات کے حملے! تو میں ہرگز ہراساں نہیں ہوں۔ اُس خدا پر بھروسا ہے، جس کی توحید کے لیے میں نے لوگوں کی ملامت کا خیال نہیں کیا۔ مجھے بھائی صاحب وغیرہ ایسی کوشش کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، جس سے آگ بجھ جائے۔ آپ ابھی مؤید الاسلام (۴) سے جا کر ملیں اور فرمائیں کہ مناسب تو یہ ہے کہ اُس کی تردید لکھی جائے اور اس سے سخت لفظ لکھ کر شائع کیے جائیں بلکہ احسن الاخبار چھاپ دے گا۔ اس کے کیا معنی کہ لڑنے بھڑنے کی ٹھہرادی ہے!

قاضی عبداللطیف (۵) آج بُلا گئے ہیں، ضرور جائیے ضرور! باقی عند الملاقات ...... (تم جانتے ہو)

حواشی:

(۱) مولانا آزاد کا یہ مضمون (اسلام اور محرم) ''احسن الاخبار'' میں شائع ہوا تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر تو مولوی احمد حسن فتح پوری تھے۔ لیکن ادارت کا سارا کام مولانا انجام دیتے تھے۔ احسن الاخبار مارچ ۱۹۰۲ء کے آخر یا اپریل کے آغاز میں نکلنا شروع ہوا تھا اور وسط ۱۹۰۳ء میں مولانا کے اسی مضمون کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ احسن الاخبار کی عمر سوا سال سے زیادہ نہ ہوئی۔ مولانا نے یہ مضمون ۱۰ محرم ۱۳۲۱ھ (۸ اپریل ۱۹۰۳ء) کو علَم کے جلوس کا ایک انگریز کو تماشہ دکھانے اور ایک شعائر اسلام کی حیثیت سے اس کا تعارف کرانے کے واقعے سے متاثر ہو کر ایک خاص جوش اور اسلامی جذبے سے لکھا تھا۔ لیکن اہلِ تشیع کے بعض مجلس طرازوں نے اسے ایک بالکل دوسرا رنگ دے دیا۔ جس کی وجہ سے ایک حلقے میں ایک جاہلانہ جوش پیدا ہو گیا۔ اسی واقعے کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصے کے بعد احسن الاخبار بند ہو گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی''

(۲) مفخم السلطان کلکتہ کے کوئی شیعہ مذہبی رہنما ہوں گے ان کے حالات کا علم نہیں ہوسکا۔

(۳) محترم مالک رام نے خریطۂ جواہر کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ شعر عبدالرحیم خان خاناں کا ہے۔

(۴) مؤید الاسلام کے بارے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی خودنوشت ''گرد راہ'' میں لکھا ہے کہ کلکتہ میں غیر ملکی تاجروں کے ساتھ ایرانی بھی خاص تعداد میں رہتے آئے تھے اور ان میں سے کئی میں علم وادب کا اچھا ذوق تھا۔ سب سے مقتدر ہستی مؤید الاسلام جلال الدین کی تھی جو جمال الدین افغانی کے رفیق اور حبل المتین کے مدیر کی حیثیت سے دنیائے اسلام میں روشناس تھے۔ گو وہ نابینا تھے لیکن ان کی ذہنی وسیاسی بصیرت کا سب احترام کرتے تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ''ذکر آزاد'' میں مولانا آزاد کے دوستوں کے ضمن میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''آغا جلال الدین ایرانی تھے اور سید جمال الدین افغانی کے ایک رفیق۔ کلکتہ سے فارسی اخبار ''حبل المتین'' نکالتے تھے۔ ایران کے انقلاب میں اس اخبار کا بڑا ہاتھ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ فارسی اور عربی میں ایسے لسان تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔ ذہانت واحساس کا یہ حال تھا کہ روپیہ ہاتھ میں آتے ہی بتا دیتے تھے کہ کھرا ہے یا کھوٹا''۔

مولانا ملیح آبادی نے انھیں ''مولانا کے قدیم احباب'' میں شمار کیا ہے۔

(۵) قاضی عبداللطیف کے بارے میں کوئی روشنی حاصل نہیں کی جاسکی۔ یقیناً اس معاملے سے ان کا کوئی قریبی تعلق ہوگا۔ اور یقیناً کلکتہ کی کوئی نمایاں شخصیت ہوں گے۔

(۳۰) ﴿۳۲﴾

برادرم!

آج، کل کیا معنی! آزاد ہمیشہ آپ کے انتظار کا لطف حاصل کرنے کے لیے بہ خوشی تیار ہے۔

آج یتیم خانہ مولوی صاحب قطعی جائیں گے(۱)۔ امید ہے کہ کل تک چھپ جائے گا(۲)۔ ہاں! ایک امر آپ سے دریافت کرنا ہے! وہ یہ کہ لاہور کا درجۂ آخر کا کرایہ کیا ہے؟ اس کا جواب لکھ کر آپ آفس جاتے ہوئے دیتے جائیں۔ والسلام

آپ کا ہمیشہ

ابوالکلام

باغ و بہار کی طرز کے کتاب لکھ رہا ہوں۔ وجہ تالیف میں سلطنتِ انگریزی کے

برکات بیان کیے ہیں۔ مثل میرامّن کے غالباً مضمون ہوگا(۳)۔

ابوالکلام

۲۔۶۔۱۹۰۳ء، یوم الثلاثہ

حواشی:

(۱) مولوی صاحب سے اشارہ مولوی احمد حسن فتح پوری کی طرف ہے اور یتیم خانے سے مراد یتیم خانۂ اسلامیہ قائم کردہ مولوی شرف الدین (نیورہ) ہے۔ مولوی احمد حسن کو وہاں کسی کام سے جانا ہوگا۔

(۲) غالباً کوئی چیز پریس میں چھپ رہی تھی۔ احسن الاخبار تو چند ماہ قبل بند ہو چکا تھا۔

(۳) باغ و بہار کے طرز پر مولانا کون سی کتاب لکھ رہے تھے۔ ایسی کسی کتاب کا کوئی تذکرہ کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

(۳۱) ﴿۳۳﴾

Calcutta

۸۔۶۔۱۹۰۳ء

برادرم!

آج آپ کو گئے کئی روز ہوگئے (۱)، مگر آپ کا ایک خط بھی نہیں پہنچا! اور نہ ''اسلام ومحرم'' کا ترجمہ ملا۔ آج انتظار کے بعد یہ خط لکھتا ہوں۔ جواب جلد تحریر فرمائیں۔

میں مع متعلقین بہ خیریت ہوں۔ شیعوں کی جانب سے بدستورِ سابق خموشی ہے۔ کل مرزا کاظم صاحب ''دارالاخبار'' میں تشریف لائے تھے۔ اُن کے بیان کے موافق معاملہ بہت سرد پڑ چکا ہے، صرف حاجی کاظم کی کارروائی جاری ہے (۲)۔ بہرکیف، کوئی قابلِ ذکر بات سننے میں نہیں آئی۔

مولوی عبدالباری صاحب (۳) پٹنہ سے واپس آئے ہیں۔ پرسوں میں نے ان سے ملاقات کی۔ احسن الاخبار کا مضمون اُنھوں نے استفساری طریقے پر خود چھیڑا اور نہایت عمدہ ہمدردی ظاہر کی۔ دوسری ملاقات میں میرا ارادہ ہے کہ اُن سے احسن

الاخبار کا تذکرہ خاص معاملے میں چھیڑوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

مولوی احمد حسن ابھی تک کلکتہ میں ہیں۔ دارجلنگ سے روپے اور جواب ابھی تک نہیں آیا۔ فرمائیں، مزاجِ شریف؟ آپ بخیریت ہیں؟ آپ کے متعلقین بخیریت ہیں؟ یہ خبر سننا چاہتا ہوں۔ ہمشیرہ صاحبہ بخیریت اور مستفسرِ احوال ہیں۔ آیندہ اتوار کو جلسہ ہے۔

والسلام علیکم

آپ کا

ابوالکلام، دوشنبہ

حواشی:

(۱) حضرت رنجور پٹنہ تشریف لے گئے تھے۔

(۲) حاجی کاظم کون شخص ہیں جن کی ریشہ دوانیاں ابھی جاری تھیں۔ ان کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

(۳) مولوی عبدالباری پر حاشیہ خط نمبر ۱۸ کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ مولانا آزاد احسن الاخبار کے بارے میں ان سے جو بات کرنا چاہتے تھے، وہ یقیناً اسے جاری رکھنے کے انتظامات کے بارے میں ہوگی۔ اس لیے کہ عبدالغفار (مالک) اور مولوی احمد حسن (مدیر) کے خوف زدہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی اشاعت کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا یا اشاعت التوا میں پڑ گئی تھی اور مولانا ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اس واقعے کے نتیجے میں اخبار بند ہونے کی شہرت ہو!

(۳۲) ﴿۳۴﴾

۱۵ر مئی ۱۹۰۳ء

برادرم!

آج پندرھویں تاریخ ہے۔ اس عرصے میں برابر خط لکھتا رہا۔ آج ایک بیرنگ خط آپ کا ملا ہے، جس کی تاریخِ روانگی ۱۱ر جون معلوم ہوتی ہے۔ چند در چند ضرورتوں سے میں ۱ بجے سے شام تک مکان پر کم رہا ہوں، اس لیے یہ بیرنگ خط آیا تھا اور واپس

ہو رہا تھا۔ آج میں نے وصول کیا۔ نمبر ۱۱ کے پتے سے آپ نے جو خطوط بھیجے، میرے اور مولوی احمد حسن کے نام، اُن کا جواب بھی میں نے روانہ کر دیا ہے۔ لیکن آپ نے اُن کا جواب ابھی تک نہیں دیا۔

میں اُسی دن ارشد علی (۱) کے پاس گیا تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ خطوط اور ایک پمفلٹ میں نے عبدالرؤف صاحب کی آڑھت میں دے دیے ہیں۔ میں بہ چند وجوہ کے وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ میں مکان نہیں جانتا تھا۔ وہاں چند ایسے ذات شریف ہیں جن کے ملفوظات اس کے پہلے ہماری سوسایٹی تک پہنچ چکے ہیں۔

اس لیے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میں وہاں اس امر کے لیے جاؤں اور اس امر کو بہ زور ثابت کروں کہ واقعی میرے خطوط مولوی صاحب کے پتے سے آتے تھے۔ اور انھیں اس اتحاد نشان پر ریمارک کرنے کا موقع دوں۔ گو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے ان لغو ریمارکوں کی بالکل پروا نہیں ہے۔ اس حالت میں کہ مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ جہلا کی زبانی نکلے ہیں۔ لیکن احتیاط کے خلاف بود۔ مگر مجبور ہو کر میں کل پہنچا اور خطوط وغیرہ لے آیا۔ اس میں دو خط مولوی شبلی (۲) کے تھے، جس میں ایک ضروری کام لکھا ہوا تھا۔ یعنی نواب امیر حسن (۳) سے چند امور میں ضروری گفتگو کرنی تھی۔ اور چند کتابیں ایشیاٹک سوسایٹی [Royal Asiatic Society] سے لے کر اُنھیں جلد بھجوانی تھیں۔ مگر وہ خطوط وہیں پڑے رہے۔ اور ارشد علی کی نالایقی اور آپ کی زود اعتباری نے یہ نتیجہ پیدا کیا۔ مجھے اس قدر شرمندگی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کل میں اسی لیے خط نہیں لکھ سکا کہ اُن کے کام میں مصروف رہا۔ ایک کارڈ محمد یعقوب نامی شخص کا آپ کے نام تھا اور دو کارڈ اور ایک اور پمفلٹ جو کل شام ارشد نے مجھے دیا ہے، وہ آپ کے پتے سے آپ کے نام بھجوا دوں گا۔ اس ارشد کی نالایقی کا یہ حال ہے کہ باوجود فہمایش کے بھی خطوط نہیں پہنچاتا۔ آپ روز ڈاکخانے جا کر دن بھر کے

خطوط لے آتا ہوں۔

آپ نمبر ۱۱ کے پتے سے خط بلا تکلف لکھا کیجیے۔ عرب صاحب کے ذریعے سے مجھے پہنچ جائے گا۔ بیرنگ کی یہ خرابی ہے کہ تین دن کے بعد آج مجھے آپ کا یہ خط ملا ہے۔ آپ پیڈ [Paid] بھیجا کریں۔ ہاں! یہ فرمایئے کہ ادھر تیرہ دن میں آپ نے خط کیوں نہیں لکھا؟ کیوں کہ میں پرسوں بھی ایک خط لکھ چکا ہوں۔

بانکی پور لائبریری کی فہرست کی تلاش ضرور جاری رہے۔ اُس کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ اگر نقل ہو سکے تو نقل ہی کرالیں۔ اُجرت دے دی جائے گی۔ ابھی تک دار جلنگ سے جواب نہیں آیا (۴)۔

والسلام

ابوالکلام

حواشی:

(۱) ارشد علی اور آگے آنے والے نام محمد یعقوب نامی اشخاص کے حالات کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

(۲) علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) عالمِ دین، مورخ، سوانح نویس، سیرت نگار، ادیب، شاعر، نقاد، مولانا آزاد کے بزرگ دوست کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء تک علامہ شبلی سے نہ صرف تعارف ہی کی نوبت آئی تھی بلکہ مراسلت کا رشتہ اور اعتماد کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ملاقات کی خوشی وقتی اس کے ایک ڈیڑھ برس کے بعد آئی۔

(۳) نواب امیر حسن خاں وہی بزرگ ہیں، جن کا ذکر مولانا نے اپنے مضمون ''اسلام اور محرم'' اور اس پر اہل تشیع کے رد عمل کے ضمن میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''پولیس کورٹ کے مجسٹریٹ اور شیعہ تھے''۔ اس معاملے میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ سنجیدہ تھا۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۹۶) علامہ شبلی مرحوم کے ضمن میں ان کا نام آنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے مابین تعلقات تھے اور صاحبِ ذوق شخص تھے۔

(۴) مولوی احمد حسن فتح پوری دار جلنگ جانے والے تھے اور وہاں سے خط آنے کے انتظار میں تھے۔

(۳۴) ﴿۳۵﴾

برادرم!

آج تیسرا روز ہے کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ اس کارڈ میں لکھنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر بات آج نہیں ہوئی۔ مولوی احمد حسن صاحب بدستورِ سابق منتظر خط ہیں۔ غالباً دارجلنگ کا مضمون رفت گذشت شد (۱)۔

بانکی پور کی لائبریری کی فہرست کا خیال رہے۔ اصل ملے، تو بہتر، ورنہ نقل کرنے کی کوشش (۲) کیجیے گا۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ والسلام

ابوالکلام آزاد

۱۸۔۶۔۱۹۰۳ء

پٹنہ۔ ڈاک خانہ گل زار باغ، محلہ تھمو ہیہ۔ میر شکار ٹولہ
مکان جناب مولوی عبدالرحیم صاحب
مولوی محمد یوسف صاحب جعفری ملاحظہ فرمائیں

حواشی:

(۱) مولوی احمد حسن فتح پور کے رہنے والے تھے۔ عالمِ دین تھے۔ تحفۂ احمدیہ، کان پور کے ایڈیٹر ہوئے، پھر کلکتہ آ گئے اور عبدالغفار تاجرِ کتب و مالک مصطفائی پریس کے ساتھ مل کر ''احسن الاخبار'' نکالا۔ ضابطے کے مطابق اس کے ایڈیٹر وہی تھے۔ ان کا ذکر پچھلے کئی خطوط میں آیا ہے۔ احسن الاخبار بند ہونے کے بعد مولانا رنجور مرحوم نے ان کی معاش کے لیے ٹیوشنوں کا انتظام کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک انگریز آفیسر کو پڑھانے کے لیے دارجلنگ جانے والے تھے اور وہاں سے خط اور منی آرڈر کے انتظار میں تھے۔ بعد میں دارجلنگ جانے کا انتظام ہو گیا تھا، وہ گئے، لیکن وہاں جا کر بیمار ہو گئے۔ واپس آ کر ۱۰ اردسمبر ۱۹۰۳ء کو انتقال کیا۔ ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں مولانا نے محبت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے انتقال پر لسان الصدق، دسمبر ۱۹۰۳ء میں ایک پُر درد تعزیتی شذرہ بہ عنوان ''احمد حسن کہاں ہیں؟'' تحریر کیا۔ رنجور مرحوم نے تاریخ وفات میں ذیل کا قطعہ لکھا:

چوں کہ احمد حسن ز دارِ محن
رفت و آسودہ زیرِ خاک نجف
سال فوتش دلم ز روے ہوش
۵

رفتہ احمد حسن بہ جنت گفت

+ ۱۸۹۸ھ = ۱۹۰۳ء

حضرت رنجور کی بیاض میں بھی مولوی احمد حسن کی وفات کے دو قطعاتِ وفات ہیں۔

(۲) سیاہی کے دھبے کے نیچے لفظ چھپ گیا۔ اس لیے پڑھا نہیں جا سکا۔ شاید تاکید یا تعجیل کے لیے لفظ ہو! اندازے سے جملہ مکمل کیا گیا۔

(۳۴) ﴿۳۶﴾

بھائی رنجور!

رات کو دس بجے مرزا محمد کاظم تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے کہ آج جلسے میں شیخ گیلانی علالت (کی وجہ سے) سے وعظ نہ کر سکے، مگر جعفر صاحب نے اچھی طرح اتفاق اور اصلاح کے فواید بیان فرمائے۔ اور یہ کہا کے مقدمہ وغیرہ کرنا محض لغویات ہے۔ اور اس میں کوئی برائی نہیں، اگر شیعی علَم سے متعلق کچھ کہا ہے۔ ہاں، اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ آیندہ سے ایسے مضامین نہ شایع ہوں۔ غرض انھوں نے آگ پر پانی ڈالنے کی اچھی طرح کوشش کی تھی۔ غرض خواص کا خیال بدل گیا ہے، تمام لوگوں میں نا اتفاقی ہوگئی ہے اب صرف ایک شخص ہے، جو مقدمہ چاہتا ہے اور اُس کی بھی دوا موجود ہے، جو عندالملاقات کہوں گا۔ کاظم صاحب رات کو بہت اطمینان بخش باتیں کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے بہت سے نظیریں اس قسم کی دیں کہ علماے عراق اور مفتی محمد حسن وغیرہ نے اس قسم کی باتوں کی سخت مخالفت کی تھی، اور چاہا تھا کہ علَم وغیرہ موقوف ہو جائے۔ اگر جزوِ ایمان ہوتا، تو ضرور ہے کہ وہ لوگ کہ مستند شیعہ تھے، ایسا امر کیوں کرتے؟

مرزا ابا بر صاحب بھی بہت سنبھل گئے ہیں۔ آپ آٹھ بجے جا کر اُن سے ملیں۔ (۱) اگر کوئی شخص موجود ہو، تو گفتگو نہ کریں۔ اِدھر اُدھر کی بات کر کے چلے آئیں۔ ورنہ

اُن سے ملیں اور اصلاح کی کوشش کریں۔ یہ نہ کہیں کہ مولانا کا فرستادہ ہوں۔ بلکہ بہ طور خود گفتگو کریں۔ متانت اور بردباری کے ساتھ! اور یہ بھی کہیے گا کہ میرے آنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ چوں کہ ابھی سنیوں میں خبر کم پھیلی ہے اور عنقریب پھیلنے والی ہے۔ اس لیے بہ خوفِ فسادِ عظیم آپ کا، ہمارا اور بالخصوص آپ کا بہ حیثیت لیڈر ہونے کہ فرض ہے کہ اصلاح کیجیے۔ اور وہاں سے واپس آکر مجھے ملیے۔ ساڑھے نو بجے بابر صاحب کے یہاں جلسے سے پہلے جائیں۔

ایک انگریزی خط بھیجتا ہوں اس کا سرسری ترجمہ لکھ دیجیے گا، اسی وقت اور بابر صاحب کے یہاں ساڑھے آٹھ تک چلے جایئے۔ ترجمہ جلد دیجیے۔

ابوالکلام

خط لکھنے کے بعد مولانا نے یہ تاکیدی جملہ خط کی پیشانی پر مزید لکھ دیا تھا:

''اس وقت پونے آٹھ ہیں۔ ساڑھے آٹھ تک چلے جایئے گا''۔

حاشیہ:

(۱) معلوم ہوتا ہے ابھی مسئلہ زندہ ہے۔ البتہ اب اس بارے میں جوش و خروش کم ہوگیا تھا۔ مرزا بابر یقیناً اہل تشیع کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔

(۳۵) ﴿۳۷﴾

برادرم

روپے کل میں نے اس لیے نہ بھیجے کہ کوئی جانے والا نہ تھا، رحمت بیمار، بتول مکان میں، امینہ گھر کے کاموں میں! ترکی ٹوپی آج قالب پر چڑھوا کے بھیج دوں گا جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا۔ ترجمہ خلیل صاحب نے دیکھ لیا۔

آج قاضی محمد سعید صاحب سے آپ مل سکتے ہیں یا نہیں؟ شیعوں میں اخبار کے بند ہونے کی خبریں گشت کھانے لگی ہیں، جن سے بہت برے نتائج نکل سکتے ہیں۔

اس لیے اگر اب اخبار نہ نکلا تو ان کو بہت زور مل جائے گا۔ آج آپ قاضی صاحب سے بعد العصر ملیں اگر کچھ امید دلائیں تو کل مولوی صاحب (۱) کو لے جائیں۔ ورنہ سکوت اختیار کریں۔ کیا آپ یہ تکلیف گوارا کیجئے گا؟

آج آپ سے چار بجے ملوں گا، اور اسی وقت قاضی صاحب کے پاس جانے کا مضمون فیصلہ پائے گا۔

آپ کا ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) مولوی صاحب سے مراد مولوی احمد حسن فتح پوری ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قاضی محمد سعید سے ملاقات ''احسن الاخبار'' کو جاری رکھنے کے سلسلے میں تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب اس حلقے کے صاحبِ ثروت لوگوں میں سے تھے۔ قاضی صاحب کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

(۳۸) ﴿۳۶﴾

(خودنوشت)

امرتلہ لین نمبر ۱۱، کلکتہ

۱۵؍جولائی ۱۹۰۳ء

میرا نام محی الدین ہے۔ ۱۳۰۳ھ میں مکّہ معظّمہ میں پیدا ہو۔ میرے والد خیر الدّین دہلی کی قدیم سوسایٹی کی یادگار ہیں، جن کا خاندان بغداد سے پنجاب آیا اور پنجاب سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی پہنچا۔ غدر سے کچھ پہلے میرے والد بمبئی آئے اور بمبئی سے مکّہ معظّمہ چلے گئے۔ وہاں ایک مدّت رہ کے پھر ہندستان آئے۔ اور ہندستان میں کچھ عرصہ رہ کر بغداد، کربلائے معلّی، نجف اشرف، مصر، قسطنطنیہ، بیت المقدّس وغیرہ کی سیر کر کے پھر مکّہ معظّمہ آئے اور وہیں میں پیدا ہوا۔

میری والدہ کا نام زینب تھا۔ اور میرے والد جہاں جہاں گئے، وہ ساتھ رہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے والد کو والدہ سے بہت محبّت اور الفت تھی۔

۱۳۰۴ھ کے اوایل میں یکا یک والدہ کو ہندوستان کے مشہور مقامات دیکھنے کا شوق ہوا اور والد صاحب کو بھی۔ حب الوطنی نے اس تحریک کو عملی صورت میں لانے کے لیے آمادہ کردیا۔ اور سننے والوں نے تعجب سے سُنا کہ مولوی خیرالدین صاحب بمبئی آگئے ہیں۔ ۱۳۰۴ھ کے اواخر میں اجمیر، اکبرآباد وغیرہ مقامات کی سیر کرتے ہوئے یہ کلکتہ پہنچے اور حاجی واحد نا جو یہاں کے مشہور رئیس اور والد صاحب کے معتقد تھے، انھیں اپنے گھر لے گئے۔ کلکتہ پہنچے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ میری والدہ یکا یک سخت بیمار ہوگئیں اور بیماری سے دو ہفتے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

والدہ کا انتقال ایسا نہیں تھا جو والد کو نہایت ملول نہ کرتا۔ بہت غمگین رہے، نہایت ملول ہوئے، مکّہ معظّمہ جانے کا ارادہ پھر ہوا، لیکن بعض مذہبی بحثوں کے چھڑ جانے اور والدہ کے مزار کے تیار کرانے کے خیال نے رکاوٹ پیدا کردی۔ انھیں دنوں میں کلکتہ کی بڑی مسجد میں ان کا ہر جمعہ کو وعظ ہوا کرتا تھا۔ لوگ جوق در جوق مرید ہو رہے تھے، ایمانِ آبا و اجدادِ حضرت رسولؐ کی بحث ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی ایک قدیم تصنیف جو اسی موضوع پر لکھی تھی، ترمیم کے ساتھ چھپوانی شروع کردی تھی۔ اور اسی لیے ایک پریس جاری کیا تھا۔ غرض ایسے تعلقات پیدا ہوگئے تھے کہ دوستانِ کلکتہ کو کئی برس تک روکنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اب ضروری ہے کہ میں یہاں اپنا اور بھائی بہنوں کا نقشا درج کردوں، تاکہ آیندہ واقعات ذہن نشین ہوجائیں۔

اولادِ اناث:

خدیجہ: ۱۲۹۱ ہجری سالِ پیدایش

فاطمہ: ۱۲۹۷ ہجری ،،

حنیفہ: ۱۲۹۹ ہجری ،،

اولادِ ذکور:

غلام یاسین: ۱۳۰۱ ہجری

محی الدین: ۱۳۰۳ ہجری (۱)

اس سے تم کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سب سے بڑی اولاد خدیجہ ہے ۱۲۹۱ھ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے جب والدہ کا انتقال ہوا یعنی ۱۳۰۵ھ میں خدیجہ کی عمر چودہ برس کی تھی۔ مگر خدا جانے کیوں، اس زمانے میں شادی نہیں ہوئی اور اس نہ ہونے نے آج وہ فساد اور جھگڑا پیدا کر دیا ہے۔ جس نے میری زندگی تلخ کر دی ہے اور خودکشی پر آمادہ ہوں۔

میری والدہ کے بھائی محمد ہاشم نے مکّہ معظّمہ میں کپڑوں کی ایک دکان کر لی تھی، جو خوب چلتی تھی۔ محمد ہاشم کے تین لڑکے تھے: محمد شفیع، محمد سعید، محمد مکّی، جہاں تک میں نے واقعات سے نتیجے نکالے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ والدہ مرحومہ کا ارادہ تھا کہ وہ تین بہنوں کو انھیں تین لڑکوں کے ساتھ منسوب کریں۔ محمد شفیع اسی خیال سے کلکتہ آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ والدہ کو انتقال کیے دو تین برس ہو گئے تھے اور والد کا رنگ کلکتہ میں خوب جما ہوا تھا۔ محمد شفیع اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوا اور خدا جانے کیوں، والد نے شادی نہیں کی۔ بالآخر وہ ناراض ہو کر اور انتظار کی سخت گھڑیاں کاٹ کر رنگون چلا گیا اور پھر ایسا مفقود الخبر ہوا کہ آج تک کوئی پتا.......... (۲)

حواشی:

(۱) عیسوی کلینڈر کے حساب سے مولانا آزاد اور ان کے بھائی اور بہنوں کے سنین پیدائش بالترتیب یہ ہیں: ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۰ء، ۱۸۸۲ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۶ء

(۲) اسے خط کے بجائے یادداشت برائے رنجور مرحوم کہنا چاہیے۔ القاب و آداب سے معرّیٰ ہے اور خاتمہ بھی روایتی انداز میں نہیں ہوا۔ معلوم نہیں یہ تحریر اتنی ہی تھی یا اس کے بعد بھی کوئی ورق تھا جو ضایع ہو گیا ہو! ایسا ہونا قرین قیاس ہے۔

(۳۷) ﴿۳۹﴾

۲۶ر ستمبر ۱۹۰۳ء، یوم الجمعہ

میرے سچّے دوست، میرے مکرم!

اللہ آپ کو صحتِ کامل عطا فرمائے!...... آمین!

میں کل تقریباً تین بجے آپ کے درِ اقدس کی طرف آ رہا تھا کہ راہ میں حضرت ''منظور'' سے ملاقات ہوگئی۔ فرمانے لگے کہ ان کا حال ویسے ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ اس خبر سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ کیوں کہ میں یہ خیال کر کے آیا تھا کہ آپ کو نہایت صحیح وسالم پاؤں گا اور طبیعت مسرور لے کر واپس آؤں گا۔ لیکن اس خبر نے خلافِ توقع مجھے پریشان کر دیا۔ بہر کیف میں آگے بڑھا کہ ملاقات ہی سے کچھ خوشنودی حاصل کر لوں گا۔ مگر ان سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ آرام کر رہے ہیں۔ ناچار اُنھیں کے ہمراہ واپس چلا آیا۔ پھر آ کر اُنھیں پریشانیوں میں اور اُنھیں افسردہ کن خیالوں میں مبتلا ہو گیا جن میں پہلے مبتلا تھا۔ اور آپ کی ملاقات کو ان خیالات سے رہائی کا ذریعہ سمجھا تھا۔ راہ میں حضرت منظور فرمانے لگے کہ ''کہیے کیسی طبیعت ہے؟ آپ کا چہرہ بہت زرد ہو رہا ہے'' میں نے جواب دیا (اور سوا اس کے اور کیا جواب دیتا) کہ ہاں حضرت زردرُو ہو چلا ہوں۔ دیکھیے سرخ روئی کب نصیب ہوتی ہے! بہر کیف:

کہیے کیسا ہے اب مزاجِ شریف؟

ان شاء اللہ عصر کے وقت حاضرِ خدمت ہوں گا۔

خادمِ احباب

ابوالکلام الدہلوی

(۳۸) ﴿۴۰﴾

مجتے کہ ترا بامنست، می دانم!
ارادتے کہ مرا با تو ہست، می دانی!(۱)

برادرِ شفیق، مکرم دوست! تسلیم

لارڈ ٹینی سن کا قول ہے کہ ''دوست کا خط بیمارِ عشق کے لیے وہ نسخۂ شفا ہے، جس کے استعمال سے مریض صحتِ کلّی پاتا ہے''۔

اگرچہ بادی النظر میں یہ مغربی مبالغہ معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس امر کی تصدیق وہ شخص کرسکتا ہے جو واقعی بیمارِ عشق ہے، اور اس کی بیماری اس امر کی محتاج ہے کہ مسیحائے عشق کوئی مجرب نسخہ لکھ کر عنانیت کرے۔ بیشک آپ کے نسخے مجھ بیمار کے لیے نہایت مفید ہیں، یعنی آپ کے خطوط میرے لیے بہت اچھا اثر پیدا کرتے ہیں۔

پرسوں بوجہ تعطیل تمام دن میں خطوں کی تقسیم کی دو ڈیلوریاں ہوئی تھیں۔ اس لیے آپ کا خط ایک بجے کے قریب پہنچا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو اس کا کس قدر انتظار تھا! سمجھ لیجیے کہ ایک دنیا سے روٹھے ہوئے کا انتظارِ مرگ تھا۔ جس کے لیے اس کا اشتیاق اپنے اشتیاق کی حد سے نکل کر جنونِ انتظار میں قدم رکھے ہوئے ہے۔

مجھے اس ذرا سے بیان سے اپنی محبّت نہیں جتانی ہے۔ کیوں کہ آپ کا دل خود میری کیفیت کا اندازہ کرتا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے عزیز و اقارب کی محبّت اعلیٰ درجے کی محبّت ہوا کرتی ہے۔ مگر جیسا کہ سرسید احمد خان مرحوم مغفور نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے، واقعی ایک سچّی محبّت کے آگے اس محبّت کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔

ہاں! بیشک آپ کی سچّی محبّت عزیز و اقارب کی محبّت سے ترجیح رکھتی ہے۔ میں الحمدللہ اپنے اعزّا کی محبّت کا شاکی نہیں ہوں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بھائی صاحب کی زیادتیاں بعض اوقات میرے دل کے لیے برا اثر پیدا کرتی ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ میرے خیالات اپنے تمام گھر والوں میں اختلافی پہلو رکھتے ہیں، بالخصوص، بعض اصلاحی خیالات، جن کو میں نے سرسید کی تحاریر سے اخذ کیا ہے، بالکل مختلف ہیں اور اسی لیے سوسایٹی کے خوف سے آج تک میں ان کو زبان پر نہیں لایا۔ (ہاں! آپ سے میں نے کچھ ظاہر کیے ہیں اور ظاہر کروں گا)۔ مثلاً پردہ اور تعلیم نسواں، ضرورتِ تاویل در آیاتِ مبحوث فیہ، صحتِ فلسفہ جدید و تغلیطِ فلسفہ قدیم وغیرہ۔ جن پر مجھے امید ہے کہ عندالاظہار نیچریت کا فتویٰ جاری کیا جائے گا

پرسوں ایک صاحب نے تعدد ازدواج کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ قرآن مجید سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بلاضرورت ایک سے زیادہ بی بی کی جائے۔ چوں کہ یہ ایک (حسبِ اعتراضات یورپ) نیا خیال تھا۔ بھائی صاحب اس پر چونک اُٹھے اور لگے کہنے کے پچھلے مفسّرین نے یہ کہیں نہیں لکھا۔ میں نے کہا نحن جہال وہم جہال انھوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ غلطی سہی کیا مضایقہ! مگر اس تعدد ازدواج کے تسلیم کرنے سے جو مہذب یورپ کا اعتراضِ قرآن شریف پر وارد ہوتا ہے اس کا جواب ضروری ہے۔ اس پر انھوں نے صاف آدمیوں میں کہہ دیا کہ یہ خیالاتِ نیچریان اور ملحدانہ ہیں یعنی تو نیچری ہے۔

مجھے اس امر کی کوئی پروا نہیں کہ دس آدمی میرا ہاتھ نہ چومیں گے یا میری پرستش نہ کریں گے، مجھ کو نیچری کہیں گے، بلکہ مجھے اس امر کا افسوس ہوا کہ کہیں اس امر کی خبر والد صاحب کو نہ ہو جائے اور وہ بھی مجھے نیچری نہ سمجھنے لگیں۔ مگر خیر! مجھے اب اس کی بھی پروا نہیں! کتمان حق غیر ممکن ہے۔ اعلانِ حق سے کبھی نہ رکوں گا۔

بہر کیف! میں اپنے خیالات بالا علان اگر کسی شخص پر ظاہر کر سکتا ہوں، تو وہ صرف آپ کی ذات ہے۔ اور اس لیے میں آپ کو اپنے اعزا سے زیادہ مخلص سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کی بہت سمع خراشی کی۔ معاف فرمایئے گا۔ کیا کروں، مجبور ہوں، لاچار ہوں، عالمِ بے اختیاری میں کیا کیا لکھ جاتا ہوں! میری مضامین نویسی کا بھی یہی حال

ہے۔عنوان لکھا ہے اور قلم دوات لے کر بیٹھ گیا۔ جو جی میں آیا، دھر گھسیٹا۔لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔واقعی ان کی یہ عنایت ہے۔

ہمشیرہ صاحبہ، بھابی صاحبہ مدظلہا کی خدمت میں آداب وتسلیم عرض کرتی ہیں۔اُن کی حالت بدستور ہے۔دعا فرمایئے۔ بھابی کا زیادہ حزن وملال واقعی نامناسب ہے، اوران کی ضعیف،علیل حالت کے لیے مضر۔اللہ انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

جناب مولوی محمد شعیب صاحب اور میرے غائبانہ کرم فرما حضرت نبی حسن صاحب کوسلامِ شوق قبول ہو۔حضرت کی غائبانہ عنایت کا ممنون ہوں (۲)۔

آپ کا خادم

ابوالکلام الدہلوی

حواشی:

(۱) یہ شعر رضا علی وحشت کلکتوی کا ہے۔۲۵/جون ۱۹۰۲ء کو جشنِ تاجپوشی کے مشاعرۂ کلکتہ میں اُنھوں نے جو فارسی غزل پڑھی تھی، اس میں سے پہلا منتخب شعر یہی ہے لیکن دونوں مصرعے مقدم و موخر ہیں۔اس غزل کی ردیف ''می دانم'' ہے۔ اس غزل کا مقطع ہے:

بہ وحشت ایں ہمہ لطفش بلا سبب نہ بود
ادائے تازہ دل بردنست می دانم

دیکھیے ! ''جشنِ تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ'' مشمولہ ''ارمغان آزاد'' مولفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۲) مولوی محمد شعیب پر حاشیہ خط نمبر ۱۴ کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ نبی حسن کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑ سکی۔

(۳۹) ﴿۴۱﴾

باسمہ سبحانہ

(اس وقت اور کوئی کاغذ موجود نہ تھا۔اس لیے اس مکلّف کاغذ پر خط لکھ رہا ہوں ورنہ میری عادت ایسی نہیں ہے۔لاتخفی)

(پرائیویٹ)

بحیرتم کہ سر انجامِ من چہ خواہد شد؟

بھائی رنجور!

اگر میں اس امر پر افسوس کروں تو کیا بیجا ہے کہ آپ ایسا شفیق، غم گسار دو مرتبہ عنایت فرمائے اور تشریف لائے اور بد بخت آزاد، نالایق آزاد، خدمت میں حاضر ہو کر ملاقات نہ کرے! پرسوں میں خوابِ غفلت میں پڑا سو رہا تھا کہ خوش قسمتی کی طرح آپ تشریف لائے۔ ہمشیرہ صاحبہ نے اس خیال سے کہ مجھے اُٹھنے میں شاید تکلیف ہو، خواب بدبختی سے بیدار نہیں کیا (واقعی بُرا کیا) اور آپ تشریف لے گئے۔ آج آپ کا پرچہ مجھے بتول نے لا کر دیا۔ میں سویا ہوا تھا۔ آمادہ ہوا کہ حاضر ہوں۔ غنودگی سی آئی، سو رہا۔ اُٹھا تو معلوم ہوا کہ آپ تشریف لے گئے ہیں۔ ہیہات! ہیہات! الاسف! الاسف!

بہر کیف، مجھے امید ہے کہ آپ میری اس مغرورانہ نالایقی کو معاف فرمائیں گے۔ اور اسی نظر ترحم سے، جس سے آپ ہمیشہ میری نالایقیوں کو دیکھا کرتے ہیں اور اسی نظرِ عفو سے جس سے آپ ہمیشہ میری نالایقیوں کو معاف کیا کرتے ہیں، دیکھیں گے اور معاف فرمائیں گے۔ والعذر عند کرام الناسِ مقبول:

اگرچہ آپ نے ابھی تک پوری باتیں نہیں فرمائی ہیں، مگر میں سمجھ گیا ہوں جو کچھ بھائی صاحب نے میرے متعلق فرمایا ہوگا۔ آپ نے خود غور فرمایا ہوگا کہ میرا معاملہ کس قدر پیچیدہ ہو گیا ہے اور کیسی پیچیدگیوں میں، میں گھرا ہوا ہوں!

بحیرتم کہ سر انجام من چہ خواہد شد!

جناب بھائی کی میرے متعلق جو رائے ہے، غالبًا آپ نے اُسے اپنی خداداد فراست سے سمجھ لیا ہوگا۔ مگر میں اسے مختصر یہاں پر لکھ دیتا ہوں۔ پہلے آپ اسے ملاحظہ فرمالیں:

میں (یعنی گنہگار آزاد) نہایت بد اعمال، نالائق، کذاب، بے ادب، بد مذہب نیچری (یا قریب بہ نیچری) بیہودہ، برگشتہ از خاندان، آوارہ، بُرے لوگوں کی صحبت میں رہنے والا، بد معاش (یا قریب بہ بد معاشی)، دشمن خاندان، بدنام کنندۂ خاندان، بے علم وغیرہ وغیرہ۔

یہ ان کا خیال اکثر تقریروں کے ذریعے سے لوگوں پر منکشف ہو چکا ہے۔ وہ بارہا صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں۔

بھائی رنجور! میں ایماناً کہتا ہوں وکفیٰ باللہ شہیداً کہ مجھے اس امر کے ماننے میں ذرہ بھر عذر نہیں ہے کہ واقعی جیسا ان کا خیال ہے۔ میں ویسا ہی ہوں۔ واقعی میں بد اعمال ہوں، (گو قائل کیسا ہی خوش اعمال، پابند صوم وصلوۃ ہو)، نالائق نیچری وغیرہ سب ہوں۔ مگر ہاں! مجھے نمبر ۴ (بے ادب) اور نمبر ۷ (برگشتہ از خاندان) اور نمبر ۸ (آوارہ) اور نمبر ۹ (برے لوگوں کی صحبت میں رہنے والا) اور نمبر ۱۰ (بد معاش) سے انکار ہے۔ میرے دل میں بھائی صاحب اور والد صاحب قبلہ کی جتنی وقعت اور عزت ہے اس سے عالم الغیب جل جلالہ واقف ہیں۔ ہاں! میرے نزدیک ادب عبارت ہے تعظیم قلبی سے، نہ فضول لسانی سے، میں بھائی صاحب کا ہاتھ نہیں چومتا، مگر دل میں انھیں اس تعظیم کے قابل سمجھتا ہوں۔

پس ان کے خیال میں گو میں کیسا ہی بے ادب کیوں نہ ہوں۔ مگر میں ہرگز بے ادب نہیں ہوں۔ نمبر ۷ اور نمبر ۸ اور نمبر ۹ کا خیال بیشک ان کا میرے لیے بہت آزاردہ ہے۔ میں نے آج تک بد معاشوں کی صحبت سے احتراز کیا ہے۔ غلطی سے کسی بد معاش سے ملاقات ہوئی اور بعد کو اس کی حالت معلوم ہوئی، تو متنبہ ہو گیا۔ میری حالت اور میرے کیرکٹر سے جو واقف ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ مجھ پر جو رنگ کہ چڑھنے والا تھا، چڑھ گیا۔ اب کسی کی صحبت سے کوئی رنگ نہیں چڑھ سکتا، چاہے کوئی کیسا ہی بد معاش ہو۔ ان شاء اللہ اس کے لغو خیالات کا مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا۔ ہاں!

بھائی صاحب اور عرب صاحب (۱) نے جو اصول بد معاش کے لیے مقرر کیے ہوئے ہیں، ان اصول کے موافق میں، بیشک بد معاشوں سے ملتا ہوں۔ مگر جب ان اصولوں کی صحت معرضِ بحث میں ہے، تو پھر میں کیوں کر اس امر کو تسلیم کرلوں کہ واقعی وہ علم دوست اشخاص بد معاش ہیں۔

الغرض بھائی صاحب کے خیالات تو میرے متعلق ایسے ہیں اور اس پر انھیں پورا بھروسا ہے۔ اب آپ بتلائیں کہ میں ایسے موقعے پر کیا کروں؟ جن قابل لوگوں سے میں ملتا ہوں، وہ بد معاشی کا ان پر فتویٰ چلاتے ہیں۔ اب ان سے ملنا کس طرح ترک کروں؟

میں چار دن سے اسی فکر میں پریشان ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ جس سے یہ روز کی زق زق بق بق بند ہو! میں نے اب یہ ارادہ کرلیا ہے کہ میں زیادہ باہر آنا جانا، جو ان حضرات (بھائی صاحب اور عرب صاحب) کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ ترک کردوں، اور سوائے اس پرانے معمول کے کہ بعد عصر مسجد یا اور کہیں تفریحاً چلے جانا، اور کہیں آؤں جاؤں نہیں! شاید اسی سے اُن کے خیالات کچھ کم ہو جائیں اور مجھے کچھ دنوں کے لیے اطمینان نصیب ہو۔ زیادہ نہ کسی سے ملوں، نہ جُلوں اور اگر ملوں بھی تو وہ بھی شام کو بعد العصر۔ وہاں کی نشست بھی ترک کردوں۔

اب آپ فرمائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر آپ کے نزدیک واقعی یہ مناسب ہو تو میں اس پر عمل کروں! میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اب مجھے جس قدر آپ پر بھروسا ہے اور جس قدر آپ کی بات پر اعتبار ہے اور کسی پر نہیں ہے۔ گو وہ کیسا ہی کیو ں نہ ہو۔ اس لیے آپ کوئی صورت ارشاد فرمائیں، یا اسی صورت پر قلم صحت کھینچ دیں، تاکہ میں اسی پر عمل کروں۔ مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ باقی رہے میرے ذاتی خیالات، تو اس کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ میرے افعال اور روش پر کچھ دنوں تک کوئی پہرہ بٹھا سکتا ہے۔ مگر خیالات پر کوئی اختیار نہیں کرسکتا۔

خط بہت لمبا چوڑا ہو گیا۔ کاغذ بھی قریب الاختتام ہے۔ کل آفس سے واپسی کے وقت تشریف لایئے میں منتظر رہوں گا۔ آپ آتے ہی اطلاع دیجیے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر اس تحریر کا جواب تحریر ہی میں دیا جائے۔ خط آپ خود ساتھ لیتے آئیں۔ اگر کل لکھا جائے۔ نہیں تو پھر بالمشافہ گفتگو ہو رہے گی، خط پھر لکھ دیجیے گا۔

باقی عند الملاقی

ابوالکلام آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے برادر نسبتی (بہنوئی) معین الدین عرب صاحب بھی مذہبی عقاید اور روایتی اعمال کے اُسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، جو مولانا کے والد ماجد اور برادر کا معروف رنگ تھا۔

(۴۰) ﴿۴۲﴾

باسمہ

برادرم!

رات بھائی صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے کالون صاحب سے پیشگی ما (سو روپیہ) منگوانے کی رائے قایم کی ہے۔ اول تو سو روپے سے نہ پریس خریدا جا سکتا ہے اور نہ لوازماتِ پریس۔ پھر اس پر آپ کی یہ رائے کہ ۲۵/ روپے کا ایک سب ایڈیٹر ملازم رکھ لیا جائے، ایک سربستہ معما ہے، جسے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے ممکن ہے کہ صاحب بجائے اس کے کہ قبول کرے، اور زیادہ بھڑک جائے۔ اور یہ اور خرابی کی بات ہو۔ کیوں کہ پیشگی روپے منگوانے کا خیال اور طرح اس کے ذہن نشین ہو۔ اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر کہیے گا۔ اگر آپ کو امید قوی ہو کہ صاحب روپے بھیج دے گا، اور اگر نہ بھیجے گا تو ناراض نہ ہوگا، تو بلا تکلف پیشگی روپے منگوا لیں اور نہیں تو بنے ہوئے کام کا بگاڑنا اور لغو ہے۔ اس لیے یہ خط لکھتا ہوں کہ آپ اس مسئلے پر توجہ

کر لیں۔

روپے جاتے ہیں، وصول کیجیے، تعویق معاف، ہاں! اگر آپ مناسب سمجھیں تو بلا تکلف پیشگی منگوالیں۔ بہت مناسب ہے، مگر صلا نہ شد بلا شد" کا مضمون نہ پیش آئے (۱)۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) خط کے مضمون سے کسی متعین واقعے پر روشنی نہیں پڑتی۔ اس خط پر تحریر کی تاریخ و سنہ بھی درج نہیں۔ لیکن تالیف مضمون اور پختگی قلم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خط بالکل ابتدائی دور کا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ۱۹۰۳ء کے آخر کا ہے اور لسان الصدق کے اجرا کا منصوبہ زیر بحث ہے۔

(۴۱) ﴿۴۳﴾

باسمہٖ سبحانہ

بمبئی، بلاسس روڈ، پوسٹ بائی کلّہ نمبر ۱۳

دفتر الہلال (۱)

برادرم!

کل پرچے پہنچے۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے لیے سخت افسوس اور رنج کا باعث ہوئے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ میں محنت اور جگر کاوی سے پرچہ ترتیب دوں۔ آپ ایسا عدیم الفرصت شخص اپنا وقت صرف کرے۔ روپے پر روپے دیے جائیں۔ مگر جب چھپ کر نکلے تو ہر شخص کی زبان سے سوائے نفرین کے اور کچھ سننے میں نہ آئے! یہاں جس نے دیکھا، نہ مضامین پر توجہ کی نہ ترتیب کی داد دی بلکہ اس کی ظاہری بھونڈی صورت پر نفرین کا تحفہ پیش کیا۔ میرے سامنے تمام کاپیاں اچھی لکھی ہوئی تھیں۔ میرے آنے کے بعد خدا کی پھٹکار ہو گئی اس قدر خراب چھپیں۔ سب قصور چھپائی اور اصلاحِ سنگ کا ہے۔

ایک رسالہ بھی ان پندرہ رسالوں (۲) میں ایسا نہیں نکلا، جس کی چھپائی سوا ایک دو صفحہ کے چھن نہ گئی ہو۔ اور یہ رسالہ تو اس قدر لغو چھپا ہے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ افسوس ہے کہ منشی ہدایت اللہ صاحب (۳) ٹھیک ٹھیک کام نہیں کرتے۔ اب زیادہ لفظ اور کیا لکھوں! آپ اُن کو میرا یہ خط دکھلایئے اور خود ان سے انصاف کے طالب ہویئے کہ کیا ہمارے کھرے روپوں کے بدلے ایسا کھوٹا کام ہونا چاہیے؟

یہاں ایک پریس ہے: مطبع ناصری میرزا محمد کردی ''ملک الکتاب خان صاحب'' اس کے پروپرائٹر ہیں۔ انھوں نے مصری ٹائپ منگوا کر ترمیم کے ساتھ پریس جاری کیا ہے۔ میں اُن سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اُجرت زیادہ مانگتے ہیں۔ اس لیے ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ اگر گفتگو مناسب ہوئی تو یہیں چھپواؤں گا۔ گو مقام اشاعت کلکتہ ہی رہے گا۔ بات یہ ہے کہ آپ سے اچھی طرح صحتِ رسالہ کا انتظام نہیں ہوسکتا اور آپ اس میں مجبور بھی ہیں۔ اس رسالہ میں بھی غلطیں ہیں، جن سے میرے دل کو کوفت ہوتی ہے۔ اس لیے اگر یہاں بمبئی میں انتظام ہو گیا، تو بہتر ہوگا۔ رجسٹر وغیرہ سب آپ کے پاس رہے گا۔ پرچے چھپ کر کلکتہ اور وہاں سے اور مقامات میں پہنچیں گے۔

اور اگر دو دن کے اندر گفتگو مناسب نہ ہوئی تو مضامین وغیرہ سب آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ لیکن منشی ہدایت اللہ صاحب کو میرا یہ خط یہاں تک ضرور دکھلا کر، انصاف کے زور پر فہمایش کر کے اور کام پڑ جانے کی وجہ سے عاجزی بھی کر کے سمجھایئے اور کہیے کہ آپ تھیٹر کے اشتہار جیسے چھاپتے ہیں کاش ویسا ہی پرچہ چھاپ دیں۔

آپ کے خطوط پہنچے۔ میں آپ کو کل تین کارڈ، ایک خط پنسل سے لکھ چکا ہوں۔ پہلا کارڈ ناگپور اسٹیشن سے لکھا تھا۔ خدا جانے آپ کو پہنچا بھی یا نہیں! افسوس ہے کہ آپ نے روپوں کے بھیجنے میں دیر کی اور آخر مجھے تار دینا پڑا۔ بلا اشد ضرورت کے میں کبھی نہ لکھتا۔ آپ نے جو کچھ یقینی نہ لکھا، اسے میں سمجھا ہوا ہوں لیکن اشد اور اٹل ضرورت کی وجہ سے میں نے لکھا تھا، آپ نے دیر کی اور مجھے اس کی وجہ سے سخت دقت

اور ندامت، خفت ہوئی۔ خیر آپ بھی معذور ہیں۔ آپ کی ہمدردی کا مشکور ہوں۔

میں نے خط آپ کو اس لیے اتنے دنوں کے بعد لکھا کہ میں ایک ہفتہ سے بیمار تھا۔ بخار موسمی ہو گیا تھا۔ کل سے طبیعت اچھی ہے۔ آج آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

جون کے لیے ایک مضمون کی اور ضرورت ہوگی۔ اس لیے کہ محمد شفیع نے ابھی تک نمبر ۲ نہیں بھیجا (۴)۔ آپ کو تکلیف قطعی ہوگی۔ آپ عدیم الفرصت ہیں، لیکن مجبوری ہے۔ اس لیے اس نمبر کے لیے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا سے کوئی تاریخی یا علمی مضمون ترجمہ یا ملخص کیجیے۔ تین ورق سے کم نہ ہو۔ انسائیکلو پیڈیا کی تخصیص نہیں، کسی انگریزی عمدہ مضمون کا ترجمہ ضرور ہو۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور یہ کام کیجیے گا۔

مندرجۂ سرنامہ مستقل پتا نہیں ہے میں نے جو الگ کمرہ لیا ہے، اس کا نمبر ابھی نہیں قرار دیا گیا، چوں کہ کامل تیار نہیں ہوا ہے۔ اُسی کے پاس یہ بلڈنگ ہے، جس کا پتا لکھتا ہوں۔

الہلال، یہاں سے ایک گجراتی انگریزی رسالہ نکلتا ہے۔

''لسان الصدق'' کا ایک نمبر جون شمس الہدیٰ صاحب (۵) کے پاس بھیجیے۔ حافظ عبدالرحمٰن (۶)، محمد شفیع وغیرہ کے پاس تو آپ نے بھیج دیا ہوگا! بالخصوص حافظ صاحب کے پاس ٹائیٹل پر کتابوں کی قیمت لکھ کر۔

ایک پرچہ ان کے نام بھیجیے، مفت: مولوی حسن نظامی دہلوی (۷) مہتمم توشہ خانۂ درگاہِ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی۔ دہلی۔

سب کی خدمت میں دعا و سلام پہنچائیں۔ آپ نے ''سفینۂ طالبی'' کا دوسرا حصہ نہیں بھیجا۔ وہ بھی آپ ہی کے پاس ہے۔ جلد روانہ فرمائیں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی

(۱) اس خط پر تاریخ درج نہیں، لیکن اس میں خراب طباعت کے سلسلے میں منشی ہدایت اللہ سے شکوۂ عدم توجہ ہے۔ لسان

الصدق جولائی ۱۹۰۴ء کے شمارے تک انھیں کے پریس میں چھپا تھا۔ یہ خط جون جولائی ۱۹۰۴ء کے پرچے کی اشاعت سے پہلے اور مئی ۱۹۰۴ء کے پرچے کی اشاعت کے بعد کا ہے۔ جون جولائی کا پرچہ اس وقت تک تیار نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے محمد شفیع کے مضمون کی دوسری قسط کا انتظار تھا۔ مزید یہ کہ ۲۵/ جون سے پہلے کا ہے۔

(۲) پندرہ رسالوں سے مراد یہاں زیرِ نظر اشاعت کے پندرہ نسخے ہیں جو مولانا آزاد کو کلکتہ سے بمبئی بھیجے گئے تھے۔

(۳) منشی ہدایت اللہ۔ ہادی پریس کلکتہ کے مالک تھے۔ لسان الصدق شمارہ اول (۲۰/ اکتوبر ۱۹۰۳ء) سے لے کر جون جولائی ۱۹۰۴ء تک انھیں کے پریس میں چھپا تھا۔ اس کے بعد اگست ستمبر ۱۹۰۴ء کا شمارہ مطبع فیض رساں، بمبئی اور آخری شمارہ لسان الصدق جو اپریل مئی ۱۹۰۵ء کا مشترکہ شمارہ ہے۔ مفید عام پریس، آگرہ میں چھپا تھا۔

(۴) ایس۔ ایم۔ شفیع پہلے مسلمان تھے جو صنعتی تعلیم کے لیے جاپان گئے۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں جب مولانا آزاد نے پنجاب کا سفر کیا تھا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے قریبی زمانے میں جاپان سے فراغت تعلیم کے بعد فائز المرام واپس آئے تھے۔ پیسہ اخبار میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولانا سے ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک مضمون لسان الصدق میں اشاعت کے لیے عنایت کیا تھا۔ یہ مضمون ''ایشیا (بیسویں صدی میں) اور ہندستان و جاپان کے تعلقات'' کے عنوان سے مئی ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ اس کا پہلا نمبر تھا۔ اس کی دوسری قسط ابھی نہیں آئی تھی۔ پہلے اس کا انتظار تھا۔ اب تاخیر ہوئی تو رسالہ میں جگہ پُر کرنے کے لیے کسی دوسرے مضمون کی تلاش ہوئی۔

(۵) شمس الہدیٰ، نواب سر (۱۸۶۲ء۔ ۱۹۲۲ء) ابن سید ریاضت اللہ ایڈیٹر دور بین۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے ایم اے کیا، مدرسۂ عالیہ کے استاد ہوئے پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا، وایسرائے کی کونسل کے ممبر بنے (۱۹۱۰ء) مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے (۱۹۱۲ء)، بنگال کونسل کے ممبر رہے (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۱۷ء)، مشرقی بنگال کے پہلے مسلمان جج کلکتہ ہائی کورٹ مقرر ہوئے (۱۹۱۷ء۔ ۱۹۲۱ء)۔ تفصیل کے لیے دیکھیے Muslims in India-A Biographical Dictionary, Vol.II از نریش کمار جین۔

(۶) حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ۱۸۴۰ء میں ضلع ڈ نگے بار تحصیل کھاریاں ضلع جہلم میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں امرتسر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا سفر نامۂ بلادِ اسلامیہ (م ۱۸۹۸ء، امرتسر) بہت مشہور ہے۔ ۱۹۰۴ء میں جب مولانا انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے تو ان سے لاہور، امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی۔ حافظ صاحب کی تین کتابوں کے اشتہار لسان الصدق میں ایک سے زیادہ بار چھپے ہیں۔ یہ کتابیں ''کتاب النحو اور عربی بول چال'' ہیں۔ ۱۹۰۵ء مولانا ابوالنصر غلام یاسین آہ ممالک اسلامیہ کے سفر پر انھی کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن حافظ صاحب حق رفاقت ادا کرنے سے قاصر رہے۔ مولانا آزاد کو اس کا ملال تھا۔ ۱۹۰۷ء میں امرتسر میں حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

(۷) خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۵۵ء) اردو کے مشہور ادیب، انشا پرداز، صحافی، بہت سی کتابوں کے مصنف، صوفی، شیخ طریقت کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

(۴۲) ﴿۴۴﴾

موجودہ صحیح پتا: بمبئی بلاسس روڈ، نیو بلڈنگ، پوسٹ بائی کلہ

۲۵/جون ۱۹۰۴ء(۱)

برادرم!

بڑے انتظار کے بعد روپے پہنچے۔ پہلے میں نے بے شک بلا ضرورت منگوائے تھے، مگر پھر میں نے دایرۂ معارف خرید لی اور روپے کے لیے تار بھیجا۔ خطوط نہ بھیجنے کی اصل وجہ میری علالت ہے۔

میں ابھی ہرگز پسند نہیں کرتا کہ لسان الصدق میں نظم کا حصّہ شروع ہو۔ آپ کو ذرا اور انتظار کرنا تھا۔ خیر، اب بھی اس نظم ''انگریزی لباس'' کی کاپی نکال دی جائے۔ ہرگز شایع نہ کیجیے۔ رسالے کی ایک مخصوص روش رہنے دیجیے۔ مضامین بھیجتا ہوں۔ صحت کا اللہ خیال کیجیے!

''جرایم پیشہ'' مضمون میں ہر جگہ بلا استثنا یاے مجہول ملتی ہے۔ آپ منشی صاحب کو کہہ دیں کہ وہ اس کا خیال رکھیں۔ اور موقع پر معروف بنا دیں۔ یہ سچ ہے کہ آپ کو فرصت نہیں ہے۔ مگر ذرا میری خاطر تکلیف گوارا کیجیے۔ ایک مختصر عربی مضمون ''السعادت والعلم'' بھیجتا ہوں۔ اس کا صاف ترجمہ کر کے درجِ رسالہ کر دیجیے۔ عنوان عربی ہی کا رہے۔ ترجمہ مثل مضمون کے ہو۔

حافظ عبدالرحمٰن کی رسالہ کے ٹائیٹل پر ''کتاب النحو'' کے ۵/(آنے)، ''صرف'' کے ۸/ ''بول چال'' کے ۸/ بنا کر چھپے۔ امرتسر ہال بازار؛ دفتر وکیل، مسٹر ایس ایم شفیع کو ارسال کیجیے اور نیز ان دو پتوں پر:

۱۔ امروہہ، محلّہ پیرزادگان، مولوی سید شاہد حسین اثیم امروہوی(۲)

۲۔ دہلی، درگاہ حضرت نظام الدین، مولوی حسن نظامی صاحب مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی۔

کاپی پروف کو دو تین مرتبہ دیکھیے۔ صحت کا خیال ضروری ہے۔ بغرضِ مبادلہ ان لوگوں کو پرچہ بھیجیے:

ا۔ ایڈیٹر رسالہ محبوب الکلام، دبدبۂ آصفی، افضل گنج، حیدر آباد (۳)

۲۔ لکھنو، گولہ گنج۔ ایڈیٹر ''الحکم'' (۴)

۳۔ ایضاً، الندوہ دار العلوم ندوۃ العلماء

کارڈ لکھیے۔ منیجر کی طرف کہ ریویو و مبادلہ کیجیے۔ باقی پھر

ابوالکلام

حواشی:

(۱) اس خط پر ۲۵ رجون کے ساتھ سنہ تحریر درج نہیں۔ لیکن اس میں ''جرائم پیشہ اقوام'' اور ''السعادت والعلم'' جن دو مضمونوں کی تصحیح اور ترجمے کا ذکر آیا ہے۔ وہ دونوں مضمون جون جولائی ۱۹۰۴ء کے لسان الصدق میں چھپے ہیں۔ اس لیے یہ قطعی طور پر فیصلہ ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۹۰۴ء کی ۲۵ رجون ہے۔

(۲) سید شاہد حسین اثیم امروہوی، کے حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ ان کا ایک مراسلہ الہلال میں نظر سے گزرا ہے۔

(۳) دبدبۂ آصفی ۱۸۹۸ء سے اور محبوب الکلام ۱۸۹۹ء سے شائع ہونے شروع ہوئے تھے۔ دونوں کے مالک اور سرپرست مہاراجہ سرکشن پرشاد تھے۔ دبدبۂ آصفی کے ایڈیٹر پنڈت رتن ناتھ سرشار اور محبوب الکلام کے ایڈیٹر حافظ جلیل حسن مانک پوری تھے۔ دونوں ماہنامے تھے۔ اول الذکر علمی ادبی رسالہ تھا اور ثانی الذکر گلدستہ تھا۔ دبدبۂ آصفی کے لکھنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگِ آصفیہ جیسے اہل علم تھے۔ جب کہ محبوب الکلام میں وقت کے مشاہیر شعرا کا کلام چھپتا تھا۔

(۴) مجھے یقین ہے کہ ''الحکم'' مولانا آزاد کے قلم سے سہواً نکلا۔ اس نام کا کوئی رسالہ لکھنو سے نہ نکلتا تھا۔ بلکہ قادیان سے نکلتا تھا۔ لکھنو سے اس زمانے میں ''البیان'' کے نام سے عربی اردو کا ذولسانی، مولانا عبداللہ عمادی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے منیجر مولانا عبدالوالی تھے۔ یہ ماہنامہ ۱۹۰۲ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۰۶ء سے اسے پندرہ روزہ کر دیا گیا تھا۔

اگرچہ یہ رسالہ ۱۹۰۸ء تک نکلتا رہا لیکن مولانا عبداللہ عمادی اس سے بہت پہلے اسے چھوڑ کر جون ۱۹۰۵ء میں الندوہ (لکھنو) سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن الندوہ میں وہ چار ماہ سے زیادہ نہ رہے۔ ستمبر تک وہ وکیل امرتسر میں چلے گئے تھے۔ الندوہ میں ان کی جگہ مولانا آزاد آ گئے تھے۔ عجیب اتفاق کہ مولانا نے الندوہ چھوڑا تو مولانا عمادی مرحوم وکیل چھوڑ

کر زمیندار لاہور میں جا چکے تھے وکیل میں مولانا آزاد نے ان کی جگہ سنبھالی۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ ''الحکم'' کی جگہ ''البیان'' ہونا چاہیے یا کوئی اور رسالہ۔

(۵) الندوہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کا علمی رسالہ تھا۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ مطابق جولائی راگست ۱۹۰۴ء میں شاہجہان پور سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اور صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی (۱۸۶۶ء۔۱۹۵۰ء) اس کے ایڈیٹر تھے اور مددگار ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم سید عبدالحی (۱۸۶۹ء۔۱۹۲۳ء) اس کے ناظم و مہتمم تھے۔ ۱۹۰۵ء میں الندوہ کا دفتر بھی لکھنو منتقل ہو گیا۔ مقام اشاعت پہلے بھی لکھنو ہی تھا۔

۲۵ رجون ۱۹۰۴ء کو جب مولانا آزاد نے الندوہ سے مبادلے کے لیے خط لکھوایا تھا اور لسان الصدق اس کے نام بھیجا تھا تو اس وقت الندوہ کی اشاعت کا صرف اعلان ہی چھپا تھا۔

(۴۳) ﴿۴۵﴾

ممبئی، بلاسس روڈ۔ پوسٹ بائی کلہ۔ نیو بلڈنگ

۷ رجولائی ۱۹۰۴ء

برادرم!

آپ کے تمام خطوط اور اخبارات مجھے ٹھیک ٹھیک وصول ہو رہے ہیں۔ مادۂ تاریخ بھی وصول ہوا (۱) اور ارجنٹ خط کا جواب بھی۔ میں کچھ ایسا خبطی ہوں کہ آپ کو ان خطوط کی رسید نہ بھیج سکا۔ آپ اطمینان رکھیں اور اسی پتے پر خطوط بھیجا کریں۔ ریویو وغیرہ کل مع ایک مفصّل خط کے ارسال ہوگا۔ ٹائیٹل ایک ہزار چھپ کر براہِ راست کلکتہ پہنچے گا (۲)۔ بھائی صاحب سے بوجوہ چندہ نہ وصول ہوا، نہ میں نے اصرار کیا۔

ہاں! روپے کل لکھنو بھیج دوں گا۔ میری طرف سے سب کو سلام کہیے۔

جنھوں نے ویلیو واپس کیے ہیں، ان کا پتا لکھیے۔

ابوالکلام (۳)

مولوی محمد یوسف صاحب جعفری

۱۶۔ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

حواشی:

(۱) مادۂ تاریخ سے مراد وہ قطعہ تاریخ ہے جو خواجہ الطاف حسین حالی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے پر مولانا رنجور مرحوم نے بہ طور ہدیۂ تبریک کہا تھا۔ اور مولانا آزاد کے شذرے میں چھپا ہے۔ فارسی میں یہ پانچ شعر کا قطعہ ہے۔ تاریخ کا شعر یہ ہے:

رنجور بگفت از سر وجد

+۶

صد شکر رسیدہ حق بحقدار

۱۳۱۶=۱۳۲۲ھ

(۲) جون جولائی اور اگست ستمبر ۱۹۰۴ء کے شماروں کے ٹائٹل پیج منشی نوبت رائے نظر کے ذریعے آصفی پریس، نواز گنج، لکھنؤ میں چھپے تھے۔ اگلے خط میں اس طرف اشارہ ہے۔

(۳) اس خط پر تاریخ تحریر ۷؍ جولائی کے ساتھ سنہ درج نہیں ہے۔ لیکن بائی کلّہ (بمبئی) کے پوسٹ آفس سے خط کی روانگی کی مہر میں ۸؍ جولائی ۱۹۰۴ء صاف پڑھا جاتا ہے۔

(۴۴) ﴿۴۶﴾

باسمہ سبحانہ

بمبئی (۱)

۱۴؍ جولائی ۱۹۰۴ء

برادرم!

عنایت نامہ مع اخبارات پہنچا۔ شکایت بجا ہے۔ لیکن غالباً آپ کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ میں ایک ہفتے سے پھر بخار میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اب طحال کی شکایت نہیں ہے، صرف بخار ہے۔

میں اب یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جون جولائی کے ملا کر ایک ساتھ نمبر شائع کر دیے جائیں (۲)۔ تاکہ یہ کمی پوری ہو جائے۔ اور کوئی صورت نہیں ہے۔ ۳۲ صفحے غالباً ہو گئے ہوں گے؟ حساب سے ۲۴ چاہییں۔ ریویوز اور ایک مضمون بھیجتا ہوں، انھیں

بھی درج کر دیجیے۔ آج ایک کارڈ نوبت رائے (۳) کو لکھا ہے کہ ٹائیٹل جلد بھیجو۔ روپے میں نے اپنے پاس سے دے دیے ہیں۔ صَرف کے متعلق اطمینان رکھیے۔ اگر نہ ہوا تو میں خود روپیہ بھیج دوں گا۔ ٹائیٹل پر صرف (بابت جون جولائی) لکھ دینا کافی ہے۔

صحت کا خیال رکھیے، اور ہاں! کتابیں پہنچیں۔

اگر ممکن ہو، تو ''اصولِ زندگی'' چار صفحے (۴) اور دے دیجیے تا کہ حساب دو ماہ صاف ہو جائے۔

ابوالکلام

جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری

۱۶۔ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

حواشی:

(۱) یہ خط بائی کلّہ بمبئی کے ڈاک خانے سے روانہ کیا گیا۔ ڈاک خانے کی مہر میں تاریخ روانگی ۱۵ر جولائی صاف پڑھی جاتی ہے۔

(۲) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲ر جون کا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا۔ اب یہ غور کیا جا رہا ہے کہ اسے جون اور جولائی کا مشترکہ شمارہ کر دیا جائے۔

(۳) نوبت رائے نظرؔ (۱۸۶۷ء۔۱۹۲۴ء م) مالک وایڈیٹر ماہنامہ ''خدنگ نظر'' لکھنو مراد ہیں۔ جون جولائی کے لسان الصدق کا ٹائیٹل لکھنو میں انھی کی معرفت چھپوایا تھا۔

(۴) سرجان لیک کی کتاب [The Use of Life] کا ترجمہ ''اصولِ زندگی'' (معاشرانہ زندگی) کے عنوان سے مولانا رنجور مرحوم نے کرنا شروع کیا تھا اور مئی ۱۹۰۴ء سے لسان الصدق میں چھپنا شروع ہوا تھا لیکن جون جولائی ۱۹۰۴ء میں دوسری قسط کے بعد اس کی کوئی قسط شائع نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں وہ ترجمہ نہ کر سکے یا لسان الصدق میں جگہ نہ نکل سکی۔

(۴۵) ﴿۴۷﴾

13, Blasis Road
P.O. Byculla,
Mombay
۴؍جولائی ۱۹۰۵ء

برادرم!

اس وقت تک میں کس حال میں رہا؟ کس حال میں ہوں؟ آپ کن علایق میں پھنسے ہوئے ہیں اور کن مصیبتوں میں تھے؟ پہلے دو سوالوں کے جواب کی اب ضرورت نہیں اور آخری سوال کا جواب مدت سے معلوم ہے۔ منشی رضاء الحق سے سب کچھ معلوم ہوتا رہا۔ اور شاید آپ کو بھی کچھ معلوم ہوا ہو (۱)۔ ۱۵؍اپریل کو پنجاب روانہ ہوا تھا۔ اور دو ماہ کے بعد ۳۰؍مئی کو ممبئی پہنچا۔ یہاں پہنچ کر ایک واقعے نے سخت صدمہ پہنچایا، جس کا اثر اب تک ہے اور شاید مدت تک رہے گا۔ اس واقعے کی آپ کو مجھ سے پہلے اطلاع پہنچ گئی ہوگی۔

''لسان الصدق'' اپریل سے پھر شایع کیا گیا۔ تمام خریداروں کے پاس مدت سے پہنچ چکا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اور خریدارانِ کلکتہ کے پاس اب تک نہیں بھیجا گیا۔ آج پیکٹ رجسٹرڈ بھیجتا ہوں۔ تمام خریداروں کے پاس بھیج دیجیے۔ مولوی عبدالباری صاحب وغیرہ معززین کے لیے درجہ اول بھیجتا ہوں۔ جس کی قیمت تین روپے چھ آنے ہے۔ نومبر میں یہ سب کلکتہ والے خریدار ہوئے تھے اور بارہ پرچوں کے حساب سے اس نمبر پر سال ختم ہو جاتا ہے۔ درجہ دوم کی قیمت دو روپے چھ آنے ہے۔ براہِ خدا کوشش کر کے قیمت جمع کیجیے۔ وحشت (۲)، اکمل (۳) وغیرہ کو کہیے کہ اگر فیس ماہوار نہیں دیتے اور نہیں دے سکتے تو خیر، انھیں گذشتہ جون کے بعد سے کچھ نہیں دیا گیا۔ اب اتنی عنایت کریں کہ ۱۲ روپے سالانہ کی جگہ چھ روپے نہیں، تو تین روپے چھ آنے منظور کرلیں اور درجہ اول کی قیمتیں دے دیں۔ امید ہے کہ وصول ہو جائے

گی۔ مولوی عبدالباری وغیرہ سے درجہ اول کی قیمت وصول کیجیے، باقی جو دیں۔ اس نمبر پر انسٹھ روپے بارہ آنے خرچ ہو چکے ہیں۔ علاوہ صرفِ محصول وغیرہ۔

روپیوں کی ضرورت اور بے حد ضرورت ہے، اگرچہ یہ کہتے ہوئے اور رسالہ کا معاملہ ڈالتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے کہ مدت کے بعد سر نکالا، تو اپنی غرض کے لیے۔ بہرکیف جو کچھ ہو، حالت یہ ہے۔ میری کتابیں بیچ دیجیے۔ کچھ قیمتیں وصول ہو جائیں، تو محصول ان سے لے کر لگا دیجیے گا، سرِ دست ذیل کی چار کتابوں کی بے حد ضرورت ہے۔ انھیں خط دیکھتے ہی روانہ کر دیجیے:

۱۔ الملل والنحل: عبدالکریم شہرستانی، مطبوعۂ یورپ۔ مجلد

۲۔ ایک عربی کتاب ضخیم، مصر کی چھپی ہوئی جس کا مصنّف رفاعہ افندی ہے اور غالباً جغرافیہ یا علمِ طبقات الارض میں ہے۔ مجلد

۳۔ رسالہ التوحید: عربی، مطبوعہ مصر، چھوٹی تقطیع، غیر مجلد، زرد کاغذ پر چھپا ہے۔

۴۔ المقدّمہ: عربی، مطبوعہ علی گڑھ، مجلد، مصنّفہ مولوی کرامت حسین صاحب، الٰہ آباد سے ٹائپ پر چھپا ہے۔

والسلام

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) منشی رضاء الحق عباسی احمد آبادی حضرت رنجور کے خردوں اور مولانا آزاد کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی شادی کے تین قطعات حضرت رنجور کی بیاض میں موجود ہیں۔ پہلا قطعہ چھ شعر کا ہے۔ آخری دو شعر یہ ہیں:

لکھوں کوئی اچھی سی تاریخ عقد
مرے دل میں جب آ گیا یہ خیال
دلِ وجد سے کلکِ رنجور نے

+۳

لکھا ''زہرہ و مشتری کا وصال''

۱۳۲۱ = ۱۳۲۴ھ

دیگر دو قطعے چار چار شعر کے ہیں۔

۱۳۲۴ ہجری، عیسوی تقویم میں ۲۶ فروری ۱۹۰۶ء سے شروع ہو کر ۱۴ فروری ۱۹۰۷ء کو ختم ہوتا ہے۔ رنجور مرحوم نے انھیں ''احمد آبادی'' لکھا ہے۔

(۲) وحشت کلکتوی (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۵۶ء) سید رضا علی نام تھا۔ مدرسۂ عالیہ۔ کلکتہ سے ۱۹۰۸ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۹۶ء میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں کلکتہ کی ادبی محفلوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ شمس کلکتوی (ف ۱۹۰۵ء) سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ وحشت اپنے وقت کے بڑے غزل گو شاعر تھے۔ ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ دیوانِ وحشت ۱۹۱۰ء کلکتہ) اور ترانۂ وحشت (۱۹۵۲ء لاہور) ان کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

انھوں نے اپنے پیچھے بہت سے شاگرد بھی چھوڑے ہیں۔

مولانا آزاد سے بہت قریبی دوستانہ تعلقات اس وقت سے تھے جب مولانا نے ادبی زندگی میں قدم رکھا تھا اور مشاعروں میں شرکت شروع کی تھی۔ لسان الصدق کے اپریل ۱۹۰۴ء کے نمبر میں ان کا ایک مضمون ''مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ الہلال کے صفحۂ ادبیات میں وحشت کی ایک فارسی غزل بھی مولانا نے شائع کی تھی، جس کا مقطع یہ ہے:

سخن از لذتِ وصل و شرابِ عیش می گوید
بقتلِ وحشتِ شوریدہ سر فرمودۂ گویا

(۶ راگست ۱۹۱۳ء، ص ۱۳)

الہلال ۱۹۱۴ء میں مئی سے لے کر جولائی تک کی سات اشاعتوں میں دیوان وحشت کا اشتہار نظر سے گزرا ہے۔

''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں مولانا نے ان کا ذکر ایک دوست کی حیثیت سے کیا ہے۔ ڈاکٹر وفا راشدی نے جو حضرت وحشت کے شاگرد اور مولانا کے عقیدت مند ہیں، دونوں بزرگوں کے دوستانہ روابط پر ایک مضمون لکھا ہے جو ''معاصرین ابوالکلام آزاد'' (مرتبۂ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری) میں شامل ہے۔

(۳) اکمل کلکتوی (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۴۳ء) اکمل علی نام تھا۔ انگریزی، فارسی اور اردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ شمس مرحوم کے شاگرد اور اچھے شاعر تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی گرامر میں ان کی ایک کتاب انگریزی میں بھی تھی۔ مولانا آزاد سے ان کے دوستانہ تعلقات کا حال تو معلوم نہیں البتہ دونوں ایک ہی ادبی ماحول کی شخصیت تھے، دوستانہ روابط بھی ہوں گے۔ وہ لسان الصدق کے خریدار تھے۔

(۴۶) ﴿۴۸﴾

لکھنو (۱)

۴۔۵۔۱۹۰۶ء

برادرم محترم!

مراد آباد میں ایک انجمنِ اسلامیہ ہے۔ جس کا سالانہ جلسہ تھا۔ خواجہ غلام الثقلین بی۔اے اصرار کر کے لے گئے (۲)۔ پرسوں واپس آیا۔ منشی عباس بھی ملے (۳)۔ علی گڑھ گئے ہیں۔ تیرہ تک آ جائیں گے۔

آپ لکھنؤ تشریف لاتے ہیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ!

میرا ارادہ تھا، قطعی ارادہ کہ پرسوں بمبئی چلا جاؤں اور وہاں ایک ماہ رہ کر امرتسر کا رُخ کروں (۴)، لیکن اگر آپ تشریف لاتے ہیں، تو قیام ضروری ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوں، آیئے اور ضرور آیئے۔ اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ تین سالہ غیبتِ کبریٰ لکھنؤ کی بدولت عشرۂ مبارک میں ختم ہو جائے۔

۹رفروری کا جواب اسی لیے نہیں لکھا گیا کہ پریشانی کے علاوہ لکھنو میں موجود نہیں تھا۔ دو روپے چھ آنے پہنچ گئے، الندوہ جاری کر دیا جائے گا۔

مسٹر علی محمود خط کیوں نہیں لکھتے؟ میں جواب کے لائق نہیں رہا، مگر وہ خط لکھنے کے تو ضرور لائق ہیں (۵)۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) یہ خط مولانا نے لکھنو سے لکھا تھا، جہاں وہ الندوہ کے معاون مدیر کی حیثیت سے مقیم تھے۔ لکھنو رفت و روانگی کی قطعی تاریخیں تو ابھی علم میں نہیں آ سکیں، وہ ستمبر کے آخر میں یا اکتوبر ۱۹۰۵ء کے آغاز میں لکھنو ضرور پہنچ چکے تھے اور ۴رمئی ۱۹۰۶ء کو وہ لکھنو میں موجود تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لکھنو میں مولانا کا قیام کم و بیش سات ماہ رہا تھا۔ اس زمانے کی صحبتوں کو جو حضرت شبلی سے میسر آئی تھیں، مولانا بہت ذوق و شوق سے یاد کرتے تھے۔ اس زمانے کے الندوہ

میں اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری، مارچ ۱۹۰۶ء کے نمبروں میں مولانا کے مضامین یادگار ہیں۔

(۴) حالی کے خاندان کی تاریخ تو قدیم تھی لیکن ماضی قریب کی تاریخ میں وہ اپنے خاندان کی پہلی عظیم شخصیت تھے۔ ان کے حصے میں کوئی علمی، تاریخی روایت نہ آئی تھی لیکن انھوں نے اپنے خاندان کو ہندوستان کی علمی، تہذیبی، تعلیمی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیا۔ ان کے بعد ان کے خاندان میں اور ان کی تعلیم و تربیت کی بدولت گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی مدت میں متعدد بلند پایہ علمی، تعلیمی، تہذیبی شخصیتیں اور قوم و ملت کے خدمت گذار ملک کو میسّر آئے۔ انھی بلند پایہ شخصیات میں مولانا حالی کے نواسے خواجہ غلام الثقلین (۱۸۷۲ء۔۱۹۱۵ء پانی پت) ابن خواجہ غلام عباس بھی تھے۔ خواجہ غلام عباس سے حضرت حالیؔ کی بھانجی بیاہی گئی تھیں اور حالی مرحوم کی پوتی مشتاق فاطمہ بنتِ خواجہ اخلاق حسین، خواجہ غلام الثقلین کے حبالۂ عقد میں آئی تھیں۔ خواجہ صاحب مرحوم نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں پائی تھی۔ انٹرنس دہلی میں خواجہ حالی مرحوم کی نگرانی میں کیا اور بی اے علی گڑھ سے کیا تھا، جہاں ان کو بہترین ماحول میسّر آیا تھا۔ انھوں نے قانون کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ انھوں نے کچھ عرصہ حیدر آباد میں ملازمت کی، کچھ عرصہ لکھنو اور میرٹھ میں وکالت کی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اصلاح تمدن کے سیکریٹری ہوئے۔ یہ شعبہ انھی کے ایک مضمون سے متاثر ہو کر اربابِ کانفرنس نے قایم کیا تھا۔ اصلاح تمدن و معاشرت کی تحریک شروع کی اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں میرٹھ سے ماہنامہ ''عصرِ جدید'' جاری کیا، شیعہ کانفرنس کی بنیاد رکھی، سیاست میں حصّہ لیا اور یو پی اسمبلی کے رکن بنے۔ وہ جہاں بھی رہے اصلاحِ تمدن و معاشرت کے علم بردار رہے۔

خواجہ صاحب کے اصلاحی کارناموں میں اصلاح سود کی تحریک بھی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے ان کی کوششوں کو سراہا اور ایک طویل مقالۂ افتتاحیہ الہلال کی دو قسطوں (۱۱ و ۱۸ / جون ۱۹۱۳ء) میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خواجہ صاحب نے معاشرتی سطح پر بھی کوشش کی اور ۱۴ / مارچ ۱۹۱۴ء کو یو پی اسمبلی میں سود کے قانون میں اصلاح کے لیے ایک بل بھی پیش کیا تھا۔

خواجہ صاحب بہت وسیع المعلومات اور مطالعے کے شوقین تھے۔ وہ نہایت سنجیدہ، میانہ روش اور علمی و تہذیبی شخصیت تھے۔ مسلمانوں اور دوسری اقوام و فُرق میں اتحاد و اتفاق اور ترقی کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ شیعہ تھے، لیکن اپنی ذاتی شرافت اور تہذیبی رویے کی بنا پر شیعوں سے زیادہ مسلمانوں میں مقبول تھے۔

انھوں نے اصلاحِ تمدن و معاشرت اور قومی تعمیر و ترقی کے مسائل پر سیکڑوں مضامین لکھے تھے، کئی ملکوں کا سفر کیا تھا اور ''روزنامچۂ سیاحت'' تالیف کیا تھا۔ مسئلہ سود کی تاریخ پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی، قومی بہبود کے مسایل پر ان کا ایک لیکچر یادگار ہے۔

مولانا آزاد کا حالی سے عقیدت و نیاز کا تعلق تھا اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے اخوت و وداد کا رشتہ تھا۔ خواجہ غلام الثقلین سے مولانا آزاد کا لسان الصدق کے زمانے ہی سے دوستی و وداد کا رشتہ قایم ہو گیا تھا، جو مدت العمر رہا۔ مولانا ان کے اصلاحی کاموں کے بہت قدرداں تھے۔ لسان الصدق کے مقاصد اجرا میں اصلاح تمدن و معاشرت کے مقصد کو شامل کر کے مولانا نے اسے خواجہ صاحب کی تحریک اصلاح سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ پہ اُن کے مقاصد اصلاح و

مسائل کا ذکر لسان الصدق میں ایک سے زیادہ بار اچھے الفاظ میں آیا ہے۔ اس خاندان کے خردوں نے مولانا کو اپنے بزرگ کا درجہ دیا اور مولانا کے حسنِ تذکرہ میں ان کے قلم اور زبانوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس خاندان کی ایک متاخر شخصیت سیدہ سیدین کی ہے۔ سیدہ خواجہ غلام السیدین کی بیٹی ہیں۔ انھوں نے مولانا آزاد مرحوم کی صد سالہ تقریب پیدائش (۱۹۸۸ء) کے حوالہ سے آئی سی سی آر [Indian Council for Cutural Ralations] کے تحت اور اس سے الگ کئی مفید علمی کام انجام دیے ہیں۔ ان کی ایک اور عمدہ کتاب [Islamic Seal on India's Independance-Abul Kalam Azad A Fresh Look 1998.] آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس۔ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

(۳) منشی عباسی سے منشی رضاء الحق عباسی مراد ہیں۔ ان پر حاشیہ خط نمبر ۴۶/۴۸ کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

(۴) معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مولانا آزاد نے وکیل، امرتسر میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن ۴رمئی ۱۹۰۶ء تک وہ لکھنؤ میں موجود تھے۔ نہیں کہا جا سکتا الندوہ سے ان کا ضابطے کا تعلق تھا یا نہیں۔ الندوہ کی نائب ادارت کے تسلسل میں ان کا آخری مضمون مارچ ۱۹۰۶ء میں چھپا تھا۔

(۵) علی محمود بانکی پور پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ لسان الصدق میں ان کے دو مضمون ''ولایتی اور دیسی الفاظ'' (اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء) اور ''قسمت'' (اپریل، مئی ۱۹۰۵ء) شائع ہوئے تھے۔ پہلے مضمون کے تعارفی نوٹ میں مولانا نے انھیں اپنا ''دلی دوست'' لکھا ہے۔ اسی نوٹ سے معلوم ہوا کہ ان کے اکثر مضامین مخزن (لاہور) اور اردوے معلیٰ (علی گڑھ) میں شائع ہو چکے تھے۔ اس سے ان کے ذوق و معیارِ علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد سے ان کی ملاقات بھی تھی۔ علامہ شبلی مرحوم سے مولانا نے بمبئی میں اپنی ملاقاتوں (۱۹۰۵ء) کے ضمن میں ایک مجلس میں علی محمود کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ مولانا کا یہ بیان ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' (روایت ۱۹۲۲ء) کا ہے۔

(۴۷) ﴿۴۹﴾

مکتوب الیہ کے بارے میں مولانا آزاد کی ایک نادر تحریر

مولانا محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے جو نوادرِ کلام نظم و نثر دستیاب ہوئے ہیں، ان میں جعفری مرحوم کے ایک مضمون پر مولانا آزاد کے قلم سے ایک مختصر تعارفی شذرہ بھی ہے۔ یہ مضمون یقیناً انگریزی سے ترجمہ یا ماخوذ ہوگا جو انھوں نے ''خدنگ نظر'' (لکھنو) کے لیے مولانا آزاد ہی کی فرمائش پر کیا ہوگا۔ اگرچہ یہ شذرہ خطوط کے ذیل میں نہیں آتا، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ شذرہ بھی انھیں

نوادر کے ساتھ محفوظ کر دیا جائے۔

مولانا آزاد چوں کہ مارچ ۱۹۰۳ء میں خدنگ نظر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے اور جولائی تک کے پرچوں میں ان کی اس حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ اغلب خیال یہ ہے کہ حضرت رنجور مرحوم سے اسی دوران میں وہ مضمون (مشرقی افریقہ کے وحشی) لکھوایا ہوگا جس پر مولانا آزاد کے قلم سے مصنّف یا مترجم کے تعارف میں یہ شذرہ ہے۔ چوں کہ یہ شذرہ خط سے مختلف نوعیت کا ہے اس لیے خطوط کے آخر میں اسے شامل کیا جاتا ہے:

''جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری جو خاندانِ صادق پور عظیم آباد کے ایک معزز ممبر اور علی گڑھ کالج کے اولڈ اسٹوڈنٹس میں ایک ممتاز شخص ہیں اور ایک مدت تک ''پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور بالفعل بورڈ آف اگزامنرس، کلکتہ کے چیف مولوی ہیں، خدنگ نظر کے لیے ایک مختصر مضمون اور دو فوٹو عنایت فرماتے ہیں۔

ان میں سے ایک فوٹو میں افریقہ کا ایک وحشی مرد ہے اور ایک فوٹو میں دو وحشی عورتیں کھڑی ہیں۔ ان تصویروں سے وہاں کے رسم و رواج نیز لباس وغیرہ کی عمدہ صفت ظاہر ہوتی ہے اور ''ہر ملکے و ہر رسمے'' کا مقولہ ذہن نشین ہوتا ہے۔

ہم نہایت شکریے سے یہ دونوں فوٹو اور مضمون ''خدنگ نظر'' میں درج کر کے مولوی صاحب کی آیندہ نوازشوں کے امیدوار ہوتے ہیں''(۱)۔

ابوالکلام دہلوی

حاشیہ:

(۱) مولانا کے نوادر میں حضرت رنجور مرحوم کے دو نوادر بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مرحوم کا یہ مضمون ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کی فرمائش پر خدنگ نظر کے لیے لکھا تھا، جب آزاد اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ لیکن خدنگ نظر کے جن پرچوں تک اہلِ تحقیق کی نظر پہنچی ہے ان میں اس مضمون کی اشاعت کا پتا نہیں چل سکا۔ اس لیے حضرت رنجور مرحوم کا یہ تبرک یہاں درج کر دیا جاتا ہے:

﴿۱﴾

مشرقی افریقہ کے وحشی

''ہر ملکے و ہر رسمے'' کتنا سچا مقولہ ہے! ایک ملک کے رسم ورواج سے اگر دوسرے ملک کے رسم ورواج کو ملا یئے گا تو زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اب دیکھیے! میرے ایک مکرم دوست نے مشرقی افریقہ سے وہاں کے وحشی باشندوں کی تین تصویریں ارسال کی ہیں۔ جن کے دیکھنے سے سخت تعجب ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ دنیا میں ابھی تک ایسی مخلوق موجود ہے، جس تک باوجود یکہ تمام دنیا تمدن اور شائستگی کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ تہذیب کی روشنی نہیں پہنچی اور ابھی تک نہایت ادنیٰ حالت میں اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ علم سے دور، تہذیب سے ناواقف، شائستگی سے بے خبر! بس! اپنے نشۂ جہالت ووحشت میں مست ہیں۔ طرہ بریں یہ کہ اور متمدن اقوام کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں!!!

دیکھیے! ان فوٹوؤں میں سے ایک فوٹو ایک وحشی مرد کا ہے جو اپنی اصلی حالت میں کھڑا اپنی حالت بتلا رہا ہے۔ یہ کلوٹی قوم کا نوجوان ہے۔ سارا بدن ننگا ہے۔ صرف چمڑے کا ٹکڑا (کمر) کے گرد ہے۔ پاؤں میں لمبے لمبے پر باندھے ہوئے ہیں۔ تصویر لیتے وقت اس نے چمڑا آگے کر دیا ہے۔ ورنہ ہمیشہ یہ قوم بالکل مادر زاد ننگی رہتی ہے۔ سر پر جانوروں کے پر جمائے ہوئے ہیں۔ ایک حلقے میں تاروں کا گچھا آویزاں ہے اور اسے گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس قوم کے تمام مرد وہاں قلی اور مزدوری کا کام کرتے ہیں اور یہی ان کی وجہ معاش ہے۔ سارے بدن پر چربی اور سرخ مٹی ملا کر ملتے ہیں اور اسے بڑی عمدہ چیز سمجھتے ہیں۔

دوسری تصویر میں مسائی قوم کی دولڑکیاں اپنے زیور وغیرہ پہنے ہوئے کھڑی ہیں۔ دیکھیے! لوہے کے تار بازو سے لے کر کلائی تک اور گھٹنوں میں بطور چوڑیوں کے پہنے ہوئے ہیں۔ بعض خوبصورتی کے خیال سے یہاں تک پہنتی ہیں کہ انھیں چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بہت آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ ان کی نشست بھی عجیب ہوتی ہے، پاؤں لمبے کر کے اوندھی ہو کر بیٹھتی ہیں۔ دیکھیے! گلے میں لوہے کے طباق کے سے بنائے ہوئے ڈالے ہیں۔ کانوں میں لوہے کی زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ گلے میں تار کا چکر ہے اور اس میں پوت کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کی عورتیں بھی بالکل ننگی ہوتی ہیں۔ صرف کمر سے نیچے تک چمڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے۔

مرد عورت سب سر منڈاتے ہیں اور اس کو بڑا حسن سمجھتے ہیں! بعض مرد اگر بال رکھتے بھی ہیں، تو بہت چھوٹے چھوٹے جو کے برابر۔ کلوٹی قوم کی عورتوں .... (۱) سے زیادہ بال رکھتے ہیں۔ مگر ان کے بھی آدھ انچ سے زیادہ نہیں بڑھتے۔ یہ عورتیں نہایت قوی ہوتی ہیں اور چھ چھ من بوجھ بلا تکلف اٹھا لیتی ہیں۔ بعض شوقین مرد کان پھاڑ کر لکڑی کے ڈھول بنا کر پہنتے ہیں اور اسے پہن کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ عورتیں پیتل یا لوہے کے گول چکر بنا کر لٹکاتی ہیں جو چھاتی پر آ رہتے ہیں۔

ان کے ہاں اگر کوئی مر جائے تو گو وہ ان کا کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو، اسے جنگل میں پھینک آتے ہیں اور وہ سڑ کے رہ جاتا ہے۔ راستوں میں ہڈیاں اور سر کی کھوپڑیاں بہت سی پڑی ملتی ہیں۔

ان کی زیادہ تر خوراک شکر قند ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ عورتوں کے بدن سے ہم کو سخت بد بو آتی ہے اور

وہ بھی اسی امر کی شاکی ہیں کہ ہمیں تم سے بوآتی ہے۔ بچوں کو عورتیں پیٹھ سے یا پیٹ سے باندھ لیتی ہیں اور اپنے کام میں مشغول رہتی ہیں۔ یہاں بڑا رئیس وہی سمجھا جاتا ہے جس کے پاس گائے اور بکریاں زیادہ ہوں۔ شادی کا بھی یہی طریقہ ہے کہ جو دس گائے دے، وہ شادی کر لے۔ عجیب رسم ہے!

محمد یوسف جعفری

حواشی:

(۱) لفظ پڑھا نہیں گیا۔

﴿۲﴾

قطعۂ تاریخ

مولانا محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کے خزانۂ علمی سے ان کے جو دو نوادر دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے ایک ''مشرقی افریقہ کے وحشی'' ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے اور بہ طور تبرک اسے نقل بھی کر دیا ہے۔ دوسرا ایک ''قطعۂ تاریخ'' ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۰۲ء میں ''تذکرہ شعرائے فارسی'' کی تالیف کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں خاقانی شروانی پر ان کا ایک مضمون مخزن۔ لاہور کے شمارے بابت ماہ اگست ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون کے سوا نہ کسی اور پر کوئی مضمون لکھا گیا نہ تذکرہ مرتب ہو سکا۔ لیکن حضرت رنجور مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے جو قطعۂ تاریخ دستیاب ہوا ہے، اس سے خاقانی پر تالیف کی تکمیل کا اشارہ ملتا ہے۔ مولانا ابوالکلام نے علی پور سنٹرل جیل کلکتہ (۲۲۔۱۹۲۱ء) میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی فرمایش پر اپنی تالیفات کی جو فہرست مرتب فرمائی تھی اس میں خاقانی کی بایوگرافی اور کلام پر ریویو کا حوالہ ہے۔ لیکن ان کی بایوگرافی کا سراغ ابھی تک نہیں ملا ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ نہ تذکرہ مرتب ہوا نہ خاقانی کے سوا کوئی دوسرا مضمون لکھا گیا۔ مخزن کے مضمون کی ضخامت دس صفحے سے زیادہ نہیں۔ اگر مفصّل مضمون ہوتا تو خیال ہو سکتا تھا کہ اسی کو کتاب کہا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بے حقیقت نہیں ہو سکتی۔ کتنی ہی معلوم اشیا ہماری نگاہوں سے اوجھل اور دسترس سے باہر ہیں، لیکن ہم ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ مولانا کی بہت تالیفات جو حوادث کا شکار ہوئی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے۔ اب اگر اس کا قطعۂ تاریخ دستیاب ہوا ہے تو آیئے اسی کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں!

قطعۂ تاریخِ تالیف ''حیاتِ حکیم خاقانی شروانی''

از تصنیفات

صدیقی وحبیبی مولانا ابوالکلام محی الدین احمد صاحب آزاد دہلوی

اثرِ خامہ محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی، چیف مولوی بورڈ آف اگزامنرس۔کلکتہ

خاقانیِ با کمال کا حال — اس پر لطفِ بیانِ آزاد
جو لفظ ہے مصری کی ڈالی ہے — کیا شیریں ہے زبانِ آزاد
صفحے نہیں تختہ ہائے گل ہیں — کہیے اسے گلستانِ آزاد
گو ہند میں ہیں بہت سخن ور — ہے سب سے نرالی شانِ آزاد
بہرہ ہی نہیں انھیں سخن سے — ہیں جو کہ نہ قدر دانِ آزاد
آزاد کو حق رکھے سلامت — برباد ہوں دشمنانِ آزاد
ہو نشو ونما پہ یا الٰہی! — دایم فکرِ جوانِ آزاد
ہر دم رہے باڑھ پر خدایا! — آبِ طبع روانِ آزاد

تاریخ کی فکر اگر ہے رنجور
لکھ دو! ''ہے ارمغانِ آزاد''

۱۳۲۰ھ

محمد ابن یامین (۱):

﴿۴۹﴾

میاں بن یامین سلمہ ربہ (۲)!

آج اس وقت ایک ویلو پے ایبل، غالباً چھبیس روپے کا میرے نام آئے گا۔ تم ڈاکیے کو کہہ دینا کہ آج یہ ویلو لے جاؤ، کل لانا۔ کیوں کہ ابھی مولوی صاحب باہر گئے ہوئے ہیں اور وہ کہہ گئے ہیں کہ کل منگوالینا۔ اس لیے اسے لے جاؤ، کل لے آنا۔ سمجھے؟ (۳)

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) محمد بن یامین حضرت مولانا رنجور کے منجھلے بیٹے تھے۔ مولانا رنجور کی شادی ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی اور ان کے چھوٹے بیٹے محمد حسان ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ تقریباً ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۹ء کے دوران مولانا رنجور مرحوم کی تین اور اولادیں ''نجم النساء'' زاہدہ اور محمد بن یامین پیدا ہوئیں۔ ۱۸۸۶ء میں مولانا آزاد پیدا ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد بن یامین تقریباً مولانا کے ہم عمر یا ان سے ایک دو برس چھوٹے ہوں گے۔ تقدیر نے انھیں زندگی کی بہت کم مہلت دی۔ ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں عین نوجوانی میں انتقال ہوا۔ مولانا رنجور کو نوجوان بیٹے کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ اس کے غم میں کثرتِ گریہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔ ان کی بیاض میں ایک قطعہ بیٹے کے انتقال کے غم کی یادگار ہے۔ قطعہ یہ ہے:

چو نورِ چشم بن یامیں مرا کوز
بکرد واہ! درگور بہ نہفت
دلِ رنجور تاریخ وفاتش
''بشد او عازم خلد بریں'' گفت

۱۳۲۷ء

(۲) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے کوئی وی پی منگوائی تھی جو مولانا رنجور کے گھر کے پتے پر ہوگی یا دارالاخبار کے یا لسان الصدق کے دفتر کے پتے پر جہاں بن یامین بیٹھتے ہوں گے۔ اس لیے انھیں یہ خط لکھا اور تاکید کی۔ بن یامین محترم قدرت اللہ فاطمی صاحب کے ماموں تھے، وہ اپنی خالہ نجم النساء (والدہ ڈاکٹر منظور احمد) سے روایت کرتے ہیں:

> ''وہ کہا کرتی تھیں کہ ''لسان الصدق'' کے اجرا کے زمانے میں گھر میں کارخانہ سا کھل جاتا تھا، جس کے دفتری کاموں میں منجھلے ماموں (بن یامین) اور وہ خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں''۔

(۳) اس خط پر تاریخ درج نہیں، لیکن یہ خط لسان الصدق کی اشاعت کے زمانے اور اس وقت کا ہے، جب مولانا کلکتہ میں مقیم تھے۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۰۴ء کو مولانا پنجاب کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اور ۳ر مئی کو یہ سفر ختم ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کلکتہ میں رہے اور پھر بمبئی چلے گئے۔ جون ۱۹۰۴ء کے بعد کی مراسلت کلکتہ کے پتے سے ہے۔ اس کے بعد لسان الصدق کے جون، جولائی واگست، ستمبر ۱۹۰۴ء اور اپریل، مئی ۱۹۰۵ء کے دو دو ماہ کے مشترکہ شمارے بمبئی سے شائع ہوئے تھے۔ اس لیے یہ خط نومبر ۱۹۰۳ء کے بعد کا اور اغلب خیال یہ ہے کہ جنوری تا مئی ۱۹۰۴ء کے زمانے کا ہے۔

حکیم محمد علی خاں (ہردوئی):

﴿۵۰﴾

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۱ر جون ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ(۱)

جناب حکیم صاحب! السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم

مجھے آپ کے ''مرقعِ عالم'' سے کس قدر شغف ہے، اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بمبئی میں ''مرقع عالم'' سنین ماضیہ کے پرچے جب میں نے طلب کیے تھے اور کار پرداز کی غفلت کے سبب فرمایش کی جلد تعمیل نہ ہوئی تھی، تو اس وقت میں نے متواتر رجسٹرڈ خطوط روانہ کیے تھے؛ یعنی طبیعت میں اس کا ایک شوق بڑھا ہوا تھا اور بد گمانی اس امر کا موقع ہی نہیں دیتی تھی کہ خط کے نہ پہنچنے کو تسلیم کر کے عدم تعمیل فرمایش کو کسی اور وجہ پر محمول کرتا۔ اگرچہ رجسٹرڈ خطوط کا کسی چیز کی فرمایش کے لیے ارسال کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے، مگر ایک ایسی حالت میں کہ ناقدری کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہو! اور لوگوں کو ایک کارڈ بھیجنا بھی بار گزرتا ہو، اس قدر اشتیاق کا ہونا کہ فرمایش کے لیے پیڈ [Paid] خطوں اور کارڈوں پر بھروسا نہ کر کے متواتر رجسٹرڈ خطوں کا ارسال کرنا ایک خصوصیّت کا پہلو رکھتا ہے۔(۲)

مگر کچھ دنوں سے میں بڑی حسرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی علالت کی وجہ سے مرقع عالم اپنی ایک خاص خصوصیّت کو جو اور ہندستانی میگزینوں میں اس کے لیے مایہ الامتیاز تھی، کھو بیٹھا ہے۔ اس لیے پبلک کو وہ توجہ جو پچھلے دنوں اس کی طرف مبذول تھی، ایک حد تک جاتی رہی، وہ کیا؟ پنکچوالٹی [Punctuality]، یعنی پابندی وقت۔ پس اب ذرا آپ اِدھر متوجہ ہوں۔ اور ایک سال کا جو آپ پر قرض باقی ہے،

اسے جلد جلد ادا کر کے آیندہ سے اس میں پابندی کا جادو پیدا کر دیں۔

اس عریضے کے ہمراہ ایک مضمون ''علوم جدیدہ اور اسلام'' کے عنوان سے ارسالِ خدمت کرتا ہوں اسے مرقع میں شامل کیجیے۔ ان شاء اللہ نمبر ۳ و ۴ بھی ارسالِ خدمت عالی کر دوں گا۔

آپ جانتے ہیں اور یقیناً مجھ سے اچھا جانتے ہیں کہ محرکین تعلیم انگریزی کی انگریزی اشاعت سے کیا غرض تھی۔ اشاعت علوم! مگر افسوس ہے کہ یہ غرض تو حاصل نہ ہوئی اور انگریزی ذریعۂ ملازمت سمجھ لی گئی۔ اب نہ کوئی سائنس سے غرض ہے نہ فلسفے سے، بس انٹرنس یا ایف اے تک انگریزی حاصل کی اور پندرہ روپے پر ملازم ہو گئے۔ پس حالتِ موجودہ کے لحاظ سے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علوم مغربی کا ترجمہ کیا جائے اور سائنٹیفک سوسایٹی اور پنجاب یونیورسٹی کی پالیسی سے اتفاق کیا جائے۔

مولوی محمد عمر صاحب (۳) نے واقعی یہ بہت اچھا کیا کہ ''مرقعِ عالم'' کو علومِ مغربی کا مخزن بنایا، ملک اور قوم کو ان کا ممنون ہونا چاہیے، مگر ساتھ ہی اگر آپ غور کریں گے تو اشاعتِ علومِ مغربی سے ایک اور زہریلا مرض ہندستان میں پھیل رہا ہے اور جب اُس میں ترقی ہوگی، تو اس میں بھی یقیناً ہوگی۔ پس اس لیے ضروری ہے کہ اس کا انسداد بھی قبل از وقت کر لیا جائے۔ آپ کہیں گے کہ وہ کون سا مرض ہے؟ حضرت وہ دہریت اور لامذہبیت کا مرض ہے، جو مذہب کی پاک زندگی کا کام تمام کر دیتا ہے۔ اور جس نے یورپ کو مذہب کی قید سے آزاد کر دیا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام کو ناواقفوں نے سائنس کے خلاف سمجھ لیا ہے اس لیے انھیں مذہب کے خلاف کرنا ضروری ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ جب مرقع عالم میں سائنس کے تراجم شائع ہو رہے ہیں، تو ان کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یہ مضمون ''علوم جدیدہ اور اسلام'' آپ کے پرچے کے لیے بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ

ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا اور وہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھیں گے۔

"مرقعِ عالم" کے غالباً ہزار سے زیادہ خریدار ہوں گے۔ کیا ہزار میں نصف، پانچ سو بھی ایسے نہ ہوں گے، جنھیں اس کی توسیعِ اشاعت کا خیال ہو! میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک صاحب، احبابِ خریدار میں سے ایک ماہ کے اندر پانچ خریداروں کو بہم پہنچانے کا ذمہ لے لے۔ اگر وہ مہینے کے اندر نہ بہم پہنچا سکے تو دس روپے دے کر پانچ پرچے خرید لے، اس کا اسے اختیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس تجویز پر محبانِ علوم غور فرما کر عمل فرمائیں گے۔ کیوں کہ جب تک ایسا خیال ساری قوم میں نہ ہوگا۔ کبھی علمی ترقی نہیں ہو سکتی۔

میں نے آپ کی تمام تصانیف پر ایک ریویو بھی لکھا ہے، اسے بھی عنقریب ارسال کروں گا، جس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ "مرقعِ عالم" کیا چیز ہے اور ہم اس کی کیسی ناقدری کر رہے ہیں۔ زیادہ نیاز!

خادم احباب
ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی۔ مقیم کلکتہ
از کلکتہ۔ امرتلہ لین

حواشی:

(۱) مرقع عالم ہردوئی بابت ماہ مئی ۱۹۰۲ء۔ ۱۱ر جون کا خط مئی کے پرچے میں چھپا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جون کا شمارہ تاخیر سے چھپا تھا۔ مولانا نے اسی خط میں رسالے کی اشاعت میں عدم پابندی وقت کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ اس کا ثبوت ہے۔ "مرقع عالم" کا ذکر مکتوب الیہ کے تعارف میں آئے گا۔

(۲) مولانا کا یہ خط تو ایڈیٹر نے فوراً شریکِ اشاعت کر لیا۔ لیکن انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے کتب خانے میں "مرقع عالم" کے جو چند متفرق پرچے یا انتخاب نظر سے گزرا ہے۔ اس میں مولانا کا مضمون نہیں ہے۔ کسی اور ذرائع سے بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مضمون کسی کو دستیاب ہوا ہو۔ ستمبر ۱۹۰۴ء کے "لسان الصدق" میں بھی اس مضمون کا ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے ذکر آیا ہے۔ اس وقت تک یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ایک باب معتزلہ کے

بارے میں تھا، اتنا طویل ہو گیا تھا کہ اسے مولانا نے ایک الگ کتاب کی شکل میں شایع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر ایک دیباچہ بھی لکھ لیا گیا تھا۔ یہ دیباچہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے ''لسان الصدق'' میں مولانا نے چھاپ بھی دیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''ارمغانِ آزاد'' مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، (۱۹۹۰ء، کراچی) نیز دیکھیے ''لسان الصدق'' (عکسی اشاعت)، ۱۹۹۶ء کراچی متعارفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔

(۳) مولوی محمد عمر صدیقی ''مرقع عالم'' کے ایک مضمون نگار تھے۔ انھوں نے علومِ مغربی پر بہت سے مضامین انگریزی سے ترجمہ کر کے مرقع عالم میں شایع کرائے تھے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی:

﴿۵۱﴾

۲ر نومبر ۱۹۰۳ء

مولانا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

چوں کہ میں وہاں سے آ کر علیل ہو گیا۔ اس لیے تعمیل حکم سے مجبور رہا ان شاء اللہ عن قریب حضرت والد صاحب مرحوم کا ترجمہ مرتب کر کے ارسال خدمت کرتا ہوں (۱) اور کتابوں کے متعلق بھی ایشیاٹک سوسائٹی سے دریافت کر کے عرض کروں گا۔

والسلام

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حاشیہ:

(۱) یقین ہے کہ ''نزہۃ الخواطر'' کے لیے مکتوب الیہ کے والد مولانا خیر الدین کے حالات دریافت کیے ہوں گے۔ مولانا نے اپنے والد گرامی مولانا خیر الدین دہلوی کے حالات مہیا کر دیے تھے اور اس جلد میں جو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مرتب کی ہے، شامل ہیں۔

خریدارانِ لسان الصدق کی خدمت میں ایک گزارش:

(اگست یا ستمبر ۱۹۰۴ء) ﴿۵۲﴾

حضرات!

تین مہینے کی مسلسل غیر حاضری کے بعد آج لسان الصدق حاضر ہوتا ہے، ایڈیٹر کی سخت علالت مختلف مقامات کا سفر، چند در چند پریشانیاں، یہ اور اسی قسم کے اور وجوہ ہیں جن سے میں اس وقت معذرت کا کافی کام لے سکتا ہوں۔ لیکن درحقیقت اپنی ذاتی مجبوریوں کو کسی پبلک کام میں پیش کرنا ایک ناجائز طریقہ ہے۔ اس لیے میں اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے لسان الصدق کی آیندہ حالت کے متعلق اطمینان دلاتا ہوں کہ اب اس کو آپ ہمیشہ وقت کا سخت پابند اور ہر حیثیت سے بہتر پائیں گے۔

اسی پرچے میں آیندہ آپ کو ان حضرات کی تحریریں نظر آئیں گی جن کی مستقل تصنیفات کے سوا عام رسایل میں بمشکل زیارت ہوتی ہے۔ چھپائی لکھائی کے لحاظ سے یہ پرچہ انشاء اللہ تمام پرچوں میں ممتاز ثابت ہوگا۔ عمدہ تصاویر اور نقشوں سے پرچے کو رونق دی جائے گا۔ عام مضامین کے سوا بالخصوص سائنٹیفک تحریرات کا خاص اہتمام ہوگا۔ اور عموماً انھیں عنوانوں پر تحریریں نکلا کریں گی۔ جن پر اردو میں آج تک بالکل نہیں یا بہت کم لکھا گیا ہے۔

اب آپ کا کام یہ ہے کہ اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیے۔ آیندہ نمبر آپ کی خدمت میں وی پی روانہ کیا جائے تاکہ آیندہ سال کی قیمت آپ سے ایک روپیہ کم لی جائے۔ ورنہ جنوری کے بعد دو روپے آنے قرار پائی ہے۔

اگر آپ کا سالانہ چندہ ماہ بعد ختم ہونے والا ہے، تو قیمت پیشگی جمع رہے گی اور اُسی مہینے سے سال شروع ہوگا قیمت اس وقت اس لیے وصول کی جاتی ہے کہ جنوری کے بعد دینے پڑیں گے اس وقت آپ کی بڑی مدد یہ ہوگی کہ آپ وی پی وصول

فرمالیں تاکہ ہم کو پرچے کی اصلاح وترقی کا کافی موقع ملے۔

ایڈیٹر(۱)

حواشی:

(۱) لسان الصدق۔کلکتہ: اگست وستمبر ۱۹۰۴ء، جلد ۲ نمبر ۸، ۹

خواجہ حسن نظامی (دہلی):

حضرت خواجہ حسن نظامی کے یہ خطوط، ساتویں خط کے سوا، ماہنامہ منادی، نئی دہلی کے اپریل ۱۹۵۸ء کے شمارے سے نقل کیے ہیں۔ ساتواں خط مولانا غلام رسول مہر کے نام مولانا کے خطوط کے مجموعے ''نقش آزاد'' (۱۹۵۹ء) سے لیا ہے۔ یہ تمام خطوط قبل ازیں خواجہ صاحب کی کتاب ''اتالیقِ خطوط نویسی'' میں شایع ہو چکے تھے۔

(۱) ﴿۵۳﴾

۱۱۔ کولوٹولہ اسٹریٹ، (کلکتہ)

۸؍دسمبر ۱۹۰۶ء

بھائی نظامی!

کیا حال ہے؟ ''وکیل'' نے علالت کی خبر سنائی (۱) اور تم اپنے نحیف جثّے کو لیے ہوئے سامنے آ گئے۔ افسوس کہ تم ڈاکٹری علاج سے متنفر ہو۔ بہر کیف! جلد اچھے ہو اور خدا کرے کہ کانفرنس (۲) میں آ کر ملو۔ سفر بنگالہ کا اس سے بہتر پھر موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ وسطِ جنوری سے ایک مستقل اخبار میری اڈیٹری میں کلکتہ سے نکلے گا: ''دارالسلطنت''۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس کے پہلے نمبر میں تمھارا ایک دلآویز مضمون ہو۔ خدا نہ کرے کہ تمھاری علالت امید براری میں حارج ہو۔

میں نے دہلی میں تمھارا شام تک انتظار کیا، اور پھر مایوس ہو کر روانہ ہو گیا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) مولانا آزاد اسی سال تقریباً جون سے نومبر تک وکیل امرتسر کے ایڈیٹر رہے تھے اور نومبر میں کلکتہ آئے تھے۔ اسی

دوران خواجہ صاحب کی خبرِ علالت چھپی ہوگی اور مولانا کی نظر سے گزری ہوگی۔ وکیل ۱۸۹۵ء میں شیخ غلام محمد نے ہفتہ وار نکالا تھا اور ۱۹۱۲ء میں ان کے انتقال کے ساتھ ہی بند ہوگیا۔ وکیل اپنے وقت کا بہت کامیاب اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹروں میں مرزا حیرت، مولوی انشاء اللہ خاں، مولوی شجاع اللہ، مولوی جالب دہلوی، حکیم فیروز الدین فیروز، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ عمادی اور عبداللہ منہاس رہ چکے تھے۔ وکیل پہلے ہفت روزہ تھا، پھر سہ روزہ ہوا، پھر ہفتے میں تین بار، پھر دو بار نکلنے لگا۔ آخر میں پھر ہفت روزہ ہوگیا تھا۔

(۲) ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ڈھاکا میں ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہونے والا تھا۔ یہ وہی تاریخی جلسہ تھا جس کے اجتماع سے فایدہ اٹھا کر ۳۰ دسمبر کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا، جس میں مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد مسلم لیگ کے اس تاریخی اساسی اجلاس میں شریک تھے۔

(۲) ﴿۵۴﴾

بنگلہ حافظ حلیم صاحب۔ کان پور

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۹ء

بھائی نظامی!

عرصے کے بعد تم ملے۔ اور پچھلی پُر از خلوص و بے تکلفانہ صحبتیں یاد آ گئیں۔ مگر جھوٹ کا عادی نہیں۔ سچ یہ ہے کہ باوجود میرے مکرر سہ کرر اصرار کے تمھارا ایک دن کے لیے بھی نہ ٹھہرنا، مجھے سخت گراں گزرا۔ یہ انکار اس لیے تو نہیں تھا کہ ایک عقیدت کیش کی معیّت تھی اور میری بے تکلفیاں خوف دلاتی تھیں کہ کہیں کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ اگر ایسا خیال ہو، تو کچھ بے جا بھی نہیں۔ کلکتے اور بمبئی میں خود مجھ کو اپنے احباب بے تکلّف سے کبھی کبھی ایسا خوف ہو جاتا ہے۔ مگر چند گھنٹوں کی صحبت میں اس کا تو تم نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ارادت اندیشوں کی موجودگی میں میرا سلوک کیسا ہوتا ہے!

ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے کسی قدر متضاد و مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہد اور قبائے رندی کو ایک ہی وقت میں

اوڑھنے پہننے کا مجرم ہوں۔ پس، اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ہم ایک دوست سے جو سلوک مے خانے کی چھت پر کریں، اسی کا مستحق اسے سجادۂ خانقاہ پر بھی سمجھیں۔

اس کی طرف سے تو مطمئن رہو، اور مجھے تم اپنا سچا خیر خواہ، اعزاز طلب اور دوست سمجھو۔ جیسا کہ برسوں سے ہم سمجھا کیے ہیں۔ مگر خدا کے لیے یہ بتلاؤ کہ اس اعراض و اغماض کا کیا مطلب تھا؟

آج کل جو کام تم نے شروع کیا ہے (۱)۔ گو میرا راستہ اس سے الگ ہے۔ مگر میں تو ہر راہ میں تیز گام ہوں۔ اگر ضرورت سمجھو تو یہاں مجھ سے کافی اعانت مل سکتی ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱) خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس جملے پر حاشیہ لکھا ہے کہ ''غالباً حلقۂ نظام المشائخ کا کام مراد ہے''۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ درست نہیں۔ حلقۂ نظام المشائخ تو ۱۹۰۶ء سے قائم اور ہنگامہ گرم تھا۔ اس کے کام کو آج کل کا کام نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کسی اور سرگرمی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) ﴿۵۵﴾

۱۳۔ میکلاؤڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

برادرم!

پتا بدل گیا ہے۔ آیندہ سے مندرجۂ صدر نشان پر خط لکھا کیجیے۔ پرچہ پہنچا۔ کھولا، تو آپ کا مضمون نظر پڑا، دمدار تارے کے اثرِ نحوست کا اقرار صالح، نیز اس کے علاج سے اتفاقِ کلی، لیکن ۹۳ (۱) کی قید پر اصرار کیجیے گا، تو مجھے مجبوراً الگ ہو جانا پڑے گا۔ یہ یسر پسندی کے خلاف ہے۔ پھر سورت بھی منتخب کی تو عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کے اجزائے اخیر کو نظر انداز کر دیا! حال آں کہ ایسے کاموں کے لیے تو سورہ اِنَّا اَعْطَيْنَا اور قُلْ هُوَ

اللہ سے بڑھ کر اور کوئی مفید نہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ ۹۳ کے جزو دوم کے حذف کر دینے پر ہم آپ باہم سمجھوتا کر لیں۔ اختلاف کو طول دینا مضر ہے! انصاف کیجیے کہ اگر میں پانی دم کر کے گھر سے نکلوں کہ کلکتے کے تمام کونوں پر چھڑک دیا جائے، تو دو ماہ سے پہلے واپسی ممکن نہیں (۲)۔

خیر! یہ تو لطیفہ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ سے کچھ ہنس بول لوں۔ اب یہ کہیے کہ جواب کیوں نہیں دیتے؟ دو خط لکھ چکا ہوں۔ اجمیر کا ارادہ قطعی کیجیے، تو شاید میں بھی نکلوں، اگرچہ وقت نکلنا مشکل ہے۔ کیوں کہ چاہتا ہوں کہ پہلی رجب سے اخبار نکال دوں۔ مشورۃً بہت کچھ کہنا ہے، بشرطے کہ پچھلے مراسلات کا جواب مل جائے۔ کلکتہ کا مکرر عزم کیجیے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) اتالیقِ خطوط نویسی اور ''نقش آزاد'' کے متون میں ''۹۳'' ہے۔ لیکن مالک رام کا خیال ہے کہ یہ سہو ہے اور اشارہ حضرت محمدؐ کے عدد بہ حساب جمل ۹۲ کی طرف ہے، اس لیے انھوں نے اپنے مجموعے ''خطوط ابوالکلام آزاد'': نئی دہلی ۱۹۹۱ء میں ۹۲ بنا دیا ہے۔ کوئی قاری چاہیں تو ایسا ہی سمجھ لیں یا مرموز کو مرموز ہی رہنے دیں!

(۲) جولائی ۱۹۰۹ء سے خواجہ صاحب نے ملا واحدی صاحب کی شراکت میں ''نظام المشائخ'' کے نام سے ایک ماہنامہ دہلی سے نکالنا شروع کیا تھا۔ خواجہ صاحب اس کے مدیر اور واحدی صاحب اس کے نائب مدیر تھے۔ اس میں خواجہ صاحب کا مضمون دمدار تارے کی نحوست کے بارے میں نکلا تھا۔ اس کی نحوست سے بچنے کے لیے بعض اعمال اور پڑھے ہوئے پانی کو شہر کے اطراف میں چھڑکنا مفید بتایا گیا تھا۔ خط میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس خط پر ایک حاشیہ لکھا ہے۔ اسے بھی پڑھ لینا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں ایک دم دار ستارہ نمودار ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب نے اسے انگریزی اقتدار کے لیے منحوس سمجھا اور ایک مضمون میں اس (نحوست) کا ذکر کیا۔ (اگرچہ انگریزی حکومت کا مضمون میں نام نہ لیا تھا۔ مولانا آزاد نے اسی سلسلے میں انگریزوں کے خلاف یہ مرموز عبارت لکھی ہے۔ مگر کچھ دن بعد مشہور انقلابی برکت اللہ مرحوم (بھوپالی) نے اسی قسم کی عبارت میں ایک خط خواجہ صاحب کو لکھا تو پولیس نے خواجہ صاحب کو بہت پریشان کیا اور چھ سال تک نگرانی کی گئی''۔ (منادی، نئی دلی، اپریل ۱۹۵۸ء ص ۱۷)

(۴) ﴿۵۶﴾

ہمدردانہ کہتا ہوں کہ یہ آپ نے اچھا نہ کیا کہ لوگوں کو مخالف بننے دیا۔ مصلحت اندیشی اور حزم واحتیاط کا راستہ دوسرا ہے۔ کام خاکساری اور فروتنی سے کرنا چاہیے کہ دشمنوں کو خاکسار بنانے کی گنجایش نظر آئے (۱)۔ اب آپ کی مخالفت زور شور سے کی جائے گی۔ کلکتہ اس دنیا سے الگ ہے۔ مگر یہاں بھی مخالفانہ خیالات سخت درجے تک پہنچ گئے ہیں۔ ایک بہت بڑا مضمون لکھا جا رہا ہے۔ مجھ سے بھی کہا گیا۔ میں نے کہا، مجھے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں (۲)۔

چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس آگ کو دبا دیا جائے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں تفصیلی مشورہ دے سکتا ہوں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) خط کے کئی متون میں جملہ اس طرح ہے: دشمنوں کو خاکسار بنانے کی گنجایش نظر نہ آئے۔ میرے خیال موقع گنجایش نظر آنیکا ہے۔ نظر نہ آنے کا نہیں۔ اس لیے جملے میں تبدیلی کر دی گئی۔

(۲) اس خط پر حاشیے میں خواجہ حسن ثانی نظامی لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں خاندان والوں اور ان کے اشارے پر بعض مشائخ کی طرف سے حضرت خواجہ صاحب کی سخت مخالفت کی جارہی تھی۔ یہ لوگ جلسۂ نظام المشائخ کے اصلاحی پروگرام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ اس سے ان کی دُکان داری میں فرق پڑتا تھا۔ ممکن ہے محترم واحدی صاحب کو یاد ہو کہ وہ کون سا خاص واقعہ تھا جس کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے"۔

اب نہ حضرت خواجہ صاحب ہیں، نہ مولانا آزاد اور نہ واحدی صاحب جو اس اشارے کی وضاحت کریں لیکن تاریخ سے اس واقعے کی تفصیل پیش کی جاسکتی ہے جس کی طرف اشارہ ہے واقعہ یہ تھا:

حضرت خواجہ صاحب نے جو حلقۂ نظام المشائخ قایم کیا تھا، اس کے مقاصدِ اربعہ میں تیسرا مقصد یہ تھا:

"عرسوں اور خانقاہوں کی ان مراسم کی اصلاح جو دایرۂ شریعت وطریقت سے علاحدہ ہو گئے ہوں"۔

قطع نظر اس سے کہ عرس ہی کون سی شرعی رسم تھی کہ دیگر مراسم خانقاہی کے جواز وعدم جواز کی بحث چھیڑی جائے! ہوتا یہ تھا عرسوں میں رنڈیاں بھی اپنے حسن کی نمایش اور کمالِ فن کی تشہیر کے لیے یا واقعی بزرگوں سے عقیدت کی وجہ سے شریک ہوتی تھیں۔ نوجوانوں پر اس کا بہت بُرا اثر ہوتا تھا۔ حلقۂ نظام المشائخ نے عرسوں میں رنڈیوں کی شرکت کے

خلاف آواز اٹھائیں۔ اگرچہ اس خلاف آواز کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بالکل ہی شریک نہ ہوں بلکہ ان کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق وضع کردیا تھا کہ حسن کی نمائش کے بغیر وہ کس طرح عرس میں شریک ہوں (گویا کہ اس تحریک اصلاح کے مطابق بھی ''رنڈی ہونا'' خلاف اخلاق وتہذیب اور مخالف شریعت نہ تھا)۔

بہر حال ٹھیک اسی زمانے میں کہ حضرت امیر خسرو کا عرس (۱۷رشوال ۱۳۲۷ھ مطابق یکم نومبر ۱۹۰۹ء) قریب آرہا تھا، حلقے کی طرف سے ایک پوسٹر شایع کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سال امیر خسرو کے عرس میں رنڈیاں بہت کم شریک ہوئیں۔ اس صورتِ حال نے خانقاہ محبوب الٰہی کے بعض حضرات جنھیں خواجہ حسن ثانی نے ''خاندان والوں'' کے نام سے یاد کیا ہے، بہت مشتعل ہوگئے اور ایک پوسٹر کے ذریعے اعلان کردیا کہ حضرت محبوب الٰہی کا عرس اپنی سابقہ روایات کے مطابق ہوگا۔ حضرت ملا واحدی صاحب نے لکھا ہے:

''......لیکن افسوس خانقاہِ محبوب الٰہی کے بعض حضرات نے جو حضرت خواجہ (حسن نظامی) صاحب سلمہ، کی ان نئی نئی تحریکوں کو اپنے نقصان کا باعث سمجھتے ہیں، اس پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور دوسرے ہی دن اس مضمون کا اشتہار دے دیا کہ عرس جس طرح ہوتا آیا ہے اسی طرح ہوگا۔ گویا رنڈیاں آئیں اور خوب رنگ رلیاں کریں۔ لیکن اس بات پر زیادہ زور نہیں دیا۔ اس کے بدلے دوسری بات لے کر گڑ بڑ مچادی''۔

(تاریخ صحافت اردو، جلد: چہارم امداد صابری، دہلی، ۷۵۹)

نظام المشائخ کا یہ پرچہ جس میں یہ تبصرہ شائع ہوا تھا ۶رذی الحجہ ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹ردسمبر ۱۹۰۹ء کو شائع ہوا تھا۔ یہ گڑبڑ صرف دہلی کے خانقاہوں کے سجادہ نشینوں تک محدود نہ رہی بلکہ ملک کے طول وعرض کے تمام عرس پسندوں اور خانقاہ نشینوں نے خواجہ صاحب کے خلاف ایک محاذ بنالیا اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کردیے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ خط اسی زمانے کا ہے۔ اس خط کی قطعی تاریخِ تحریر تو متعین نہیں کی جاسکتی لیکن ۱۹۱۰ء کی پہلی سہ ماہی کا تعین بے شک کیا جاسکتا ہے۔

(۵) ﴿۵۷﴾

۸۹۔ کلنگا بازار اسٹریٹ۔ کلکتہ

۳رجون ۱۹۱۰ء

......

یہ ''متّصل'' خاموشی کیوں؟ کہیے تو سرمد کا بقیہ مضمون لکھ بھیجوں؟ بمبئی سے آتے ہوئے سرمد یاد آگئے تھے۔ ان کی رباعیات کا دیوان ساتھ لے لیا تھا۔ کبھی نظر پڑ جاتی ہے، تو خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو قلم بند کرکے بھیج دوں (۱)۔

علامہ امام الدین لاہیجی ثم الفنجابی دہلی میں آپ سے ملے؟ نہیں معلوم، کیسی گزری!

ابوالکلام آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱) سرمد شہید پر مولانا نے ایک مضمون ''نظام المشائخ'' کے ''شہید نمبر'' کے لیے لکھا تھا اور ایک حصہ مکمل کر کے بھیج دیا تھا۔ ابھی اس کا کچھ حصہ باقی تھا۔ بعد میں اسے بھی لکھ کر بھیج دیا تھا، جو کہ نظام المشائخ کے شہید نمبر (۱۹۱۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے کا ایک خط ملا واحدی صاحب کے نام ہے۔

(۶) ﴿۵۸﴾

۸۹۔ کلنگا بازار اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۵ر جون ۱۹۱۰ء

بھئی! اصل بات یہ ہے کہ عدیم الفرصت بہت ہوں۔ اپنے ذاتی اشغال کے علاوہ چند کام ایسے سر پڑ گئے ہیں کہ ایک گھنٹہ بھی فرصت کا نصیب نہیں ہوتا۔

چند تفصیلی مضامین بعض اہم معاملات کے متعلق ہیں کہ بہت جلد شائع ہو جانے چاہییں، ان کی بھی فکر ہے۔ اُن سب پر طُرّہ اخبار، جو ۱۵ر رجب سے شائع ہو جائے گا۔ پھر بعض تالیفات جن کو مکمّل کر دینا چاہتا ہوں کہ جو زندگی عنقریب شروع ہونے والی ہے، وہ اس کی مہلت بہت کم دے گی(۱)۔

سرمد کا ذکر تو یوں آ گیا کہ آپ خاموش تھے اور چاہتا تھا کہ کوئی ذکر چھیڑ دوں کہ بات کا پہلو نکل آئے۔ قطعی وعدہ نہیں کرتا۔ پہلی رجب کو دیر ہی کتنی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن ہاتھ آ جائے اور لکھ کر بھیج دوں۔ بمبئی پہنچا تو کتب خانے پر نظر ڈالی۔ حالات بھی زیادہ معلوم ہوئے ہیں۔

کیا اب کے اجمیر کا ارادہ ہے؟ ضعیف سا ارادہ میرا بھی ہے۔ اگر آپ کا آنا قطعی

طور پر معلوم ہو جائے، تو ممکن ہے، ضعیف اپنی جگہ، ارادۂ مصمم کے حوالے کر دے۔ صاف صاف لکھیے۔

واحدی صاحب کو خدا جلد شفا دے (۲)۔ یہ دوسری بات ہے۔ مگر مجھ سے پوچھیے تو آدمی کو ہمیشہ بیمار رہنا چاہیے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

حواشی:

(۱) اس بیان میں ''اخبار'' سے اشارہ الہلال کی جانب ہے، جو مولانا اس وقت (گویا کہ وسط جولائی ۱۹۱۰ء) سے نکالنے کی کوشش میں تھے۔ اگرچہ اس میں بہت تاخیر ہوگئی اور ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء سے قبل اس کی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔

(۲) ملا واحدی صاحب مراد ہیں۔ ان کے نام بھی مولانا کا ایک خط یادگار ہے۔ ملا واحدی صاحب کے حالات مکتوب الیہ کی حیثیت سے مجموعۂ مکاتیب کے آخر میں آئیں گے۔

(۷) ﴿۵۹﴾

۱۳۔ میکلا وڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

یکم دسمبر ۱۹۱۱ء

مجبّی!

خط پہنچا تھا۔ علالت اور عدیم الفرصتی نے مہلت نہ دی۔ اب تو خود حاضر ہو رہا ہوں، نامہ بر کی منت پذیری کیوں!

کل رات کو پونے گیارہ بجے کی دربار اسپیشل ٹرین سے روانہ ہوں گا۔ انشاء اللہ دہلی میں ملاقات ہو (۱)۔

واحدی صاحب کو سلامِ شوق۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) ایڈورڈ ہفتم کے انتقال (۱۹۱۰ء) کے بعد جارج پنجم تخت نشین ہوئے۔ ۲۲؍مارچ ۱۹۱۱ء کو اعلان کیا گیا کہ بادشاہ سلامت کی تاج پوشی کا جشن ۱۲؍دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں منایا جائے گا۔ اور بادشاہ بہ نفس نفیس جشن میں شرکت فرمائیں گے۔

اسی وقت سے دہلی میں جشن کے انتظامات شروع کر دیے گئے۔ اس موقع پر اطراف ملک سے دہلی کے لیے ''دربار اسپیشل ٹرین'' چلائی گئی تھی۔ اس موقع پر مولانا آزاد بھی اس ٹرین سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔

(۸) ﴿۶۰﴾

۱۳۔ میکلاؤڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۳؍نومبر ۱۹۱۲ء

زادنا اللہ وایاکم حمیۃ الاسلام!

خط پہنچا تھا۔ یہ سچ ہے۔ مگر اس میں مصر و شام کی کیا خصوصیّت ہے! سیاحتِ قلبی کے جغرافیہ کی کوئی حد نہیں۔

یہ تمام موانع جو آپ نے لکھے ہیں، پیشتر ہی سے پیشِ نظر تھے۔...... (۱) کو میں نے ان کی افسردہ جوابی پر ۶ صفحے کا خط لکھا، جو اگر حس و غیرت مر نہیں گئی، تو نشتر بن کر مدت العمر چبھتا رہے گا۔ تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ ان خوش پوش غلاموں سے کوئی امید نہیں۔ علی گڑھ کی تحریک نے مسلمانوں کو عضوِ شل بنا دیا ہے۔ لیکن بہ ہر حال فرصت قلیل اور وقت نازک ہے۔ فتح پوری میں جو مجلس ہوئی، کافی نہیں۔ اس کی روئیداد بھی متضاد چیزوں کا مجموعہ۔ ایک صاحب حکیم جی کو صدر بتاتے ہیں (۲) دوسرے صاحب سرے سے شرکتِ محض ہی سے ساکت ہیں۔ چندے کا طالب نہیں، لیکن صرف ایک اجتماعِ عام ہونا چاہیے۔ باہم دعائے نصرت و فتح، اصلی مقصود اتحاد بین الملی کہ بنیادِ حقیقی و اصل رشتۂ ارتقا و اصلاحِ اسلام ہے۔ اور اس کے لیے اس موقعے سے بہتر اور پھر کوئی وقت نہ ملے گا۔

آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فایدہ نہیں پہنچا سکتی۔ خواہ وہ یونیورسٹی کا افسانہ ہی کیوں نہ ہو، جب تک تمام دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی و عالم گیر اتحادی تحریک نہیں ہوگی، زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چالیس کروڑ مسلمانوں کو کیا فایدہ پہنچا سکتے ہیں! بہ ہر حال یہ داستان طویل ہے۔

مقصود صرف یہ ہے کہ سرِ دست ایک جلسے کا انتظام ہو سکے، جو عام، اور زیادہ تر عام آبادی پر مشتمل ہو۔ کچھ ضرور نہیں کہ دہلی کا کوئی سر برآوردہ یا خطاب یافتہ بھی اس میں شریک ہو۔ آپ اس پر غور کیجیے۔ اور جلد جواب دیجیے۔ آتے اتوار کو دوسرا جلسۂ عام ہے۔ اس کے بعد قطعی ارادۂ سفر۔ والاتمام من اللہ۔

وانا الفقیر احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی

حواشی:

(۱) اس مقام پر علی گڑھ کے ایک بزرگ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کا نام تھا جو خواجہ صاحب نے حذف کر دیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی جگہ کو خالی رہنے دیا تھا اور نہ اس کی وضاحت کی تھی۔ صاحب زادہ صاحب ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سیکریٹری تھے۔

اس زمانے میں سب سے اہم مسئلہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) اور اس کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے مساعی خیر کا تھا۔ جن کے تذکرے سے الہلال کی پہلی جلد کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ صاحب زادہ مرحوم نے اسی مسئلے پر مولانا آزاد کے ایک مضمون مطبوعہ الہلال ۴راگست ۱۹۱۲ء میں راجہ صاحب محمود آباد کے تذکرے پر ان کی مدافعت اور صفائی میں مولانا کو ایک خط لکھا تھا، جو الہلال کی ۱۸راگست کی اشاعت میں شامل ہے۔ اُسی خط کی طرف مولانا نے خواجہ صاحب کے نام اس خط میں اشارہ کیا ہے۔ ورنہ بغیر کسی تحریک کے از خود مولانا کسی کو ایسا سخت خط لکھنے کے کبھی روادار نہیں ہوئے۔

(۲) اسی زمانے میں دہلی میں اسی مسئلے پر کوئی جلسہ ہوا تھا۔ جس میں حکیم محمد اجمل خاں دہلوی کی شرکت یا صدارت کی طرف اشارہ ہے۔

(۹) ﴿۶۱﴾

دفتر البیان توحید، میرٹھ

۱۶رمئی ۱۹۱۲ء(۱)

وعلیکم السلام

۱۔ قائل ہوں۔

۲۔ اس کا اتفاق نہیں ہوا۔

۳۔ ایک اتنا بڑا مذہبی اجتماع کیوں نہ مفید ہو! البتہ ضرور ہے کہ اصلاح کی

جائے۔ نیز ضرور ہے کہ تبدیلیاں ہوں!

فقیر ابوالکلام

حواشی:

(۱) خواجہ حسن ثانی نظامی نے ''منادی'' میں مولانا کے جو خطوط شائع کیے ہیں۔ ان میں اس خط پر اسی طرح مقام و تاریخ تحریر کی ہے۔ گویا مولانا نے اخبار توحید کے دفتر میرٹھ میں بیٹھ کر ۱۶ رمئی ۱۹۱۳ء کو یہ خط لکھا تھا۔ ''نقش آزاد'' میں مقام و تاریخ محذوف ہے۔ جناب مالک رام نے اتالیقِ خطوط نویسی سے خطوط نقل کیے ہیں۔ اُس میں یہ تاریخ و مقام خواجہ حسن نظامی کے اس خط پر درج ہے، جس کے جواب میں یہ خط ہے۔ صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ و مقام تحریر خواجہ صاحب کے خط کا ہے۔ اس صورت میں مولانا کے خط کا مقام تحریر کلکتہ، دہلی یا کوئی اور مقام ہوگا اور تاریخ ۱۶ رمئی کے بعد کی کوئی تاریخ ہوگی۔ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مولانا سفر میں ہوں۔ ایک ہی مجلس میں پوچھا گیا ہو اسی وقت جواب دے دیا گیا ہو، سوال جواب دونوں کی ایک ہی تاریخ و وقت اور ایک مقام تحریر ہو۔

میرٹھ سے ہفت روزہ توحید ۱۵ را پریل ۱۹۱۳ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ خواجہ حسن نظامی اس کے اعزازی مدیرِ اعلیٰ اور بھیا احسان مدیر تھے۔ الہلال میں ۶ رمارچ ۱۹۱۳ء کو اس کے اجرا کا اعلان اور ۱۶ رمئی کو اس پر تبصرہ چھپا تھا۔ توحید صرف پانچ مہینے جاری رہ سکا۔ خواجہ صاحب کی ایک تقریر ''کہو اللہ اکبر'' چھاپنے کے جرم میں گورنر یوپی لارڈ مسٹن کے حکم کے تحت بند کر دیا گیا۔

(۲) خواجہ حسن نظامی نے مولانا آزاد سے پوچھا تھا: آپ کراماتِ اولیا کے قایل ہیں؟ کیا آپ نے خواجہ اجمیری کی کوئی کرامت دیکھی ہے؟ اور کیا آپ خواجہ اجمیری کے عرس کو کسی حیثیت سے مفید سمجھتے ہیں؟ جواب کے لیے یہ شرط بھی تھی کہ دو سطری اور جلد ہونا چاہیے۔ جواب میں مولانا نے یہ خط لکھا۔

(۱۰) ﴿۶۲﴾

خواجہ صاحب نے لکھا تھا کہ حاجی محمد ضامن صاحب نے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین میں خاص اس موقع پر چلے شروع کرادیے ہیں، جب کہ قاضی سید صفدر علی مشاعرے کراتے تھے، قاضی صاحب کے قدیمی حق کی طرف توجہ فرمانے کی مولانا سے درخواست کی گئی تھی۔ ۲۸ رجون ۱۹۵۳ء

جواب:

مولانا نے تحقیقات حال کے لیے فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ضامن صاحب اپنے

آپ کو ہیڈ پریسٹ کہتے ہیں۔ معلوم نہیں اس سے ان کی کیا مراد ہے۔ خلاف مسلک مشائخ وہ حکومت کے افراد کو درگاہ میں بلا کر عمامہ وخلعت سے سرفراز کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال یہ بھی ایک دلچسپ قسم کی پیری ہے۔ معاملے کی تحقیقات ہو رہی ہے۔

اجمل

(١١) ﴿٦٣﴾

خواجہ حسن ثانی نظامی کے نام: خواجہ صاحب کے انتقال پر مولانا کا خط

دہلی۔

اگست ١٩٥٥ء

جناب محترم تسلیم

خواجہ صاحب کی وفات پر نہایت قلق ہوا۔ بہ راہِ کرم ان کے تمام عزیزوں کو تعزیت کا پیغام پہنچا دیجیے!

ابوالکلام (١)

حاشیہ:

(١) یہ خط ماہنامہ منادی۔ نئی دہلی میں چھپا تھا۔ خواجہ صاحب کا انتقال ٣١ رجولائی ١٩٥٥ء کی شام کو مغرب کے بعد ہوا تھا اور یکم اگست کو ان کے سکونتی مکان کے قریب بستی نظام الدین (نئی دہلی) میں تدفین ہوئی تھی۔

اس خط کا اندراج اسی مقام پر صحیح معلوم ہوا۔

مولوی ان شاء اللہ خاں (لاہور):

﴿۶۴﴾

نمبر ۱۱، کولوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء

شفیقِ مکرم!

اظہارِ ندامت و معذرت کے لیے الفاظ نہیں ملتے کہ میرے عدم اطلاع میں آپ کا وی پی واپس ہو گیا۔

قطعی ارادہ ہے کہ وسطِ جنوری سے مرحوم ''دارالسلطنت'' کو زندہ کروں۔ غالباً آپ بھی اس کو پسند کریں گے کہ ایک مستقل اخبار میرے زیرِ قلم ہو۔

اب کچھ کام کی باتیں سنیے: آپ کو تاریخِ ہندستان (فارسی) سر جان مارشمین کلارک، مطبوعۂ قدیم کلکتہ، ارکانِ اربعہ، مآثرِ عالمگیری اور تاریخ نادری کی ضرورت تھی۔ چناں چہ متعدد بار اس ضرورت کا آپ اظہار کر چکے ہیں۔ ان چاروں کتابوں کے کافی نسخے میرے پاس موجود ہیں۔ مگر اب مبادلۂ کتب نہیں ہو سکتا، نقد قیمت پر معاملہ کیجیے!

آپ تاریخِ ہند اور مآثرِ عالمگیری کو چھ چھ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں۔ مجھ سے ڈھائی روپے اور ساڑھے تین روپے میں لیجیے۔ اول الذکر آپ تین (روپیہ) میں بصیغۂ مبادلہ لے چکے ہیں اور بصورتِ نقد آٹھ آنے کی تخفیف۔ ارکانِ اربعہ اور تاریخ نادری، ایک روپیہ اور دو روپے سے کم میں ممکن نہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد تفصیلی جواب دیں گے۔

کوئی کارآمد قیمتی کتاب معاوضے میں دیجیے، تو لینے کے لیے تیار رہوں۔ مثلاً ؟

تمدن عرب یا مطبوعاتِ عربی۔

''دارالسلطنت'' کی نسبت اب تک کوئی نوٹ ''وطن'' میں نہیں نکلا۔ ''دار السلطنت''، ''وطن'' کے مقاصد کا حامی اور اس کی اسلامی خدمات کا ہمیشہ معترف رہے گا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

مولوی عبداللطیف (کلکتہ):

﴿۶۵﴾

نومبر ۱۹۰۶ء میں اخبار وکیل۔ امرتسر سے مولانا آزادؒ کلکتہ تشریف لے آئے تھے۔ مولوی محمد یوسف جعفری نے مولوی عبداللطیف تاجر چرم سے تعارف کرایا اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ دارالسلطنت (ہفت روزہ) جو ان کے والد نکالتے تھے اور اب ایک مدت سے بند تھا، مولانا آزادؒ کی ادارت میں دوبارہ جاری کریں۔ انھی دنوں میں آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹیل ایجوکشنل کانفرنس کا ڈھاکا میں اجلاس ہونے والا تھا اور مولانا آزادؒ اس میں شرکت کے خواہاں تھے۔ مصارفِ سفر کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ مولانا نے آیندہ جنوری کی تنخواہ سے پیشگی رقم طلب کی، ۱۹۰۷ء کے شروع میں کچھ دنوں تک ''دارالسلطنت'' نکلتا رہا تھا۔

۱۱۔ کولوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ

جنابِ مکرم!

افسوس ہے کہ کثرتِ کار اور ہجومِ احباب سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ خود حاضر ہوں۔ پریس کی نسبت ضروری معلومات بہم پہنچ چکی ہے اور صرف ایک گھنٹے کا کام رہ گیا ہے۔ میں اس کو بھی ابھی طے کر لیتا، مگر ہجوم احباب ایک گھنٹے کی فرصت نہیں دیتا، اس لیے آج شام کو ڈھاکا روانہ ہوں گا، پہلی جنوری کو یقیناً واپس آجاؤں گا۔ پہلی سے ۷ ار تک کافی وقت ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد قیامِ پریس کی صورت ہو جائے گی۔

لیکن ایک انتہائی ضروری معاملہ ہے، جو اس وقت اس خط کے لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ضرورتیں متقاضی نہ ہوتیں تو میری خودداری اس کے لکھنے سے سخت مانع آتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ماہ کی تنخواہ متعلق اخبار مجھے اس وقت پیشگی دے دیں۔

بشرطے کہ پیشگی دینے میں کوئی امر مانع نہ ہو، ڈھاکا سے واپسی پر اخبار جاری ہو جائے گا اور ان شاء اللہ پہلے ماہ میں یہ رقم وضع ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس میں عذر نہ ہوگا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ یہ پیشگی رقم میرے لیے ایک نہایت کارآمد اور بے حد مفید رقم ہوگی۔

اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ کی دوستانہ توجہ کا ممنون ہوں اور ممنون رہوں گا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

۲۵/دسمبر ۱۹۰۶ء

حاشیہ:

(۱) ابھی تک یہ بات علم میں نہیں آسکی کہ دارالسلطنت کا کوئی پرچہ بھی کسی محقق کی نظر سے گزرا ہو! سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی کے نام مولانا کے خط مورخہ ۸/دسمبر ۱۹۰۶ء میں دارالسلطنت کا ذکر پڑھا، اس کے بعد مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن لاہور کے نام خط مورخہ ۱۲/دسمبر ۱۹۰۶ء میں ان کے علاوہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت کے مطابق ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں مولانا آزاد کا بیان دیکھا۔ اس کے بعد مولوی عبداللطیف مالک اخبار دارالسلطنت کے نام مولانا کا ایک خط دستیاب ہو گیا۔ خواجہ صاحب اور مولوی صاحب کے نام مولانا کے خطوط میں نے اپنے مجموعے ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' (مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء) میں شامل کیے تھے اور انھیں حوالوں سے میں نے اپنی کتاب ''ارمغان آزاد'' اور ''مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت'' میں ذکر کیا تھا۔ اب قدرت اللہ فاطمی کی عنایت سے مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کی بیاض سے ''دارالسلطنت'' کا قطعۂ تاریخِ اشاعتِ ثانی دستیاب ہو گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دارالسلطنت کا پہلا دور ۱۹۰۰ء میں ختم ہوا تھا اور سات سال کے وقفے کے بعد ۱۹۰۷ء (جنوری) میں مولانا آزاد کے زیرِ ادارت اس کی اشاعت کا دوسرا دور شروع ہوا تھا۔ مولانا رنجور مرحوم کا قطعۂ تاریخ مع عنوان یہ ہے:

قطعۂ تاریخ اشاعت دومین اخبار دارالسلطنت۔ کلکتہ

ہوگئے رخصت خزاں کے دن، چلی بادِ بہار
ہوگیا سرسبز پھر گلزارِ دارالسلطنت
شائقو! دوڑو، خریدو! یہ متاعِ بے بہا
گرم پھر ہوتا ہے اب بازارِ دارالسلطنت
حاضری کے واسطے ہوں مستعد نامہ نگار

منعقد ہوتا ہے پھر دربارِ دارالسلطنت
جس کا جی چاہے، وہ ہو جائے یہاں سے مستفیض
ہے بہت فیاض یہ سرکارِ دارالسلطنت
جہل کی جو ظلمتیں ہیں ملک میں پھیلی ہوئی
دور کردیں گے انھیں انوارِ دارالسلطنت
ہے جو یہ گھڑ دوڑ اخباری ترقی کے لیے
اس میں اول آئے گا رہوارِ دارالسلطنت
ہیں اڈیٹر حضرتِ آزاد تو پھر کیوں نہ ہو
شہرتِ شیرینیِ گفتارِ دارالسلطنت
اس فراقِ ہفت سالہ پر نہ تھی ہرگز امید!
پھر میسّر آئے گا دیدارِ دارالسلطنت
یاس کا سر کاٹ کر رنجور تاریخِ شیوع
-۱۰
لکھ دو ''پھر چھپنے لگا اخبار دارالسلطنت''

۱۹۱۷-۱۰=۱۹۰۷ء

چوں کہ مولانا کے خطوط و بیان میں اور اس تاریخ میں ''دارالسلطنت'' کے ساتھ ''اخبار'' کا لفظ اور ''نامہ نگاروں'' کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ''دارالسلطنت' ہفت روزہ ہوگا یا پھر زیادہ سے زیادہ پندرہ روزہ!

علامہ شبلی نعمانی:

(۱)

﴿۶۶﴾

حضرت علامہ شبلی مرحوم کے نام مولانا آزاد کے یہ خطوط معارف (اعظم گڑھ) اور کئی دوسری جگہ شایع ہوئے تھے۔ اسی کسی حوالے سے "مکاتیب ابوالکلام آزاد" میں شامل کیے تھے۔ اب اس مجموعے میں شامل کیے جاتے ہیں۔

آقاے من!

آج پُرانے کاغذات میں لفافے ڈھونڈ رہا تھا۔ آپ کے چند خطوط اور کارڈ نکل آئے۔ میں پھر اسی تمنّا زار میں پہنچ گیا، جہاں کسی کی نگہِ ارادت نواز مایۂ حیات تھی۔

والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے(۱)۔ اخبارات میں بھی تذکرہ آچکا ہے، مگر آپ نے ایک سطر بھی نہیں لکھی! دل ارادت وعقیدت سے اسی طرح لبریز ہے، جیسے پہلے تھا اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔

از طورِ صلح و عربدہ بیگانہ ام ہنوز
بر آتشے نہ تافتہ پروانہ ام ہنوز

معلوم نہیں آپ کہاں ہیں؟ حافظ عبدالرحمٰن راوی تھے کہ عرصے تک آنے کی اُمید نہیں، بہ ہر حال میں چہلم کے بعد بمبئی پہنچتا ہوں اور وہاں سے جہاں آپ ہوں۔

ابوالکلام

۲۶/اگست ۱۹۰۸ء

حواشی:

(۱) مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین کا انتقال ۱۵/اگست ۱۹۰۸ء کو ہوا تھا۔

(۲) حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ان پر حاشیہ مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کے نام خطوط کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

(۲) ﴿۶۷﴾

۱۴۳۔ میکلا وڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۶۔۹۔۱۹۱۰ء

یا مولی الجلیل!

تعلیقۂ مبارک پہنچا۔ پچھلے کارڈ میں آپ نے لکھا تھا کہ غضب ہے کہ تم ضروری باتوں کا بھی جواب نہیں دیتے، سوچ رہا ہوں کہ آپ کے خط میں غیر ضروری بات کون سی ہوتی ہے؟

کتابیں خط کے ساتھ رجسٹرڈ روانہ کی گئیں، لیکن کبھی کبھی ڈیلوری میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ ہاں البتہ اگر ''کتاب الوفاء دار المصطفیٰ'' کا نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ تو نہایت نایاب ہے(۱)۔ شیخ عبدالحق محدث کو بھی غالباً نہیں ملا تھا، کیوں کہ ''جذب القلوب'' میں صرف ''خلاصۃ الوفاء'' کا خلاصہ وترجمہ ہے۔

دیوان صائب سے کیا وہ نسخہ مقصود ہے۔ جو امپیریل لائبریری میں بخطِ مصنّف موجود ہے؟ اس کا عکس جب چاہیں لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ لائبریرین ہری ناتھ دے سے شناسائی ہے۔

اول تو میں اب کلکتہ سے کہاں نکلتا ہوں، لیکن نمایش الہ آباد کا ضعیف سا خیال ہے، مگر مسئلۂ قیام پیش نظر! الہ آباد میں میری کسی سے ایسی ملاقات نہیں کہ اپنا بوجھ ڈالوں۔ ایک دو بار مسٹر اسحٰق کے ہاں ٹھہرا مگر برسم طفیلی! کہ جب آپ کہیں ٹھہریں گے تو آپ کے خدام ووابستگان بھی لامحالہ! میں بھی ایک جاکر گستاخ تھا کہ ٹھہر گیا۔

علاوہ بریں وہ زمانہ ایسا ہوگا ''من کل فج عمیق'' زایرین نمایش کا ہجوم اور ہر الہ آبادی کا گھر مہمان سرا۔ پس آج چاہتا ہوں کہ سپرنٹنڈنٹ سے خط وکتابت کر کے بہ اجرت قیام کا بندوبست کرلوں۔ کیوں کہ خیموں میں فی کس تین روپے روزانہ لے کر انتظام کیا گیا ہے۔

''شہاب ثاقب'' کو پہلے اچھی طرح نہیں سمجھا تھا، کیوں کہ اس نصِ مبہم ومتشابہ کی کئی تاویلیں ہوسکتی تھیں، مجبوراً مذہبِ اربابِ ظواہر ومحدثین اختیار کیا تھا، یا مذہب سلف کیفیتہ مجھول والسّوال عنه بدعة الخ کہ استوا علی العرش پر بالفاظہ ایمان لانا چاہیے۔لا یعلم تاویله الا الراسخون فی العلم اور رسوخ علم سے بے بہرہ! البتہ اتنی تسکین تھی کہ الا من ارتضی من رسول بھی کہیں کہیں آیا ہے۔اب پرسشِ مزید سے درجۂ متکلمین اشعریہ حاصل ہوا کہ تاویل کی جرأت ہوئی، مگر متمنی درجۂ اربابِ کشف جہاں حقایق اصلیہ بصورت حقیقی منکشف ہو جاتے ہیں۔

......(۲) کا اس کارروائی سے ایک مقصد تو ان جملوں کا انتقام ہے جو ان کی تلون مزاجی، ضمیر فروشی کی نسبت ہمیشہ آپ کی زبان سے نکلے، پھر یہ بھی کہ ان لوگوں کے عقیدے میں اپنے قد کی پستی مبدل بہ بلندی نہیں ہوسکتی، جب تک دوسروں کے قد کو پست نہ ثابت کیا جائے۔

میں تو کسی اردو اخبار کو خریدتا نہیں، مفت آیا کرتے تھے، سو وہ بھی اب بند۔ اتفاقاً مرزا صاحب نے (۳) ''دل گداز'' دکھایا۔ (۴) تو پہلا مضمون نظر سے گزرا، تاہم آپ اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہیں کہ ایسے لوگوں کے منہ لگیں فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا O

''دیوانِ شرف جہاں'' دیلو بھجوا دیجیے!

''کنز العلوم'' کے لیے آج لکھتا ہوں۔

کاش! آپ سے ملاقات ہوتی تو بہت باتیں کرتا، میری قلبی حالت عجیب وغریب ہو رہی ہے۔لیکن افسوس کہ بظاہر حالات جلد شرف یابِ زیارت ہونے کی اُمید نہیں۔

کیف الوصول الیٰ سعاد و دونها
قلل الجبال و دونهن خیوف

اکتوبر میں رنگون ہی چلیے۔ والد کے عقیدت مند وہاں کم نہیں

ابوالکلام دہلوی

حواشی:

(۱) کتاب کا پورا نام ''وفاء الوفاء بالا خبار دار المصطفیٰ'' ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۶ھ میں دو جلدوں میں چھپی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو اس کی صرف تلخیص ملی تھی، جس کا ترجمہ انھوں نے ''جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب'' کے نام سے فارسی میں مرتب کیا تھا۔

(۲) یہاں شبلی کے جن مخالف و نکتہ چیں بزرگ کا نام تھا وہ خطوط کی اولین اشاعت ہی میں حذف کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی راز رکھا جائے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بہت احتیاط کے ساتھ حضرت شبلی کی مخالفت کے پسِ منظر سے پردہ ہٹا دیا ہے اور مخالفین کے نام بھی درج کر دیے ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں یہ نام مولوی خلیل الرحمٰن نائب ناظم (۱۸۷۹ء۔۱۹۳۶ء) ابنِ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ شبلی مرحوم نے خود بھی اپنے خط مورخہ ۱۵ر جون ۱۹۰۹ء میں ان کا نام لے کر ان کی مخالفتِ بے جا کا ذکر کیا ہے۔ ان کی کارروائی سے مقصود اس بے ضابطہ جلسۂ انتظامیہ کی کارروائی ہے جس میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی اخلاقی و مذہبی حالت کی تحقیق کے لیے ایک انکوائری کمیٹی کا قیام منظور کیا گیا تھا اور یہ کہ معتمد دار العلوم علامہ شبلی کا بیان بھی لیا جائے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: ''حیات شبلی''، ص ۶۳۹ تا ۶۴۳)

(۳) مرزا فضل الدین احمد کی طرف اشارہ ہے، جو مولانا آزاد کے ''تذکرہ'' کے محرکِ تالیف تھے۔

(۴) مولانا عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء تا ۱۹۲۶ء) کا مشہور ماہنامہ دلگداز۔ لکھنو، جنوری ۱۸۸۷ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں شرر حیدر آباد چلے گئے اور دلگداز بند ہو گیا۔ ۱۹۰۴ء میں شرر حیدر آباد سے لوٹے تو اسے پھر نکالنا شروع کیا جو آخر زمانے تک جاری رہا۔

﴿۶۸﴾ (۳)

حضرت!

میری مصلحتِ دید تو یہ ہے کہ کہیں نہ جایئے لکھنو میں رہیے۔ حج کی دو صورتیں ہیں، ایک تو للعوام کہ بہ تلاشِ کعبہ بحر و بر ہا طے می کنند اور دوسرا للخواص کہ جب

ضرورت ہوتی ہے، کعبہ کو طلب کر لیتے ہیں۔ ''ابراہیم بن ادھم ہر ہر قدم دو رکعت نماز کرد، چوں قریب کعبہ رسید، نہ یافت۔ ندائے غیبی بگوش رسید کہ برائے استقبال رابعہ بصریہ رفتہ''۔ آپ کا درجہ اس سے بلند ہے کہ کعبہ کی تلاش میں دشت پیمائی کریں۔

ہاں! اجرام سماوی کا مطالعہ اور تفکر فی خلق السموٰت والارض، گو لکھنو میں بیت المقدس جیسی ٹیلسکوپ اور دوربین نہیں، اس لیے اجرامِ بعیدہ کا مطالعہ بے عذر۔ لیکن تاہم اگر علم ہیئت کے ابتدائی مراتب کی تحقیق منظور ہو تو شہابِ ثاقب کے اجرام کی تفرید و تحلیل کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ بابِ حرم سے عراقی کی طرح سُننا پڑے:

تو برونِ درچہ کردی کہ درون خانہ آئی

ابوالکلام

میکلا وڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۱/ اکتوبر ۱۹۱۰ء

حاشیہ:

(۱) مولانا آزاد کا یہ خط حضرت شبلی (مرحوم) کے ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۰ء کے مکتوب کے جواب میں ہے۔ حضرت مرحوم نے لکھا تھا:

> ''آپ حیدر آباد چلتے ہیں تو میں افریقہ ہو کر کعبہ کو جا سکتا ہوں۔ ترکستان واپسی میں آجائے گا۔ جزیرہ (مسکنِ عطیہ فیضی،) تو ہرگز جانے کا ارادہ نہیں۔ البتہ چمنستان بمبئی کو چھوڑنا فردوس کو چھوڑنا ہے، جو ایک زاہد سے ممکن نہیں......''۔

ایسے پر لطف اور بے تکلف خط کا جواب ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ جیسا مولانا نے دیا۔

(۴) ﴿۶۹﴾

کلکتہ۔

۲۰/ اکتوبر ۱۹۱۰ء

یا مولی الجلیل!

گو رابعہ بصریہؒ کی جلالتِ مرتبت کا سید الطائفہ تک کو اقرار اور آپ تو اپنے ظہور اول میں یہاں تک معترف کہ ''خدایا ایں چہ بوالعجبی ست کہ مردان عالم را ازاں محروم می کنی کہ نصیب ایں پیرزن است'' لیکن تاہم الذکر مثل حظ الانثیین اور سرِ دست تو آپ کو اس آیت کے دقایق حل کرنے ہیں کہ الرجال قوامون علی النساء

ماسٹر دین محمد نہایت وحشت انگیز خبر لائے۔ میں وارداتِ مسرت و نشاط میں شریک نہ تھا۔ مگر اجازت دیجیے کہ ماتم میں بقدرِ استعدادِ دست و سینہ حصّہ لوں! ''لا یحب الآفلین'' سرائی تو مخصوص بامثال ابراہیم ہے(۱) مگر میرے عقیدے میں آپ امت مرحومہ کی اس جماعتِ ابدال سے کسی طرح کم نہیں، جن میں سے ہر فرد چالیس درجہ ابراہیمؑ خلیل اللہ سے مرتبے میں زاید، بہ طفیلِ فیضانِ محبوبیت محمد یہ کما ورد فی الحدیث(۲)! پس کم از کم آپ کو زبانِ حال سے ''انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفاً'' ضرور کہنا چاہیے اور نیز ''ما انا من المشرکین'' جو نفوس قدسیہ عطیۂ توحید سے فیض یاب ہوں، انھیں کیا ضرور کہ آلودۂ شرک ہوں۔ یہ تو ہم ایسے بت پرستوں کے لیے رہنے دیجیے!

اس زمانے کی خیرہ مذاقی دیکھیے کہ ''دیوان فیضی'' کا اولین مستحق تو کتب خانۂ ندوہ تھا کہ ان چیزوں کا موجودہ عہد میں آپ کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ گورنمنٹ لائبریری الٰہ آباد میں اس کے دقایق و محاسن کو سمجھنے والا کون ہے؟ اور یوں ورق گردانی اور عنوان ہائے جلی کو نا فہمانہ دیکھ لینا دوسری بات ہے۔ الٰہ آباد کی نمائش بازارِ مصر سے تو کسی طرح فایق نہیں، لیکن جب اس کی نسبت اردو کے ملک التجار نے صاف کہہ دیا کہ

خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

تو پھر نمائش کے خریداروں کی حقیقت معلوم! البتہ اس واڑوں روشنی کی حمایت

میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مقصود بیع وشرا نہیں، بلکہ صرف نمایش! لیکن شاید جناب کو اس پر بھی اعتراض ہو۔

بار بار چاہا کہ اپنی سرگزشت عرض کروں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک دفتر بے کنار اور پھر اتنے بڑے دفتر میں کہیں فصل نہیں، باب نہیں! حیران ہوں کہ کہاں سے عرض کروں اور کس قدر! ایک قصّہ ہوتا تو سنا دیتا۔ میری داستان تو ایک مجموعۂ قصص ہے۔ اپنی کن کن مصیبتوں کو عرض کروں:

بکشت ما گزار لشکرِ اُفتاد

مونسِ قدیم بخار کی صحبت شبانہ روزی نے عدیم الفرصت کر دیا ہے، چند دنوں کے لیے یہ کہیں تشریف لے گئے تو اپنے سلسلۂ قصص کا کوئی تازہ ترین افسانہ بالا ختصار عرض کروں گا:

ز اں جملہ یکے قصۂ محمود و ایاز است

''کنز العلوم'' کے لیے شیخ محمد کو کہہ دیا تھا، تعجب ہے کہ نہیں بھیجا، آج ان کو پھر لکھتا ہوں، بایں مضمون کہ اگر آپ کے لیے دقّت و اشکال ہو تو مجھے بھیج دیجیے۔ میں خود بھیج دوں گا۔

دواوین و تذکار کا خیال رکھیے۔ جب کوئی عمدہ نسخہ ہاتھ آئے تو مجھے یاد کر لیجیے۔ چاہتا ہوں کہ قُدماو متوسطین کے تمام دواوین جمع کر لوں نیز تذکرے، ورنہ مطالعہ کے لیے تو سوسایٹی میں کافی ہیں (۳)۔

جناب کی نئی غزلیں شایع ہوئی ہیں۔ صرف خبر سنی آج کل کوئی پرچہ نہیں منگواتا۔

مولانا ہدایت حسین (مولانا ان کا لقب ''کالعلم'' ہے) لکھنو جاتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ مولوی سید عبدالحی صاحب (۴) کا تذکرہ علماے ہند زیرِ تصنیف دیکھیں کیوں کہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے لیے لکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سے ملیں گے۔ مولوی صاحب سے کہہ دیجیے کہ دکھلانے میں بخل نہ کریں (۵)۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) عطیہ فیضی حیدرآباد جانے والی تھیں اور علامہ شبلی نے مولانا آزاد کو بھی حیدرآباد چلنے کی ترغیب دی تھی۔ جس کے سبب میں مولانا آزاد کا مرموز خط مورخہ ۱۱ راکتوبر گزر چکا ہے۔ جس میں انھوں نے صاف لکھ دیا تھا کہ حضرت یہ کوچہ گردی اور صحرانوردی آپ کے شایان شان نہیں۔ آپ کا مقام اس سے بہت بلند ہے...... وغیرہ وغیرہ مع الامثال۔ اس کے جواب میں حضرت شبلی نے جو خط لکھا وہ بھی تمام تر مرموز عبارت میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اچھا کہیں نہیں جاؤں گا......''

بندہ را فرماں نباشد ہر چہ فرمائی بر آنم!

لیکن کیا شبلی کو رابعہ کا درجہ مل سکتا ہے، الیس الذکر کالا نثی؟ ماسٹر دین محمد وطن گئے تھے اور سخت جاں گزا خبر لائے۔ یعنی بدر کامل حیدرآباد سے دلی پہنچ کر ختم ہو گیا۔ مرتبۂ ابراہیمی کہاں سے ہاتھ آئے کہ لا احب الافلین کہہ سکوں۔

(الف) وحشت انگیز خبر یہ تھی کہ عطیہ حیدرآباد سے دہلی چلی گئیں اور کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں اور کب تک قیام ہوگا۔ دہلی کا سفر کس تقریب سے ہو، دہلی میں یہ کہاں ٹھہریں اور ملاقات کی سبیل کیا ہو؟ اگر بمبئی گئی ہوتیں تو حیدرآباد سے چمنستانِ بمبئی کا سفر آسان تھا۔

(ب) حضرت ابراہیمؑ جیسا عشق حقیقی کہاں میسّر ہے کہ چھپ جانے اور آفل (فنا ہو جانے والوں) کی محبت سے باز آ جاؤں۔

مولانا آزاد حضرت شبلی کے عطیہ سے عشق کے راز دار تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کو شبلی کی اس واردات کا پتا ہی نہ تھا۔ ان کی عقیدت مند نگاہیں شبلی کے قدموں سے دل تک کبھی بلند نہ ہو سکیں۔ سید صاحب ان کے صرف شاگرد تھے اور ان کے انسانی جذبات کو سمجھنے سے محض معذور ابوالکلام شبلی کے فضل و کمال کے معترف ان کے شریک راز دوست اور ان کے انسانی جذبات سے واقف اور ان کے قدر دان تھے۔

شبلی کی عظمت کے ہیکل کی تعمیر میں ان کے علم و مطالعہ کی وسعت، ذہن کی دراکی، ذوق و فکر کے محاسن، تصنیف و تالیف کے کارناموں، سیرت النبی کے جامع منصوبے، تحقیق و تدوین کے آغاز و بنیاد کے قیام سے لے کر ان کے عاشقانہ مزاج تک کا حصہ ہے۔ اگر وہ عشق مجازی کے ابتلا سے نہ گزرے ہوتے تو وہ عشق حقیقی کے اس مقام کو بھی نہ پا سکتے جوان کے انسان ہونے کے لیے ضروری تھا۔ عطیہ نادان اور ناواقف نہ تھی، اس نے شبلی کی محبت کا جواب محبت سے بہ اندازِ عقیدت دیا۔

شبلی کی عظمت کا یہ پہلو بھی ہے کہ عطیہ کے عشق میں انھوں نے کچھ گنوایا نہیں، بلکہ پایا ہے۔ اگر ان کا ظاہری جامۂ زہد تار تار نظر آتا ہے تو وہ پہلے ہی ان کے قامتِ زیبا پر درست کب آتا تھا اور اگر انھوں نے اپنے ہی سالہ شیشہ زہد و

تقویٰ کوتوڑا تھا:

جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود
شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام

تو عطیہ نے بھی انھیں اپنے قرب ووصال کی لذتوں سے محروم نہ کیا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر انھیں آدابِ ہم آغوشی سکھائے تھے:

من فدای بتِ شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

البتہ جب رقیبوں نے دیکھ لیا اور محرومین وصال کو خلوت کدۂ ناز و نیاز کا پتا چل گیا تو اس نے بھی شور مچا دیا۔ وہ خواہ کتنی ہی آزاد خیال ہو اور مشرقی عورت نہ ہوتی تب بھی، رہتی تو مشرق میں تھی اور اس کا مرنا جینا تو مشرقی معاشرے ہی سے وابستہ تھا۔

(۲) یہ مزاحیہ اشارہ کسی متصوفانہ اور موضوع روایت کی جانب ہے۔

(۳) سوسایٹی سے مراد رائل ایشیاٹک سوسایٹی آف بنگال کا کتاب خانہ ہے۔

(۴) مولانا حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء (۱۸۶۹ء تا ۱۹۲۳ء) بلند پایہ ادیب ومحقق، عربی اور اردو کی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، ادب، تذکرہ، تاریخ وغیرہ میں مرحوم کی کتابیں بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ مرحوم نے اپنے پیچھے دو فخر روز گار فرزند چھوڑے تھے۔ ڈاکٹر سید عبدالعلی (۱۸۹۳ء تا ۱۹۶۱ء) اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: (۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) عالمی شہرت کے عالمِ دین، عظیم مفکر، صاحبِ تصنیفات وتالیفاتِ کثیرہ اور ناظم ندوۃ العلماء، لکھنو۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس خاندان کے اسلاف کی علم وعمل کے میدانوں میں خدمات کے معترف تھے اور اس خاندان کے اخلاف مولانا آزاد کے معتقد اور ان کی عظمت اور قومی وملی خدمات کے مداح ہیں۔

(۵) تذکرہ علماے ہند سے اشارہ مولانا سید عبدالحی کی معرکہ آرا تالیف نزہۃ الخواطر (عربی) کی طرف ہے، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس وقت زیرِ تالیف تھی۔ طباعت واشاعت کا مرحلہ حضرت مرحوم کے انتقال کے بعد طے ہوا۔ آٹھویں جلد مرحوم کے چھوڑے ہوئے مواد کی تصحیح وتہذیب اور اس میں بہت سے اضافوں سے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے مرتب فرمائی ہے۔

ملا واحدی (دہلی):

﴿۷۰﴾

۱۴ا۔فورٹ اسٹریٹ، بمبئی

واحدی صاحب! تسلیم

مضمون قصداً نا تمام بھیجا تھا کہ بیماری اور سفر کی حالت میں جتنے صفحے قلم سے نکلے، انھیں کو غنیمت سمجھ کر بھیج دینا مناسب نظر آیا۔ تین دن کے بعد پھر کچھ مہلت ملی، تو باقی مضمون مرتب کیا۔ اور وہ بھی خواجہ صاحب کے نام کلکتہ بھیج دیا۔ حیرت ہے کہ اب تک صرف پہلی قسط کیوں بھیجی گئی!

بہر کیف، اگر ضایع ہو گیا ہے، تو اب نہ اتنی مہلت ہے کہ پھر لکھوں اور نہ اس میں اتنی اہمیّت ہے کہ دوبارہ وقت صرف کیا جائے۔ یہ بھی خواجہ صاحب کا اصرار تھا کہ سرمد کے حالات لکھیے! ورنہ تاریخ کے سیکڑوں ارباب اجتہاد و تجدید شکوہ سنج بے التفاتی ہیں۔ انھیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون وقت ضایع کرے!

یادفرمائی کا شکریہ!

ابوالکلام آزاد دہلوی

حاشیہ:

(۱) اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ لیکن چوں کہ یہ خط خواجہ حسن نظامی سے سلسلۂ مکاتبت جون ۱۹۱۰ء کی ایک کڑی ہے، جس میں سرمد شہید والے مضمون کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے یقیناً جون کی کسی تاریخ کا ہوگا۔

حکیم غلام غوث خان پوری:

(۱) ﴿۷۱﴾

حیاکم اللہ وکثر اللہ امثالکم !السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حکیم زادہ محمد عبدہ مبارک ہو۔نہایت اجمل واحسن نام ہے۔

فتشبھو ان لم تکونو مثلھم

ان التشبہ بالکرام کرام

ناموں میں ان کے معانی کی رعایت کا ہونا عقلاً واضح و بین اور احادیث صحیحہ سے ثابت و معلوم ہے۔ اگر ناموں میں معانی ملحوظ نہیں تو عبدالمسیح اور عبدالعزیٰ کیوں ناجائز ہوئے اور کیوں بدلے گئے؟

اس مبارک نام سے ایک محبوب ترین ہستی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی توحید کا رعب قایم رہتا ہے:

اذا کان ھذا لدمع ینجری صبابتہ

علی غیر لیلی فھو دمع مضیع

کوشش کیجیے کہ جاہلانہ خیال دور ہو جائے۔شرعاً کوئی ممنوع نہیں۔ایسے ناموں کو رائج کرنا چاہیے کہ ایک خدمت دینی ہوگی اور آپ کا اجر اللہ کے یہاں تیار ہے۔

بہ ہر حال صاحب زادے کے نام میں معانی صحیحہ ومفہومات مستحسنہ کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔عرب میں اس قسم کے نام بہ کثرت مستعمل ہیں۔شیخ محمد عبدہ مفتی مصر کا نام جناب نے سنا ہوگا۔

خدا سے دعا ہے کہ مولود سعید صدوسی سال کی عمر پائے اور صالح ہو۔والعاقبۃ للمتقین. والسلام مع الاکرام

وانا مخلصکم العاصی

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حاشیہ:

(۱) مولانا آزاد نے یہ خط مکتوب الیہ کے صاحبزادے ''محمد عبدہ'' کی ولادت کی خوش خبری اور تسمیۂ مولود کے جواب میں لکھا تھا۔ اس پر تاریخ و سنہ تحریر درج نہیں ہے۔ لیکن اس ولادت کی مبارک باد میں جو خط مولانا ابوعبید میر احمد اللہ امرتسری کا، مولانا آزاد کے خط سے پہلے درج ہے اس کی تاریخ تحریر ۱۳/اپریل ۱۹۱۱ء ہے اور مولانا کے خط کے بعد ایک خط سردار محمد ابراہیم خاں وزیر ریاست خیر پور کا ہے، اس کی تاریخ تحریر ۲۹/اپریل ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کا خط بھی اس سے قریبی کسی تاریخ کا ہوگا۔ اس مولود کی ولادت کے سلسلے میں ایک نادر خط علامہ شبلیؒ کا بھی یادگار ہے۔ چوں کہ علامہ کا یہ خط مکاتیب شبلی میں شامل نہیں ہے، نیز اس میں مولانا آزاد کا ذکر بھی آیا ہے اس لیے اس کا یہاں درج کر دیا جانا بھی مناسب معلوم ہوا۔ خط یہ ہے:

''دوش در حلقۂ ما قصۂ گیسوئ تو بود
تا دلِ شب، سخن از سلسلۂ موئ تو بود

حبیبی و طبیبی! السلام علیکم

مولوی ابوالکلام سے ''حکیم خورشید لقا'' (۱۳۲۹ھ) کے مقدمِ خیر کی خبرِ مسرت انگیز معلوم ہوئی۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔ ''حکیم دوم تشریف آورد'' (۱۳۲۹ھ) ''تشریف آوردنِ حکیم'' (۱۳۲۹ھ) مبارک ہو:

مبارک مبارک، سلامت سلامت

آپ نے پرزۂ کاغذ کا بخل کیا۔ خبر تک نہ کی۔ خیر! جیتے رہیے اور خوش رہیے۔ ہوا خواہوں کی خدمت بڑھ گئی دو جانوں (والدین) سے تین جانوں کی سلامتی کی دعا ذمے ٹھہری۔

میری صحت ابھی تک خراب ہے''۔

اس خط کے جواب میں حکیم صاحب نے علامہ سے نومود کی ولادت کا قصیدۂ دعائیہ وقطعۂ تاریخ لکھنے کی فرمائش کر دی۔ یہ چیز علامہ مرحوم کے ذوق کی نہ تھی معذرت کر دی۔

ہجری سال ۱۳۲۹، ۳/جنوری ۱۹۱۱ء سے شروع ہوا تھا۔ اس لیے ولادت اس تاریخ کے بعد کسی تاریخ کی ہوگی۔

حوالہ: مولانا آزاد کا مندرجۂ متن خط اور علامہ شبلیؒ کا مندرجۂ حاشیہ خط ''صدق المقال فی احوال الاہوال'' سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب کے چند اوراق کا عکس قاضی فضل اللہ فاروقی مرحوم بہاول پوری کے عم زادہ مولوی نور محمد کے بیٹے تاج محمد فاروقی نے عنایت فرمایا تھا۔ ان اوراق سے کتاب کے بارے میں کسی تفصیل کا علم نہیں ہوسکا۔

(۲)

﴿۷۲﴾

مولانا غلام غوث صاحب کے صاحبزادے محمد عبدہ، ام الصبیان کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ مولانا موصوف نے حضرت مولانا آزادؒ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ جواب میں یہ مکتوب وصول ہوا۔

باسمہٖ سُبحانہٗ

۲۳/اکتوبر۱۹۱۲ء

جناب الجلیل الاعز!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامۂ گرامی پہنچا۔ صاحب زادہ کی علالت کی خبر پڑھ کر نہایت صدمہ ہوا۔ مجھ ایسے روسیاہ وعصیاں کار کی دُعا، اس بارگاہ میں کیا قبول ہوگی! تاہم نسبت اسلام وایمان سے مشرف اور وعدۂ صادق ومصدوق روحی فداہ سے شادکام ہوں۔ یقین فرمایئے کہ جس وقت آپ کا خط ملا، وہ عصر کا وقت تھا۔ اس کے بعد ہی مسجد گیا اور عرصے تک مصروف دعا رہا۔ اس کے بعد مغرب اور پھر علی الخصوص عشاء کے وقت قبل از وتر دیر تک توفیق تضرع وتوجہ حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں پر نظر فرمائے اور ہم کو ان آزمائشوں میں نہ ڈالے۔ جن کی ہم میں طاقت نہیں۔

اُمید ہے بہت جلد آپ مژدۂ صحت سے شادکام فرمائیں گے۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

(۳)

﴿۷۳﴾

مکتوب الیہ نے ''گھر کا حکیم یا ڈاکٹر'' کے قسم کی ایک کتاب لکھی تھی اور حضرت مولانا سے اس پر مقدمہ یا تقریظ لکھنے کی گذارش کی تھی۔ حضرت مولاناؒ نے اس سے معذوری کا اظہار فرمایا۔

اس کتاب کا تاریخی نام ''جواہر تہذیب'' (۱۳۳۲ھ) تھا اور دوسرے نام کے بارے میں بھی حضرت مولاناؒ سے مشورہ طلب کیا تھا۔ حضرتؒ نے طبیبِ عائلہ'' نام تجویز کیا۔ مکتوب الیہ نے اسی کی نسبت سے ''العائلہ'' نام رکھا۔ یہ کتاب ۱۹۱۴ء میں مولوی رشید احمد انصاری کے زیر اہتمام مطبع احمدی۔ علی گڑھ سے شایع ہوئی تھی۔

باسمہ

اخی الجلیل الاعز! زادنا اللہ وایاکم محبۃ الاسلام!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ پہنچا۔ اپنی کوتاہ قلمیوں کے لیے نادم وخجل وخواستگار معافی ہوں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔ یقین فرمایئے کہ جناب کے لطف وکرم کی فقیر کے دل میں بہت جگہ ہے اور جب بھی کبھی احباب خاص وبندگان مخصوص یاد آتے ہیں۔ تو ان میں جناب کا اسم سامی بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دورِ طغیان وفساد وغربتِ خیر اہل خیر میں ہم سب کی اپنی محبّت وقرب کا ذوق وحسنِ خاتمہ کی دولت عطا فرمائے۔

جناب کی تصنیف کی خبر سے نہایت مسرت ہوئی۔ کاش فقیر کو مہلت ملتی کہ مشورے سے خدمت کرسکتا۔ لیکن اپنی حالت کیا عرض کروں، زندہ ہوں اور اس کو فضلِ مخصوص حضرتِ الٰہی سمجھتا ہوں۔

''جواہر تہذیب'' (۱۳۳۲ھ) تاریخی نام نہایت عمدہ ہے۔ دوسرے نام کی تلاش ہے تو ''طبیبِ عائلہ'' رکھیے کہ جامع اور صحیح ہے۔ عائلہ کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ اسی کو رائج کرنا چاہیے۔

انا الفقیر احمد المکنی بابی الکلام کان اللہ لہٗ

مولانا عبدالباری ندوی:

(۱) ﴿۷۴﴾

۱۴۔ میکلا ؤڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

(یکم فروری ۱۹۱۲ء)(۱)

صدیقی المحب! جس دن مولانا پہنچے (۲)۔ اسی دن سے بیکار و معطل محض۔ مچھلی کا ایک کانٹا دل کی جگہ حلق میں چبھ گیا۔ عرصے کی تکالیف شاقہ و استعمال آلاتِ متعددہ کے بعد اترا۔ مگر اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ سارا حلق زخمی و ماؤف، نہ گفتگو کرسکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں۔ افسوس کہ مولانا کی تشریف آوری سے کچھ مستفید نہ ہوسکا۔ آپ کی نسبت مولانا نے گفتگو کی تھی لکھا ہوگا یا لکھیں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ارادے کو فلسفہ نہ بنایئے۔ اس قدر کدو کاوش کی کیا ضرورت۔ پڑھنا ہے تو کلکتہ چلے آیئے، انتظام ہو ہی جائے گا (۳)۔

مسٹر عبدالماجد صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے (۴)۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) مکتوب پر مولانا کے قلم سے تاریخ تحریر درج نہ تھی، ڈاک خانے کی مہر میں تاریخِ روانگی یکم فروری ۱۹۱۲ء درج تھی۔ شاید جنوری کی آخری تاریخ کو لکھا ہو!

(۲) مولانا شبلی نعمانی مراد ہیں۔

(۳) مکتوب الیہ کا ارادہ کلکتہ جانے اور کسی اسکول میں داخل ہوکر انگریزی پڑھنے کا تھا۔

(۴) مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۷۲ تا ۱۹۷۷ء) موجودہ دور کے ادیب، صحافی، مفسر اور مصنف۔ وہ اپنی ہر حیثیت سے معروف و منفرد تھے۔ اس وقت کنگ کالج، لکھنو کے طالب علم تھے۔ اسی سال بی اے پاس کیا۔ علمی و ادبی اور تصنیفی

زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ دینی شغف اور اسلام سے دل چسپی کا وہ دور جس نے انھیں ''مولانا اور مفسر قرآن'' بنایا بہت بعد میں شروع ہوا۔ اس وقت وہ محض مسٹر عبدالماجد تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسی دور سے دوست تھے۔ تعلقات میں بعض نشیب بھی آئے لیکن منقطع کبھی نہیں ہوئے۔ دونوں مرحومین ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور خدمات کے معترف تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''اردو کا ادیب اعظم'' از مولانا عبدالماجد دریابادی مولف و مرتب ابوسلمان شاہ جہان پوری۔

(۲) ﴿۷۵﴾

۱۴۔ میکلا وڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۷۔۳۔۱۹۱۲ء

مجی الصدیق!

مرحمت نامہ پہنچا۔ اب فی الجملہ آرام ہے۔ والحمد للہ علی احسانہ۔ مولانا سے مشورے کے بعد ایک آخر رائے قایم کر لیجیے (۱)۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) یعنی مولانا شبلی سے مشورہ کر کے بغرض تعلیم کلکتہ کے سفر و قیام کے بارے میں۔

خواجہ الطاف حسین حالی (پانی پت):

﴿۷۶﴾

(۱۹۱۲ء)

خواہی کہ بہ تو بیش شود شوق نظیری
از پیش خودش گاہ براں، گاہ نگہدار

یا جناب الجلیل الاعز! انعم اللہ علی بقائکم

دفتر سے معلوم ہوا کہ ''الہلال'' کے جو پرچے خدمتِ عالی میں جاتے ہیں، بجنسہ واپس آ جاتے ہیں۔ ایک پرچہ میں نے بھی دیکھا۔ اس پر لکھا تھا کہ مکتوب الیہ کو لینے سے انکار ہے۔

میرے دلِ عقیدت کیش کے لیے تو اتنی نسبت بھی بہت ہے کہ آستانۂ مبارک تک ''الہلال'' پہنچے اور محروم واپس آئے۔ تاہم اس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہوں!

میں نے پیشتر ہی عرض کر دیا تھا کہ حاضری سے ارادت کیشوں کو نہ روکیے، ردی کی ٹوکری میں تو آخر جگہ مل ہی سکتی ہے۔

جب کبھی کلکتہ سے نکلتا ہوں تو ارادہ کرتا ہوں کہ آستانۂ مبارک پر قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں لیکن محرومی پہنچنے نہیں دیتی۔ شاید اواخر دسمبر میں پانی پت حاضر ہوں، گو ڈرتا ہوں کہ ''الہلال'' کی طرح میری دلی عقیدت کی قبولیت سے بھی انکار ہو(۱)۔

حاشیہ:

(۱) یہ مکتوب ''تبرکاتِ آزاد'' مرتبہ غلام رسول مہر سے ماخوذ ہے۔ مرتب کے قلم سے اس پر یہ حاشیہ ہے:

''مولانا نے ''الہلال'' ان کی خدمت میں اعزازی جاری کیا تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ہر پرچے پر یہ لکھ کر واپس فرما دیتے کہ مکتوب الیہ لینے سے انکاری ہے۔ اس لیے کہ وہ خود پڑھ نہیں سکتے تھے اور یہ گوارا نہ تھا کہ پرچہ بھیجنے والے کو خواہ مخواہ نقصان ہو۔ مولانا نے اصرار کیا تو پھر ''الہلال'' کو خواجہ صاحب نے قبول فرما لیا اور دوسروں سے پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے''۔ (تبرکاتِ آزاد، ۱۹۵۹ء، لاہور)

نواب سید علی حسن خاں (لکھنؤ):

﴿۷۷﴾

نواب صاحب مرحوم سے مولانا آزاد کے جو قریبی تعلقات تھے، ان کی بنا پر انھیں بجا طور پر توقع تھی کہ الہلال ان کے نام ضرور آئے گا۔ لیکن جب نا امیدی ہوئی تو خط لکھا۔ مولانا نے الہلال کا فوراً اجرا کر دیا لیکن اس میں کچھ عرصہ لگا اور نواب صاحب کو دوسرا خط لکھنا پڑا۔ مولانا نے اس خط کے جواب میں معذرت اور صورت حال کی وضاحت میں یہ خط لکھا۔

اس خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے، لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ الہلال کے اجرا کے بعد پہلے الہلال کے انتظار میں ایک دو ماہ تو ضرور لگے ہوں گے اور اجرا کے لیے خط لکھنے سے یاد دہانی کرانے تک ایک آدھ ماہ کا عرصہ مزید بھی لگا ہوگا۔ اس لیے میرا اندازہ ہے کہ یہ ستمبر ۱۹۱۲ء کے اواخر یا اکتوبر کے اوایل کا ہوگا۔

صدیقی العزیز! السلام علیکم

الہلال کے اجرا میں دفتر سے جو تاخیر ہوئی اس کے لیے شرمندہ ہوں اور خواستگار معافی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس دن آپ کا خط پہنچا، اسی دن میں نے دفتر کو اطلاع دے دی کہ رسالہ جاری کر دیا جائے۔ افسوس ہے کہ منیجر صاحب کی علالت کی وجہ سے تمام کام کلرکوں کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے غفلت کی اور مجھے آپ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ آج میں نے پھر دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ پرچہ جاری کر دیا گیا ہے اور گذشتہ نمبر بھی بھیج دیے گئے ہیں۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے میرا یہ تساہل محسوس کیا ہوگا کہ میں نے خود الہلال آپ کی خدمت میں کیوں نہیں بھجوا دیا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نے نہ صرف آپ کو بلکہ احباب و اصدقا میں سے کسی کو بھی بطور خود نہیں بھیجا۔ اس لیے نہیں کہ یہ تساہل و تغافل تھا، بلکہ اس لیے کہ یہ ایک طرح کی دوستانہ جسارت تھی اور طبیعت پسند نہیں

کرتی تھی کہ جسارت کی جائے بطور خود اپنی کسی ایسی چیز کے بھیجنے کے دو ہی معنی لیے جاسکتے ہیں:

ایک یہ کہ قیمت کی طلب گاری ہے۔

دوسرے یہ کہ قیمت کی نہیں تو وقت و مطالعہ کی درخواست ہے۔

میرے لیے پہلی بات، ایسا سوءِ ظن ہے جس کے تحمّل کی طاقت نہیں رکھتا اور دوسری بات بھی ایسی نہیں جسے خوش دلی کے ساتھ گوارا کیا جائے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ایک دوست وصدیق محض اس بنا پر کہ دوست ہے کسی رسالے کے مطالعے میں بھی ضرور ہی دلچسپی لے؟ ممکن ہے اسے دلچسپی نہ ہو۔ ممکن ہے وقت نہ نکال سکے۔ البتہ جن دوستان عزیز نے اپنے لطف ومحبّت سے مطالعے کی خواہش ظاہر کی بلا تاخیر ان کی خدمت میں الہلال بھیج دیا گیا۔ میں آپ کی محبّت و ذوق کا معترف ہوں کہ اس کی خواہش ظاہر کر کے مجھے مسرت کا موقع دیا۔ امید ہے مع الخیر و عافیت ہوں گے۔

بہت مدت ہوگئی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پہلے آپ تبدیلی آب و ہوا کے لیے بمبئی جایا کرتے تھے۔ کیوں نہ چند دنوں کے لیے کلکتہ آ جائیے؟ لکھنو کے موجودہ موسم سے تو یہاں کا موسم بہر حال زیادہ گوارا اور آرام دہ ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ چند دنوں کے لیے آئیں اور یک جائی وملاقات کا موقع میسّر آئے۔

ابوالکلام (کلکتہ)

ماخوذ: مجلّہ نقوش، لاہور، خطوط نمبر ا، ۱۹۶۸ء

محمد ابراہیم زکریا بھاگل پوری

مولانا کے خطوط کا جو مجموعہ ''مولانا ابوالکلام آزاد۔ آثار و افکار'' پروفیسر محمود واجد صاحب کے نام سے مرتبہ شایع ہوا تھا۔ اس پر خاکسار نے جو تعارف لکھا تھا۔ ذیل کی تحریر اسی کی تلخیص ہے۔ (ا۔س۔ش)

مولانا آزاد کے خطوط کا یہ مجموعہ پروفیسر محمود واجد صاحب نے مرتب کیا ہے جو ''ادارۂ تحقیقاتِ افکار و تحریکات ملی'' (کراچی) کی جانب سے آزاد صدی مطبوعات کے سلسلے میں (نمبر۲۲) مولانا آزاد نیشنل کمیٹی کے زیر اہتمام ۱۹۸۹ء میں کراچی سے شایع ہوا ہے۔ یہ خطوط ان کے تمام مطبوعہ ذخیرۂ خطوط میں نہ صرف علمی و فکری لحاظ سے اہم ہیں، بلکہ خطوط نگاری کے فن اور اس کے خصایص کے اعتبار سے بھی مولانا مرحوم کے اہم ترین خطوط میں شمار ہوں گے۔ ان خطوط کے ذریعے مولاناؒ کی زندگی کے بعض حالات اور سیرت و افکار کے بعض پہلوؤں پر اہم روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہ کہ

الف: مولانا اپنی ازدواجی زندگی سے خوش اور پوری طرح مطمئن نہیں تھے، لیکن ان کے سامنے زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد تھا اور اس کا تقاضا تھا کہ ازدواجی زندگی کی خوشیوں اور دنیاوی راحتوں اور لذتوں کو اس پر قربان کر دیا جائے۔ مولانا نے ایسا ہی کیا۔

ب: ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں بھی مولانا اپنی سیرت اور دین داری کے لحاظ سے قریبی دوستوں کے معتمد علیہ تھے اور نازک ترین مسایل اور نجی زندگی کے معاملات میں بھی ان کے دوست انھیں مشورے کا اہل سمجھتے تھے۔ اور ان سے مشوروں کے طالب ہوتے تھے۔

ج: مولانا کے تمام خطوط اور ان کے ایک ایک جملے سے اخلاص ٹپکتا ہے۔

د: مجموعے کا پہلا خط معارف کا سرچشمہ، بصائر وحکم کا گنجینہ، نہایت روح پرور اور ایمان افروز ہے؛

☆ یہ خط ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان کی طرف سے اس سے آٹھ نو سال بڑے دوست کے نام ہے، لیکن بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی شفیق ومربی اور دانا وعاقل بزرگ ومرشد کی طرف سے کسی نوجوان عقیدت کیش اور مسترشد کے نام ہے۔

☆ اس سے ازدواجِ ثانی کے متعلق مولانا کے فکر پر روشنی پڑتی ہے۔

☆ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک لذیذ دنیوی اور ترغیبات نفس کی کیا حیثیت ہے، اور زندگی میں انھیں کس درجے اہمیت دینی چاہیے۔

☆ اس خط میں جو مسئلہ زیر بحث ہے، اس کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاکر مولانا نے مخاطب کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا کس درجے بصیرت افروز اور حقایق پر مبنی ہے کہ

☆ ''سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے۔ جس کی محبّت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ دنیا اور دنیا کے مصایب سے بے خبر! کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے، جس کے مصائب ومشکلات کا ابھی سے علم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عیش وراحت اُس کے لیے مہیا نہ کرسکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں! کیا محبّت ووفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلاوجہ اس کی بقیہ زندگی تلخ کردی جائے''۔

☆ پھر اپنے عقدِ ثانی کے لیے مجبور کن ترغیبات کے تذکرے کے بعد اس پر یہ تبصرہ تو سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے:

''صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں! اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کرسکتے تو پھر دنیا میں نہ محبتؐ ہے، نہ سچائی اور نہ انسان''!۔

☆ مولانا کا یہ پورا خط ہی نہایت بصیرت افروز اور فکر انگیز ہے۔ اس کے بعض جملے تو ضرب المثل بننے کے لائق ہیں۔ مولانا کا ایک جملہ ہے:

''تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں، سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات ہی کی ہے''۔

اس جملے کے چند لفظوں میں وہ عالمگیر سچّائی سمٹ آتی ہے، جسے دنیا کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ کر لینا چاہیے۔

☆ مولانا علیہ الرحمہ کا یہ جملہ بھی کتنا بصیرت افروز اور ایمان پرور ہے:

''جو دل فاطر السماوات والارض کے عشق کا متحمل ہو سکتا ہے، اس کو فانی اور وہمی الجھنوں میں لگانا انسانیت و حیات کو تاراج کرنا ہے''۔

مولانا مرحوم نے زکریا صاحب کے اس کشمکش و آزار سے نجات پانے کے لیے جو نسخۂ شفا تجویز کیا تھا۔ اس سے مولانا کے انداز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔

☆ مولاناؒ کے اس خط کا مسرت انگیز پہلو یہ ہے کہ مولاناؒ کی سعی بلیغ رائیگاں نہیں گئی۔ زکریا صاحب نے مولاناؒ کے مشورہ و ہدایت پر عمل کیا، اور اس لڑکی کی محبت کے خیال کو دل سے نکال پھینکنے میں کامیاب ہو گئے۔ ممکن ہے یہ حادثہ دل پر کوئی داغ چھوڑ گیا ہو، لیکن عملی زندگی میں اس حادثے کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔

☆ یہ خط اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کے نام مولانا مرحوم کے خطوط کو چھوڑ کر اس سے پہلے کے جو خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد ابھی تک اٹھائیس سے آگے نہیں بڑھی انھیں میں ایک خط یہ ہے۔

ہ: ان خطوط سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ذوق و افکار اور زندگی کے تجربات و نظریات کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان کی مثال مولانا کے کسی ایک مجموعۂ خطوط سے پیش نہیں کی جا سکتی۔

و: حضرت مولانا کے قلب کے سوز، طبیعت کے گداز، خورد نوازی، شفقت و ترحم اور دردمندی کی جیسی مثالیں، ان خطوط میں بہ کثرت سامنے آتی ہیں، دوسرے مجموعہ

ہائے مکاتیب میں شاذ کے درجے میں ملیں گی۔

ز: ان خطوط میں مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کی دل ربائی اور افکار کی عطر بیزی کا عالم ہی دوسرا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہ کے خطوط کا یہ ایک یادگار اور تاریخی مجموعہ ہے۔ جو علمی، ادبی حلقوں میں ''اصحاب ذوق میں اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ارادت رکھنے والوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ابوسلمان شاہجہان پوری

ترمیم واضافہ:

زکریا صاحب کے خطوط کے مذکورہ مجموعے میں مولانا کا ایک خط حکیم محمد اجمل خاں دہلوی کے نام تھا جو انھوں نے زکریا صاحب کے طبیہ کالج دہلی میں داخلے کے لیے بطور سفارش کے لکھا تھا۔ اب اسے الگ کر کے حکیم صاحب کے نام کے تحت درج کر دیا ہے اور زکریا صاحب کے نام مولانا کا ایک خط ''آثار ونقوش'' میں تھا۔ اسے زکریا صاحب کے نام خطوط میں شامل کر دیا ہے۔ آخری خط وہی ہے۔

اگست ۱۹۶۴ء میں زکریا صاحب کا اپنے وطن بھاگل پور میں انتقال ہو گیا۔

اس۔ش

خطوط

(۱) ﴿۸۷﴾

(۱۹۱۲ء)

عزیزی! السلام علیکم

جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے، تخصیص و تعین کے ساتھ تو اس کا علم نہ تھا، لیکن یہ معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حالت کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین کیجیے کہ دنیا میں انسان کے تمام قوایل و فضایل کے لیے اصلی آزمایش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں کوئی آزمایش نہیں۔ سب سے بڑی آزمایش نفس و جذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوتِ ایمانی و احسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمایش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱)۔

اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملے کو نہیں بھولوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آزمایش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔

موجودہ حالت میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں:

۱۔ عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجیے۔ اپنے اندر عزم پیدا کیجیے اور اللہ سے مددگاری طلب کیجیے۔ زندگی چند روزہ ہے۔ اور سارے مطلوباتِ نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں۔ کب تک اس بند و قید میں گرفتاری رہے گی؟ جو دل فاطر السماوات والارض کے عشق کا متحمل ہوسکتا ہے، اس کو فانی و وہمی الفتوں میں لگانا انسانیت و حیات کو تاراج کرنا ہے۔ طلب مفرط جس چیز کی بھی ہے انداد و طواغیت میں داخل ہے۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲) اور يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۳) محبّتِ الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ احب چیز کو اس کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۴)۔

پس اصلی و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگایئے اَلا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب (۵) اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا (٦) اور لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْن (۷) کی صدا لگا کر اس خیال کو دل سے ہی نکال دیجیے اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی۔ اور ان شاء اللہ ایک جہادِ اکبر کا اجر عند اللہ!

غور کیجیے! آپ متاہل ہیں، مجرد نہیں۔ پھر صاحبِ اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ!، کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کے لیے باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس و قلتِ معیشت کی بے سروسامانی، دوسری طرف عوازم و معالی امور و عمل کا ولولہ۔ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلا شبہ ابتدا میں مسرتِ حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا۔ لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے۔ اس کے بعد قدرتی کشاکش و کشمکش اور مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے، عجب نہیں کہ خود اس معاملے سے دل برداشتہ ہو جائے۔

یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ ابھی ایک لمحے کے لیے اس کا احساس نہیں ہوسکتا۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ لیکن جب یہ حالت پیش آجائے گی تو کوئی علاج سودمند نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبّت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ دنیا کے مصائب سے بے خبر! کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے، جس کے مصائب و مشکلات کا ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لیے مہیّا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ کیا محبّت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اس کی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے؟

میری شادی کو دس سال ہو گئے (۸)۔ یقین کیجیے کہ میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ وبواعث شرعاً وعقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا۔ بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ پھر دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا۔

صداقتِ حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبّت ہے نہ سچّائی اور نہ انسان!

آپ کہیں گے دل کس کے بس میں ہے؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس میں ہے! دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے اس کو جگا دیجیے سونے نہ دیجیے۔ وہ دل کی لگام جس طرف چاہے موڑ دے گی۔

اس بارے میں کثرت سے عواقب ونتائج پر غور و تفکر، مطلوباتِ نفس کی ہیچ مائیگی اور بے حاصلی کا تصور، کثرت استغفار و دعا اور مشغولات دینیہ ان شاء اللہ نہایت سود مند ہوں گے۔ اگر ایک دعا بھی پورے اضطراب والتہاب کے ساتھ نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک مرتبہ پوری طرح لگ جائے کہ طلب وعشق اور اضطراب قلب و اشک چشم جیسی نعمتیں ایک وہمی و خیالی مطلوب کے لیے کس طرح ضایع جارہی ہیں اور اگر یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہو جائے تو پھر یہی وجود فانی کیا کیا کچھ نہیں کر سکتا اور اس آزمایش سے نکل جانے میں ذرا بھی رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

۲۔ لیکن اگر ضعفِ عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھوڑ کر فوراً بھاگل پور چلے جائیے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔ اور جس قدر مشکلات ومہالک پیش آئیں

گے ان کو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجے موجودہ اضطراب نفس سے بہتر ہوگی۔ اقلاً بہت سے انتہائی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔

غرضے کہ یا فوراً بلا تاخیر اس کو بالکل دل سے نکال ڈالیے۔ یا فوراً بلا تاخیر جا کر کسی نہ کسی طرح نکاح کر لیجیے! تیسری حالت کوئی نہیں اور اگر اختیار کی جائے گی تو سخت مضر ہوگی۔ والعاقبة للمتقين!

ابوالکلام آزاد(۹)

حواشی:

اس مکتوب میں مولانا علیہ الرحمہ نے متعدد آیات قرآنی استعمال کی ہیں۔ مکتوب الیہ کے لیے تو ان کے ترجمے کی ضرورت نہ تھی لیکن یہاں نامناسب نہ ہوگا کہ ان آیات کے ترجمے کا اضافہ کر دیا جائے۔ ترجمے کے لیے مولانا کے ترجمان القرآن اور باقیات ترجمان القرآن (جلد سوم) سے رجوع کیا گیا ہے:

(۱) ''جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی، ضروری ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک کردار ہیں''۔ (۶۹:۲۹)

(۲) ''پس ایسا نہ کرو کہ اس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک اور ہم پایہ بناؤ اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے!''۔ (۲۲:۲)

(۳) سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۵ کے نصف اول کا یہ ٹکڑا ہے۔ پورے نصف اول کا ترجمہ یہ ہے:

اور (دیکھو!) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو اس کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انھیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جیسی چاہت اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ حال آں کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے زیادہ محبت اللہ ہی کی ہوتی ہے''۔

(۴) سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۹۲ کا نصف آخر۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''(یاد رکھو!) تم نیکی کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے، جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ (مال و دولت میں سے) جو کچھ محبوب رکھتے ہو اسے (راہ حق) میں خرچ کرو''۔

(۵) ''یاد رکھو! یہ اللہ کا ذکر ہی ہے، جس سے دلوں کو چین اور قرار ملتا ہے'' (۲۸:۱۳)

(۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شرک سے بریت کے اظہار کے ساتھ اپنی قوم سے مخاطب ہو کے فرمایا تھا: ''میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اس ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے جو (کسی کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ) آسمان اور زمین کی بنانے والی ہے''۔ (۷۹:۶)

(۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ پوری آیت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

"پھر (دیکھو!) جب ایسا ہوا کہ اُس پر رات کی اندھیری چھا گئی تو اس نے (آسمان پر) ایک ستارہ (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے"۔ (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا "نہیں! میں انھیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں (یعنی طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں) (۶:۷۶)

(۸) مولانا آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء کی ہے اور شادی ان کی بہن کی روایت کے مطابق ۱۳، ۱۴ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس خط میں مولانا نے لکھا ہے: "میری شادی کو دس سال ہو گئے"۔ اسی سے خط کا زمانۂ تحریر بھی متعین ہو جاتا ہے یعنی ۱۹۱۲ء اور ہمشیرہ کی روایت کی صحت کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔

مکتوب الیہ کی روایت کے مطابق مولانا آزاد سے ان کے تعلقات کا آغاز بھی اسی سال سے ہوا تھا۔ گویا کہ مولانا کا یہ خط مکتوب الیہ سے تعلقات کے اوائل ۱۹۱۲ء کی یادگار ہے۔ اسی لیے اس خط کو مجموعے کے شروع میں جگہ دی ہیں۔

(۲) ﴿۷۹﴾

عزیزی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ آپ نے بہ ہر حال اچھا کیا کہ بارک پور کے تعلّق سے دست بردار ہو گئے (۱)۔ حالاتِ معلومہ کے ساتھ وہاں کا قیام بے سود تھا۔

اب آپ چند دنوں توقف کیجیے کہ میں مطمئن ہو کر اپنے کاموں سے فارغ ہوں اور اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں بہ وقتِ مناسب آپ کو بلا لوں گا۔

فقیر ابوالکلام

۳ رشوال (۱۳۳۲ء)

جواب کے لیے جوابی خطوط کی ضرورت نہیں۔ آئندہ اس سے احتراز کیجیے۔

حاشیہ:

(۱) زکریا مرحوم کے نام مولانا کے پہلے خط میں جس لڑکی کا ذکر آیا ہے۔ اس کا تعلق بارک پورا (کلکتہ) سے تھا۔

(۳) ﴿۸۰﴾

عزیزی! السلام علیکم

افسوس ہے کہ آپ آئے اور ملاقات نہیں ہوئی، جہاں تک فقیر کو یاد ہے اس اثنا میں آپ کے آنے کی بالکل اطلاع نہیں ملی۔ غالباً عدم موجودگی میں آپ آئے ہوں گے۔

دارالارشاد کا افتتاح بوجوہ اب تک معرضِ تاخیر میں ہے، اور نظر بہ حالات غالباً بعد رمضان سلسلۂ درس شروع ہو سکے (۱)۔

آپ کے متعلق فقیر نے غور کیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ کوئی صورت کلکتہ میں قیام کی پیدا ہو، لیکن میرا حال یہ ہے کہ ایک فکر و دماغ اور صدہا معاملات سامنے ہیں۔ بہ ہر حال جب طلبِ صادق اور فکرِ مستقیم ہے تو امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ سرِ دست تو چندے وہاں قیام ناگزیر ہے۔ تا آں کہ یہاں کوئی صورت قرار پائے۔

فقیر ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) جولائی ۱۹۱۴ء (مطابق رمضان ۱۳۳۲ھ) میں دارالارشاد کی تاسیس عمل میں آئی تھی اور جب ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء (مطابق محرم ۱۳۳۴ھ) کو البلاغ کا پہلا شمارہ مُنصّۂ شہود پر آیا تو اس سے معلوم ہوا تھا کہ مدرسہ دارالارشاد میں سلسلۂ درس و ارشاد شروع ہو گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خط جولائی ۱۹۱۴ء اور نومبر ۱۹۱۵ء کی درمیانی مدت کا ہے۔ اگر اور تفحّص سے کام لیا جائے تو اس کا زمانہ تحریر رمضان ۱۳۳۳ھ (مطابق جولائی ۱۹۱۵ء) سے کچھ قبل کا نکلتا ہے۔

(۴) ﴿۸۱﴾

عزیزی! السلام علیکم

خط پہنچا، اللہ تعالیٰ پریشانیوں سے نجات دے اور طمانیت خاطر کا سامان مہیّا فرمائے۔ جو کچھ میرے امکان میں ہے، اس کے لیے کسی یاد دہانی کی ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ جوں ہی کوئی مناسب موقع ملے گا، آپ کو اطلاع دوں گا۔ بالفعل صورتِ حال ایسی نہیں ہے کہ آپ کو آنے کے لیے لکھوں۔

فقیر ابوالکلام۔ کلکتہ

(۵) ﴿۸۲﴾

عزیزی! السلام علیکم

افسوس کہ آج شام کو بھی آپ حضرات سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ شام کو ٹیگور نے کھانے کی دعوت دے دی ہے۔ مجبوراً وہیں رہوں گا۔

اس لیے آپ حضرات آج زحمت نہ فرمائیں، اور دلشاد کو کھانے کے لیے بھیج دیں۔ انشہ کل ملاقات ہوگی۔

ابوالکلام

(۶) ﴿۸۳﴾

باسمہٖ تعالیٰ

صدیقی العزیز! السلام علیکم

تبریک عید کے لیے ممنون ہوں۔ آپ سے غافل نہیں۔ کئی کوششیں کی ہیں۔ اللہ نتیجہ خیز ثابت کرے۔ ایشیاٹک سوسایٹی کا میں خود بھی ممبر ہوں، اور مجھ کو معلوم کہ وہاں کوئی کام نہیں۔ سہروردی کو لکھنا بے سود ہے۔

فقیر ابوالکلام

رانچی، ۸؍شوال ۱۳۳۴ھ(۱)

حاشیہ:

(۱) ۸؍شوال ۱۳۳۴ھ مطابق یکم اگست ۱۹۱۶ء

(۷) ﴿۸۴﴾

باسمہٖ تعالیٰ

عزیزی وصدیقی! السلام علیکم

آپ کے لیے ایک صورت نکلی ہے۔ کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے(۱)۔ اس میں بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم کے لیے بیس روپیہ کی ایک جگہ ہے۔ وہ آج کل خالی ہے۔ میں نے سیکریٹری کو کہہ کر آپ کے لیے گنجایش نکالی ہے اور بیس کی جگہ پچیس منظور کرایا ہے۔ مکان بھی رہنے کو مفت ملے گا۔ بقیہ وقت میں اور اشغال جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس جگہ کے لیے انگریزی کی شرط نہیں ہے، لیکن مجھ کو اب یاد پڑتا ہے کہ آپ نے انگریزی بھی پڑھی ہے، چناں چہ میں نے یہ کہہ دیا تھا۔

منتظمین یتیم خانہ مذہبی اعتقادات میں ناواقف ہیں، اور حنفیت کے عاشق، سابق معلّم کو اس جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام کے مخالف تھے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی طریق میں بیعت کردہ ہیں۔ پس ان جزئیات کا خیال رہے۔ آپ فوراً بھاگل پور سے روانہ ہو کر کلکتہ پہنچیں اور مرزا احمد علی سیکریٹری یتیم خانہ، نمبر ۳۰ لوئر چیت پور روڈ سے جا کر ملیں اور میرا خط دکھلائیں۔

بہ حالت موجودہ یہ جگہ غنیمت ہے اسے منظور کرلیجیے کہ اس کے بعد ان شاء اللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا ہو اور تمام امور عمل میں آئیں۔ والامر بیدہ سبحانہ وتعالیٰ۔

فقیر ابوالکلام

رانچی۔ بہار، ۲۲؍ذیقعدہ ۳۴ھ (۲)

حواشی:

(۱) یہ انجمنِ اسلامیہ اور یتیم خانہ اسلامیہ مولوی شرف الدین (نیورہ) نے قایم کیا تھا۔ مرکز کلکتہ تھا۔ بہار و کلکتہ کے مسلمانوں میں اسلامی ذوق کے فروغ اور مسلم یتامیٰ کی تعلیم وتربیت اور پھر ان کے لیے اسبابِ معیشت کی فراہمی میں اس انجمن نے شان دار خدمات انجام دیں۔

(۲) ۲۲؍ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ مطابق ۲۰؍ ستمبر ۱۹۱۶ء

(۸) ﴿۸۵﴾

عزیزی الاجل! السلام علیکم

تاخیر اس لیے ہوئی کہ کلکتہ سے جواب کا انتظار تھا۔ آپ کی علالت کا حال پڑھ کر نہایت ہی قلق ہوا۔ اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرمائے اور اس کے سوا چارہ ساز بیکساں کون ہے کہ یجیب المضطر اذا دعاہ.

میں نے بہت کوشش کی کہ زیادہ عرصے تک جگہ خالی رہے، مگر امیدواروں کا ہجوم، شاید عید کے بعد وہ کوئی انتظام کرلیں۔ بہ ہر حال صحت مقدم ہے، اور خدا کے خزانوں میں رزق کی کمی نہیں۔ ان شاء اللہ وہ کوئی اور صورت پیدا کردے گا۔

حکیم صاحب کو لکھ دیا ہے، نیز دواخانے کو لکھ دیا ہے کہ دوا آپ کو بھیج دے اور قیمت فقیر سے وصول کرلے۔ موجودہ حالات سے مطلع کیجیے۔

خدا یار و یاور یار باد!

فقیر ابوالکلام۔ رانچی

(۹) ﴿۸۶﴾

بسمہٖ تعالیٰ

عزیزی وحبّی فی اللہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ادھر عرصے سے مبتلائے آلام معنوی وصوری ہوں۔ علائق قلبیہ رسل ورسایل پر موقوف نہیں۔ آپ کی طرف سے نہ کبھی غفلت ہوئی ہے اور نہ انشہ ہوگی! افسوس کہ

اب تک آپ کا زمانۂ ابتلا و محن ختم نہیں ہوا اور سلسلۂ علالت جاری۔ جب بھاگل پور کے علاج سے اتنے عرصے میں بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ جلد سے جلد سفر دہلی کا تہیہ کیا جائے۔ اس سفر کے لیے بعض ضروریات کی فراہمی ناگزیر اور جواب میں اسی لیے تاخیر ہوئی کہ ان کی فکر درپیش تھی۔ ان شاء اللہ امید ہے کہ عن قریب سامان ہو جائے گا۔ بعض اسباب سے ادھر یکے بعد دیگرے مجبوریاں پیش آتی رہیں اور بعض تازہ حالات نے دل کی طرح جیب کو بھی خالی رکھا۔

دوسرے خط میں آپ نے اپنے گھر کے طرزِ عمل کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر سخت قلق ہوا۔ وھذا اشد من ذاک غالباً آپ کے ابتلا و آزمایش کی تکمیل اس معاملے پر موقوف تھی۔ جب تک الم جسمانی کے ساتھ الم قلبی مکمّل طور پر جمع نہ ہو، صبر کی پوری آزمایش نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا معاملہ انسان کے لیے علایق و موثراتِ حیات دنیوی میں آخرترین الم ہے، اور اب یہ بھی آلام جسمانیہ کے ساتھ جمع ہو گیا۔ جب آزمایش یہاں تک پہنچ چکی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اب اس کے اختتام کا وقت آ گیا، اور ان شاء اللہ آپ کا اجر صبر بھی آخری درجے تک پہنچ کر رہے گا۔ کام جتنا سخت ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مزدوری بھی ملا کرتی ہے۔

گو یہ معاملہ نہایت ہی درد انگیز ہے، مگر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کچھ مزید تعیین و تفصیل کریں؟ قلب انسانی کے لیے مجرد تذکرہ و حکایتِ آلام میں بھی بہت بڑی تسکین رکھی گئی ہے۔ خصوصاً جب کہ کسی غم گسار کے سامنے ہو:

ولابد من شکویٰ الی ذی مروۃ

یواسیك، او یسلیك او یتوجع

آپ نے اپنے آنے کی نسبت بھی لکھا ہے۔ میں خود کب اس کو پسند کرتا ہوں کہ جسماً بھی آپ مجھ سے دور ہیں، لیکن علاج سب پر مقدم ہے اور اس کے لیے دہلی جانا لازم و الزم۔ پس اسی کا تہیہ کیجیے جس طرح بھی ممکن ہو۔ اور میں بھی ان شاء اللہ

بجز دحصول و بہ اول حصول اس کے لیے کوشش کروں گا۔ واللہ معکم اینما کنتم وحسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم

ادھر اتفاقاً ایک ضرورت سے بعض کتب طب کی ورق گردانی کا اتفاق ہوا تو گردہ کی بحث نکل آئی۔ ضعفِ گردہ کے جس قدر آثار وحالات لکھے ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یہ مرض بجز ضعفِ گردہ اور کچھ نہیں ہے۔ اور جو شے خارج ہوتی ہے وہ گردہ کی چربی ہے وہاں کے اطباء سے اس کا ذکر کیجیے۔

(۱۰) ﴿۸۷﴾

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خاموشی بلاوجہ نہ تھی، چاہتا تھا کہ اس موقعے پر آپ کی پریشانیوں کے لیے کچھ نہ کچھ باعث تخفیف ہوں۔ بعض اسباب کی بنا پر اس کی امید بھی تھی، لیکن سوءِ اتفاق سے اب تک اسبابِ مطلوبہ فراہم نہ ہوئے۔

اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ بحمد اللہ آپ کی طبیعت روبہ افاقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صحتِ کامل عطا فرمائے۔

میں اس موقعے پر آپ کو ضرور رانچی بلا لیتا۔ مگر جب آپ کے تمام مصالح پر غور کرتا ہوں تو سردست توقف اولیٰ وانسب نظر آتا ہے۔ پس بالفعل توقف کیجیے اور منتظر رہیے کہ آیندہ کیا صورت حال پیش آتی ہے؟ شاید بہت جلد اللہ تعالیٰ بہتر صورت پیدا کردے۔ بالفعل آپ کا یہاں آنا چنداں سودمند نہ ہوگا۔ ان شاء اللہ وقت مناسب دیکھ کر میں خود آپ کو مطلع کردوں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کچھ عرصے آپ مونگیر میں قیام کریں؟ اور آپ کے متعلقین اپنے گھر میں رہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کوئی مناسب صورت پیدا کرے!

فقیر ابوالکلام

(۱۱)

﴿۸۸﴾

یہ مکتوب بھی رانچی سے لکھا گیا تھا اور بالیقین ۱۹۱۸ء کے اوایل کا ہے۔

برادرم! السلام علیکم

سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے کہ آپ کی نسبت یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا۔ زندگی کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کرلیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث و واقعات کے حوالے نہ کردیا جائے۔ بہت سے لوگ باوجود صلاحیت وقابلیت کے اپنی زندگی سے کوئی بڑا کام مدۃ العمر نہ لے سکے۔ صرف اس لیے کہ کوئی مستقل نظام عمل ان کے سامنے نہ تھا۔

آپ کے لیے جس قدر میں نے غور کیا اخبار نویسی کی زندگی موزوں نہیں بلکہ ہلاکتِ وقت وضیاعِ قوت ہے۔

اخبارات بلاشبہ دعوت وتذکیر کا ایک بڑا ذریعہ ہیں لیکن جب تک ایک نہایت ہی نمایاں اور غیر معمولی شکل میں ان سے کام نہ لیا جائے، اور نہایت وسیع پیمانے پر اسباب و وسایل مہیّا نہ ہوں، مطلوبہ اثر پیدا نہیں کرسکتے اور محنت یکسر رایگاں جاتی ہے۔

اول تو ایسا اہتمام چند در چند وجوہ سے مستبعد۔

ثانیاً بصورت حصول، اس درجے مشکلات وعوایق حایل کہ ان پر عبور وغلبہ شخص واحد سے ممکن نہیں، جب تک جماعت نہ ہو۔ علاوہ بریں اس شغل میں رہ کر صرف سیاسیات کے لیے وقف ہونا پڑتا ہے اور علمی ذوق کو مدۃ العمر کے لیے ترک کردینا پڑتا ہے۔

آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے، اور اس شکل وطرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے۔ علماے اسلام کے حالات پڑھیے۔ درس

وتدریس، وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف تینوں چیزوں کو بہ یک وقت کرتے تھے۔ اور اس طرح ایک ہی زندگی میں تین عظیم الشان خدمات انجام دیتے تھے۔ عوام کی اصلاح وعظ وتذکیر سے، مستقبل کے لیے تیاری درس وتدریس سے اور علم و مذہب کی خدمت دائمی تصنیف وتالیف سے!

ابن جوزی مصنف ہیں۔، مستنصر یہ کہ صدر مدرس ہیں اور جامع رصافہ کے واعظ، غزالی مدرسۂ طوس کے معلّم، سو کتابوں کے مصنّف اور جامع طوس کے واعظ۔ علمائے اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہوگئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہیں ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو۔ صبح کو درس دیا بقیہ اوقات میں تصنیف وتالیف اور مجامع و جوامع میں وعظ وتذکیر کا سلسلہ جاری۔ جب سے یہ چیز مفقود ہوئی اور ان تینوں اجزا کو الگ الگ کر دیا گیا۔ واعظوں کا طبقہ الگ، مصنفین کا الگ اور معلمین کا الگ، اس سے سلسلۂ ہدایت حقیقی ونشو ونمائے علم مفقود معدوم ہوگیا۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کے لیے تیار ہو جائیں! آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے۔ چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم! چوں کہ ایک گوشے میں واقع ہے، اس لیے علما کی آمد ورفت بھی کم تر ہوئی، اور جہل وافلاس نے اور زیادہ حالت خراب کر دی۔ اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی دعوت وتبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک غیر مترقبہ زندگی پیدا ہوگئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا۔ اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ آیندہ ضایع نہ ہو جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطّے کی دینی پیشوائی وریاست اس

کے ہاتھ میں رہے گی۔ اور باطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت وارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علماے سوکی کثرت اور دجاجلۂ فساد وجہل کی شقاوت سے اصلاح وہدایت کا کام بہت مشکل ہوجاتا ہے اور کوئی نظام قایم نہیں ہوسکتا۔ یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے۔ اور ابتدا سے بنیاد صالح پڑچکی ہے۔ اور اب جتنی عمارت بنائی جائے اور جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔

پس ہدایت ودعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع واعتقاد کے لیے موجود ہے۔ بلاشرکتِ غیرے۔

اب رہی دوسری چیز یعنی مشغلۂ درس وتدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہاں بنیاد ڈالی اور مدرسے کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوت کو چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج تیس برس سے اصلاح نصاب کا مسئلہ مصر وہند میں درپیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا۔ اگر یہاں ایک کالج قایم ہوجائے اور اولین تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا۔

اسی اثنا میں مدرسۂ عالیہ کے اصلاح نصاب پر ڈائریکٹر تعلیم بنگال کی توجہ ہوئی اور اس کے لیے مجھ کو ایک نصاب جامع مرتب کرنا پڑا۔ اس بات سے مزید تحریک ہوئی اور مدرسے کو اسی اصول پر قایم کیا گیا۔

مدرسے کا نصاب جونیر اور سینئر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم چودہ سال ہے۔

پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے۔ اس میں صرف ونحو عربی بالکل ختم، ادب شروع، فارسی مکمّل ختم، حساب وہندسہ ختم، ترجمۃ القرآن کامل، تاریخ ہند، تاریخ اسلام بالاجمال اور انگریزی ادب ہے۔

دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب بہ نہج واسلوب قدما، علوم القرآن، علوم الحدیث، فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول توحید، علم اسرار الدین، علم اخلاق، تاریخ عام،

تاریخ اسلام، تاریخ علوم عربیہ، تاریخ مذاہب وطوایف اسلامیہ، معقولات قدیم اور انگریزی علم ادب ہے۔

اس کے بعد درجۂ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی میں۔

ابھی مدرسے کی ابتدائی جماعتیں کھول دی ہیں۔ عمارت آخر اپریل تک مکمّل ہو جائے گی اور پھر کوشش کی جائے گی کہ تمام جماعتیں شروع ہو جائیں۔

اب چوں کہ یہ مدرسہ مسئلہ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے۔ اس لیے صرف رانچی ہی کا مقامی مسئلہ نہیں بلکہ تمام ہندستان کا مسئلہ ہے۔ اس کا انتظام ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے گا اور مصارف وفنڈ کی طرف سے پورا اطمینان ہے۔

آخری چیز مشغلۂ تصنیف وتالیف ہے اور یہ بہت ضروری ہے اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے بجنور اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں۔ ہندستان میں اس کے اسباب وسامان کا بطرز یورپ کہاں کیا سامان ہے؟ صورت یہی ہے کہ کوئی ایک مستقل تصنیف پیش نظر رکھ لی جائے اور اس کے مواد وسامان کو فراہم کیا جائے۔ اس کے لیے میں موجود ہوں جب تک رانچی میں ہوں۔ کتب خانہ بھی موجود ہے اور اگر کلکتہ چلا گیا جب بھی کلکتہ رانچی سے قریب، نیز مشورہ ومواد کے لیے ہر طرح آمادہ و مستعد۔

یہ جو آپ نے لکھا ہے کیا چندے کی فراہمی کے لیے دورہ کرنا پڑے گا؟ تو اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ انجمن کے چندے کی فراہمی کے جھگڑے سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس کے لیے دورے میں تضیع وقت! آپ کا قیام تو یہیں رہے گا۔ لفظ وعظ سے مقصود یہ تھا کہ ایسے شخص کی ضرورت ہے جو وعظ وہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھے اور جمعہ کی امامت وخطابت وغیرہ اس سے متعلق ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں ایک شخص یہاں آ جائے اور لوگوں کو اس سے شناسا کر دیا جائے۔ اس کی حیثیت یہاں ایک عالم، مفتی، قاضی، امام جمعہ اور ہر طرح مقتداے شہر کی ہوگی اور

تمام شہر صرف اسی کی طرف رجوع کرے گا یہ بات دوسرے مقامات میں بہ آسانی میسر نہیں آ سکتی۔

چوں کہ ابھی عمارت کا کام ختم نہیں ہوا۔ اس لیے مصارف دائمی میں تخفیف پیش نظر ہے اور سر دست انجمن علاوہ مکان واکل وشرب کے (تیس روپے) کے لیے تیار ہے مگر افتتاحِ عمارت مدرسہ کے بعد یہ رقم قطعاً (چالیس روپے) ہو جائے گی۔

بہتر یہ ہے کہ آپ سر دست ایک ماہ کے لیے وقت نکالیں اور رانچی چلے آئیں۔ یہاں چند دنوں رہ کر تمام حالات کا اندازہ ہو جائے گا اگر کسی وجہ سے آپ کی طبیعت نہ لگی تو آمد و رفت کے مصارف انجمن کے ذمے ہوں گے اور آپ واپس چلے جایئے گا۔

(۱۲) ﴿۸۹﴾

پچھلے خط میں مولانا آزاد نے جو یہ لکھا کہ ”آپ سر دست ایک ماہ کے لیے وقت نکالیں اور رانچی چلے آئیں۔ یہاں چند دن رہ کر تمام حالات کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ کی طبیعت نہ لگی تو آمد و رفت کے مصارف انجمن کے ذمے ہوں گے اور آپ واپس چلے جایئے گا“۔

مکتوب الیہ کو یہ پیشکش معقول نظر آئی وہ آ گئے مولانا آزاد کا یہ خط اس کے بعد کا ہے کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مولانا نے ان سے ان کے ارادے کے بارے میں دریافت فرمایا۔ لیکن کسی خط سے نہ تو ان کے آنے کی قطعی تاریخ کا پتا چلتا ہے اور نہ ان کے زمانۂ قیام کی مدت کا صحیح اور قطعی علم ہوتا ہے۔ (ا۔س۔ش)

ڈاک بنگلہ۔ رانچی

۷ر اپریل

برادرم! السلام علیکم

اپنے ارادے اور قیام سے اطلاع دیجیے۔ ابھی کچھ دنوں رہیے گا یا جانے کا قصد ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کے شامل حال رہے۔

فقیر ابوالکلام

(۱۳) ﴿۹۰﴾

(یہ خط سنسر ہو کر مکتوب الیہ تک پہنچا)

جبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا۔ غلطی سے پڑا رہا اور خیال یہ ہوا کہ جواب لکھ چکا ہوں، لیکن آج دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ غالباً جواب نہیں گیا۔

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب آپ بہ صحت و عافیت ہیں۔

فقیر ابوالکلام

رانچی۔ ۱۸/اپریل ۱۹۱۷ء

(۱۴) ﴿۹۱﴾

یہ مولانا کا ایک نوٹ ہے جو انھوں نے مولوی مظہر الدین شیرکوئی کے نام لکھنے کے لیے زکریا صاحب کو بہ طور ہدایت تحریر فرمایا تھا:

''مولوی مظہر الدین صاحب (۱) کو اسی وقت مندرجۂ ذیل مطالب لکھ دیجیے:

۱۔ آپ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ اپنے حالات کے لحاظ سے چالیس روپے کو ناگزیر دیکھتے ہیں اور اس لیے تکمیل عمارتِ مدرسہ تک ارادۂ ورود کو ملتوی رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کوئی مضایقہ نہیں! انجمن سے چالیس روپے منظور کرا لیا جا سکتا ہے، جو آپ کو یوم ورود سے ملے گا۔ علاوہ مکان وغیرہ۔

۲۔ ''جمہور'' کا حال آپ کو معلوم نہیں۔ ایک نو گرفتار میمن تاجر کے بھروسے پر نکل رہا ہے۔ چند دنوں سے زیادہ کا مہمان نہیں۔ ماہوار رسالے کا محض ولولہ ہے۔ مع ہذا اگر

اس کی کوئی صورت نکلی تو رانچی سے وہاں جانا ممکن اور بصورت اختتام نظر بندی وہاں بھی معیت حاصل۔

۳۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ آپ سردست صرف ملنے کا قصد کر کے آیئے۔ اگر آپ کو میں بلاتا تو کیا آپ نہ آتے؟(۲)

ساری باتیں بالمشافہ ہوں گی۔ اس خط کو دیکھتے ہی بہ ذریعۂ تار مطلع کیجیے کہ آنے کا قصد ہے یا نہیں؟ بہ صورت قصد مصارف سفر کے لیے روپیہ بھیج دیا جائے گا۔ آپ آکر مل لیجیے۔ اگر رائے قرار نہ پائے تو واپس تشریف لے جایئے گا۔ کم از کم ملاقات ہو جائے گی۔ تمام مصارف آمد و رفت یہیں سے دے دیے جائیں گے۔

۴۔ بہ وجوہ اس میں عجلت ہے۔ لہٰذا حسب سابق جواب میں تاخیر نہ ہو۔

حواشی:

(۱) اس خط کے اصل مخاطب مولانا مظہر الدین ہیں جو شیر کوٹ ضلع بجنور (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام شیخ علی بخش تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں پڑھا اور ۱۹۰۸ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ انھیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن علیہ الرحمہ کے شاگرد اور مرید ہونے کا شرف حاصل تھا۔ کان پور کے مدرسۂ الٰہیات میں کچھ عرصہ پڑھا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی سے بھی استفادہ کیا تھا اور اسی زمانے میں حضرت علامہ احمد حسن کان پوریؒ سے بھی تحصیل علمی کی تھی۔

دیوبند میں کچھ عرصے مدرس رہے، جمعیۃ الانصار کے سرگرم رکن تھے، جمعیۃ کی شاخ ''قاسم المعارف'' کلکتہ سے وابستہ رہے اور مولانا عبیداللہ سندھی کے نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مولانا سندھی کابل چلے گئے (۱۹۱۵ء) تو مولانا آزاد سے وابستہ ہو گئے۔ وہ مولانا کے درس قرآن کے ایک شریک، دارالارشاد کے مدرس اور البلاغ کی ادارت سے بھی وابستہ تھے۔ وہ اس وقت کے تمام انقلابیوں مثلاً: شیخ الہند، مولانا آزاد، مولانا سندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اعتماد کی شخصیت تھے۔ رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ اور ریشمی رومال سازش کیس میں وقت کی انقلابی شخصیات اور تحریکات سے ان کی وابستگی کا ذکر موجود ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر بندی کے بعد، ریشمی رومال سازش کیس کے مطابق وہ رسالہ ''ادیب'' (الہ آباد) اور ''رسالت (کلکتہ؟) کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں قاضی عبدالغفار مرحوم نے روزنامہ ''جمہور'' کلکتہ نکالا تو اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جمہور بند ہوا تو وہ وطن (بجنور) لوٹ گئے۔ مولوی مجید حسن نے انھیں سہ روزہ ''مدینہ'' کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ سال سوا سال کے بعد اوائل جولائی ۱۹۱۹ء میں انھوں نے شیر کوٹ سے ہفت روزہ''

دستور'' نکالا۔ تحریک خلافت کے زمانے (۱۹۲۱ء) میں انھوں نے نگینہ (ضلع بجنور) سے ''الامان'' ہفت روزہ جاری کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ''الامان'' کا دفتر دہلی منتقل ہوا تو اسے سہ روزہ کر دیا گیا۔ بعد میں ''وحدت'' کے نام سے ایک روزانہ اخبار بھی جاری کیا۔

۱۱ر مارچ ۱۹۳۹ء کو دہلی میں جب کہ وہ اپنے دفتر میں مصروف کار تھے دو مسلمان نوجوانوں نے انھیں ذاتی وجوہ کی بنا پر مشتعل ہو کر قتل کر دیا۔

مولانا مظہر الدین ایک بلند پایہ صحافی ہونے کے علاوہ مصنف بھی تھے اور انھوں نے کئی تاریخی کتابیں اور ناول لکھے تھے۔

(۲) مولانا آزاد کے مشورے کے مطابق مولانا مظہر الدین شیر کوٹی نے رانچی کا سفر کیا اور مولانا آزاد سے ملاقات کی خوش وقتی ضرور حاصل کی، لیکن مدرسۂ اسلامیہ رانچی میں مدرس بننا انھوں نے قبول نہیں کیا۔ درس و تدریس کے مشغلے کے مقابلے میں انھوں نے صحافت کے مشغلے کو اور جمہور کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بننا پسند کیا۔ افسوس کہ ''جمہور'' کی زندگی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو اس کا اجرا عمل میں آیا تھا ستمبر ۱۹۱۸ء کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اپنی جان ہار گیا۔

(۱۵) ﴿۹۲﴾

عزیزی! السلام علیکم صبحکم اللہ بالخیر

کل میں رکھشا (۱) کے لیے کہنا بھول گیا۔ یا تو خود یا بذریعۂ موذن وغیرہ اس کا انتظام کیجیے کہ آج رکھشا ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائے۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) یہ مولانا کا خاص املا ہے، عام طور پر اس لفظ کا املا رکشہ یا رکشا استعمال ہوتا ہے۔

(۱۶) ﴿۹۳﴾

اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ ایک عرصے تک رانچی میں مقیم رہ کر مدرسۂ اسلامیہ کی مخلصانہ خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ مولانا نے اس کا اعتراف فرمایا ہے۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ مولانا سے اس زمانے میں پڑھتے

بھی تھے۔ مولانا آزاد کے ذوق دینی و علمی کے پیش نظر یہ فرض کر لینا شاید غلط نہ ہو کہ قرآن حکیم کے معارف اور آیات الٰہی کے درس و تعلیم کا سلسلہ ہوگا کہ یہ سلسلہ کلکتہ سے مولانا کے اخراج کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔

عزیزی!

آپ نے رقعے میں جس امر کی نسبت لکھا ہے، دراصل اس کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ آج شام کو حاجی رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ کل حسبِ مرضی معاملہ صاف ہو جائے گا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا۔ وہ آپ کی مخلصانہ خدماتِ انجمن کے پوری طرح المعترف اور قدردان ہیں۔ اصل معاملے سے وہ بے خبر تھے۔ اس لیے ان کو غلط فہمی ہوئی۔ مولوی قاسم صاحب وطن میں تھے۔ ان کا نام بل میں دیکھ کر وہ اصل حقیقت نہ سمجھ سکے۔

قطعِ نظر اس کے آپ کا تعلّق تو مجھ سے ہے۔ پس آپ کو اس قسم کے امور سے دل گرفتہ نہ ہونا چاہیے۔

افسوس کہ اس وقت مسجد سے آتے ہی میرے سر میں کل کی طرح سخت درد شروع ہوگیا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور جلد نماز عشاء سے فارغ ہو کر سو جاوں۔ آپ کا سبق ان شاء اللہ کل بعد نماز جمعہ ہو جائے گا اور پھر شام کو۔ اس طرح آیندہ ناغہ ہونے نہ دوں گا۔

ابوالکلام

(۱۷) ﴿۹۴﴾

حبّی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا۔ کلکتہ کے اس تعلّق کی نسبت میں نے اس لیے رائے دی کہ رانچی میں قیام کی کوئی صورت نہ تھی، اور آپ نے دریافت کیا تو آپ کے وطن واطراف میں بھی کوئی صورت سامنے نہ آئی۔ مجبوراً خیال کیا کہ بیکاری سے بہر حال کچھ نہ کچھ معاش کی

صورت کا ہو جانا بہتر ہے۔ چوں کہ آپ نے بھی رضا مندی ظاہر کی، اس لیے میں نے مسٹر فضل دین کو لکھ دیا(۱)

باقی رہا ان کا مزاج! تو آپ جانتے ہیں کہ آج کل طبایع کا کیا حال ہے۔ اور پھر اختلاف طبایع ناگزیر۔ لہٰذا کسی کی ذاتی حالت وطبیعت سے ہمیں کیا مقصود، صرف معاوضے پر کام کر دینا ہے اور بس۔ یہ معلوم ہے کہ دوستی ومحبّت کا تعلّق نہیں۔

البتہ یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ صبح سے لے کر شام تک کی حاضری دفتر میں کیوں ہو؟ کام تو بہ ظاہر کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ صاف صاف ان سے کہہ دیں کہ یا تو بلا قید وقت میں کام کر دوں گا یا پھر دس سے چار تک یا پانچ تک کام کروں گا۔ ان امور میں سکوت کسی طرح بہتر نہیں۔ یہ تو معاملے کی بات ہے، ایک لمحے میں صاف ہو جائے گی۔ اس کو اس قدر اہمیّت کیوں دی جائے۔

باقی رہا تنخواہ کا معاملہ تو بلا شبہ کم ہے اور اللہ اس سے زیادہ کا سامان کرے، لیکن سامان ہونا چاہیے۔ آپ نے کلکتہ کے میمنوں وغیرہ کی نسبت لکھا ہے میمنوں میں کون ایسا شخص ہے جس کے یہاں اس قسم کی ملازمت کی گنجایش نکل سکتی ہے۔ ان کے یہاں تو غالباً صرف تجارتی کام ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ تجسس میں رہیں، اگر کوئی ایسی جگہ نظر آئے تو مجھے لکھیں۔ میں پوری سعی کروں گا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ تعلّق آپ کا شخصاً مسٹر فضل دین سے ہے۔ مجھ سے اس خاص معاملے کو کوئی تعلّق نہیں، یعنی یہ میرے کاموں میں سے نہیں ہے۔ آپ اس خیال سے اس کام کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھیں کہ یہ میرا کام ہے۔ میں نے تو بیکاری سمجھ کر اس کو غنیمت سمجھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس کے ترک کو میں پسند نہ کروں گا۔ آپ دیکھ لیں اور موافق طبع ہو تو کریں۔ ورنہ بلا تامل ترک کر دیں۔ میں دونوں حالتوں میں خوش ہوں۔ یہ تمام معاشی امور میرے علاقے کے دایرے سے خارج ہیں۔ میرا علاقہ تو صرف اللہ کی راہ میں ہے۔ ہاں! اگر دنیوی امور میں کچھ کر سکوں تو

شخصاً اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ بہ ہر حال میرے پیشِ نظر کوئی صورت اس وقت نہیں ہے۔ آپ کے سامنے ہو تو لکھیے۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) فضل دین پر کسی دوسرے خط کے ذیل میں حاشیہ آیا ہے۔

(۱۸) ﴿۹۵﴾

حبّی فی اللہ! السلام علیکم

اللہ تعالیٰ اس عزم کو صادق و کامل فرمائے، آپ نے اللہ کی راہ میں "مـمـا تحبون" کا انفاق کیا ہے۔ یہ عملِ عظیم انشہ ضایع نہ جائے گا۔

باقی رہا انفاقِ قوت و عمر اللہ کی راہ میں، تو اس کے دو مرتبے ہیں:

پہلا عزم و نیت سے تعلّق رکھتا ہے۔

دوسرا عمل سے!

پہلی چیز ہر وقت و آن مطلوب اور ہر وقت ہمارے اختیار میں۔ اس میں کوتاہی نہیں ہونا چاہیے۔ رہا عملی کام تو اس میں انتظارِ وقت ناگزیر، شوق و طلب کا تقاضا یہی ہونا چاہیے کہ ایک لمحے کی تاخیر بھی شاق گزرے، لیکن فہم و فکر صایب کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ انتظار کے بغیر چارہ نہیں۔

سردست آپ کے لیے مسئلہ معیشت بھی ضروری ہے اور ادائے حقوق اہل و عیال بھی، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ میں ملتے جلتے رہیے۔ سعی و کوشش کیجیے کہ کوی گنجایش کہیں دوسری جگہ نظر آئے تو بجر دِ علم مجھے اطلاع دیجیے۔

۱۔ مسٹر فضل دین کے جو حالات لکھے ہیں وہ پیشتر سے مجھے معلوم ہیں، مگر چارۂ کار

کیا؟ باقی رہا ''تذکرہ'' تو اصل حقیقت یہ ہے کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ انھوں نے ہی چھاپا ہے اور اس کی تمام خرید و فروخت اُنھی سے متعلق ہے۔ نفع و نقصان وہ جانیں۔ اگر عقل و دانش سے کام لیتے، اسراف میں نہ پڑتے، اپنی نادان بیوی کی پرستش نہ کرتے اور حالت کے مطابق خرچ رکھتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ حتی الوسع مشورہ و فہمایش میں کمی نہیں کی۔ لیکن افسوس کہ کلکتہ کا قیام غیر ضابطہ طبائع کے لیے موجبِ ابتلا ہے۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔ قانوناً پریس پر کوئی ڈگری جاری نہیں ہوسکتی(۱)، گو زحمت و پریشانی کا موجب ہوسکتی ہے۔ آپ ان کے معاملات کو انھیں پر چھوڑ دیں۔ اس بارے میں میری فہمایش بے اثر رہ چکی ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہوا کہ بند رہنے کی جگہ پریس کا مکان کھلا رہا اور کچھ لوگ اس میں رہے۔ اور مجھے کوئی اس سے نفع نہ ہوا، اور نہ ہوگا۔ نقصان جس قدر ہو خلافِ امید نہیں۔ دنیا کا یہی حال ہے، اس کو آپ ہم بدل نہیں سکتے۔

ایک کام ضروری ہے۔ ایک نسخہ تذکرہ درجۂ اول حکیم برہم ایڈیٹر ''مشرق'' گورکھ پور کے نام رجسٹرڈ بھیج دیجیے (۲)۔ انھوں نے شاید مشرق میں اشتہار چھپوایا تھا۔ اجرت اب تک نہیں دی۔ وہ کہتا ہے کہ کم سے کم ایک نسخہ تو بھیج دو۔ وہ بھی نہیں بھیجا جاتا۔ خط پر خط آرہے ہیں۔ بہ ہر حال آپ بھیج دیں۔ بھیجنے سے پہلے غلط نامہ دیکھ کر قلم سے غلطیاں درست کر دیجیے گا اور غلط نامہ اگر شامل جلد نہ ہو تو جلد کے اندر رکھ دیں۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسٹر فضل الدین جو پریس کو چلا رہے تھے، کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے قرضہ بہت بڑھ گیا تھا اور پریس کی قرقی کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن پریس کے مالک مولانا تھے اور اخبار کا ڈیکلریشن بھی مولانا کے نام تھا اور وہ حکماً نظر بند تھے اور فضل الدین کو ان کی طرف سے کوئی پاور آف اٹرنی حاصل نہ تھا، اس لیے پریس پر ڈگری نہیں کرائی جاسکتی تھی۔ مولانا نے اسی قانونی نقطے کی طرف اشارہ کرکے مکتوب الیہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) برہم تخلص اور عبدالکریم نام تھا۔ فتح پور ہسوہ کے رہنے والے اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ادیب اور ناول نگار بھی تھے، لیکن صحافی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ریاض الاخبار، فتنہ، عطر فتنہ، صلح کل (گورکھ پور) وغیرہ کے نام سے اپنا ہفت روزہ اخبار نکالا اور بہت شہرت پائی۔ وہ ایک کامیاب صحافی تھے۔

(۱۹) ﴿۹۶﴾

(۲۵ر نومبر ۱۹۱۹ء)

برادرم السلام علیکم

یہ معلوم کر کے سخت قلق ہوا کہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ لطف فرمائے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟ آپ کو وہاں رکوانے سے مقصود یہ تھا کہ قبل از جلسہ انجمن مقامات مشہورۂ بہار میں ایک دورہ کیا جائے اور دعوتی خطوط و کارڈ بالمشافہ لوگوں کو دیے جائیں۔ نیز اشتہارات مناسب مقامات پر چسپاں کرائے جائیں۔ لیکن اگر آپ کی طبیعت درست نہیں تو پھر یہ تمام معاملات مہمہ کیوں کر انجام پائیں گے؟

اس صورت میں وہاں بھاگل پور کا کوئی مستعد شخص کیا اس کام کے لیے فوراً مل سکتا ہے؟ اگر آپ کے شناسا لوگوں میں کوئی ہو تو تمام مصارف انجمن ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ واجرہ علی اللہ۔ اس کے علاوہ بہ ہر حال اس خیال سے کہ وقت کم ہے، خواہ خود آپ انجام دیں، خواہ کسی اور ذریعے سے، اصل کام کو لکھ دیا جاتا ہے:

۱۔ جلسے کے دعوتی خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔

۲۔ بھاگل پور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں، اُن کے نام حسبِ حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر بالمشافہ تقسیم کیجیے اور از جانبِ انجمن ترغیبِ شرکتِ جلسہ اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی

اجتماع ہے۔ اس کا خیال رہے کہ کارڈ کم ہیں اور صرف اُن لوگوں کو دینے چاہییں جو انگریزیت میں بہ شدت غرق ہوں، ورنہ اردو خطوط۔ بھاگل پور کے لیے دس خط رکھے گئے ہیں اور دس پوسٹر۔ لیکن حسبِ ضرورت زیادہ صرف کر سکتے ہیں۔ پوسٹر شہر کی مساجد اور نمایاں مقامات پر چسپاں کرائے جائیں۔

۳۔ اس کے بعد فوراً بانکی پور جایئے اور مسٹر مظہر الحق (۱) اور ڈاکٹر محمود بیرسٹرایٹ لا (۲) سے ملیے۔ ڈاکٹر محمود ایک جونیر بیرسٹر اور مسٹر مظہر الحق کے داماد ہیں۔ ان دونوں صاحبوں سے کہیے کہ ''صرف اس قدر زحمت دینا مقصود ہے کہ بزرگان بانکی پور کی کوئی فہرست یہاں موجود نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے نام بتلایئے تاکہ ان کو خطوط و کارڈ خاص طور پر دیے جائیں اور شرکتِ جلسہ کے لیے اصرار کیا جائے۔ اور آپ کی نسبت تو شرکت کا پورا یقین ہے''۔ بانکی پور کے علاوہ دیگر مقاماتِ بہار کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے اور ان تک پہنچایئے۔

اس کے بعد پوسٹر بانکی پور و پٹنہ میں بھی مناسب مقامات پر چسپاں کرانا چاہیے اور عام طور پر لوگوں سے ملنے اور دعوت دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۴۔ وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جاسکتے ہیں، نیز مظفّر پور و مونگیر وغیرہ۔ مظفّر پور میں مولوی ریاض حسن صاحب (۳) رئیس شہر ہیں، اُن سے مدد ملے گی۔ اگر یہاں کا ذکر کر دیا جائے گا۔ اس بارے میں بھی ڈاکٹر محمود سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

۵۔ ہر مقام پر گروہ علما و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علما پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسۂ عربی و انگریزی سے مرکب اور آخری درجۂ تعلیم و تکمیلِ نصابِ علومِ دینیہ پر مبنی۔

۶۔ وقت کم ہے اس لیے تعجیل مطلوب۔ یہ اچھا ہوگا کہ اثنائے سفر میں خط و کتابت ''بذریعہ پوسٹ ماسٹر'' ہو۔ یعنی یہاں سے آپ کے نام کے خطوط وغیرہ ہر شہر

کے پوسٹ ماسٹر کے ذریعے جائیں۔ آپ کو ہر جگہ پوسٹ آفس میں جا کر خود دریافت کر لینا ہوگا، اور اپنے نام کی ڈاک لے لینی ہوگی۔

۷۔ چوں کہ آپ کی علالت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہوگیا۔ اس لیے روپیہ نہیں بھیجا گیا۔ بصورت مستعدی آپ فوراً بلا ادنیٰ تامل سفر شروع کر دیں اور خط میں پتا لکھیں۔ مصارف کے لیے روپیہ بھیج دیا جائے گا یا مثلِ سابق آپ مصارف کا پرچہ بھیجتے رہیں گے اور روپیہ جاتا رہے گا۔

۸۔ مزید دعوتی خطوط مطلوب ہوں گے وہ طلب کر لیجیے گا۔

۹۔ جناب مولانا محمد علی صاحب (۴) کی عدم شرکت پر کمال افسوس! مگر واقعی، ان کی معذوری واضح۔ لیکن بعض علماے واعظین جو ان کی خدمت میں رہتے ہیں، ان کی شرکت تو نہایت ضروری ہے۔ اگر جناب موصوف امر فرمائیں تو وہ ضرور شریک ہوں گے۔ پس اس کے لیے کوشش کیجیے۔ یہ اجتماع صوبۂ بہار کی تعلیمی اصلاح و ترقی کا اجتماع عام ہے، اور ستم ہے اگر خود اس صوبے کے علما و اصحاب راے اس میں حصّہ وافر نہ لیں!

۱۰۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ زبانی بھی ان کو خاصتۂ آمادۂ شرکت کیا جا سکتا ہے۔ بلا رسمِ ابلاغِ رقعہ و کارڈ۔

۱۱۔ اس جلسے میں صوبۂ بہار کے وعاظ و مقررین کی خاصتۂ ضرورت ہے۔ جلسہ تین دن ہوگا۔

۱۲۔ بانکی پور میں حافظ محبّ الحق صاحب (۵) کا پتا دریافت کر کے ان سے بھی خاص طور پر ملیں اور کہیں کہ آپ کی شرکت نہایت الزم داعیۂ مزید معطی و تناصر و تعاون۔

۱۳۔ ایک شخص مولوی ضمیر الدین صاحب (۶) ہیں۔ ان سے بذریعۂ مسٹر محمود بیرسٹر ایٹ لا محلہ دریاپور پٹنہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ وہی شخص ہیں جو رمضان میں یہاں

تھے از ہم راہیانِ مولوی شرف الدین (۷)۔ اور جمعہ کے دن اکثر مسجد آتے تھے۔ ان سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔ بلکہ بہتر ہے کہ سب سے پہلے انھی سے ملیے، اور انھی کے مشورے سے لوگوں کے نام حاصل کیجیے اور ان کو دعوت دیجیے اور کہیے کہ انجمن آپ کو اپنا قایم مقام سمجھتی ہے، اور امید کرتی ہے کہ خود آپ انجمن کی جانب سے یہاں لوگوں سے ملیں گے اور دعوت دیں گے اور جلسے میں لائیں گے۔

میرا ذکر کیجیے کہ اس کو اس بارے میں آپ پر خاصۃً اعتماد ہے۔ اس جلسے میں کلکتہ سے تمام معززین و ممبران کونسل وغیرہ شرکت کے لیے آئیں گے، حتیٰ کہ ڈھاکہ سے، کس قدر افسوس کی بات ہو اگر خود صوبۂ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں؟ حال آں کہ جو کچھ ہے، انھی کے گھر کا کام ہے۔

ضروری: خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً بذریعۂ تار مطلع کیا جائے اور رقعے وغیرہ معاً واپس کر دیے جائیں۔

حواشی:

(۱) مظہر الحق بیرسٹرایٹ لا پر حاشیہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام خطوط کے ضمن میں آیا ہے۔

(۲) ڈاکٹر محمود کے نام مولانا آزاد کا ایک خط یادگار ہے۔ ان کا تعارف تراجم مکتوب الیہم کے ضمن میں آئے گا۔

(۳) ریاض حسن موضع رسول پور ڈاک خانہ سلیم پور ڈویا ضلع مظفر پور (بہار) کے رئیس اعظم تھے۔ والد کا نام حکیم محمد ہادی حسن نایاب تھا۔ ۱۲ر رجب ۱۲۹۴ کو پیدا ہوئے۔ مولانا حکیم سید فرزند علی دہلوی مجددی نقشبندی مہاجر مدینہ اور مولانا سید سخاوت حسین کاکوی سے درسیات کی متداول کتابیں پڑھی تھیں۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ اردو اور فارسی میں ان کا کلام یادگار ہے۔ اردو میں خیال اور فارسی میں دانش تخلص کرتے تھے اردو میں داغ سے اور فارسی میں خواجہ عزیز الدین کشمیری لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۵۳ء کو انتقال ہوا۔

ریاض حسن خیالؔ اور ان کے والد ہادی حسن نایابؔ کا ترجمہ حکیم سید احمد ندوی نے ''مسلم شعرائے بہار'' حصہ دوم اور پنجم میں لکھا ہے۔

(۴) مولانا محمد علی مونگیری بانی و ناظم اول ندوۃ العلماء لکھنو، ۲۸ر جولائی ۱۸۴۶ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ مدرسۂ فیض عام

کان پور میں درسیات کی تکمیل کی۔مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی ان کے نامور اساتذہ میں تھے۔ مولانا فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفۂ مجاز اور خود بھی بہت بڑے بزرگ شخصیت اور اللہ والے تھے۔تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور وعظ وتقریر کے ذریعے اسلام کی بہت خدمات انجام دیں۔ردِ عیسائیت میں خاص طور پر ساعی رہے۔ بہت وسیع الخیال اور بلند اخلاق کے مالک تھے۔زندگی کے آخری پچیس برس مونگیر میں گزرے۔بہار میں ارشاد واصلاح کے بڑے گہرے اثرات اور ایک وسیع حلقۂ مریدین چھوڑا۔۱۳ر ستمبر ۱۹۲۷ء کو مونگیر میں انتقال ہوا۔نور اللہ مرقدہ۔

(۵) حافظ محب الحق، شاہو بیگہ ضلع گیا کے رئیس، مشہور شاعر فضل حق آزاد عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی ''شمس العلماء'' کے خطاب یافتہ، نہایت متقی اور پرہیز گار شخص تھے۔مولانا محمد علی مونگیری سے بیعت تھے۔تقسیم ملک کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔کراچی میں انتقال ہوا۔

(۶) مولوی ضمیر الدین: خان بہادر سید ضمیر الدین احمد ۱۸۶۲ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے ۱۸۸۵ء میں فلسفہ، انگریزی اور فارسی کے مضامین میں اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کیا۔اردو اور انگریزی کے ادیب اور مصنف تھے۔شیر شاہ کی لائف، راسخ کی لائف، داؤد خاں پنی کی لائف وغیرہ ان کی مشہور انگریزی تصانیف ہیں۔ انھوں نے طبقات اکبری کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔کوکبۂ ملوکی ومملوکی کے نام سے ملک قطب الدین ایبک سے لے کر خلجی سلاطین تک کے تاریخی حالات لکھے۔سیرۃ الشرف میں حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کی سیرت وسوانح نگار ہیں۔الپنچ میں مضمون نگاری بھی کرتے تھے۔جنوری ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوا۔سید بدر الدین بدر آپ کے صاحبزادے اور بہار کے مشہور اردو شاعر ہیں۔

(۷) مولوی شرف الدین نیورہ کے سادات خاندان کے مشہور فرد اور سید فرزند علی وکیل چھپرہ کے بیٹے تھے۔کلکتہ اور پٹنہ کے ہائی کورٹوں میں جج رہے۔گاندھی جی سے پہلے کانگریس کے فعال رکن تھے۔شمس العلما حافظ محب الحق کے برادرِ نسبتی تھے۔قومی ومذہبی کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔کلکتہ کی انجمنِ اسلامیہ اور یتیم خانۂ اسلامیہ ان کی مذہبی اور ملی خدمات کی یادگاریں ہیں۔حاجی وارث علی شاہ کے مریدوں میں تھے۔۱۹۲۱ء میں نیورہ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

(۲۰) ﴿۹۷﴾

حبّی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا۔اخلاص احمد صاحب وغیرہ کا تار آیا تھا۔اللہ کو جو منظور ہوگا، ہو رہے گا اس میں کاوش بے سود ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ جب تمھارا جلد کلکتہ آنا مطلوب ہے تو پھر مولوی اکرم (۱) کے یہاں تعلّق کیوں کروں؟ بلا شبہ میرے لیے نہایت خوشی کا موجب ہو اگر بہ راہِ راست

آپ کے لیے کسی بہتر سامان کا ذریعہ ہوسکوں۔ لیکن یہ چیزیں اصل کار و مقصد میں داخل نہیں ہیں، محض وسیلۂ معیشت ہیں۔ جہاں ہوں ایک ہی حکم میں داخل ہیں۔

علاوہ بریں بالفرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو وہاں آپ کے لیے بالفعل کوئی اچھی صورت ذہن میں نہیں۔ پریس میں کوئی ایسا کام نہیں جس کو آپ کے لیے منتخب کروں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ پریس کے کام کی حالت کیا ہوگی۔ موجودہ حالت میں صرف ایک تذکرہ کے لیے مسٹر فضل دین نے آپ کو بلالیا۔ چوں کہ وہ اپنے طور پر کام کررہے ہیں، اس لیے میں نے دخل نہیں دیا ورنہ نہ تو آپ کے لیے یہ کام کوئی کام تھا۔ نہ دفتر کے لیے واقعی ضرورت تھی۔ برخلاف اس کے مولوی اکرم اخبار روزانہ ''بنگالی'' نکال رہے ہیں۔ کام اور ترقی کا بہت اچھا موقع ہے۔ آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں۔

بحالت موجودہ آپ کے لیے اس سے بہتر کلکتہ میں اور کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ تنخواہ بھی امید ہے مناسب ہوگی۔ آپ کو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دل چسپی بھی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر کسی طرح مناسب نہیں کہ اس عمدہ موقعے کو ہاتھ سے جانے دیں، فوراً اختیار کرلیں۔ ان شاء اللہ موجبِ فلاح ہوگا۔

میں اگر کلکتہ چلا بھی گیا، جب بھی بحالت موجودہ مجھ کو دوسری مشغولیتیں درپیش ہوں گی، اور مالی مشکلات کی وجہ سے پریس میں کوئی گنجایش ایسی نہ نکلے گی کہ مختلف قسم کے کام پیش آئیں۔ پس جو صورت سامنے ہے، اسے ضایع نہ کیجیے۔

بڑی اچھی بات اس میں یہ ہوگی کہ آپ کا قیام کلکتہ ہی میں رہے گا۔ چوں کہ المستشار موتمن، اس لیے جو اصلیت تھی لکھ دی گئی ہے۔

ابوالکلام

رانچی، ۲؍جنوری ۱۹۲۰ء

حواشی:

(۱) یہ خط ۲ر جنوری ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس وقت تک نظر بندی ختم ہو جانے کے باوجود رانچی میں تھے۔ بلکہ اس کے بعد بھی چند روز وہ رانچی میں ضرور ٹھہرے تھے۔

(۲) اکرم خاں: مولانا محمد اکرم خان ۸ر جون ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی۔ مذہبی قومی اور سیاسی کاموں کا شوق شروع سے تھا۔صحافی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔امرت سر کے اخبار اہل حدیث اور کلکتہ کے اخبارات میں اخبارِ محمدی، الاسلام، زمانہ، محمدی اور آزاد میں ایڈیٹر اور بعض کے معاون ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے صحافت کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح وترقی میں بہترین حصّہ لیا۔ انھیں بنگال میں بابائے مسلم صحافت کہا جاتا ہے۔وہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے۔چوں کہ مکتوب الیہ بھی اہل حدیث تھے، اس لیے مولانا نے اس خط میں ان الفاظ سے کہ ''آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں'' اسی طرف اشارہ کیا ہے۔''خوش خیال'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں اہل حدیث ہونے کے باوجود تقشف یا اسی قسم کی کوئی اور بات نہیں ہے۔

اس صدی کی دوسری دھائی سے سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا تھا۔ خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریکات میں شریک رہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے آنریری سکریٹری اور بنگال خلافت کمیٹی کے تین سکریٹریوں میں سے ایک تھے۔ مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت صوبہ بنگال خلافت کانفرنس ''مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب'' کا پہلا ایڈیشن انھیں نے شائع کیا تھا۔متعدد، ادبی، سماجی، مذہبی، سیاسی انجمنوں سے وابستہ رہے۔تحریک پاکستان میں بہت سرگرم تھے۔ بنگال کی تقسیم کے خلاف تھے، بنگال کو متحد رکھنے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد ڈھاکا منتقل ہوگئے تھے۔مسلم لیگ کی حکومت کے خلاف سخت محاذ قایم کیا تھا، لیگی لیڈروں کی بدعنوانیوں اور خود غرضیوں کو طشت از بام کیا اور حزب اختلاف کا بہترین تعمیری کردار ادا کیا۔قرآن حکیم اور سیرت النبی (شبلی وسلیمان) کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا۔ایک درجن سے زیادہ بنگلہ زبان میں ان کی تصانیف ہیں۔اردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے اس کے دونوں بازوؤں میں مسلّط کیے جانے کے سخت خلاف تھے۔

انھوں نے بنگلہ زبان کے قدیم عربی رسم الخط کے رجوع کی تحریک کی بھی سخت مخالفت کی تھی۔ ڈھاکا میں علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے خلاف تاریخ کانفرنس کے ہنگامے کے پس پردہ ڈاکٹر شہید اللہ کے علاوہ مولانا محمد اکرم خاں مرحوم کا ہاتھ کارفرما تھا۔۱۴ر ستمبر ۱۹۶۸ء کو ڈھاکا میں انتقال ہوا۔

(۲۱) ﴿۹۸﴾

زکریا صاحب نے مولانا سے چند سوالات کیے تھے۔ سوالات کا مفہوم جوابات سے ظاہر ہے۔ اس لیے سوالات نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

باسمہ

کلکتہ،

۲۰ رفروری ۱۹۳۰ء

حبی فی اللہ! السّلام علیکم

آپ کی پریشاں حالیوں سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ زمانہ بے مہر ہے اور اربابِ درد کی جیب خالی ہے۔ بہر حال، جوں ہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپ کے لیے سودمند ہو، آپ کو اطلاع دوں گا۔

۱۔ اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے، بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ اُسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اس کی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت وسیاست کی سب سے بہتر مثال قایم کر گیا۔

۲۔ جنوبی اور وسطِ امریکا کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں اس کا تعلّق قدیم براعظموں سے رہ چکا ہے، لیکن جہاں تک تاریخی وثایق کا تعلّق ہے، قطع وجزم کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے، لیکن یہ محض ایک قیاس ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ ریڈ انڈین کا اطلاق امریکا کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے۔ اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

۴۔ مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت ونجات اور ایک خالقِ کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افرادِ انسانی کو باہم دگر متحّد کر دینا ہے۔ یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصراً جواب دیا جاسکے، بہت زیادہ تفصیل وبحث کی ضرورت ہے۔

ابوالکلام

(۲۲) ﴿۹۹﴾

۱۹۳۱ء میں ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ زکریا مرحوم نے اسی سلسلے میں مولانا کو خط لکھا تھا۔ یہ اسی کا جواب ہے۔

دہلی،

۲۶۔۱۲۔۱۹۳۱ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ ترجمان القرآن کے لیے منیجر صاحب کو کہہ دیا ہے۔ غالبًا مل گیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فہم ومطالعہ قرآن کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ضرور آپ کے لیے کوئی راہ نکالتا بشرطے کہ بہ حالت موجودہ اس کی صورتیں موجود ہوتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالفعل کوئی ایسا کام میرے ہاتھ میں نہیں۔ اگر آپ کو بلاؤں تو کون سا کام سپرد کروں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا سامان کر دیا کہ آپ کے لیے موزوں صورت نکل سکی تو یقین رکھیے میری جانب سے کوتاہی نہ ہوگی۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۲۳) ﴿۱۰۰﴾

زکریا مرحوم نے ترجمان القرآن کے مطالعے کی بعض لوگوں کو ترغیب دی تھی اور ان کے لیے ترجمان القرآن منگوانا چاہتے تھے۔

عزیزی!

بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ آرڈر کی تعمیل کی گنجایش ہے۔ کتاب اسی لیے چھپی ہے کہ جو خواہش مند ہوں، منگوائیں۔ کتاب منیجر دفتر ترجمان القرآن، نمبر ۱۰۔ دریا گنج، دہلی سے مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات دور کرے اور بہتر سروسامان فراہم فرمائے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

دہلی، ۵۔۱۔۱۹۳۲ء

(۲۴) ﴿۱۰۱﴾

کلکتہ،

۲۰۔۴۔۱۹۳۷ء

عزیزی!

آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے، لیکن آپ کو لکھتا تو کیا لکھتا؟ کوئی صورت ایسی موجود نہیں کہ اس پر اعتماد کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کر لیجیے۔ کئی ماہ تک پچھلے دنوں آپ کلکتہ میں رہے اور کوشش میں کمی نہیں ہوئی، لیکن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت اخبار کی وہاں نکل آئی ہے، جیسی کچھ بھی ہو، بہ ہر حال ایک صورت ضرور ہے۔ جب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے، اسے غنیمت تصور کرنا چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم سے کم بے کاری تو نہیں۔

اگر میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو آپ کے لیے کام دے سکے تو ان شاء اللہ تغافل نہیں کروں گا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۲۵) ﴿۱۰۲﴾

نیو دہلی

۱۰رمئی ۱۹۵۱ء

جناب والا!

آپ کا خط مورخہ ۵رمئی ۱۹۵۱ء وصول ہوا۔ مولانا جلد ہی یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دورے پر جانے والے ہیں۔ اس لیے ان دنوں وہ بہت ہی مصروف ہیں۔

افسوس کہ آج کل ان کے لیے اپنی نج کی ڈاک دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

آپ کا مخلص

ایم این مسعود

پرائیویٹ سیکریٹری وزیرِ تعلیم۔ بھارت

ایم ای زکریا، استادِ فارسی مکھشدا (۱) گرلز ہائی اسکول

بھاگل پور (برار)

حاشیہ:

(۱) پروفیسر محمود واجد ہاشمی کے بہ قول یہ لفظ ''مقصودا'' ہے۔ جس کا تلفظ بگڑ کر مکھشدا ہو گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اہل اردو کی زبانوں پر مقصودا ہی ہے۔

(۲۶) ﴿۱۰۳﴾

زکریا صاحب کو ان کے خط کا جواب لکھنے کے لیے مولانا نے اپنے سیکریٹری کو ہدایت فرمائی کہ انھیں انگریزی میں یہ جواب دے دیجیے کہ

"گورنمنٹ آف انڈیا میں کوئی ایسا اسکالرشپ اب نہیں ہے، جو ڈاکٹری کے لیے کسی امیدوار کو دیا جا سکے۔ جو اسکالرشپ آج کل دیے جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ شرط ہے کہ کوئی یونیورسٹی اس کی سفارش کرے اور آدھا خرچ خود برداشت کرے۔ بس اگر یہ صاحب چاہتے ہیں تو بہار یونیورسٹی کے پاس درخواست بھیجیں۔ وہ اگر سنٹرل گورنمنٹ کو لکھے گی اور ان کا آدھا خرچ اٹھائے گی تو گورنمنٹ اس پر غور کرے گی"۔

M.E.ZAKARIA. ESQ
MOHALLA MULLACHAOK
BHAGALPUR CITY

مولانا عبدالماجد دریابادی

مولانا دریابادی مرحوم کے نام مولانا آزاد کے یہ خطوط پہلے ''نیا دور'' لکھنو میں چھپے، پھر اس سے صدق جدید۔ لکھنو (۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء تا ۱۰ر فروری ۱۹۶۱ء) میں نقل ہوئے۔ بعدہٗ مولانا غلام رسول مہر نے انھیں ''تبرکاتِ آزاد'' میں شامل کرلیا تھا، اب انھیں اس مجموعے میں شامل کیا جارہا ہے۔ خطوط کے آغاز میں تمہیدی عبارت اور ہر خط کے آخر میں توضیحی اشارات مولانا دریابادی کے قلم سے تھے اور مولانا مہر نے اپنے طور پر بھی حواشی لکھے تھے۔ خاکسار نے جابجا دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ جہاں کہیں کسی وضاحت یا حاشیے کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں حاشیے کے ساتھ ''ا۔س۔ش'' کی صراحت کردی ہے۔ اس مجموعے میں مولانا آزاد کے مکمل ونامکمل ۲۴ خط ہیں۔ مکتوب الیہ نے صرف ۱۹ خط قابلِ اشاعت سمجھے تھے۔ بقیہ خطوط مختلف مآخذ سے لے کر شامل کردیے ہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں تاریخی حیثیت ان کی بھی ہے۔

خطوط پر مولانا دریابادی کے قلم سے تعارفی نوٹ یہ ہے:

''غالی معتقدین تو اپنے ہیرو کو عرشِ معلّٰی پر ہی پہنچا کر دم لیتے ہیں لیکن احتیاط و اعتدال سے بھی پورا کام لینے کے بعد، اتنا تو بہرحال ماننا ہی پڑتا ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد اپنے معاصرین میں ایک بڑا امتاز مرتبہ رکھتے تھے اور نہ صرف ذہنی، فکری، علمی، ادبی، بلکہ بعض اخلاقی کمالات کے بھی مالک تھے۔

ان کی پبلک تحریریں جس معیار کی ہیں، وہ تو ظاہر ہی ہیں لیکن ان کی سیرت کے بعض جوہر ایسے ہیں جو ان کی خانگی یا نجی ہی تحریروں میں زیادہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مطبوعہ تحریروں سے الگ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان سے بالکل مختلف۔ مثلاً؟

۱۔الہلالی دور کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز وتعریض کا عنصر نمایاں و غالب نظر آئے گا۔لیکن عین اسی زمانے کے مکتوبات میں یہ عنصر نام کو بھی نہیں نظر آتا اور مولانا (ایڈیٹر الہلال سے الگ) تمام تر سادگی، سنجیدگی کی تصویر نظر آتے ہیں۔

۲۔اس دور کے مضمون اور مقالے جوشِ خطابت اور شعلہ بیانی کی نذر ہیں۔ مکتوبات میں اس کے برعکس، مولانا بجائے ایک جذباتی انسان کے ہر طرح متوازن و معتدل اور ٹھنڈے دل سے غور وفکر کرنے والے انسان کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔

۳۔نکتہ چینوں کو اس دور کی مطبوعہ تحریروں میں بوے انانیت محسوس ہوتی ہے۔ ذاتی خطوط کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہے۔یہاں جلوہ آرائیاں تواضع، انکسار واخلاص ہی کی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پختہ عمری کے بعد مولانا کی پبلک تحریروں میں بھی یہ رنگ ایک حد تک آ چلا تھا، پھر بھی یہ رنگ نمایاں خطوط ہی میں ہے اور ابتدائی اور درمیانی دور کی مطبوعہ تحریریں تو بالکل ہی دوسرے رنگ کی ہیں۔

انسان کے ظرف کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو یہی دیکھنے پر قناعت نہ کیجیے کہ اس کا برتاؤ دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ کیسا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ معترضوں نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ امتحان ایک کڑا امتحان ہے۔ اچھے اچھے عابد وزاہد بزرگ بھی اس امتحان میں ہمیشہ پورے نہیں اتر پاتے۔مولانا کو اللہ نے اس نعمتِ خصوصی سے نوازا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے لیے بھی دل میں جگہ رکھتے تھے اور ان سے معاملہ رکھنے میں اپنے حلم، رواداری اور اعلیٰ ظرفی کا پورا ثبوت دیتے رہتے۔

ان حالات میں یہ کچھ ضروری سا معلوم ہوا کہ مولانا کے یہ نجی خطوط جو تعداد میں بہت تھوڑے ہیں دنیا کے سامنے پیش ہو جائیں۔گو ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے خود مکتوب الیہ کی خودستائی کا پہلو نکل رہا ہے"۔

ان خطوط کو مولانا غلام رسول مہر نے "تبرکات آزاد" میں شامل کیا تھا تو ان پر شروع میں ایک نوٹ لکھا تھا جس میں مہر مرحوم نے مولانا دریابادی کی تمہید

کی عبارت کے بارے میں لکھا تھا:

''مولانا عبدالماجد نے جو تمہیدی عبارت تحریر فرمائی، وہ عموماً اور اس کا ابتدائی حصہ خصوصاً میرے لیے سراسر تعجب انگیز تھا۔ میں عقیدت یا عدم عقیدت دونوں میں غلو کو خلافِ حق و انصاف سمجھتا ہوں اور خالص غیر جانب داری کے نقطۂ نگاہ سے اس عبارت کے محرکات پر جتنا غور کیا مولانا عبدالماجد کے مقام و مرتبہ بلند سے اس کی کوئی مناسبت نظر نہ آئی''۔ (''تبرکات آزاد'' ص ۸۷)

خاکسار ابوسلمان نے ان مکاتیب پر حواشی کی تالیف میں مولانا مہر کے افادات سے فایدہ اٹھایا اور کہیں من وعن انھیں درج کردیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

خطوط

(۱) ﴿۱۰۴﴾

۷۔ میکلا وڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۴/اگست ۱۹۱۲ء

صدیقی العزیز!

والا نامہ پہنچا۔ آج صبح مہلت ملی تو عین صبح کے وقت کہ ذہن و دماغ کے سکون اور جمعیّت کا وقت ہوتا ہے۔ اول سے آخر تک پڑھا، یقین فرمایئے کہ اس مخلصانہ اظہار راے و مشورہ کے لیے کمال متشکر اور ممنون ہوں۔

میں آج ہی تفصیلی طور پر اپنی معروضات بھی عرض کرتا لیکن خود بیمار ہوں۔ گھر میں شب سے سخت علالت، دو چار دن کی مہلت دیجیے۔ انشہ جمعرات یا جمعے کے دن خط لکھوں گا(۱)۔

آپ کا پتا مجھے معلوم نہ تھا۔ مولانا شبلی یہیں مقیم تھے، ان سے پوچھا تھا اور خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

مولانا شبلی کی بھی الہلال کے لب و لہجہ کی نسبت وہی راے ہے، جو آپ کی ہے(۲)۔

فقیر ابوالکلام

حواشی:

(۱) مولانا کے محفوظ خطوط میں یہی سب سے پہلا خط ہے۔ مکتوب الیہ اس وقت بی اے پاس کر کے ایم اے میں (فلسفہ لے کر) داخلہ لینے کی فکر میں تھا اور اس وقت مسلمان طالب علم کے لیے یہ ایک حد تک نئی سی بات تھی۔

(۲) الہلال کو نکلے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا۔ علی گڑھ کے خلاف اس کی شدید اور تند پالیسی سے مکتوب الیہ متفق نہ تھا اور یہی مولانا کو مفصل خط میں لکھ بھیجا تھا۔ مولانا شبلی تو علی گڑھ کی سیاسیات کے خود ہی بہت مخالف تھے تاہم الہلال کی

حد تک جانے کو تیار نہ تھے۔

صاحب الہلال کا مرتبہ اس وقت بھی بلند تھا۔ یہ ان کا نہایت کرم تھا کہ ایک طالب علم سے وہ مساویانہ لہجہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

لفظ ''صدیقی'' جس سے یہ مکتوب شروع ہوا ہے اور آیندہ بھی عموماً اسی سے سارے مکتوب شروع ہوتے رہیں گے۔ عربی کا لفظ صدیق بروزن فعیل و کریم ہے نہ کہ اردو میں چلا ہوا لفظ صدیق (دال مشدد کے ساتھ) اور اس کے معنی دوست کے ہیں۔ (دریابادی)

(۳) ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء (ص ۱۳) کے الہلال میں ''فکاہات'' کے کالم میں ''جزرومد'' ۔ الہلال کا لب ولہجہ'' کے عنوان اور کشاف کے نام سے علامہ شبلی کی ایک آٹھ اشعار کی نظم چھپی تھی، جس کا پہلا شعر یہ تھا:

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید
سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟

اور آخری شعر یہ ہے:

فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
''جزر'' جیسا تھا اسی زور کا ''مد'' ہے کہ نہیں؟
(ا۔س۔ش)

(۲) ﴿۱۰۵﴾

۷۔ میکلاوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۷؍دسمبر ۱۹۱۲ء

صدیقی العزیز!

سخت نادم ہوں کہ خط کا جواب وقت پر نہ دے سکا اور خواستگارِ معافی۔

امید ہے کہ آپ بہ صحت و عافیت ہوں گے۔ یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ نے ایم اے میں فلسفہ لیا ہے، نیز تحصیل زبان جرمن (۱)۔

مولوی عبدالقادر صاحب خط کا جواب نہیں دیتے۔ امرتسر میں نے خطوط لکھے اور عرصے تک انتظار کیا۔ میرا اسلام پہنچا دیجیے (۲)۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) مکتوب الیہ لکھنو چھوڑ کر اب علی گڑھ پہنچا ہے (لکھنو میں ایم اے میں فلسفے کی تعلیم کا انتظام نہ ہوسکا۔ علی گڑھ میں پروفیسر ہوروئز (جرمن یہودی مستشرق) سے جرمن زبان میں کچھ شد بد شروع کردی تھی اور وہ شد بد سے آگے بڑھی ہی نہیں۔ مولوی عبدالقادر بھاگل پوری بھی ایم اے بی کے طالب علم تھے۔ فلسفے میں کوئی اور مضمون لیے ہوئے۔ مسلک قادیانی (احمدی) رکھتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد ان کے علم و نظر کے مداحوں میں تھے۔ (دریابادی)

(۳) ﴿۱۰۶﴾

۲۶ رمئی ۱۹۱۳ء

دیر آمدی اے نگارِ سرمست
زودت ندہم دامن از دست

صدیقی العزیز!

عطیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شایع ہو جائے گا۔

کیا آپ اس کو پسند فرمائیں گے کہ البصائر کے لیے جو ایک ماہوار غیر سیاسی، خالص علمی و دینی پرچہ ہوگا جو جولائی سے شایع ہو جائے گا۔ کوئی مضمون مخصوص ارقام فرمائیں؟ کسی اہم علمی موضوع پر ہو اور ترجمہ یا بطور خود۔

ایک مستقل کتاب کے زیرِ ترتیب ہونے کی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی (۱)۔

البصائر کے لیے مضمون ۱۵ رجون تک ضرور مل جانا چاہیے۔ پہلا نمبر مدت سے مرتب ہے۔ صرف بعض ابواب باقی ہیں (۲)۔

مخلصکم الوفی

ابوالکلام

جناب عبدالماجد بی اے اسکوئر
گھسیاری منڈی۔ لکھنو

حواشی:

(۱) یہ مضمون الہلال کی دو اشاعتوں میں شایع ہوا تھا۔ مولانا مہر نے اس پر ایک مفصل حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ مضمون ''فلسفۂ جذبات'' کا ایک باب تھا جو بہ عنوان ''حظ و کرب'' الہلال کی دو اشاعتوں ۸؍جون اور ۲۵؍جون ۱۹۱۳ء میں شایع ہوا تھا۔ مولانا نے مضمون کے خاتمے پر تحریر فرمایا تھا:

''مسٹر عبدالماجد اُن معدودے چند تعلیم یافتہ ارباب علم میں سے ہیں، جن کو تصنیف و تالیف اور تراجم علمیہ کا ذوق ہے۔ ان ابواب کی اشاعت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان کے متعلق اگر ارباب علم مشورہ دے سکیں تو قبل از اشاعتِ کتاب اس سے فایدہ اٹھائیں مگر مجھے اس میں شک ہے کہ لوگ اس طرح کے مضامین کو غور سے پڑھنے اور رائے دینے کی زحمت گوارا کریں گے''۔

آخر میں اپنی طرف سے مشورہ دیا تھا کہ ''حظ و کرب'' کی جگہ ''لذت والم'' کے الفاظ زیادہ موزوں اور صحیح تھے اس لیے کہ حظ کے معنی لذت کے نہیں البتہ اردو اور شاید فارسی میں لذت کے لیے بولتے ہیں، لیکن بہ اعتبار لغت غلط ہے۔ نیز کرب صرف حزن کے معنی میں آتا ہے اور ''الم'' میں اس سے زیادہ وسعت و تعمیم ہے۔

غرض اس تحریر میں کوئی چیز کسی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض نہ تھی مگر سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا عبدالماجد نے کس بنا پر فرمایا کہ

''الہلال نے اسے چھاپا تو لیکن بعض مصطلحات پر ایک تنقیدی نوٹ دے کر جس کا لہجہ مولانا کے مکتوب کے محبت آمیز لہجے سے بالکل مختلف تھا۔

۲۵؍جون ۱۹۱۳ء کا الہلال موجود ہے اور مولانا کی عبارت کا بیشتر حصہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لب و لہجہ زیادہ محبت آمیز نہ تھا''۔

(۲) مولانا ''الہلال'' کے علاوہ بھی کچھ چیزیں شایع کرنے کے خواہاں تھے۔ مثلاً:

الف۔ ایک ماہوار دینی رسالہ جس کا اعلان پہلے ''البیان'' کے نام سے ہوا تھا۔ اسے صرف تفسیر اور علوم و معارف قرآن کے لیے مخصوص رکھنا چاہتے تھے۔ پھر یہ قرار پایا کہ یہ رسالہ دینی و علمی ہونا چاہیے اور اس کا نام ''البصائر'' تجویز ہوا۔ زیرِ غور مکتوب میں اسی کا ذکر ہے۔ پھر الہلال میں اشتہار بھی دے دیا گیا تھا کہ البصائر شوال ۱۳۳۱ھ (ستمبر ۱۹۱۳ء) سے شایع ہونے لگے گا۔ بلکہ اس کا ایک عربی ایڈیشن بھی شایع کرنے کا ارادہ تھا لیکن البصائر اردو شایع ہوا اور نہ عربی۔

ب۔ بیچ میں روزانہ ''الہلال'' ہفتہ وار ''الہلال'' سے الگ جاری کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا پھر چند روز تک روزانہ ''الہلال'' ایک ورق کی شکل میں چھپتا بھی رہا جس میں خبریں ہوتی تھیں اور میرے علم کی حد تک یہ کلکتہ سے باہر نہ گیا مگر اس سلسلے میں بھی قدم آگے نہ بڑھایا جا سکا اس لیے کہ جن رفیقوں کی ضرورت تھی وہ مولانا کو میسر نہ آ سکے اور صرف ہفتہ وار الہلال کسی نہ کسی طرح شایع ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں دو ہزار کی ضمانت ضبط ہونے کے باعث بند ہو گیا۔ اس لیے کہ آگے دس ہزار کی ضمانت دیے بغیر چارہ نہ تھا اور وہ بھی یقیناً جلد از جلد ضبط ہو جاتی۔

(۴)

﴿۱۰۷﴾

۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز!

آپ کا مضمون پہنچا لیکن آپ نے کسی قدر جلدی کی۔ میری تحریر نا تمام ہے۔ میں اسے بجنسہٖ الہلال میں شایع کردوں گا، مگر اپنی بقیہ تحریر کے ساتھ یا بعد!۔

آپ کے غصّے نے بڑا لطف دیا(۱)۔

لکھنو میں مولوی ظفر حسن صاحب کے متعلق آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور یہ بات قرار پا گئی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آ کر یہاں ٹھہریں۔ لیکن پچھلے دنوں ان کا ایک خط مراد آباد سے آیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس قرار داد کی کچھ خبر نہیں۔ اب غالباً وہ لکھنو میں ہوں گے۔ جو گفتگو آپ سے ہوئی تھی وہ ان سے فرما دیجیے۔ اب تک اس کا پورا موقع باقی ہے کہ وہ تشریف لائیں (۲)۔

ہاں یہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل "مسلم گزٹ" کا اڈیٹر کون ہے؟(۳)

ابوالکلام

حواشی:

(۱) الہلال کے تنقیدی نوٹ کے جواب میں ادھر سے بھی ایک مضمون ترکی بہ ترکی لکھا گیا تھا۔ مکتوب میں مکتوب الیہ کے غصّے کا حوالہ اسی جوابی مضمون کے سلسلے میں ہے۔ (دریابادی)

مولانا مہر مرحوم نے اس مقام پر زیادہ مفصّل اور پُر معلومات حاشیہ تحریر کیا ہے فرماتے ہیں:

مولانا عبدالماجد نے جو تحریر بھیجی وہ ۱۶/ جولائی ۱۹۱۳ء کے الہلال میں چھپی۔ اس میں غصّے اور خفگی کی کوئی بات نہ تھی۔ لب ولہجہ بھی بالکل علمی تھا۔ تحریر کا مفاد یہ تھا کہ "حظ" جس انگریزی لفظ کے لیے استعمال ہوا ہے اس کا ابتدائی مفہوم حواس ظاہری کو آرام پہنچانا ہے اسی طرح "کرب" جس لفظ کے لیے استعمال ہوا۔ اس کا مفہوم اجسام حیوانی میں ناگوار کیفیت ہے۔ جب یہ الفاظ وضع ہی مادی وجسمی کیفیات کے لیے ہوئے تھے، اگرچہ بعد میں ان کا اطلاق وسیع تر ہو گیا تو ان کی جگہ "لذت والم" کو کیوں استعمال کیا جائے؟ جن میں بہ نسبت جسمی کے نفسی، انبساط وانقباض کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے؟ ساتھ ہی یہ فرمایا تھا کہ جب حظ اردو کتب لغت مثلاً فرہنگ آصفیہ اور اشعار میں بہ معنی خوشی وانبساط مستعمل ہے

توکم ازکم میری راے ناقص میں یہ سوال کسی قدر غیر متعلق ہے کہ عربی لغت میں ''حظ'' کے معنی صرف حصہ کے ہیں''۔

مولانا نے اس کے جواب میں جو تحریر ۶راگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں شائع فرمائی۔اس کا مفہوم یہ تھا:

ا۔ ''لذت والم'' ٹھیک وہی مفہوم ادا کرتے ہیں جو انگریزی کے الفاظ ''پلیژ'' اور ''پین'' ادا کرتے ہیں۔

ب۔فارسی میں بھی یقیناً ''حظ'' بہ معنی لذت ومسرت استعمال نہیں ہوا۔مثلاً غالب:

دگر زا یمنی راہ و قربِ کعبہ چہ ''حظ''

ج۔آپ (مولانا ماجد) نفسیات پر کتاب لکھ رہے ہیں، ''مثنوی زہر عشق'' یا ''فریاد داغ'' نہیں لکھ رہے۔مطلب یہ کہ علمی اصطلاحات جس زبان سے آئی ہیں ان کے بارے میں تحقیق اسی زبان کی بنا پر ہونی چاہیے۔مولاناؒ نے صاف لکھا تھا کہ دو چیزیں ہیں اور دونوں بالکل مختلف حکم وحالت رکھتی ہیں۔ایک مسئلہ تو عام طور پر اردو زبان میں الفاظ کے استعمال اور ان کے معانی کے قرار دینے کا ہے دوسرا علمی اصطلاحات کا دوسری صورت میں اب تک اردو عربی کے تابع ہے اور عربی الفاظ کو عربی ہی کے متعارف معانی میں استعمال کرنا پڑے گا۔مولانا عبدالماجد نے پھر ایک مراسلہ بھیجا جس میں حظ بہ معنی لذت کے لیے غیاث اللغات کے علاوہ مستشرقین یعنی پامر، ویلکنس، اسٹین گاس کی کتابوں کے حوالے دیے۔یہ ۲۰ر اگست کے الہلال میں چھپا۔نیز اس سلسلے میں اکبرالہ آبادی اور مولانا خدابندہ جون پوری کی تحریرات شایع ہوئیں۔

مولانا نے اس کا جواب ۷ارستمبر کے الہلال میں شروع کیا اور وہ دو نمبروں میں شایع ہوا، پہلا حصہ ۷ارستمبر کے نمبر میں اور دوسرا یکم اکتوبر کے نمبر میں۔پہلا حصہ نکلنے کے بعد بھی مولانا عبدالماجد نے وہ خط بھیج دیا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ آپ کے ''غصے نے بڑا لطف دیا''۔

یہ مراسلہ ۲۲ر اکتوبر کے الہلال میں مع جواب شایع ہوا مولانا عبدالماجد کا یہ مراسلہ واقعی غصے کی حالت میں لکھا گیا تھا۔عام اسلوب تحریر افسوس ناک ہونے کے علاوہ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''مولانا نے اپنی خطیبانہ سحر بیانیوں سے ایک بہت بڑی جماعت کو مرعوب ومسحور کر رکھا ہے۔مگر آپ کے خالص کمالات علمی کا ثبوت اب تک باوجود سعی وتلاش نہیں ملا۔نیز مذہب اور سیاست تو مدت سے آپ کی تیغ خطابیات کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں۔اب مہربانی فرما کر علمی مسایل کی جان پر تو رحم فرمایئے''۔

مولانا نے اس کے جواب میں بھی متانت وثقاہت قایم رکھی اور کوئی غیر مناسب بات نہ کہی۔کہا تو یہ کہ ''جو لوگ چالیس سال سے علمی توقعات کا مرکز چلے آتے ہیں۔وہ اگر علمی کمالات کا ثبوت دینے میں مقصر رہے تو یہ ان کے لیے افسوس ناک ہے نہ کہ میرے لیے؟''۔ (''تبرکات آزاد'' ص ۹۳، ۹۴)

(۲) ظفر حسن خاں سے مراد ہیں آج کے خان بہادر ظفر حسن خاں، ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز اور ریٹائرڈ پرنسپل شیعہ کالج لکھنو۔لکھنو کیننگ کالج میں مکتوب الیہ کے خصوصی دوستوں میں تھے۔اور اسی کے توسط سے مولانا سے ملے تھے، جب وہ (مولانا) سول اینڈ ملٹری ہوٹل (بعد کے برلنگٹن ہوٹل) لکھنو میں مقیم تھے۔مولانا انھیں الہلال کے اسٹاف میں لینے کو آمادہ تھے۔(دریابادی)

(۳) مسلم گزٹ اس وقت لکھنو کا ایک مشہور ہفتہ وار تھا۔مولوی محمد وحیدالدین سلیم پانی پتی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

(دریابادی)

(۵) ﴿۱۰۸﴾

۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط پہنچا۔ یہ تو میں نے پیشتر ہی آپ کو لکھ دیا تھا اور اجازت طلب کی تھی کہ مضمون کی اشاعت میں تاخیر ہوگی اور لکھا تھا کہ میں اپنی تحریر کے اختتام کے بعد جو نمبر وار چھپ رہی ہے اسے درج کروں گا۔ چناں چہ اس کی نسبت آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ادھر میں اور معاملات میں اس طرح مصروف رہا کہ بقیہ مضمون کے لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بانکی پور چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس ہوا اور بیمار ہوں۔ پس آپ کی تحریر آیندہ اشاعت میں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد کی اشاعت میں شائع ہوگی، مع میرے مضمون کے تیسرے آخری نمبر کے۔ رہا یہ کہ آپ اس کو دوسرے اخبارات میں شایع فرمائیں گے۔ تو شاید میں نے اب تک کوئی کوشش اس طرح کی نہیں کی ہے کہ لوگ اپنے مضامین الہلال کے سوا دیگر رسایل میں شایع نہ کریں۔ یہ آپ کے لیے جس طرح اُس وقت ممکن تھا، جب آپ نے وہ تحریر مجھے بھیجی تھی۔ اب بھی ممکن ہے اور آیندہ بھی ممکن رہے گا۔ آپ جس اخبار میں شایع کرنا چاہیں شایع فرمادیں، مجھے تو کوئی عذر نہیں۔ البتہ بہ صورتِ عدم اشاعت سامنے بدھ کے بعد والے بدھ کو الہلال میں درج ہو سکے گی اور بصورتِ اشاعت اس کا تذکرہ بحوالہ اخبار شایع کنندہ۔

آپ کو معلوم نہیں مراسلات وغیرہ الہلال میں ہمیشہ تاخیر سے شایع ہوتے ہیں۔ کئی مضمون ایک ایک ماہ کے بعد نکلے ہیں، یہ بدنظمی ہو یا سوءِ قصد لیکن ایک عام بات ہے(۱)۔

مسلم گزٹ تو بالآخر بند ہی ہوگیا لیکن افسوس ہے کہ بے موقع اور بہت ہی بری

طرح (۲)۔ مولوی ظفر حسن صاحب کا خط آیا انھوں نے اپنی موجودہ حالت جو بیان کی ہے، مجھے ہمدردی ہے۔ خدا انھیں کامیاب فرمائے۔ ایسی صورت میں تو واقعی ان کا تشریف لانا مشکل معلوم ہوتا ہے (۳)۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) مکتوب کے بیشتر حصے میں تذکرہ اس ناخوش گوار مناظرانہ رنگ کے سلسلۂ مضامین کا ہے۔ اب بات کتنی ہلکی بلکہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت مرکزِ اہمیت بنی ہوئی تھی۔

(۲) ''مسلم گزٹ'' سرکاری عتاب کی زد میں آ کر بند ہو گیا تھا۔ سلیم صاحب کے ہٹ جانے کے بعد اس کے اڈیٹر بریلی کے ایک پر جوش اور درد مند مسلمان، مولوی ابوالکمال عبدالودود درد ہو گئے تھے۔ مولانا شبلی اس کے قبل ہی اس کی سرپرستی سے دست کش ہو چکے تھے۔

(۳) ظفر حسن خاں صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ اپنی ذاتی و خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔

(۶) ﴿۱۰۹﴾

۱۵/ مارچ ۱۹۱۸ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

یاد فرمائی کے لیے ممنون و شکر گذار اور تاخیر کے لیے خواستگار معافی ہوں۔ امید کہ معذرت مقبول ہوگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اگر وجود میں آ گئی تو بلاشبہ موجودہ زمانے میں ہندستان کا سب سے بڑا علمی کام ہوگا البتہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے اشخاص کی کمی ہے اور ضرور ہے کہ کچھ عرصے تک مطلوبہ نتائج پیدا نہ ہوں۔ لیکن ابتدا میں کوئی کام بھی بلا انتظار و تدریج متوقع نتائج پیدا نہیں کرتا۔ کام صحیح اور مفید ہونا چاہیے نقایص رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گے۔ عدم سے وجود مع النقایص بہر حال بہتر ہے اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہے کہ کام ہو۔ آپ نے لکھا ہے کہ سردست صرف معمولی درجے کی فلسفہ و منطق کی کتابوں کو لکھنا پڑتا ہے اور اس لیے طبیعت لگتی نہیں۔ لیکن یہ تو ناگزیر ہے اور ترتیب مبادیات و اوایل کا کام بھی منتہیوں ہی کو کرنا پڑے گا۔ مبتدیوں کے

لیے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ کے قیام و تعلّق سے عثمانیہ یونیورسٹی نے اتنا ہی فایدہ حاصل کیا کہ ہر فن میں مبادیات کا سلسلہ مکمّل ہو گیا تو یہ کوئی چھوٹا کام ہے(۱)!

آپ نے فلسفے کے ساتھ منطق کا بھی ذکر کیا ہے۔ منطق میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا رسالہ ''مبادی الحکمۃ'' ہر لحاظ سے بہت عمدہ ہے اور بیان مسایل میں اس درجے کا ہے کہ ہمارے قدیم عربی نصاب کے ابتدائی ایساغوجی وغیرہ سے لے کر قطبی تک کا قایم مقام ہوسکتا ہے اور حسنِ بیان و تعبیر و ترتیب و امثلہ کے لحاظ سے بدر جہا ان پر فایق! انگریزی کا حال مجھے معلوم نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کے بعد کا صرف ایک رسالہ سردست اور مرتب کیا جائے۔ مجوزہ یونیورسٹی میں ہمارے عربی مدارس کی طرح منطق ابتدا ہی میں نہیں رکھی جائے گی بلکہ جدید نظام تعلیم کے مطابق ابتدائی سنین تعلیم کے گزر جانے کے بعد اس وقت کے لیے ''مبادی الحکمۃ'' بہت اچھی پہلی کتاب ہے۔

لیکن یہ صرف مقدمات و مسایل تک ہے مباحث کے لیے اس کے بعد کی دوسری کتاب تیار کرنی چاہیے۔ متعدد چھوٹے چھوٹے رسایل مفید ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ''تین چار سال ادھر شاید بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دلوں کی صفائی میں زنگ آ گیا تھا''۔ آپ نے دل کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، حال آں کہ ہونا چاہیے مفرد۔ میں آپ کو پوری سچّائی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میرے حافظے میں کوئی گذشتہ زمانہ ایسا موجود نہیں ہے جس میں آپ کی جانب سے میرا قلب زنگ آلود رہا ہو۔ دنیا میں باہمی علایق کے تکدر کے مختلف اسباب ہوا کرتے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ اس قسم کا کون سبب پیدا ہو گیا تھا۔ کیا اس پورے زمانے میں آپ نے کوئی بات میری جانب سے دیکھی یا سنی؟

میں نے تو جب کبھی کوئی بات مولانا شبلی مرحوم یا بعض دیگر حضرات سے نقلاً سنی تو خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی اثر اپنے قلب میں حسبِ عادت محسوس نہ کیا۔ بلکہ اس کو کسی

ایسے سبب پر مبنی خیال کیا، جو مجھے معلوم نہیں۔ اس طرف سے جناب بالکل مطمئن رہیں۔ میں آپ کے جن اوصاف کا علماً یقین کرتا ہوں اور جو باعث نیاز مندی ہوسکتے ہیں۔ جب تک ان میں تغیّر نہ آئے میری نیاز مندی متغیر نہیں ہوسکتی۔ ایسے تو الحمدللہ مجھ کو کوئی وجہِ شکایت نہیں لیکن اگر ہوتی بھی تو ان شاءاللہ آپ مجھ کو کبھی شاکی نہ پاتے (۲)۔

بہ یمنِ عشق ز کونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

آپ کی توجہ فرمائی بالکل مخلصانہ اور بے لاگ ہے۔ موجودہ حالات میں کہ نظر بند ومعتوبِ حکومت ہوں۔ آپ کے لیے کوئی وجہ مراسلت نہیں ہوسکتی تھی۔ الا یہ کہ مخلصانہ و بے غرضانہ لطف ونوازش، ومقتضاے خلقِ طبع اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور ممنون و متشکر ہوں۔

آپ نے جناب مولانا حمید الدین کا ذِکر خیر فرمایا، ملاقات ہو تو اس دور افتادہ کا سلامِ شوق عرض کردیں۔ (۳)

معارف آتا ہے۔ نہایت شوق و دلچسپی سے مکالمات بر کلے کا سلسلہ پڑھ رہا ہوں اور آپ کے حسنِ بیان وقوتِ نقل علوم وتسہیل مطالب کی تعریف نہیں کرسکتا (۴)۔ آپ انشہ اردو کے لیے وہ کام کریں گے جواب تک کسی سے نہیں ہوا یعنی نقل علوم۔ سر سید مرحوم کے مجمع نے اردو کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں، لیکن اس مد میں اب تک کچھ نہیں ہوا۔ حکیم عباری صاحبِ ''تصورات کلیہ'' بھی اس بارے میں اتنی ہی مدح کے مستحق ہیں جس قدر کہ آپ (۵)۔

فقیر ابوالکلام
رانچی۔ بہار

حواشی:

(۱) مکتوب الیہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے حیدرآباد آ گیا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ نہیں کھلی ہے لیکن اس کا مقدمۃ الجیش سررشتۂ تالیف و ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب (جو اب بابائے اردو کے نام سے مشہور ہیں) کی نظامت میں قایم ہو چکا ہے اور مکتوب الیہ کے سپرد شعبۂ فلسفہ و منطق ہے۔ (دریابادی)

مولانا مہر مرحوم نے اس مقام پر زیادہ مفصل اور مفید حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مولانا آزاد کو اپریل ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے اخراج کا حکم ہوا بعض دوسری صوبائی حکومتیں پہلے ان کا داخلہ بند کر چکی تھیں۔ صرف حکومت بہار کی جانب سے ایسا کوئی حکم ممانعت صادر نہ ہوا تھا۔ چنانچہ مولانا رانچی چلے گئے۔ وہیں کچھ دیر بعد انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ مکتوب اسی زمانے کا ہے جب مولانا رانچی میں نظر بند تھے۔ جیسا کہ خود مکتوب میں بھی فرمایا گیا ہے۔ مولانا عبدالماجد بہ سلسلہ تالیف و ترجمہ حیدرآباد پہنچ چکے تھے۔ جہاں جامعۂ عثمانیہ کی تیاری کے سلسلے میں مختلف علوم کی معیاری اردو کتابیں زیر ترتیب تھیں۔ مولانا موصوف فرماتے ہیں:

''۱۹۱۳ء میں جو تلخ و تند مباحثہ الہلال کے صفحات میں بعض اصطلاحات کے پیچھے ہو پڑا، تھا اب مکتوب الیہ کو اس پر ندامت و تاسف تھا اور اپنے خط میں مولانا سے معذرت کی تھی......الخ

ضمناً اپنے مشاغل کا بھی ذکر کر دیا چنانچہ مولانا نے ان مشاغل کے سلسلے میں اپنے خیالات قدرے تفصیل سے بیان فرمائے۔ (تبرکات آزاد ص ۵۹)

مولانا آزاد کے اسی بیان پر مولانا مہر مرحوم نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا:

''مولانا آزاد کے اخلاق کریمانہ کی سیکڑوں دستاویزیں موجود ہیں ان میں سے ایک دستاویز یہ بھی ہے: ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا عبدالماجد نے خفگی کے جوش میں کیا کچھ لکھ دیا تھا۔ پھر خود اپنے مکتوب میں مولانا نے اشارہ کر دیا کہ مولانا شبلیؒ مرحوم یا بعض دوسرے اصحاب سے نقلاً بعض باتیں ان تک پہنچتی رہیں۔ باایں ہمہ فرماتے ہیں:

الف: آپ کے جن اوصاف کا علم یقین ہے جب تک وہ متغیر نہ ہوں۔ نیازمندی متغیر نہیں ہو سکتی۔

ب: کوئی شکایت نہیں، اگر ہوتی بھی تو آپ مجھے کبھی شاکی نہ پاتے (تبرکات آزاد ص ۵۹، ۵۵)

(۳) مولانا حمید الدین صاحب فراہی اعظم گڑھی (صاحب تفسیر القرآن، عربی) اس وقت تک حیدرآباد میں دارالعلوم کالج کے صدر تھے۔

(۴) ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں مکتوب الیہ کے قلم سے انگلستان کے فلسفی بشپ بار کلے کے مکالمات [Dialogu] کا ترجمہ نکل رہا تھا۔ مولانا نے حوصلہ افزائی اس کی فرمائی ہے۔

(۵) عباری سے مراد ہیں مولانا عبدالباری ندوی۔ وہ اور میں فلسفی بار کلے کے مکالمات کو اردو میں معارف کے صفحات میں لا رہے تھے۔ ''تصورات کلیہ'' کے عنوان سے۔ (دریابادی)

(۷) ﴿۱۱۰﴾

صدیقی العزیز! السلام علیکم

کل خط بھیج چکا ہوں، لیکن ایک غلطی ہوگئی جو آپ کو حیران کر دے گی۔ کل ایک خط بمبئی کے ایک تاجرِ کتب کے نام بھی لکھا تھا اور اس کو فہرست کی قیمت ۵ (پانچ آنے) بھیجنی تھی، غلطی سے ۵/ کے ٹکٹ آپ کے خط میں رکھ دیے گئے اور اس کا خط یہیں پڑا رہا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ ٹکٹ کیوں بھیجے گئے۔

فقیر ابوالکلام

رانچی۔ بہار، ۱۶/ مارچ ۱۹۱۸ء

(۸) ﴿۱۱۱﴾

۲۷/ جنوری ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یاد فرمائی کا شکریہ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ حیدر آباد سے کنارہ کش ہو گئے۔ اول تو علمی زندگی ملازمت کے ساتھ نبھ نہیں سکتی، پھر ملازمت بھی دیسی ریاستوں کی! اور ریاست بھی حیدر آباد جیسی سازش کدہ، عثمانیہ یونیورسٹی کا ابھی نیا نیا غلغلہ ہے۔ چند دنوں کے بعد دیکھیے گا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ نے اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا تھا۔ غالباً اس سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔

۲۔ یہ تکفیر کا معاملہ بہت ہی دل چسپ رہا۔ مجھ کو امید نہ تھی کہ آپ اس قدر جلد مسلمان ثابت ہو جائیں گے (۱)۔ اگر چہ کفر کا مقام اس سے ارفع ہے:

کافر نتوانی شد لاچار مسلمان شو"

امید ہے کہ آیندہ آپ اس طرح کے علایق سے آزاد و کنارہ کش رہیں گے اور آزادانہ وخود مختارانہ اپنے اشغال میں منہمک و مستغرق۔ اگر ایسی زندگی میسّر آئے تو

اس سے بہتر و کامیاب زندگی کوئی نہیں۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) مکتوب الیہ تقریباً ایک سال کی مدت پوری کر کے حیدر آباد سے لکھنو واپس چلا آیا ہے۔ اور ملازمت سے استعفا دے آیا ہے۔ مکتوب الیہ کا دل حیدر آباد کے شاہی ماحول میں بالکل نہ لگ سکا تھا۔ وہاں کے بہت سے بزرگوں، دوستوں، عزیزوں کی انتہائی خاطر داریوں کے باوجود مکتوب الیہ کی ایک کتاب (فلسفہ اجتماع) نفسیات اجتماعی کے موضوع پر دو تین سال قبل کی چھپی ہوئی تھی۔ اس میں مذہب پر جا بجا حملے تھے۔ (اور خود الہلال پر بھی جا بجا چوٹیں تھیں) حیدر آباد میں اس پر ایک ہنگامۂ تکفیر برپا ہو گیا تھا۔ مکتوب الیہ انگیریزیت کے اثر سے واقعتہً اس وقت ''عقلیت'' اور ''الحاد'' میں مبتلا تھا۔ از سرِ نو مسلمان اس کے ایک عرصے کے بعد ہوا۔ (دریابادی)

مولانا مہر نے اس حاشیے پر مزید لکھا ہے: ''مجھے یاد ہے کہ ایک بزرگ نے فلسفۂ اجتماع کی مختلف عبارتیں پیشِ نظر رکھ کر ضرب در ضرب کے عمل سے مولانا عبدالماجد کے ذمے اڑھائی کروڑ کفر لگا دیے تھے۔ (''تبرکات آزاد'': ۱۰۱)

(۹) ﴿۱۱۲﴾

صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت کے بعد آپ کا خط آیا، خوش وقت فرمایا۔ ''تذکرہ'' کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیّت کے ساتھ شایع کی جاتی، ایک صاحب نے بطور خود شایع کر دیا۔ بوجوہ اس کی اشاعت میرے لیے خوش آیند نہ ہوئی (۱)۔

''حقیقت'' کے کئی نمبر آ چکے ہیں۔ آپ کے خط کے بعد خصوصیّت سے میں نے دیکھا، بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سب سے اچھا ویکلی اردو اخبار ہے۔ اور استقلال کے ساتھ جاری رہا اور مذاقِ عوام کی پیروی نہ کی گئی تو یہ ایک بڑی ضرورت پوری کرے گا (۲)۔

آپ نے لکھا ہے کہ تعطل کا زمانہ کیوں نہ تمدنی اصلاحات کی سعی میں بسر کیا جائے (۳)؟ لیکن زمانۂ تعطل کی قید کیوں؟ یہ کام تو ایسا ہے کہ بڑی بڑی طاقتور کارکن زندگیوں کو وقف ہو جانا چاہیے۔ جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں وہ بھی

دراصل تمدنی اصلاحات وترقیات کی ایک خاص مجتمعہ حالت ہی سے عبارت ہے۔ سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود نہیں۔ اور جس قدر بھی جماعتی مطلوبات ہیں، بغیر درستگی علم وعملِ افراد، حصولِ حقوقِ معاشرت و مدنیت ممکن نہیں (۳)۔ بہر حال یہ ضرور ہونا چاہیے لیکن آپ نے جس مسئلے کی نسبت لکھا ہے وہ صرف پنجاب و بمبئی کی بعض اقوام سے تعلّق رکھتا ہے۔ یعنی مسئلہ توریث میں رواج اور ہندو لا پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل پیش نظر ہوں تو تحریر فرمایئے۔ میں حقیقت کے لیے ضرور لکھوں گا۔

مولانا سید سلیمان صاحب دوبار لطف فرما چکے ہیں۔ انجمن کے جلسے کے موقع پر بھی تشریف لائے تھے۔ آپ کی ملاقات کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیاں گزر گئیں۔

ابوالکلام

رانچی، ۲۶؍نومبر ۱۹۱۹ء

حواشی:

(۱) ''تذکرہ'' سے مراد خود مولانا کی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب ''تذکرہ'' ہے نئی نئی شایع ہوئی تھی اور اس کا بڑا غلغلہ تھا۔ مکتوب الیہ نے اسے کہیں پڑھ کر اس پر اپنی رائے لکھ بھیجی تھی۔

اس مقام پر مولانا مہر کا حاشیہ یہ ہے:

تذکرہ مولانا کی رائے اور مرضی کے خلاف فضل الدین احمد مرزا مرحوم نے شایع کر دیا تھا۔ مولانا پورا چھاپنا چاہتے تھے۔ فضل الدین احمد نے مختلف اجزا روک لیے اور مولانا کے بیان کے مطابق دوسری جلد کا مسودہ بھی انھیں کے پاس تھا۔ مولانا کی رہائی سے پیشتر فضل الدین احمد پنجاب آ گئے تھے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ مسودہ تلاش کے باوجود نہ مل سکا''۔ (تبرکات آزاد: ص ۱۰۱)

(۲) مکتوب الیہ اب لکھنؤ میں ہے اور آزاد ہے۔ مولوی ظفر الملک علوی کاکوروی مرحوم کی شرکت سے اور اپنی نگرانی میں اس نے ایک ہفتہ وار پرچہ ''حقیقت'' نامی شروع کرایا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد ظفر الملک مرحوم اور مکتوب الیہ دونوں اس سے الگ ہو گئے اور پرچہ تمام تر انیس احمد صاحب عباسی کے ہاتھ میں آ گیا۔ (انھوں نے اسے روزانہ کر دیا تھا) جس زمانے میں مولانا نے یہ واد لکھ کر بھیجی ہے۔ مکتوب الیہ ہی کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

(۳) مولانا مہر مرحوم نے اس مقام پر یہ توضیحی نوٹ تحریر فرمایا ہے:

''اس سے اصلاحات کے متعلق مولانا کے نقطۂ نگاہ کی بنیادی حیثیت واضح ہوسکتی ہے۔ یہ فقرہ کس قدر جامع ہے۔ جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں۔ وہ بھی دراصل تمدنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خالص مجمعہ حالت ہی سے عبارت ہے۔ سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود نہیں''!۔

(۴) یہاں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دوسرے سفر رانچی (بہار) نومبر ۱۹۱۹ء کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت سید صاحب نے اپنے پہلے سفر اور اس کے مشاہدات و تاثرات کا ذکر مولانا دریابادی کے نام یکم اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''میں پورا ایک عشرہ اپنے مرکز سے غائب رہا، میں رانچی پہنچا۔ تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ بڑی مسرت ظاہر کی۔ خوب خوب صحبتیں رہیں! وہ بھی تطبیق معقول و منقول کے دیرینہ ضابطے سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ و عقاید۔ ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے۔ رانچی کی شور و سنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادوے بیان سے پانی ہوگئی ہے۔ وہ بھی بیٹھا! مدرسے کی عمارتِ چھوٹی، لیکن خوبصورت اور شان دار بنی ہے۔ لوگ بہت مانتے ہیں''۔ (مکتوباتِ سلیمانی بہ نام و مرتبہ عبدالماجد دریابادی: (جلد اول): لکھنو، ۱۹۶۳ء، ص ۱۵، ۱۶

دوسرے سفر کا ذکر مولانا آزاد کے حضرت سید صاحب کے نام اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں آیا ہے۔ اس دوسرے سفر کے (نومبر ۱۹۱۹ء) مشاہدات و تاثرات کا اظہار شاندار الفاظ میں سلسلہ ''نظر بندانِ اسلام'' کے ضمن میں معارف اعظم گڑھ کے شمارہ مارچ ۱۹۱۹ء میں کیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۱۰) ﴿۱۱۳﴾

صدیقی العزیز!

مسئلہ توریث میں یوپی کے مسلمانوں کا حال معلوم نہ تھا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا! جن مفاسد کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اور اسی طرح کے بے شمار مفاسد ہیں، جن کی اصلاح مقدم ترین امور میں ہے۔ لیکن اس کے بارے میں سب سے پہلا سوال طریقِ اصلاح کا ہے۔ کسی جماعت کے رسوم و عوائد اور صدیوں کی مالوفات میں تبدیلی پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے، جو صرف بحث و نظر سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یعنی دلایل و معلومات کی اشاعت اس کے لیے سود مند نہیں ہوسکتی۔ جہاں تک تعلق احساس و اعترافِ مفاسد اور معلومات مانعہ کا ہے۔ بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ایسے نکلیں

گے جو ان سے بے خبر ہوں یا ضرورت اصلاح سے اختلاف رکھتے ہوں۔ تاہم یہ طاقت کسی میں نہیں ہے کہ عملاً اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے اور داعیات و بواعث مفاسد کا عزم و ہمت سے مقابلہ کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام فضایل عملیہ کا یہی حال ہے۔ مجرد بحث و نظر سے یہ مرحلہ نہ کبھی طے ہوا ہے نہ ہوگا۔ مفاسد معاشرت میں بڑا حصّہ ایسے رسوم و اعمال کا ہے، جو شرعاً بھی داخل اشد معاصی و فسق ہیں۔ اس لیے کم سے کم ان کے لیے تو علماء و مشایخ کو ضرور سعی کرنی چاہیے۔ مگر جو حال علما کا ہے، آپ کو معلوم ہے۔ علماء غیر علماء سے نفسِ معلومات میں ممتاز ہیں، عمل میں نہیں! مفاسد کے دواعی و ترغیبات جس طرح عوام کے لیے قہر و تسلّط رکھتی ہیں، ان کے لیے بھی۔ اس لیے باوجود علم وہ خود بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔(۱)

ضرورت اس کے لیے دو باتوں کی ہے؛

ایک تو سعی اصلاح کے ساتھ ساتھ دفع و انسدادِ دواعی و ترغیبات کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ان محرکات کا دفعیہ نہ ہوگا، جو مفاسد کے لیے باعث ہیں، مجرد ترک و منع کی دعوت سودمند نہیں ہوسکتی۔ آپ لوگوں سے کہتے ہیں۔ گرد و غبار سے بچو اور سڑک پر چھڑکاؤ کا انتظام نہیں کرتے۔

ثانیاً ایک ایسی جماعت کا وجود، اور منظر عام پر آجانا جو عملاً اصلاح کا نمونہ ہو اور اصلاح کا وجود خارج میں مجسّم و ممثّل دکھادے۔ چند عازم انسانوں کا فعلِ نفوذ اخبارات کے سیکڑوں آرٹکلوں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت بھی اصلاح و تغیّر کے چند ممتاز خصایص کے ساتھ قایم ہوجائے تو چند سالوں کے اندر تمام قوم کی حالت بدل جائے۔ علی الخصوص انگریزی تعلیم یافتہ جماعت، جس میں احساسِ حال اور طلبِ اصلاح کی استعداد سب سے زیادہ موجود ہے۔(۲)

آپ تصنیف و تالیف میں علم اور سعی و عمل میں اصلاح معاشرت، ان دو چیزوں کو اپنا مطمح نظر بنایئے۔ پہلی بات تو موجود ہے دوسری کے لیے بھی آمادہ ہوجایئے! اپنے

تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزم صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجیے۔ اور ایک انجمن قایم کیجیے۔ ابتدا میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے، جو ان پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے تیار ہوں اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہو سکتے ہیں ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہو جائے گا۔ عملاً اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا جس کے خصایص و اعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں، معاشرت کا فلسفہ ہے۔ اصلاح معاشرت نہیں ہے (۲)۔

تاہم مقصود یہ نہیں کہ مضامین نہ لکھے جائیں۔ ان کی ضرورت سے انکار نہیں۔ بہر حال بہتر ہے۔

میں ''حقیقت'' کے لیے ضرور لکھوں گا لیکن براہ عنایت حاجی بغلول اور تجاہل عامیانہ وغیرہ کو تو رکوایئے یہ کیا مصیب ہے۔ اگر یہی حال رہا تو وہی ہمدرد وغیرہ کا حال ہو کر رہ جائے گا (۴)۔

والسلام علیکم۔ دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔

ابوالکلام

رانچی، ۳۰/ جنوری ۱۹۲۰ء

حواشی:

(۱) مولانا ابوالکلام کے اس بیان پر مرحوم مہر صاحب نے حاشیے میں یہ تبصرہ فرمایا ہے: ''اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قوم و جماعت کے رسوم و عوابد اور صدیوں کی مالوفات میں بحث و نظر سے تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی اور اس بارے میں محض دلایل و معلومات کی اشاعت سود مند نہیں ہو سکتی۔ دلایل و معلومات سے کوئی بھی بے خبر نہیں لیکن عمل کا خانہ بالکل خالی ہے''۔

(۲) اس پیراگراف میں مولانا آزاد نے جو بات ارشاد فرمائی ہے اس پر مولانا مہر نے توصیف و تائید میں یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

''کتنی پختہ اور پائیدار بات کہہ دی کہ ایک دوائی و ترغیبات کو رد کیے، دوسرے کوئی ایسی جماعت پیدا کیجیے، جو اصلاح کا عملی نمونہ پیش کرتی رہے''۔ (تبرکات آزاد: ص۱۰۲ و ۱۰۴)

یہاں جماعت سے مراد تنظیم یا کوئی انجمن یا سوسائٹی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ معاشرے میں ایسے صاحب اخلاص و عمل لوگوں کی ایک تعداد ہونی چاہیے جن کی زبانیں خواہ خاموش ہوں دعوت اسلام کی پکار سے، لیکن جن کی زندگیاں ترک عواید و رسوم کے پاکیزہ نتایج کی مظہر اور لایق اتباع نمونہ ہوں۔

(۳) اس طرح کے مکتوبات سے مولانا کے اصولِ زندگی کے بہت سے گوشوں پر خوب روشنی پڑ جاتی ہے۔

(۴) ''حقیقت'' سے مکتوب الیہ کا تعلّق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں عام پسند ظرافت و مزاح کے خاصے عنوانات اب ہونے لگے تھے۔ (دریابادی)

اس مقام پر مولانا مہر کے حاشیے سے مولانا ابوالکلام کے ذوق مزاح پر روشنی پڑتی ہے اور وقت کی بد ذوقی کا پتا چلتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مولانا مزاح کے خلاف نہ تھے۔ اس لیے کہ خود مزاحی مضامین لکھتے رہے۔ مگر عوام پسند ظرافت بلکہ تکلّف کی ظرافت کو بہت برا سمجھتے تھے۔ اس کا سلسلہ ہمدرد۔ دہلی میں شروع ہوا تھا۔ بعض مضامین بہت اچھے لکھے گئے۔ لیکن بعد میں معیار بہت گر گیا۔ ''حاجی بغلول'' و ''تجاہل عامیانہ'' میں اسی جانب اشارہ ہے''۔ (تبرکاتِ آزاد: ص۱۰۵)

(۱۱) ﴿۱۱۴﴾

صدیقی العزیز!

آپ کا خط رانچی میں ملا تھا۔ معافی خواہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ کلکتہ میں ایک ہی دن قیام کر سکا، پھر دہلی چلا گیا، اب واپس آیا ہوں(۱)۔ خط میں آپ نے اپنی علمی خدمات کے ساتھ عملی اقدام کے لیے بھی جو مستعدی ظاہر فرمائی ہے، اس سے طبیعت نہایت درجہ مسرور ہوئی۔ کاش اس کا جلد ظہور ہو۔ ہمراہیوں کا انتظار بے سود ہوگا۔ سب سے پہلا اور سب سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے۔ آپ نے مسٹر محمد علی کی شعلہ بیانی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے بالکل متفق ہوں اور اتنا اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص اپنی ہتھیلی کے لیے انگاروں ہی کو منتخب کرتا ہے تو خیر، یہ بھی ایک راہ ہے۔ بشرطے کہ جلد پھینک نہ دے۔ بہر حال وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی اور زیادہ سے زیادہ عزت کے لیے یہ بس

کرتا ہے(۲)۔

دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔رانچی میں نہیں تو کلکتہ میں تو آپ آسکتے ہیں؟

ابوالکلام

۲۷/جنوری ۱۹۲۰ء

حواشی:

(۱)اب مولانا رانچی کی نظر بندی سے رہائی پا کر کلکتہ پہنچ چکے ہیں۔

(۲)مولانا محمد علی وشوکت علی کو بھی ۱۹۱۹ء کے آخر میں قید و بند سے رہائی مل گئی تھی۔اور مولانا محمد علی نے جیل سے باہر آتے ہی اس وقت کے معیار سے زیادہ تیز و تند تقریریں شروع کر دی تھیں۔

مولانا غلام رسول مہر نے علی برادران کی زبان اور مزاج کی تیزی اور جوش کے حوالے سے اس مقام پر حاشیے میں جو بات لکھی ہے وہ بہت سبق آموز اور حقیقت سے پُر ہے،فرماتے ہیں:

''رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی اسی زمانے میں طویل قید و بند کے بعد رہا ہوئے تھے۔حضرت رئیس الاحرار مرحوم کی طبیعت میں جلال بہت تھا۔ان کی اسیری کے زمانے میں نہ صرف ترکی سلطنت بلکہ اسلامی خلافت بھی خوفناک مصایب میں مبتلا ہو چکی تھی،جس سے وہ حد درجے متاثر تھے۔چناں چہ رہا ہوتے ہی،انھوں نے تند و تیز تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔مولانا عبدالماجد نے اپنے مکتوب میں اسی کا ذکر کیا تھا،لیکن مولانا کے نزدیک اصل شے اس باب میں استقامت تھی اور دیکھیے کس کشادہ دلی سے رئیس الاحرار کی عظمت کا اعتراف کیا ہے کہ''وہ ایک بڑی آزمایش سے کامیاب نکلے ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ عزت کے لیے یہ بس کرتا ہے''۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا تمام امور میں بنیادی اور اساسی چیزوں کا ہمیشہ خاص خیال رکھتے تھے اور جہاں بنیاد و اساس درست ہوتی تھی جزئیات و فروع میں کم یا زیادہ اختلاف کو چنداں اہمیت نہیں دیا کرتے تھے۔(''تبرکات آزاد''۔ص ۱۰۶)

(۱۲) ﴿۱۱۵﴾

ری ٹریٹ شاہی باغ۔احمد آباد

۲۹/جون ۱۹۲۴ء

صدیقی العزیز!السلام علیکم

سفر سے واپس کلکتہ پہنچا تو آپ کا خط ملا،لیکن ہجوم کار نے مہلتِ جواب نہ

دی۔ پھر دہلی اور احمد آباد کا سفر پیش آیا۔ ڈاک رکھ لی تھی کہ جہاں کہیں مہلت ملے گی، جواب لکھوں گا۔ امید ہے اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔(۱)

آپ نے مولوی طفیل احمد صاحب کی نسبت دریافت کیا ہے کہ میں نے ان سے جواز سود کے باب میں کوئی گفتگو کی ہے؟ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، مجھے یاد نہیں کہ مولوی صاحب موصوف سے کبھی اس باب میں کوئی گفتگو ہوئی ہو بلکہ شاید ان سے ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں انھیں ایسا خیال ہوا۔ غالباً اس بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے ان کے ساتھ ''صاحبِ جواز سود'' لکھا ہے۔ کیا اس سے مقصود کوئی ان کی مصنّفہ کتاب ہے؟(۲)

باقی رہا اصل مسئلہ تو جہاں تک قرآن اور اسلام کا تعلّق ہے۔ نفس ربا کی حرمت میں تو گنجایشِ قیل وقال نہیں۔ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ. البتہ ربا کے تعین وتشریح میں متعدد فقہی مباحث اور مذاہب وآرا ہیں۔ جنھیں فقہ وحدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہندستان میں اوایل حکومت انگریزی سے ایک بحث یہ بھی شروع ہوگئی ہے کہ ہندستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اگر دارالحرب ہے تو فقہاء کا قاعدہ ہے۔ ''لا ربا بین الحربی والمسلم''، یعنی دارالحرب میں مسلمان اور حربیوں کی معاملت ربا نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک حربی کی قید بھی زاید ہے۔ پس اس بنا پر متعدد علماء کی راے یہ رہی ہے کہ ہندستان کی موجودہ پولیٹیکل حالت میں مسلمان غیر مسلم سے سود لے سکتے ہیں۔ مولوی عبداللہ مرحوم ٹونکی اور مولانا شبلی مرحوم کی یہی راے تھی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا اور ندوۃ العلماء کی کونسل کے علماء کے سامنے پیش کیا تھا۔ غالباً ان کے مسودات میں ہوگا۔

پھر دارالحرب کے شروط میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی راے دوسری ہے۔ صاحبین کی دوسری ہے۔ پھر بعض کے نزدیک ایک ملک دارالاسلام ہوکر

دارالحرب ہو جا سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک نہیں۔

حقیقت ان اختلافات سے بالاتر ہے اور دارالحرب میں جواز اخذ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے، وہ بھی محل نظر ہے۔ صحیح تعلیل دوسری ہے۔ اگر ضرورت ہوئی اور مہلت ملی تو اس باب میں غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔ (۳)

ابوالکلام

حواشی:

(۱) ملک میں ترکِ موالات وخلافت وغیرہ تحریکات کا غلغلہ ہے۔ بلکہ ابتدائی جوش اب دھیما پڑ چکا ہے۔ مولانا کا شمار اب آل انڈیا سیاسی لیڈروں میں ہے۔ اور مسلسل سفر اور دورہ اس کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اس افراطِ مشغولی کے باوجود، علمی بحثوں کے لیے بھی مولانا وقت و فرصت نکال لیتے ہیں۔

(۲) ''جوازِ سود'' مولوی سید طفیل احمد مرحوم کے ایک رسالے کا نام تھا۔ اللہ ان مرحوم کی لغزشیں معاف فرمائے بیچارے کو دھن ہوگئی تھی مسلمانوں میں ترویج سود کی۔ (دریابادی)

(۳) اس خط پر مولانا مہر کا حاشیہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کی ایک خصوصیت پر روشنی ڈالتا ہے وہ کئی لحاظ سے جامع اور حقیقت افروز ہے۔ میں اس کے مطالعے میں قارئینِ کرام کو شریک کر لینا مفید سمجھتا ہوں۔ حاشیہ یہ ہے:

''مولانا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سوال ان سے زبانی کیا جاتا یا تحریری جواب میں مسئلے کے ایک ایک پہلو کو اس طرح کھول کھول کر بیان فرماتے کہ قلب مطمئن ہو جاتا۔ مسایل کے تجزیے میں انھیں جو خداداد کمال حاصل تھا، اس مکتوب سے بھی نمایاں ہے یعنی پہلے نفس مسئلہ واضح کیا۔ پھر ربا کے تعین و تشریح کے سلسلے میں فقہی مباحث و مذاہب کا ذکر فرمایا۔ بعد میں یہ بتایا کہ جب کوئی ملک دارالحرب قرار پا جائے تو فقہا کا مسلک کیا ہے۔ آخر میں دارالحرب کے شروط میں اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ دارالحرب میں جوازِ اخذِ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے وہ محل نظر ہے صحیح تعلیل دوسری ہے۔

دیکھیے بہ ظاہر کوئی پہلو واضح نہیں کیا گیا، مگر پڑھا لکھا آدمی چاہے تو اسی مکتوب کو مشعل راہ بنا کر ربا کے متعلق پوری چھان بین کر سکتا ہے۔

مولانا طفیل احمد مرحوم مختلف اسباب و دلایل کی بنا پر جوازِ سود کے قایل ہو گئے تھے، پھر انھوں نے زندگی کا خاصا بڑا حصہ اسی کوشش میں بسر کر دیا۔ یقیناً انھوں نے نہیں کہا ہوگا کہ مولانا سے گفتگو ہوئی غالباً مولانا عبدالماجد صاحب کو خیال ہوا ہو کہ انھوں نے گفتگو کی۔ (تبرکاتِ آزاد: ص ۱۰۸)

(۱۳) ﴿۱۱۶﴾

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا، دہلی سے واپس آ کر دو ہفتہ تک مبتلائے بخار و پیچش رہا۔ اس وقت تک طبیعت صاف نہیں ہے۔ جہاں تک مسئلہ حجاز کا تعلّق ہے، جو کچھ ہو رہا ہے تمام تر افراط وتفریط ہے۔ بڑی مصیبت یہ پیش آ گئی ہے کہ مسئلہ دینی احکام و مصالح سے ممزوج ہو گیا ہے اور جو لوگ اس جھگڑے میں ہیں، انھیں ان کی خبر نہیں۔ ذاتی کاوشیں اور جماعت بندی کا جذبہ ایک مزید آفت ہے۔ مسئلے پر آرا کی تقسیم حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ محض پارٹی کی بنا پر ہوتی ہے۔ مختلف حالات و اسباب ایسے ہیں کہ اصلاح حال کی امید بہت ہی کمزور ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔ (۱)

لکھنو میں جلسے کے موقعے پر آنا ہی پڑے گا۔ اگرچہ سرے سے یہ جلسہ ہی بیکار ہے۔ ممکن ہے جلسے کی تاریخیں بدل دی جائیں۔ لوگوں کو اعتراض ہے کہ دہلی میں جلسہ صرف اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ رپورٹ وفد چھپ کر شایع ہو جائے اور ممبروں کو مطالعہ ونظر کا کافی وقت ملے۔ لیکن رپورٹ اس وقت تک تقسیم نہ ہو سکی غالباً آج بمبئی سے روانہ ہوئی ہوگی۔ میں نے شوکت صاحب کو لکھا ہے کہ جلسہ ۱۵/ نومبر یا دسمبر کے پہلے ہفتے میں منعقد ہو (۲)۔ غالباً ۱۵/ نومبر قرار پائے (۳)۔

بہر حال امید ہے آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ قیام غالباً نواب علی حسن صاحب ہی کے یہاں ہو (۴) لیکن میں تو آپ کے یہاں ٹھہروں، اگر آپ ٹھہرائیں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کا ادھر کئی ہفتے سے کوئی خط نہیں آیا۔ مجھے ان کی صحت کی طرف سے برابر تشویش رہتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ملیے اور خط لکھنے کے لیے کہیے۔ مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام شوق (۵)۔

ابوالکلام

۲۶/ اکتوبر ۱۹۲۶ء، کلکتہ

حواشی:

(۱) مولانا اس وقت تک آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور کمیٹی کے اندر مسئلۂ حجاز کے باب میں ایک عجب خلفشار برپا ہوگیا تھا۔ علی برادران اور حضرات فرنگی محل و بدایوں وغیرہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے شدید مخالفوں میں ہو گئے تھے اور ظفر علی خاں صاحب اور اہل حدیث جماعت کے حضرات ان کے اسی شدید درجے میں حامی اور حمایتی تھے۔ مکتوب الیہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر تھا۔ (دریابادی)

(۲) جس جلسے کا ذکر ہے وہ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہو رہا تھا۔ جس میں شدید جنگ اور زور آزمائی کا خطرہ تھا۔ رپورٹ سے مراد اس وفد خلافت کی رپورٹ ہے جو ۱۹۲۶ء میں حج کے موقعے پر جا کر سلطان سے ملا تھا۔ اس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔ (اسی وفد کے ایک رکن مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار۔ لاہور بھی تھے۔ وفد کی رپورٹ انھوں نے الگ لکھی تھی جو رپورٹ کے آخر میں شامل ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۳) اس مسئلے میں مولانا مہر صاحب کا حاشیہ معلومات افزا اور متوازن ہے۔ اس سے مسئلے پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ حاشیہ یہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''مولانا (ابوالکلام) مجلس خلافت ہند کے صدر تھے اور سلطان ابن سعود کے ملک الحجاز بن جانے کا مسئلہ وجہِ نزاع بن گیا تھا، جس حد تک مجھے اندازہ ہے، نزاع کی حیثیت ابتدا میں بہت محدود تھی لیکن اختلافِ عقاید نے اس میں شدت پیدا کر دی ایک گروہ جن میں اہل حدیث شامل تھے، سلطان کا حامی تھا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ، جو حجاز، شام اور عراق پر وہابیوں کے سو سوا سو سال پیشتر کی یورشوں کے سلسلے میں افسانہ آرائیوں نیز قبہ شکنیوں سے متاثر تھے۔ سلطان کے مخالف تھے۔ خود مجلس خلافت کے ارکان بھی دو فریقوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک حامی تھا اور دوسرا مخالف۔ حامی فریق میں ذی اثر اور متحد عنصر ارکان پنجاب کا تھا، جنھیں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم پنجابی ٹولہ کہہ کر پکارتے تھے، ان ارکان میں سے صرف چند اہل حدیث تھے، باقی احناف تھے بلکہ بعض شیعہ حضرات بھی تھے۔ یقیناً آخر میں اس معاملے نے فریق بازی ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ خود مولانا (ابوالکلام) نیز مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو فریق مخالف میں درجۂ اعتماد حاصل نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ سلطان کی حمایت کی طرف مائل سمجھے جاتے تھے۔ مذکورہ اجلاس دسمبر میں ہوا اور افسوس کہ بعض معاملات پر اختلاف نے نہایت ناگوار صورت اختیار کر لی اور ناکامی پر منتج ہوا۔ (تبرکات آزاد: ص ۱۰۹)

(۴) نواب علی حسن خاں (صفی الدولہ حسام الملک) مرحوم، مشہور اہل حدیث فاضل نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کے صاحبزادے خود بھی صاحب علم رئیس تھے۔ ندوہ اور مولانا شبلی کے شیدائی، کوٹھی ''بھوپال ہاؤس'' واقع لال باغ میں رہتے تھے۔

(۵) الف: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پیغام کی اشاعت کے وقت سے کلکتہ میں مولانا کے ساتھ تھے، پھر مولانا نے عربی کا رسالہ الجامعہ جاری کیا تو مولانا عبدالرزاق اس کے ایڈیٹر رہے۔ اسی زمانے میں مولانا کا بیان ''قول فیصل'' عربی میں منتقل کیا، جو المنار کے مطبع سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ پھر مولانا عبدالرزاق کلکتہ سے چلے آئے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا

نے 'الہلال' دوبارہ شایع کیا تو مولانا عبدالرزاق پھر کلکتہ چلے گئے تھے۔

ب: مولوی ظفر الملک اس وقت خلافت کے کارکن خصوصی تھے، مولانا نے ازخود مکتوب الیہ کے ہاں قیام فرمانے کا ذکر فرمایا۔ یہ دلیل ان کے کمال شفقت وعنایت کی ہے۔ (دریابادی)

(۱۴) ﴿۱۱۷﴾

جبی فی اللہ! السلام علیکم

ایک خط بھیج چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا شاید مجوزہ تاریخوں میں جلسے کا انعقاد ملتوی ہوجائے۔ چناں چہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔ التوا کا باعث یہ ہوا کہ تقریباً ان ہی تاریخوں میں ہر جگہ کونسل کے انتخابات کی کس مکش درپیش ہے مرکزی (کونسل) کے ممبروں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو انتخابات میں مشغول ہیں۔ خصوصاً بنگال اور پنجاب کے ممبر! انھوں نے اعتراض کیا کہ ہماری شرکت ممکن نہیں۔ علاوہ بریں رپورٹ وفد حجاز کی اشاعت میں بھی تاخیر ہوگئی۔ یہ تاخیر قصداً نہیں ہوئی، ناگزیر تھی۔ رپورٹ ضخیم ہے۔ باوجود سعی ۲۶ سے پہلے مکمّل نہ ہوسکی۔ ایسی حالت میں یہی مناسب تھا کہ تاریخیں بدل دی جائیں۔ پیشتر ہی سے کافی نزاعات موجود ہیں۔ اب محض تاریخ انعقاد کا معاملہ مابہ النزاع کیوں بنا دیا جائے۔ نومبر میں انتخابات کی کش مکش ختم ہو جائے گی۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں بہ اطمینان جلسہ ہوسکے گا۔ آپ لوگوں نے لکھنؤ میں جلسے کا اہتمام کیا تھا، ممکن ہے اس تاخیر کی وجہ سے کارکنوں کو بے لطفی ہو۔ لیکن امید ہے دسمبر کا اہتمام اس کی تلافی کر دے۔

افسوس ہے کہ زمیندار اور ہمدرد (۱) کی نزاع کسی طرح ختم ہونے پر نہیں آتی! پچھلی دفعہ جب شروع ہوئی تھی تو میں نے بہت کوشش کی کہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب سے تو دہلی میں قول وقرار کرالیا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کے خلاف کچھ نہ لکھیں۔ چناں چہ سلسلہ رک گیا تھا۔ مگر اب پھر شروع ہوگیا ہے۔ اور بڑھتا ہی جاتا

ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کا جو کچھ بھی رہا سہا اثر عوام میں باقی تھا وہ بھی امید نہیں کہ قایم رہ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء سے پہلے مسلمانانِ ہند میں جس قدر جماعتی قوی کا نظم اور دماغی انضمام تھا اتنا بھی اب نہیں ہے اور یہ نتیجہ ہے اس ردِ فعل کا جو ۱۹۲۰ء کی حرکت کے بعد ظہور میں آیا۔ اب مسلمانوں کی دماغی واجتماعی تالیف ونظم کے لیے از سرِ نو دعوت وتحریک کی ضرورت ہے۔

مولوی عبدالرزاق اور مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام پہنچا دیں۔ آپ کے اخبار سچ کا اب کیا حال ہے؟ کتنی اشاعت ہے؟ ممکن ہو تو تفصیلات سے مطلع کریں(۲)۔

ابوالکلام

کلکتہ۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۶ء

حواشی:

(۱) ہمدرد (دہلی) سے مراد مولانا محمد علی کا روزنامہ ہے اور زمیندار (لاہور) سے مراد مولانا ظفر علی خاں کا۔ وہی سعودی نزاعات دونوں میں زور شور سے جاری تھے۔

(۲) سچ، صدق کا نقش اول تھا، اور اس وقت تک مولوی ظفر الملک کے اہتمام میں نکل رہا تھا۔

(۱۵) ﴿۱۱۸﴾

صدیقی!

آپ کا رجسٹرڈ خط دہلی سے واپس ہو کر یہاں ملا۔ ''سچ'' میں آپ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے میری نظر سے نہیں گزری (۱)۔ آپ نے جو اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کو تاریخ اسلام کے مبادیات تک معلوم نہیں، مجھے نہیں معلوم اس کے مترجم کون صاحب ہیں اور کیوں انھوں نے یہ کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی۔ اگر مقصود یہ تھا کہ ایک مخالف کا نقطۂ نظر واضح کیا جائے تو ضروری تھا

کہ مقدمے میں اس کی تصریح کی جاتی اور جا بجا فٹ نوٹس بڑھائے جاتے۔ مصیبت یہ ہے کہ یا تو لوگوں کو کام کا شوق نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو نظر و امتیاز میسّر نہیں (۲)۔ یورپ کی زبانوں خصوصاً جرمن میں اسلامی تاریخ وعلوم کے متعلق مفید چیزیں موجود ہیں لیکن ہمارے نئے مترجموں کو صرف ایسی ہی کتابیں مل سکتی ہیں۔

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ نے اسے جامعہ کے کارنامہ سے کیوں تعبیر کیا۔ اس قسم کے اخبار نویسانہ مبالغوں سے بحث ونقد کی وقعت اور سنجیدگی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اگر جامعہ کے کسی پروفیسر نے ایک غلط کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی، یا اس نے نقد و تبصرہ میں کوتاہی کی، تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ بہ حیثیت ایک مترجم کے اسے مخاطب کرنا چاہیے۔ جامعہ کے کارناموں کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا (۳)۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام

کلکتہ۔ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۹ء

حواشی:

(۱) جس کتاب کا ذکر ہے وہ جرمن مستشرق ہیل جوزف شاخت کی کتاب کا ترجمہ "عربوں کا تمدن" جامعہ ملیہ (دہلی) کے ایک استاد منیر نیازی کے قلم سے اردو میں شایع ہوا تھا۔ اور "سچ" نے اس پر شدید گرفت کی تھی۔ (ا۔س۔ش)

(۲) کیا پتے کی بات کہہ دی ہے کہ یا تو لوگوں کو کام کا شوق نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے تو نظر و امتیاز میسّر نہیں۔

(۳) دیکھیے توازن یہاں بھی ہر لحاظ سے سلامت ہے اور اس لحاظ سے بھی مولانا ایک یگانہ فرد تھے۔ یعنی ایک پروفیسر کی غلط اندیشی کے لیے ادارے کو ذمے دار ٹھہرالینا اخبار نویسانہ مبالغہ ہے، کیوں پروفیسر کو مخاطب نہ کیا جائے اور کیوں معاملہ اس کی ذات تک محدود نہ رکھا جائے؟

حواشی نمبر ۲ اور ۳ مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے قلم سے یادگار ہیں۔ دونوں میں کیسی منصفانہ اور نکتے کی باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریرات خصوصاً خطوط علمی جواہر ریزوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

(۱۶) ﴿۱۱۹﴾

۲۲۔ پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

۱۱رفروری ۱۹۴۴ء(۱)

جناب محترم! تسلیم

آپ کا تحفہ حضرت مولانا کو پہنچ گیا۔ اس کے لیے وہ شکر گذار ہیں۔ مکتوب گرامی بھی موصول ہوا۔

ترجمان القرآن (جلد اول) زم زم کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور میں چھپ رہی ہے۔ وہ غالباً ہفتے عشرے میں پریس سے نکل جائے گی (۲)۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز مند

محمد اجمل خان۔

سکریٹری مولانا آزاد

حاشیہ:

(۱) یہ خط ۱۱ فروری ۱۹۴۴ کا نہیں ہے! اس وقت مولانا احمد نگر جیل میں قید تھے۔ پھر بانکوڑا بھیج دیے گئے ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو رہائی ملی۔ رہائی کے بعد مسودہ پبلشر کو دیا گیا۔ ۱۵راپریل ۱۹۴۷ء کو ترجمان القرآن شایع ہوا یہ خط ۱۹۴۷ء کے ابتدائی ایام کا ہوسکتا ہے۔ ۱۱رفروری ۱۹۴۷ء کو ہوسکتا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۲) یقیناً میں نے اپنی کوئی کتاب تحفتہً پیش کی ہوگی، اسی کا یہ جواب ہے اور مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن کے بارے میں بھی ضرور دریافت کیا ہوگا۔ (دریابادی)

(۱۷) ﴿۱۲۰﴾

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔الہ آباد

۱۹؍جولائی ۱۹۴۵ء

صدیقی!

شملہ سے واپس آ کر یہاں کی ڈاک دیکھی تو آپ کا کارڈ ملا(۱)۔ایک مدت کے بعد ایک عزیز کی صورت دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے، وہ آپ کا کارڈ دیکھ کر ہوئی۔شکر گذار ہوں اور دعا کرتا ہوں(۲)۔

والسلام علیکم۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) اب بالکل ذہن میں نہیں کہ اس کارڈ کا مضمون کیا تھا۔

(۲) ۱۵؍جون ۱۹۴۵ء کو مولانا آزاد جیل سے رہا ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا دریابادی نے رہائی پر مبارک باد کا خط لکھا ہوگا۔مولانا آزاد نے اسی کا شکریہ ادا کیا ہے۔

(۱۸) ﴿۱۲۱﴾

۱۹۔اکبر روڈ۔نئی دہلی

یکم اپریل ۱۹۴۸ء

جناب محترم!تسلیم

آپ کا خط حضرت مولانا کو ملا۔وہ فرماتے ہیں کہ ۵؍اپریل کو آپ مندرجہ بالا پتے پر ۱۱:۳۰ بجے تشریف لائیں اور لنچ بھی نوش فرمائیں(۱)۔

راقم محمد اجمل خان

حاشیہ:

(۱) آل انڈیا ریڈیو کی مرکزی اردو کمیٹی کا میں ممبر تھا اور اس کے جلسے میں شرکت کے لیے ۵/اپریل ۱۹۴۸ء کو جانا ہورہا تھا۔ اجمل خان صاحب کا دوسرا دستی احتیاطی خط ۵/اپریل کو کمیٹی کے عین دفتر میں بھی اسی مضمون کا موصول ہوا تھا۔

میں تو اپنی کتابیں مولانا کی خدمت میں بھیجتا ہی رہتا تھا۔ اُدھر سے بھی ایک بار ''غبار خاطر'' کی جلد عنایت ہوئی۔ اس کے ساتھ کوئی عنایت نامہ بھی ضرور ہوگا۔ لیکن وہ مجموعے میں ملا نہیں۔

(۱۹) ﴿۱۲۲﴾

۲۲/مئی ۱۹۴۸ء

صدیقی!

خط مورخہ ۱۷/مئی پہنچا۔ جس معاملے کی نسبت آپ نے لکھا ہے وہ پیش نظر ہے۔ ہر بات اپنے مناسب وقت ہی پر انجام پا سکتی ہے اور انشاءاللہ انجام پائے گی (۱)۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) اب مولانا وزیر تعلیمات سرکار ہند ہیں۔ غالباً ندوہ یا دارالمصنفین ایسے ہی کسی ادارے کی سرکاری امداد کی تحریک کی گئی تھی۔

مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کل یہی ۱۷ خط محفوظ نکلے۔ اس کے بعد کے کوئی ۳۰ خط اور بھی ہیں۔ لیکن وہ سب مولانا کی طرف سے ان کے پرائیویٹ سیکریٹری یا سرکاری پرسنل اسسٹنٹ کے ہاتھ کے یا اردو میں لکھے ہوئے یا انگریزی میں ٹائپ کیے ہوئے ہیں۔ اور وہ پبلک کے کام کے نہیں۔ صرف دو چھوٹے سے خط اس رنگ کے بھی محض نمونے کے طور پر خلاف ترتیب درج کیے جاتے ہیں۔

(۲۰) ﴿۱۲۳﴾

(مولانا دریابادی نے انجمن طبیہ (یوپی) کے آل انڈیا طبیہ کنونشن (لکھنو) کے افتتاح کی مولانا سے درخواست کی تھی۔ اسی سلسلے میں حکیم مشتاق احمد بھی مولانا سے ملے تھے۔ ۲۸/جنوری ۱۹۵۳ء)

جناب محترم! تسلیم

آپ کا خط مولانا کو مل گیا تھا۔ حکیم مشتاق احمد صاحب بھی کنونشن کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تھے۔ مولانا کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے معذرت کردی تھی۔ آپ سے بھی وہ معذرت خواہ ہیں۔ اطلاعاً تحریر ہے۔

اجمل

(۲۱) ﴿۱۲۴﴾

(ظفر احسن خاں کی کتاب ''مآل ومشیّت'' دار المصنّفین اعظم گڑھ نے چھاپی تھی۔ اس پر وزارتِ تعلیم نے پانچ ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔ مولانا دریابادی نے مولانا کو اس کے لیے شکریے کا خط لکھا تھا۔ ۷رمارچ ۱۹۵۵ء)

جواب:

مولانا فرماتے ہیں کہ آپ نے ''مآل ومشیت'' کے انتخاب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے خوشی ہوئی، بلاشبہ اس امتیاز میں مصنّف کے ساتھ دار المصنّفین کا بھی حصّہ ہے، جس نے اسے شایع کیا۔

محمد اجمل خان (۱)

حاشیہ:

(۱) اس کے بعد کے تین خط ''ملفوظات'' یا ''مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط وجوابات آزاد'' سے ماخوذ ہیں۔

(۲۲) ﴿۱۲۵﴾

جناب محترم! تسلیم

مولانا کو نسخہ مرسلہ پہنچ گیا (۱)۔ غالباً مولوی ابوالحسن علی صاحب نے صدق جدید ۲۸رجنوری کا پرچہ مجھے بھیجا ہے اس کے آخری صفحے میں امام جماعت احمدیہ (ربوہ) کی تقریر سے یہ خبر نقل کی گئی ہے کہ

''مولانا ابوالکلام صاحب جب جیل میں تھے تو حکومت نے انھیں صرف ایک اخبار منگانے کی اجازت دی۔ انھوں نے الفضل کے متعلق کہا کہ میرے لیے الفضل

منگانے کا انتظام کیا جائے''۔

یہ پڑھ کر میں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت کی انھوں نے فرمایا کہ ''عمر بھر میں کبھی ایسے اخبار کا جس کا نام الفضل ہو پڑھنے والا نہیں رہا ہوں (۲)'' اور یہ واقعہ بھی سرے سے غلط ہے کہ جیل میں انھیں صرف ایک اخبار منگوانے کی اجازت دی گئی۔ مولانا نے فرمایا جب میں رانچی میں نظر بند تھا تو ۵، ۶ انگریزی روزانہ اخبار میرے پاس آتے تھے۔ علی پور سینٹرل جیل کلکتہ میں گورنمنٹ کی طرف سے ''اسٹیٹس مین'' مجھے ملتا تھا۔ اور ''امرت بازار پتر کا'' اور ''سرونٹ'' میں خود منگواتا تھا۔ احمد نگر قلعے میں ابتدا میں بندش رہی۔ اس کے بعد جب بندش دور ہوگئی تو جتنے اخبار ہم چاہتے تھے وہ برابر ہمارے پاس آتے تھے۔ علاوہ بریں جیل میں مطالعے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کیا جائے۔ وہاں اردو کے ایک ہفتے وار یا ماہوار مذہبی رسالے کے منگوانے کا وہم وگمان بھی کسی کو نہیں ہوسکتا اور وہ بھی قادیان کا۔ معلوم نہیں ''الفضل'' ماہوار ہے یا ہفتے وار لیکن بہر حال روزانہ نہیں ہوسکتا ہے۔

افسوس ہے کہ ایک صاحب جو اپنے آپ کو اپنی جماعت کا امیر قرار دیتے ہیں۔ ایسی غلط اور بے پر کی بات اپنی تقریر میں کہتے ہیں۔

محمد اجمل خان

حواشی:

(۱) مولانا دریابادی نے اپنی تصنیف ''اکبر نامہ'' مولانا آزاد کی خدمت میں بھیجی تھی۔

(۲) یہ بات ۲۸؍ دسمبر ۱۹۵۴ء کو ربوہ کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہی گئی تھی اور الفضل ہی کے حوالے سے صدق جدید نے نقل کی تھی اس بیان کا آخری جملہ یہ تھا:

''واقعات بتاتے ہیں کہ اگر اخبار کو دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کی جائے تو اس کی نہ صرف اپنوں میں بلکہ غیروں میں بھی کتنی اشاعت ہوسکتی ہے''۔

الفضل کے لیے یہ بیان اس لیے بھی دلچسپی کا باعث بنا کہ ایک غیر شخص بھی اس کے مطالعے کا شائق تھا۔ مولانا دریابادی کے پیش نظر صرف روایت کی تحقیق ہی نہ تھی بلکہ معاصر موصوف کے لیے ''شرف وفضل'' کی آرزو بھی تھی۔ چنانچہ

مذکورہ روایت کو نقل کر دینے کے بعد لکھتے ہیں:

''روایت عجیب جتنی بھی ہو، اگر اس کی تفصیلات معلوم ہو جائیں کہ یہ کس زمانے کا ذکر ہے، مولانا اس وقت کس جیل میں تھے؟ اور یہ روایت آیا خود مولانا کی بیان کی ہوئی ہے یا کسی اور کی؟ وغیرہا، تو یقیناً اس سے معاصر موصوف کو شرف وفضل کی ایک سند ہاتھ آ جائے گی۔ مولانا جیسے صاحبِ ذوق وصاحبِ نظر کے انتخابات میں آ جانا کوئی بہت معمولی سی بات نہیں''۔

(صدق جدید۔لکھنؤ، ۲۸رجنوری ۱۹۵۵ء، ص ۳+۸)

اب جو مولانا دریابادی کا مولانا کے نام خط پہنچا تو مناسب معلوم ہوا کہ اس بے اصل روایت کی حقیقت بیان اور مولانا دریابادی کی غلط فہمی دور کر دی جائے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسی زمانے میں مولانا آزاد کے نام خط اور اس روایت کا تراشہ اس ضروری تردید کے لیے تحریک بن گیا۔ (ا۔س۔ش)

(۲۳) ﴿۱۲۶﴾

(مولانا دریابادی کا یہ خط مولانا کے نام نہیں، اجمل خاں کے نام تھا اور دریافت کیا تھا کہ محکمۂ اثریات (آرکیالوجی) کی انگریزی مطبوعات معارف (اعظم گڑھ) اور صدق جدید (لکھنؤ) کو تبصرے کے لیے نہیں بھیجی جا سکتیں؟)

جواب:

۱۱راکتوبر ۱۹۵۳ء

بہت ہی کم تعداد میں وہ چھپتی ہیں اور اخباروں کو نہیں بھیجی جاتیں۔

اجمل

(۲۴) ﴿۱۲۷﴾

مولانا آزاد کے کلام کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

جواب:

۶رفروری ۱۹۵۷ء

وہ کلام ضائع ہو گیا(۱)۔

اجمل

حاشیہ:

(۱) مختلف اخبارات وجرائد اور کتب سے مولانا آزاد کا بہت سا اردو فارسی کلام حاصل ہوگیا تھا، جسے پہلے خاکسار ابوسلمان نے ''ارمغانِ آزاد'' کے نام سے ان کے ابتدائی مضامین نثر کے ساتھ مرتب کر کے چھاپ دیا تھا۔ اس کے بعد بہت سا کلام اور دریافت ہوگیا جسے ''کلیات آزاد'' کے نام سے مستقل مجموعے میں مدون کر کے چھاپ دیا ہے۔ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان، کراچی ۱۹۹۷ء

کلیات آزاد کی تالیف واشاعت کے بعد مزید کلام ابھی تک دریافت و دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ ''ارمغانِ آزاد'' میں جو کلام جمع ہوا تھا، اس کا عکس لے کر پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے ''دیوان آزاد'' کے نام سے اس پر مقدمہ لکھ کر ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ، کے مجلّے ''معیار وتحقیق'' (۱۹۸۹ء) میں چھپوادیا تھا، جو بعد میں مذکورہ بالا ادارے ہی کی طرف سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔

شکیل صاحب کا یہ بیان تو درست نہیں کہ یہ دیوان انھوں نے مرتب کیا ہے۔ اس لیے کہ دیوان کا تمام مواد ''ارمغانِ آزاد'' سے معکوس ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی ہے نہ ترتیب بدلی ہے۔ حتیٰ کہ متن وحواشی کی غلطیاں بھی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ البتہ ان کا مقدمہ جامع اور معلومات افزا ہے۔ میں اس کے مطالعے سے لطف اندوز اور مستفیض ہوا ہوں۔ اگر وہ دیوان کے متن میں وہ مواد بھی شامل کر دیا جاتا جو اس وقت تک دستیاب ہو چکا تھا، اس اضافے کے ساتھ ترتیب کلام پر نظر ثانی فرمالیتے اور متن وحواشی کے اغلاط درست فرمادیتے تو ایک نیا مکمل اور مفید متن تیار ہو جاتا۔ ''کلیات آزاد'' کے نام سے خاکسار نے اسی قسم کا کام انجام دیا ہے۔ شائقین ابوالکلام کو ڈاکٹر شکیل کے مقدمے سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

علامہ سید رشید رضا (قاہرہ، مصر)

(۱) ﴿۱۲۸﴾

مولانا آزاد کے تین خط بنام علامہ سید رشید رضا مصری (متوفی ۲۲ راگست ۱۹۳۵ء) ڈاکٹر عبدالمنعم النمر کی تحقیق ''مولانا ابوالکلام آزاد - ایک مفکّر ایک رہنما'' سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ خطوط اس تحریک کے آغاز کی نشان دہی کرتے ہیں، جس کا اختتام مرکزیہ خلافتِ عثمانیہ ترکیہ کے انہدام، محلقات ومحروسات کے انقطاع، اختیارات کی تحدید، مرکزیت کے خاتمے، ممالکِ اسلامیہ کے انتشار اور خلافت کے انفساخ پر ہوا تھا۔

''لامرکزیت'' کی تحریک جس نے عربِ اسلامی ممالک میں ایک جوش پیدا کردیا تھا۔ ملک اور زبان کی بنیاد پر عرب قومیت کی حامی تھی اور عربوں کی آزادی کی حمایت کرتی تھی۔ علامہ رشید رضا اس تحریک کے زبردست مؤیداور رہنما تھے۔ ان کے نزدیک خلافت قریش (عرب) کا حق تھا، عثمانیوں (ترکوں) کا نہیں۔ اس لیے انھوں نے ترکوں کے خلاف شریف (گورنر) مکّہ ''حسین'' کی بغاوت کی تائید کی تھی۔

یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ خلافتِ اسلامیہ ترکیہ کے زوال وشکست کے ساتھ ہی ''متّحدہ عرب'' کے وجود میں دنیائے اسلام حجاز، عراق، شام، اردن کے ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی اور قلب میں اسرائیل کا ناسور پیدا ہوا۔ بعدہٗ مقدس ردائے اسلام مزید عرب امارات کے نام پر دھجیوں میں تقسیم ہوگئی۔

مولانا آزاد کے خیال میں ترکوں کی مرکزیت (خلافۃ اسلامیہ ترکیہ) کے خلاف عرب قومیت کا نعرہ، عرب ملکوں کی آزادی کی تحریک، محبانِ وطن اور بہی خواہانِ

ملتِ اسلامیہ کی تحریک نہیں، برٹش استعمار کی تحریک تھی۔ اس سے عالمِ اسلام، مسلمانوں کی اجتماعیت اور ان کی مرکزی سیاسی قوت کو نقصان پہنچتا تھا۔ کتنا بڑا تضاد تھا، دونوں بزرگوں کے نقطہ ہائے نظر میں! ہندستان میں مسلمانوں کے نظم و اتحاد کی بنیاد وحدتِ کلمہ تھی، جب کہ عالمِ اسلام میں اور حضرت علامہ رشید رضا کے نزدیک ملک اور زبان قومیت کی بنیاد تھی۔ ہندستانی مسلمان اسلامی قومیت کے تصور پر فدا تھے اور اسلامی ممالک میں ملک اور زبان کے نام پر مسلمان اپنے بھائیوں کے گلے کاٹ رہے تھے۔ مولانا آزاد نے ان خطوط میں جس خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ پیش آکر رہا!

علامہ رشید رضا ۱۹۱۲ء میں ہندستان تشریف لائے تھے اور ۶ راپریل کو ندوۃ العلماء کے جلسے کی صدارت فرمائی تھی۔ اس سفر میں مولانا آزاد سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اگرچہ المنار ایک زمانے سے مولانا کے مطالعے میں تھا، اور ان کی شخصیت و افکار سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ جلسۂ ندوہ میں علامہ کی تقریر کا ترجمہ مولانا نے کیا تھا اور اپنی طلاقتِ لسانی کا سامعین کے دلوں پر نقش بٹھا دیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قادرالکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے۔ وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔" (حیاتِ شبلی۔ اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۵۰۱)

مولانا آزاد کے ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہ اور مولانا کے درمیان مدت دراز تک مراسلت رہی تھی، عبدالمنعم النمر کو یہی تین خطوط دستیاب ہو سکے۔ (ا۔س۔ش)

کلکتہ

محرم ۱۳۳۱ھ (دسمبر ۱۹۱۲ء)

فاضل جلیل و شیخ نبیل

السلام علیکم طبتم ودمتم فوق مارمتم وبعد!

یہ امر آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ میں آپ کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف پاتا ہوں۔ آپ کی خدمت میں خلوص ہے اور اس میں شخصی اور طبقاتی مصالح کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لیے جب میں نے ایسی بات سنی جو آپ کے شایانِ شان نہ معلوم ہوئی تو میں نے اس کی تردید ضروری سمجھی۔ ہندستان کے بعض اخبارات نے لکھا ہے کہ موجودہ ''تحریک لامرکزیت'' میں (جو بعض عرب ممالک کو حکومتِ ترکیہ سے علاحدہ کرانا چاہتی ہے) آپ بھی شریک ہیں۔ یہ خبر چھپتے ہی ہندستان کے طول وعرض میں بحث چھڑ گئی، کچھ لوگ اس خبر کی تصدیق کر رہے ہیں، کچھ اسے غلط قرار دے رہے ہیں اور کچھ لوگ گومگو کی حالت میں ہیں۔ جہاں تک میرا تعلّق ہے، میں سخت حیرت میں گرفتار ہوں کہ آیا میں کیا کہوں۔ جب میں محمد علی پاشا کی خبر مرگ کو یاد کرتا ہوں، جو آپ نے مجھے سنائی تھی، تو دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ممکن ہے بوجوہ ان کی ذات سے مصر کو فایدہ پہنچا ہو، لیکن انھوں نے مرکزیت سے گریز کر کے مصر اور دولتِ عثمانیہ دونوں کو نقصان پہنچایا۔ مجھے تو اس خبر کے الفاظ کی صحت پر شبہ ہے۔ لامرکزیت تو محمد علی کی تصنیف تھی، لیکن جب میں اس خبر کے الفاظ سے قطعِ نظر کر کے اخبارات میں جو کچھ چھپا ہے اسے پڑھتا ہوں، تو میرے لیے انکار کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

آپ نے اصلاح کو اپنا نصب العین بنایا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امت کے کسی حال کی اصلاح مقصود ہو، نمونوں کو سامنے رکھے بغیر کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ نمونوں سے بھی کام نہیں چلتا، اگر عوام کو اس کے خیر ہونے کا یقین نہ ہو۔ فرمانِ الٰہی ہے:

تعاونوا على البر والتقویٰ (نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو)

نیکی میں تعاون کی شکل یہی ہے کہ نیکی کرنے والوں کی پوزیشن صاف و مضبوط کی جائے۔ اس لیے میں چند سوالات پیش کر رہا ہوں اور آپ سے اطمینان بخش جواب کی امید کرتا ہوں۔ میں ہندستان میں آپ کی پوزیشن صاف کرنے کی غرض سے اس کی اشاعت کروں گا۔

س ۱: کیا ''تحریک لامرکزیت'' سے جناب کا کوئی تعلّق ہے؟

س ۲: کیا لامرکزیت کا نتیجہ خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا نہ نکلے گا اور اس کے اجزا الگ الگ کرنے سے اسے نقصان نہ پہنچے گا؟

س ۳: کیا یہی تو وہ بنیاد نہیں، جس کی بنا پر آپ نے محمد علی پاشا کی وفات کی خبر سنائی تھی؟

س ۴: کیا اس سے اس الزام کی تصدیق نہیں ہوتی کہ آپ خلافتِ عربیہ کی تاسیس کر کے دولتِ عثمانیہ کے اعضا کو منتشر کرنا چاہتے ہیں؟

س ۵: کیا یہ کوئی ڈھکا چھپا خطرہ ہے کہ دولتِ عثمانیہ کے اعضا کے بکھرنے کے بعد اجانب اُسے نگل جائیں گے اور دولتِ عثمانیہ کا نام و نشان باقی نہ رہے گا؟

آپ کا مخلص

ابوالکلام الدہلوی (۱)

حاشیہ:

(۱) ڈاکٹر النمر نے لکھا ہے کہ مولانا کا یہ خط ان کی نظر سے گزرا ہے۔ علامہ رشید رضا کے قلم سے اس پر یہ جملہ درج ہے کہ انھوں نے اس کا فوراً جواب لکھوادیا (۱۹ر محرم ۱۳۳۱ھ م ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

(۲) ﴿۱۲۹﴾

مولانا نے یہ خط ان نکات کے رد میں لکھا تھا جو علامہ رشید رضا نے اپنے خط میں اٹھائے تھے۔ مولانا کے خط سے علامہ مرحوم کے نکات بھی معلوم ہو جاتے ہیں (ا۔س۔ش)

کلکتہ

۲۸ رمئی ۱۹۱۳ء

حضرت المصلح الجلیل اللہ یطیل بقائہ! تحیۃ وسلام

مجھے آپ کے خط نے سرفراز کیا تھا، لیکن میرے لیے کتنی شرمندگی کی بات ہے کہ میں ابھی تک اس کا جواب نہیں لکھ سکا تھا۔ میرا جواب نہ لکھنا کسی کاہلی اور سستی کی وجہ سے نہ تھا۔ آپ کا مکتوب اتنا اہم تھا کہ اس کے جواب میں کوئی تاخیر کسی طرح مناسب نہ تھی۔ لیکن کثرتِ مشاغل کی وجہ سے دماغ کو مہلت نہ ملی اور میں مسلم عوام کے مسایل کے سلسلے میں اِدھر اُدھر سفر کرنے پر مجبور رہا۔ اس لیے تاخیر ہوئی۔ امید کہ معاف فرمائیں گے۔

وقت کافی گزر گیا اور میں ابھی تک وہ مواد اکٹھا نہ کر سکا، جس کی ان مسائل پر قلم اٹھانے کے لیے ضرورت ہے۔ معلوم نہیں یہ فرصت کب ملے گی! بہ ہر حال جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اجمالاً سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ جب بھی مشاغل کا بوجھ کم ہوگا اور فرصت ملے گی تو ان شاء اللہ تفصیل سے گفتگو کروں گا۔

ا۔ آپ کی رائے ہے کہ ”عالمِ اسلام نے دولتِ عثمانیہ کی بے حد عزت کی اور اس کے اوپر اپنے تمام امور چھوڑ دیے۔ اس کے نتیجے میں ان کو اصلاحِ احوال کی فکر نہ رہی اور جب ان پر وہ مصیبت آئی جس کا انھیں کوئی تجربہ نہ تھا تو وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل بھی نہ نکلے۔ عربوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ انھیں ظالم حاکموں اور امیروں نے پیس کے رکھ دیا، ان کا خون بہایا، ان کی زرعی دولت کو برباد کیا، انھیں ہر طرح کی

تعلیم سے محروم رکھا۔ یہاں تک کہ انھیں فوجی تربیت سے بھی دور رکھا؛ ترکوں نے پورے عالمِ اسلام پر سیاسی مظالم بھی کیے اور اس طرح مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ خسارے میں رہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ عرب اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے تاریخی عز و شرف کے حصول کے لیے جدوجہد کریں، اور اپنی کھوئی ہوئی میراث حاصل کریں''۔

آپ کی رائے میں وزن ہے! میں اس فکر میں آپ کے ساتھ ہوں، لیکن عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ راستہ نشیب و فراز سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں زبردست سیاسی کھانچے ہیں، جن کو یورپ کی ارواحِ خبیثہ اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بڑی بڑی جماعتوں کو پھاڑ ڈالا ہے، ان کے پنجۂ استبداد و ہوس کے سامنے ہم غریب قوموں کی کیا بساط ہے! ایسے وقت میں جب مسلمانوں کی سادہ لوحی اور جہالت، نادانی اور ملّت فروشی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور ہر وہ قدم جو وہ اصلاح احوال کے لیے اٹھاتے ہیں، مزید مشکلات اور آزمائشوں کا موجب ہوتا ہے اور جب وہ دشمنوں کی یلغار کے سامنے راہ روک کر کھڑے ہوتے ہیں تو اس کے داخلے کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

۲۔ موتمر اسلامی عام کے باب میں آپ کی رائے پڑھ کر مجھے ایسا گمان ہو رہا ہے کہ جیسے میرے دل کے احساسات ہی کو کوئی میرے کانوں تک پہنچا رہا ہے۔ میں اس فکر میں راتوں کو بستر پر بے چینی کی کروٹیں بدلتا رہا ہوں۔ پوری پوری راتیں اسی فکر میں کٹ گئی ہیں۔ اس تصور نے غنودگی کو میری آنکھوں سے دور رکھا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا! میں آپ کی اس تجویز کا خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدا اس تصور کو عمل کی شکل عطا کرے۔

لیکن یہ موتمر کہاں ہو، اس مسئلے کا فیصلہ بڑا ہی دشوار ہے۔ موجودہ حالات میں ہندستان اور مصر — دو ہی جگہیں ایسی ہو سکتی ہیں جہاں اس کے انعقاد کے بارے

میں سوچا جائے! لیکن ان دونوں پر انگریزوں کا تسلّط ہے۔ وہ مسلمانوں کے صفِ اول کے دشمن ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں ملکوں میں ہماری جدوجہد کی کامیابی کے امکان باقی نہ رکھیں گے۔ لیکن کام تو ہر حال میں کرنا ہے۔ ہمارا مقصد اہم ہے، وقت کم ہے اور دشمن دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ حالات کا تقاضہ واضح ہے۔ ہمارا اندازِ فکر ایک ہے اور موقف میں متّحد ہیں۔ راہ بھی ہماری نظروں میں واضح ہے۔ کاش! ہم افکار وتجاویز کی تنگ نائے سے نکلتے اور اپنے مقصد کی طرف سرگرم سفر ہوتے۔

مجھے آپ اجازت دیں کہ میں عرض کروں کہ دوریِ منزل کی وجہ سے ہندستان کے حالات سے آپ کی واقفیت کافی نہیں ہے۔ نواب وقارالملک اس کام کے آخری آدمی نہیں ہیں۔ مردانِ کار کی یہاں کمی نہیں ہے۔ آپ اہلِ ہند کے سپرد کیا کام کرنا چاہتے ہیں؟ براہِ کرم ذرا وضاحت سے فرمائیں!

۳۔ میں نے ''الاتحاد الاسلامی'' کے نام سے ایک عربی رسالہ نکالنے کا پورا ارادہ کرلیا ہے تاکہ اس سے عالمِ اسلام میں اخوتِ اسلامی کے فروغ اور تبلیغ کا کام لیا جائے۔ خاص طور پر عربوں تک یہ آواز پہنچانی ہے۔ وہ گہوارۂ اسلام میں ہیں۔ ان کے اور ہمارے احوال و افکار ایک ہیں اور ہم ان کے حالات و رجحانات سے واقف رہنا چاہتے ہیں۔ کیا جنابِ والا عالمِ اسلام کے لیے اس خدمتِ جلیلہ میں میری مدد فرمائیں گے؟

عربوں کی لامرکزیت کی تحریک نے ہندستان کے مسلمانوں کو عربوں سے بدگمان کردیا ہے۔ وہ اس تحریک کو اغیار کی فریب کاری کا ایک شگوفہ سمجھتے ہیں اور خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ تحریک دولتِ اسلامیہ کے ایک ایک جز کو منتشر کردے گی۔ لیکن یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں بڑے فخر سے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی شخصیت کے بارے میں میری رائے میں بال برابر تغیر نہیں ہوا ہے۔ میں آپ کو اللہ کی راہ کا ایک مخلص مجاہد

سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ امتِ مسلمہ کو قرآن مجید کی طرف بلاتے ہیں اور سنتِ نبوی کا احیا چاہتے ہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ سیاسی مسایل میں ہمارے سامنے حقیقت کھول کر ہمارے قلوب کو اطمینان عطا فرمائے۔ اس وقت تو میری راے اس باب میں آپ کی راے سے مختلف ہے۔

آپ چاہیں تو میرا خط اشاعت کے لیے دے سکتے ہیں۔

آپ کا مخلص

ابوالکلام الدہلوی

(۳) ﴿۱۳۰﴾

اللہ کے محتاج احمد کی طرف سے

حضرت علامۃ المصلح الجلیل السید محمد رشید رضا کی خدمت میں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ وبعد!

مجھے گزشتہ سال آپ کے خطوط ملے تھے۔ میں ان دنوں قید خانے سے نکلا تھا۔ اس دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشات کی وجہ سے حالات بہت پیچیدہ ہوگئے تھے۔ لیڈر جیل میں بند تھے۔ حالات کی اصلاح کے لیے ملک کے دورے کرنے پڑے۔ میری صحت بھی ہموار نہ تھی۔ وطنی مشاغل دامن کشاں تھے۔ سیاسی اختلافات توجہ کے طالب تھے۔ جمعیۃ الخلافۃ کے کاموں کا ہجوم تھا۔ برابر ارادہ کرتا رہا کہ آپ کے خطوط کا جواب لکھوں لیکن کثرتِ مشاغل اور ہجوم کار نے اس کا موقع نہ دیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ موانع کی شدت کا کیا عالم تھا۔ وہی میرے عزم اور ارادے پر غالب آتے رہے۔ پھر گرمی کا موسم شروع ہوگیا اور میں بالکل بے بس ہوگیا۔ میرے مرض نے شدت اختیار کر لی اور مجھے یہ موسم گزارنے کے لیے شملہ میں

قیام کرنا پڑا۔ یہاں مجھے کچھ وقت ملا اور میں نے آپ کے خطوط نکالے جو سفر میں برابر میرے ساتھ رہے تھے، تاکہ پہلی فرصت میں ان کا جواب لکھ سکوں۔ میں نے اس سے پہلے آپ کو ڈاک کے ذریعے یکے بعد دیگرے دو خط لکھے تھے۔ شاید ۱۵ر یا ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کی تاریخ ہوگی۔ میں نے ان خطوط میں تمام مسایل کے بارے میں اپنی رائے لکھی تھی۔ اس کے بعد میں ہندوستان کے سیاسی مسائل میں الجھ گیا۔ لیکن میں آپ کے جواب کا برابر انتظار کرتا رہا۔ آپ کی مصروفیت ہی غالبًا تاخیر جواب کا موجب ہوئی۔ پہلے میری جانب سے جواب میں تاخیر ہوئی تھی، جس کی شرمندگی مجھے برابر لاحق رہی اور اب آپ کی طرف سے تاخیر ہوئی ہے تو میں اپنے آپ کو ہرگز اس کا مستحق نہیں پاتا کہ تاخیر کے لیے شکوہ سنج ہوں۔ مجھے الشیخ عبدالرزاق سے معلوم ہوا کہ آپ کے تازہ خطوط میں میرے خطوط کا کوئی ذکر نہیں (۱)۔ اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ میرے خطوط آپ تک پہنچے ہی نہیں۔ اس خیال سے مجھے الجھن ہوئی۔ اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب آپ کے خطوط میرے پاس بغیر کسی تاخیر کے آرہے ہیں تو میرے خطوط بھی اسی طرح آپ تک پہنچ جانے چاہییں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ کے پچھلے خطوط میرے پاس نہیں ہیں۔ اس لیے میں جو کچھ اپنے خطوط میں آپ کو لکھ چکا ہوں، اس کا دہرانا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ خدا کرے میرا یہ خط آپ کو وقت پر مل جائے۔ میں اس کے ارسال میں امکانی احتیاط برت رہا ہوں۔ آیندہ میں ہر ہفتے خط لکھنے کا اہتمام کروں گا۔ آپ کے لطف و کرم سے امید رکھتا ہوں، مجھے آپ کے جواب سے محرومی نہ رہے گی۔ اس لیے کہ مجھے آپ کے جواب سے تقویت بھی ملتی ہے اور خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔

اس وقت یہ خط میں آپ کو مختصر لکھ رہا ہوں۔ ان شاء اللہ دوسری ڈاک سے آپ کو تفصیلی خط بھیجوں گا میں کوشش کروں گا کہ پچھلے کھوئے ہوئے خطوط میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اس خط میں اس کا خلاصہ ضرور آجائے۔

۱۔ مغرب زدہ انتہا پسند ترکوں نے وہی کیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ جنابِ والا سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ ہندستان میں پہلے ہی دن سے ہمارا یہ مسلک تھا کہ متحارب قوتوں اور اغیار کے مقابلے میں ترکی کی حمایت کی جائے اور پھر کوشش کی جائے کہ دولتِ ترکیہ کے داخلی امور کی اصلاح ہو۔ جنگ کے زمانے میں ہم نے پہلی بات پر عمل کیا۔ جب کہ ترکی کا نام لینا بھی ناقابلِ معافی جرم تھا، ہم نے جان و مال کی قربانی دے کر اپنا فرض ادا کیا۔ اب ہمارے سامنے دوسرا دروازہ کھلا ہے۔ ہم تیار ہیں اور ہم سے جو کچھ ہو سکے گا نتائج سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دیں گے۔

۲۔ اس وقت ہندستان اور مصر کے عوام میں جو ہیجان برپا ہے، میرے خیال میں اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں اس سے کسی فایدے کی امید نہیں رکھتا۔ مصر میں شاید چند ہی آدمی ہوں گے جنھیں اس مسئلے کے واقعی مضمرات کا اندازہ ہو! کہا جاتا ہے کہ خلافت کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے! لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس وقت روے زمین پر کہیں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جو خلافت کی معمولی شرایط پر بھی پورا اترتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ہم ایسی جگہیں جو اس غرض کے لیے موزوں ہوں، طاقت سے حاصل کر لیں گے۔ لیکن مجھے تو یہ مسئلہ صرف نظریات سے حل ہوتا نظر نہیں آتا۔

۳۔ بے شک موتمر اسلامی کی تجویز صحیح ہے۔ ایسے اجتماع کی بہ ہر حال ضرورت ہے۔ صدیوں سے مسلمانوں کی بنیادی جمعیّت وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اربابِ حل وعقد کی ایک چھوٹی سی باصلاحیت جماعت کا پیدا کرنا ہے۔ اگر ہم ایسی جماعت بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو اسے ''اربابِ حل وعقد'' کا لقب دینا صحیح ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس میں خلافت کے مسئلے کا بھی کوئی حل نکل آئے۔

میں دوسری ڈاک سے اس مسئلے پر اپنے مفصّل خیالات آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ خدا ہم کو اپنی پسند اور رضا کی راہ پر چلائے۔

آپ کا مخلص

ابوالکلام الدہلوی

۷/ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

(۱۰/ جولائی ۱۹۲۴ء)

حاشیہ:

(۱) الشیخ عبدالرزاق سے مراد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں جو علامہ شیخ رشید رضا کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ان کے مدرسہ دعوت وارشاد (قاہرہ) میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد زندگی کے آخری ایام تک استاد شاگرد دونوں میں مراسلت کا تعلق رہا۔ (ا۔س۔ش)

نیاز فتح پوری:

مولانا غلام رسول مہر نے یہ خطوط ''اتالیق خطوط نویسی'' از خواجہ حسن نظامی سے اپنی کتاب ''نقش آزاد'' میں درج کیے تھے۔

(۱) ﴿۱۳۱﴾

کلکتہ

۲۱ر جولائی (۱۹۱۳ء)

صدیقی العزیز!

والا نامہ پہنچا۔ میں نے ایک اطلاعی خط لکھوا دیا تھا اور خود خط رکھ لیا تھا کہ جواب لکھوں گا۔ مجھے جو کچھ اس بارے میں کرنا تھا، کر دیا ہے اور منتظر جواب ہوں۔

یہ فتح پور میں ندوے کے متعلق جلسہ کن لوگوں نے کیا تھا؟(۱)۔

خط کے جواب وغیرہ میں، مجھ سے جو قصور ہو جایا کرتا ہے، اس کی بنا پر میرے دل کی نسبت کوئی رائے قایم نہ کیجیے، میں ہر حال میں، ہر طرح کی خدمت کے لیے مستعد ہوں اور علی الخصوص آپ کی تو اپنے دل میں جگہ رکھتا ہوں۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) ندوہ میں گڑبڑ کے واقعات اور اس کی اصلاح وتصفیہ کے لیے جلسوں وغیرہ کا سلسلہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ علامہ شبلی کے نام مولانا کے بعض خطوط پر قدرے تفصیلی حواشی ہیں۔ اس خط پر ۱۹۱۳ء سنہ تحریر کا اندراج قیاسی ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۲) ﴿۱۳۲﴾

امی لاج، مسوری

۸ر اگست (۱۹۱۳ء)

صدیقی العزیز!

آپ کے متواتر خطوط پہنچتے رہے۔ میں اس تمام عرصے میں بہت زیادہ گرفتارِ تفکر و تردد رہا۔ اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا کہ میں لکھنؤ میں تھا(۱)۔ آج صبح واپس آیا اور آپ کی شکایتوں سے رفعِ کسلِ سفر میں مدد لی۔ کل کلکتہ روانہ ہوں گا اور انشہ وہاں سے تفصیلی خط لکھوں گا۔ احتیاطاً آپ کی کتاب کی نسبت آج ہی دفتر لکھ دیا ہے۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) اس خط میں تاریخ کے ساتھ سنہ تحریر درج نہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ معلوم ہے کہ مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے حادثے کے بعد ۱۹۱۳ء میں مولانا اگست کے مہینے میں کچھ دنوں تک لکھنؤ میں مقیم رہے تھے۔ کان پور جانے کی انھیں اجازت نہ ملی تھی۔

(۳) ﴿۱۳۴﴾

۲۴ر جون (۱۹۱۴ء)

صدیقی الاعز!

سخت نادم ہوں کہ اتنے عرصے کے بعد جواب لکھتا ہوں۔ آپ کا خط پڑھ کر معمولاً رکھ دیا تھا کہ ضروری خطوں کے ساتھ جواب لکھوں گا۔ ہفتے میں ایک رات یہی کام ہوتا ہے، لیکن غلطی سے وہ وہیں رہ گیا اور میں سمجھا کہ جواب لکھ چکا ہوں۔ آج کاغذات دیکھے تو بجنسہٖ موجود تھا۔ سخت شرمندگی ہوئی۔ خواستگار معافی ہوں۔

نظم، انشہ، درجِ ''الہلال'' ہوگی(۱)

ایک دوسرے امر کے لیے آپ نے لکھا ہے۔ مجھے بہ ہمہ وجود اور ہر حال میں مستعد خدمت یقین کیجیے۔ اگر کوئی سعی مفید مقصد نکلے تو اسے بہترین عبادت سمجھوں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ بہ تفصیل لکھیں(۲)۔

میری طرف سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی۔ تاخیر کے لیے سخت نادم ہوں۔

فقیر ابوالکلام

حواشی:

(۱)"التجاے پروانہ" کے نام سے علامہ صاحب مرحوم کی یہ نظم الہلال یکم جولائی ۱۹۱۴ء میں درج ہوئی۔ اس سے یہ اندازہ کیا کہ یہ خط ۱۹۱۴ء کا ہے۔

(۲)اس معاملے پر کوئی روشنی کسی طرف سے نہیں پڑتی۔ (ا۔س۔ش)

(۴) ﴿۱۳۴﴾

کلکتہ

صدیقی الاعز!

خط پہنچا، ....(۱)صاحب کا تو یہ حال ہے:

کاں نیز گہے بامن و گہہ بادگرے داشت

لیکن اس سے مطمئن رہیے کہ طے شدہ امور میں بے ثباتی و تزلزل ممکن نہیں۔ آپ روزانہ اثباتِ وجود کرتے ہیں۔

(۲)...... صاحب ذاتی اور شخصی تعلقات میں اس درجے محکم و استوار ہیں کہ موجودہ عہد میں شاید بہ مشکل اس کی نظیر ملے۔ میں مطمئن ہوں اور آپ بھی مطمئن رہیں۔

غالباً میں نومبر کی ۱۵ر تک دہلی آؤں، اگر اس وقت تک نقل و حرکت کے لیے آزاد رہا۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱)دونوں خالی جگہوں میں دو اصحاب کے نام تھے جو اس خط کی اولین اشاعت ہی میں حذف کردیے گئے تھے۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی (لکھنؤ):

(۱) ﴿۱۳۵﴾

۲۹ رشوال ۱۳۳۱ھ (یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء)

جناب الجلیل الاعز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ان شاء اللہ طبع مبارک قرین صحت واعتدال ہو!

(۱) کل ایک نہایت معتبر ذریعے سے ایک عجیب خبر سننے میں آئی یعنی بعض حضرات مستبدع نے بہ اشارۂ حکام جناب والا سے خواہش کی کہ ایک تحریر الہلال اور فقیر کے خلاف ارقام فرمادیں! چناں چہ جناب نے لکھ دی۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ الہلال کی ضمانت کے واقعے سے ہم کو نہایت مسرت ہوئی (۱) وہ اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔ وہ کوئی مذہبی و دینی رسالہ نہیں بلکہ اس کی تحریرات وآرا مذہب کے لیے نہایت مضر اور قوم کے لیے گمراہ کنندہ ہیں۔ اڈیٹر الہلال محض ایک جاہل شخص ہے۔ علوم دینیہ سے ناآشنائے محض وغیرہ وغیرہ۔ اختلاف راے دوسری شے ہے اور الہلال کے متعلق اگر کسی شخص کی یہ رائیں ہوں، تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن میں جناب والا سے اس امر کو نہایت بعید بلکہ ابعد سمجھتا ہوں کہ کوئی اس قسم کی تحریر بہ اشارۂ حکام لکھیں۔ تاہم چوں کہ وسیلۂ علم معتبر ہے، اس لیے نہایت ممنون ہوں گا اگر اصلیت سے مطلع فرمائیں۔ بشرطے کہ کچھ ہو۔ (۲)

(۲) مسئلہ کان پور کے معاملات میں جو نئے تغیّرات ہوئے ہیں، مجھ سے بھی بغرض مشورہ بیان کیے گئے۔ جناب کی راے مبارک بھی معلوم ہوئی کہ ان حالات میں سرِ صلح خم کردینا چاہیے۔ تاہم یہ معاملہ نہایت پیچیدہ ہے اور ذمے داری عنداللہ و عندالناس شدید! اس لیے امید ہے کہ جناب اپنی آخری راے کے اظہار میں کمالِ حزم واحتیاط سے کام لیں گے۔ (۳)

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

ماخذ: حضرت فرنگی محلی مرحوم کے نام تمام خطوط نقوش۔ لاہور (خطوط نمبر۲)، ۱۹۶۸ء سے ماخوذ ہیں۔

حواشی:

(۱) الہلال کی ضمانت کا واقعہ ۳/ستمبر ۱۹۱۳ء کے نمبر میں ''مشہد اکبر'' کی اشاعت پر پیش آیا تھا۔

(۲) اگلے خط کے مطالعے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ محض غلط بیانی تھی۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

(۳) اواخر جون ۱۹۱۳ء میں مسجد مچھلی بازار کان پور کے وضو خانے کا حصہ ڈھا دیا گیا تھا۔ ۳/اگست کو منہدم حصے کی دوبارہ تعمیر کے لیے مسلمان بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کا مجمع ہوا تھا اس پر پولیس نے گولی چلادی۔ اس دوران اور اس کے بعد یہ تحریک مختلف نشیب و فراز سے گزری۔ بالآخر صلح کی گفتگو کا آغاز ہوا، جس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا، لیکن ابھی صلح کی گفتگو کسی نتیجے تک نہ پہنچی تھی کہ مولانا آزاد نے حضرت فرنگی محلی کو یہ خط لکھا اور اس میں انھیں کمال حزم و احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

(۲) ﴿۱۳۶﴾

۵/اکتوبر (۱۹۱۳ء)

جناب الجلیل الاعز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

والا نامۂ گرامی پہنچا۔ جناب یقین فرمائیں کہ خود مجھ کو بھی اس روایت پر ایک لمحے کے لیے یقین نہ ہوا، تاہم ضروری تھا کہ خود جناب کو بھی اطلاع دوں اور یہ بھی خیال ہوا تھا کہ ممکن ہے اس کی بنیاد کوئی دوسرا واقعہ ہو۔ اور اس کو بہ تغییر و تحریف بیان کیا گیا۔ راوی کی نسبت کیا عرض کروں لکھنؤ کے ایک معزز شخص ہیں اور شاید یہی بہتر ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

معاملۂ کان پور کی نسبت جناب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے یہ مجھ کو مسٹر مظہر الحق کی زبانی معلوم ہوگیا تھا اور وہ مجھ سے اس بارے میں مشورہ لینے کلکتہ تشریف لائے تھے۔ البتہ علاوہ واپسی زمین مغصوبہ کے اور جو شرایطِ مصالحت جناب نے تحریر فرمائے ہیں، انھوں نے نہیں بتائے۔ صرف مسئلۂ مسجد کی نسبت تذکرہ کیا تھا۔ مجھ کو اس کی نسبت جو

کچھ عرض کرنا ہے وہ کسی قدر تفصیل طلب ہے۔ آج نہایت مشغول ہوں۔ اس عریضے کو صرف تعلیقۂ مبارک کی رسید تصور فرمائیے۔ ان شاء اللہ آج رات کو یا کل کسی وقت فرصت نکال کر مفصّل عریضہ لکھوں گا۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

حواشی:

(۱) الحمدللہ کہ کسی شخص کی غلط بیانی سے مولانا آزاد کو جو غلط فہمی پیدا ہوتے والی تھی حضرت فرنگی محلی کی وضاحت سے اس کا خدشہ دور ہوگیا۔

(۲) مظہر الحق، ضلع پٹنہ کے ایک زمیندار خاندان میں دسمبر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ نسباً فاروقی تھے۔ پٹنہ، لکھنؤ اور انگلستان میں تعلیم حاصل کی۔ گاندھی جی اور علی امام کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مسجد کان پور کے وکیل کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ مقدمہ انھوں نے للہ فی اللہ بڑی قابلیت سے لڑا تھا۔ ان کی قابلیت کا اعتراف پورے ملک نے کیا۔ مولانا آزاد اُن کی قابلیت اور ایثار کے بہت معترف تھے۔ الہلال میں ان کا ذکر کیا گیا تھا اور ان کی پورے صفحے کی تصویر بھی چھاپی گئی تھی۔ مولانا آزاد سے ہمیشہ ان کے بہت اچھے دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ مسجد کان پور کے مقدمے میں سر راس مسعود ان کے معاون تھے۔ بہار میں تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے سب سے بڑے رہنما یہی تھے۔ ''صداقت آشرم'' کے نام سے تعلیم وتربیت کی ایک آزاد قومی درس گاہ قایم کی اور اس کے لیے اپنا عالی شان مکان وقف کر دیا۔ نہایت اعلیٰ زندگی گزارتے تھے لیکن ترک موالات کے زمانے میں سادگی اختیار کی اور دیسی اشیا استعمال کرنی شروع کیں تو دیسی بنا ہوا معمولی کپڑا اور دیسی بنے ہوئے مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے۔ کانگریس کے رکن اور نیشنلسٹ خیال کے مالک تھے۔ بچپن میں حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت ہوگئے تھے۔ آخری عمر میں مذہبیت بہت بڑھ گئی تھی۔ تقویٰ وپاکیزگی کی مثال تھے۔ لیکن سیاسی خیالات میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہوئی۔ اردو انگریزی کے ادیب ومصنف اور خطیب تھے۔ لندن میں گاندھی جی کا ساتھ رہا تھا اور ایک ساتھ ہی ہندستان واپسی ہوئی تھی۔ ۲ر جنوری ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا۔

(۳) ﴿۱۳۷﴾

جناب الاعزم! السلام علیکم

بعض ضرورتوں کی وجہ سے آج ٹھہر گیا اور اس وقت حاضر ہوا کہ ایک امر اہم کے متعلق کچھ عرض کروں۔ لیکن جناب تشریف نہیں رکھتے۔ اب میں تو کل جاتا ہوں۔

لیکن علی حسن خان غالباً کل آپ سے ملیں گے۔ ندوہ کے متعلق آخر تک سعیِ اصلاح ہم سب کا نصب العین ہونا چاہیے۔ (۱) اور میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ تھوڑی سی زحمت گوارا فرما کر جناب اس باب میں سعی فرمائیں۔ بہ صورت نا امیدی دیگر وسایل اختیار کیے جائیں گے۔ لیکن مصالحت کی سعی کو تا انتہا ضرور پہنچانا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے متعلق کچھ امور ایسے ہوں جن کی بنا پر آپ اس میں دخل پسند نہ فرمائیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو حالت ہو رہی ہے وہ اب حدِ سکوت سے بالکل گزر چکی ہے اور ایک اہم کام کو اپنی آنکھوں کے سامنے تلف ہوتے دیکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا اور سعیِ اصلاح کے لیے کامیابی کا اذعان ضروری نہیں ہے۔ کاش آپ سے ملاقات ہوتی تو بہت سی ضروری تفصیلات تھیں۔ لیکن بہ ہر حال مجھے امید ہے کہ جناب کو سعی و کوشش سے انکار نہ ہوگا۔ اس کے طرق و تدابیر کے متعلق نواب علی حسن (۲) مل کر بعض امور پیش کریں گے۔

فقیر ابوالکلام

حواشی:

(۱) مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری نایب ناظم شروع ہی سے علامہ شبلی کی ندوہ سے وابستگی کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ شبلی کے نکتہ چیں رہے۔ ۱۹۱۰ء میں اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ شبلی استعفا دینے والے تھے پھر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں حالات نے دوبارہ بہت نازک صورت اختیار کرلی اور نوبت بہ این جا رسید کہ ۱۹۱۳ء میں بالآخر حضرت علامہ شبلی نے استعفا دے دیا۔ ندوہ کے اختلافات، طلبہ کی اسٹرایک، حالات کی سنگینی، اصلاح ندوہ کی کمیٹی کے قیام اور ملک کے مختلف شہروں میں جلسوں کے انعقاد، اصلاح کے لیے اکابرِ ملت کے مساعی وغیرہ کی تفصیلات سے اس زمانے کا الہلال بھرا پڑا ہے۔

اس خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ خط اسی زمانے کا ہے۔

(۲) نواب علی حسن خان ابن نواب صدیق حسن خاں آف بھوپال (ف ۱۹۳۶ء) کے نام مولانا آزاد کا ایک خط یادگار ہے۔ اس لیے ان کا ترجمہ آخر میں تراجم مکتوب الیہم میں آئے گا۔

(۴)

﴿۱۳۸﴾

ٹیلی گرام

تبریک کے اس ٹیلی گرام پر تاریخ نہیں ہے۔ یہ رانچی سے بھیجا گیا تھا۔ مولانا آزاد اپریل ۱۹۱۶ء سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک رانچی میں نظر بند رہے تھے۔ اس مدت میں چار بار یکم اگست ۱۹۱۶ء، ۲۱/جولائی ۱۹۱۷ء، ۱۰/جولائی ۱۹۱۸ء اور ۳۰/جون ۱۹۱۹ء کو عید (یکم شوال) آئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ ۱۹۱۹ء کا تار ہے۔ اس زمانے میں ترکی کے واقعات کی وجہ سے ملک کی ساکت فضا میں جو کچھ حرکت پیدا ہوئی تھی، اس کی ایک محرک شخصیت مولانا فرنگی محلی کی ذات گرامی تھی۔ اکثر مسلمان اکابر اس وقت قید یا نظر بند تھے۔ حضرت فرنگی محلی سے تحریکِ آزادی کو آگے بڑھانے میں بڑی توقعات تھیں۔ تار یہ ہے:

رانچی

جناب مولانا عبدالباری فرنگی محلی، لکھنؤ!

عید کی دلی مبارک باد اور استقلال کی کامیابی کے لیے دعا

ابوالکلام۔ رانچی

(۵)

﴿۱۳۹﴾

ترک موالات کا کوئی فتویٰ چھپوانا مقصود تھا۔ البلاغ پریس چوں کہ لیٹر پریس تھا اور کوئی اچھا لیتھو پریس کلکتے میں موجود نہ تھا۔ اس کا بہتر انتظام لکھنو ہی میں ہوسکتا تھا۔ یہی بات اس خط میں لکھی گئی۔ چوں کہ یہ خط مولانا آزاد ہی نے لکھوایا تھا۔ اس لیے مولانا کے سلسلۂ مکاتیب میں درج کیا گیا۔

۲۰/اپریل ۱۹۲۰ء

مکرمی! السلام علیکم

گرامی نامہ پہنچا۔ یہاں بڑی دقت یہ ہے کہ کوئی لیتھو پریس نہیں، نہ کاپی نویس!

اور یہ تمام چیزیں پتھر ہی کی چھپائی میں بہتر ہیں۔ مجبور ہو کر خلافت کمیٹی اپنے روزانہ اخبار اور پریس کا انتظام کر رہی ہے (۱)۔ پس اگر جناب لکھنؤ میں بالفعل اس فتوے کی چھپائی کا خلافت کمیٹی بنگال کی جانب سے انتظام فرما دیں تو بہت بہتر ہو۔ تمام مصارف یہاں سے دیے جائیں گے۔ چوں کہ فتویٰ استفتا کے پیرائے میں ہے، اس لیے عوام کے لیے صاف صاف مطالب و احکام (درج کیے جاویں) مولانا ابوالکلام نے فتویٰ کے آخر میں اس کا کچھ اہم حصّہ لکھ کر شامل کر دیا ہے۔ بہ ذریعہ تار مطلع فرمایئے۔ تا کہ مسودے کا خلاصہ بھیج دیا جائے۔ دس ہزار چھپے گا۔

خاکسار محمد علی

منیجر البلاغ پریس (کلکتہ)

حواشی:

(۱) خلافت کمیٹی کا اپنا پریس تو کلکتہ میں کبھی قایم نہیں ہو سکا۔ البتہ پیغام کے نام سے ایک ہفت روزہ ضرور نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا پرچہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو نکلا تھا اور دسمبر میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مدیر) اور مولانا ابوالکلام آزاد (نگراں) کی گرفتاری کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس کے کل ۱۳ نمبر نکلے تھے۔ آخری نمبر ۱۶ ر دسمبر ۱۹۲۱ء کا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''مولانا آزاد کی صحافت'' از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور ''پیغام۔ کلکتہ'' (مکمل عکسی اشاعت)۔ ۱۹۸۸ء میں کراچی سے اور آخر الذکر ۱۹۸۹ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے بھی مع مقدمہ و انڈکس مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری شایع ہو گیا ہے۔

(۲) ﴿۱۴۰﴾

۲۳ ر رمضان المبارک ۰۰۰ (۱)

صدیقی المحترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

تاخیر کے لیے خواستگار معافی ہوں۔ وفد حجاز کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور نہایت ضروری قطعِ نظر تبلیغ و تفہیمِ شریف (۲) کے ویسے بھی اس کی ضرورت مسلم ہے۔ مجھے بھی گزشتہ روز خیال ہوا تھا۔ شوکت علی صاحب بھی متفق تھے لیکن پھر دوسرے مہمات

پیش آ گئے اور بات نسیاً منسیا ہوگئی۔ اگر آپ حضرات کی رائے ہوئی کہ مجھے جانا چاہیے تو ضرور اس کی تعمیل کروں گا۔ البتہ تمام ضروریات اور حالات پر نظر ڈال لینی چاہیے۔

ہندستان کے اندرونی حالات اس وقت نہایت پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ سفر کی اصل نازک منزل اب پیش آئی ہے۔ ہر طرف مہلکات و آفات کا ہجوم ہے۔ بعض تازہ حالات جو پیش آئے ہیں میرے خیال میں خوش آیند نہیں اور مشورہ و فکر کی سخت ضرورت درپیش ہے۔ بہ ہر حال عید کے بعد کسی مقام پر یک جا ہو کر مسئلۂ وفد حجاز پر مزید غور کرلیا جائے۔ اگر یہی رائے قرار پائے کہ مجھے چلا نا جانا چاہیے اور یہاں موجودگی ضروری نہیں تو میرے لیے حضور موسم اور ادائے حج سے بڑھ کر اور کون سی بات موجب ابتہاج و مسرت ہوسکتی ہے۔ عید کے بعد بمبئی کا قصد ہے۔ اس بارے میں اگر کچھ مراتب طے ہوں تو مطلع فرمایئے۔

جناب کی جو تحریر ہمدم میں شایع ہوئی تھی میں اب تک اس سے بے خبر تھا۔ لیکن آج بعض احباب کے خطوط بریلی اور بجنور سے آئے تو اس کی جستجو ہوئی اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے وہ پرچہ دکھلایا۔ افسوس کہ زمانہ ایسے حق پرستانہ سلوک کا مستحق نہیں۔ جناب نے تو کمال درجہ حق پرستی و شرف نفس و طریقِ ایمان و اخلاص سے کام لیا، لیکن مخالفین اپنی پُر فساد طبع کی وجہ سے اس کو دوسری جانب لے گئے اور طرح طرح کی نئی بنیادیں اٹھادی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بحکم "**واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما**" ان لوگوں کی جانب توجہ ہی نہ کی جائے اور بالکل خاموشی اختیار کرلی جائے (۳)۔

مخلصکم

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حواشی:

(۱)...... جیسا کہ قارئین کرام ملاحظہ فرمارہے ہیں، خط پر ۲۳ر تاریخ درج ہے۔ یہ تاریخ ہجری کلنڈر کے مطابق ۲۸ر ستمبر

۱۹۱۰ء ہوتی ہے۔ جو ہر گز درست نہیں۔ اس وقت تو حجاز کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ حجاز کا مسئلہ تو ۱۹۱۶ء کے اواخر میں شریف مکہ حسین کی بغاوت سے پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۰ء اور پھر ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء تمام مسلم زعمائے ہند نظر بند، جیلوں میں بند رہے تھے اور ۱۹۲۶ء میں ۱۹رجنوری کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ خط ۱۹۲۴ء سے پہلے کا اور ۱۹رجنوری ۱۹۲۶ء کے بعد کا نہیں ہوسکتا۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۴ء میں امیر عبدالعزیز ابن سعود نے پہلے طائف پر اور پھر مدینہ و مکہ مکرمین کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ شریف حسین عرب کی عنان حکومت اپنے بیٹے امیر علی کے سپرد کر کے خود جزیرہ قبرص چلا گیا تھا۔ امیر علی جدہ میں آ بیٹھا تھا۔ اب ماسوا جدہ کے پورا عرب......ابن سعود کے زیر انتظام آ گیا۔ اس وقت امیر عبدالعزیز اور امیر علی سے گفتگو اور ارسالِ وفود کی راہ ہموار ہوئی تھی اور ۱۹۲۵ء کے ختم ہوتے ہوتے امیر علی کو جدہ سے بھی بے دخل کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت مجلس خلافت کے صدر تھے اور جیسا کہ معلوم ہے وفد خلافت کی تشکیل زیرِ غور تھی تو مولانا ابوالکلام کے حجاز جانے کا مسئلہ بھی زیرِ غور آیا تھا۔ مولانا کا یہ خط اسی زمانے کا اور تشکیل وفد سے پہلے کا ہے اس لیے یہ قرین قیاس ہی نہیں بالیقین یہ خط ۲۳ر رمضان ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۷ر اپریل ۱۹۲۵ء کا قرار پاتا ہے۔ خلافت کمیٹی کا وفد علامہ سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو جہانگیر جہاز کے ذریعے بمبئی کے ساحل سے روانہ ہوا تھا۔

(۲) شریف سے مراد "حسین" نامی گورنر مکہ ہے۔

(۳) مولانا عبدالماجد دریابادی کے خلاف بعض علماء کے فتویٰ کفر سے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے اختلافات پر بعض علمائے بریلی نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اس پر حضرت فرنگی محلی نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا تھا لیکن نکتہ چیں اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ مولانا آزاد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۷) ﴿۱۴۱﴾

اس خط میں تاریخ تحریر درج نہیں اور خط میں تاریخ کے کسی معین واقعے کا حوالہ بھی نہیں۔ اس لیے اس کی تاریخ تحریر کا تعین دشوار ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کی برائے نام خلافت کو ختم کر کے جمہوریہ ترکیہ کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اس واقعے نے تحریکِ خلافت کے کام کو مشکل اور مساعی کے لیے راہوں کو مسدود کر دیا تھا۔ لیکن عام مسلمانوں میں خصوصاً قصبوں اور شہروں میں ابھی تک خلافت اور تحریکِ خلافت کے لیے جوش موجود تھا۔ ضرورت تھی کہ ان کے جوش کو قومی اور ملی کاموں کی طرف موڑ دیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ رہ گیا تھا کہ اندرونِ ملک قومی کاموں پر توجہ دی جائے

اور ملتِ اسلامیہ کے تعلیمی، معاشرتی کاموں اور اصلاح و ترقی کے امور پر توجہ دی جائے۔ مولانا محمد علی ۱۹۲۴ء میں مرکزی خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ اب ان کی صدارت میں خلافت کمیٹی صوبہ یوپی کا جلسہ ہو رہا تھا مولانا آزاد نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ انفساخ خلافت کے بعد ہندستانی مسلمان افکار کی جس کشمکش سے گزر رہے ہیں، ان میں ان کی رہنمائی کے لیے بڑے غور و تدبر کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ مولانا محمد علی کے جوش جذبات اور انتشار افکار میں اب تک کوئی فرق نہیں پڑا تھا! میرے خیال میں یہ خط ۱۹۲۴ء کا ہے، جب فرقہ وارانہ مناقشات نے سر اٹھایا تھا اور صورت حال مخدوش ہوگئی تھی اور بڑے غور و فکر اور تحمل کی متقاضی تھی!

صدیقی الجلیل الاجل! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

مسٹر قدوائی کے خط کی نسبت عرضِ حال میں بہت تاخیر ہوئی۔ خواستگارِ معافی ہوں۔ سفر ناگ پور کے بعد سے گزشتہ جمعہ تک مستقل بیمار رہا۔ تمام اشغال متروک و مہجور تھے۔ مسٹر قدوائی کا ایک خط اس سے پہلے لالہ لاجپت رائے صاحب کے ذریعے مل چکا ہے۔ میں نے اسی وقت اس معاملے پر غور کیا تھا، لیکن ان کی تجویز بعد از وقت نظر آئی۔ وہ اب مسٹر محمد علی کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ بھی بے محل اور بے نتیجہ ہے۔ اب نہ تو کوئی وفد بھیجا جا سکتا ہے اور نہ کوئی قدم پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے۔ معاہدۂ ترکی کا نفاذ ناممکن تھا اور اب فیصلہ کن وقت قریب آ گیا ہے اب جو کچھ ہوگا واقعات کے اٹل فیصلے سے ہوگا اور ہم کو صرف انتظار ہی کرنا چاہیے۔

لکھنؤ خلافت کانفرنس کا انعقاد بہت ضروری تھا اور الحمد للہ کہ اس کا سر و سامان ہوا۔ مسٹر محمد علی کہتے ہیں کہ مقررہ تاریخوں میں انھیں فرصت نہ ہوگی۔ اگر ممکن ہو تو وقت بدل دیا جائے۔ اطراف کے دیہاتوں کا مسئلہ نہایت اہم ہو گیا ہے۔ اگر بر وقت اس کی اصلاح نہ ہوئی تو پوری تحریک اس سے مضرت اٹھائے گی۔ بالفعل اس کا صرف یہی ایک علاج ہے کہ ایسی جماعتوں کو نہایت سختی کے ساتھ امتناع و سکوت پر

مجبور کیا جائے۔ اس کے بغیر کسی طرح کی پولیٹیکل دعوت ان کے سامنے نہ پیش کی جائے ان کو سمجھایا جائے کہ ان کا اپنی حالت پر سردست قانع رہنا ہی سب سے بڑی ملکی خدمت ہے۔ اگر ان جماعتوں میں سردست کام شروع کیا گیا تو اس کے مشکلات ہماری تمام قوتوں کو الجھالیں گے۔

امید ہے کہ جناب مع الخیر ہوں گے۔

مخلصکم الوفیٰ

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

علامہ سیّد سلیمان ندوی

حضرت سید صاحب کے نام مولانا آزاد کے انتالیس خطوط دارالمصنّفین میں محفوظ تھے۔ ان میں سے اڑتیس خطوط شاہ معین الدین ندوی نے معارفِ میں چھاپ دیے تھے۔ البتہ ایک (خط مورخہ ۳/فروری ۱۹۱۴ء) جو مولانا کے بعض اظہارات پر مشتمل تھا، انھوں نے روک لیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صدر دارالمصنّفین نے اسے دیکھنے کے لیے منگوایا اور ''مکتوبات سلیمانی'' کے حاشیے میں شایع کر دیا۔ ایک خط محترم ابوعلی اعظمی کی دریافت تھا (خط نمبر ۲۸، مورخہ ۲۵/ مارچ ۱۹۲۶ء)۔ یہ خط در اصل ارکان خلافت کمیٹی کے نام مشترک خط یا گشتی مراسلہ تھا جو حضرت سید صاحب کے کاغذات میں دستیاب ہوا تھا اور ایک رسالے میں انھوں نے چھپوا دیا تھا۔ معارف میں مطبوعہ خطوط مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ''تبرکاتِ آزاد'' میں شامل کر لیے تھے۔ ابوعلی اعظمی کا دریافت شدہ خط اور ایک خط اور جو کسی ماخذ سے ملا تھا۔ خاکسار نے ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' کراچی، ۱۹۶۸ء میں شامل کر لیا تھا۔ اب یہ تمام خطوط جو تعداد میں اکتالیس ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ ''تبرکات آزاد'' سے ماخوذ خطوط پر تمام حواشی مولانا مہر مرحوم کے قلم سے ہیں۔ بعض خطوط پر خاکسار نے بھی چند ضروری وضاحتیں اور گذارشیں بہ طور حواشی درج کر دی ہیں۔

سیّد صاحب کے نام مولانا کے خطوط ان کے خاص اعتماد اور اخلاص کے آئینہ دار ہیں۔ جب کہ سیّد صاحب کے حالات اور ان کے افکار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف ادوار میں جذبات کے کئی نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ یہ خطوط گوناگوں علمی، تعلیمی، سیاسی، تاریخی افکار و معلومات سے مملو اور زبان و ادب کا بیش

قیمت سرمایہ ہیں۔ ''تبرکاتِ آزاد'' میں مولانا مہر مرحوم نے مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، علامہ سیّد سلیمان ندوی اور کچھ مختلف حضرات کے نام مولاناؒ کے جو خطوط مرتب کردیے تھے۔ ان خطوط کے بارے میں مولانا مہر نے جو رائے دی تھی وہ حضرت سیّد صاحب کے بارے میں بہ درجۂ اولیٰ درست ہے۔ مولانا مہر مرحوم لکھتے ہیں:

''کتاب کے آغاز میں مکاتیب کے چار مجموعے ہیں، جن کی کل تعداد ستانوے ہے۔ ان میں سے متعدد اتنے طویل اور مفصّل ہیں کہ انھیں مستقل رسالے سمجھنا چاہیے، جو نہایت نفیس، دقیق اور مفید مباحث کے حامل ہیں۔ ایسی چیزیں دوسری جگہ شاید ہی مل سکیں۔ ان میں دینی اور علمی مسایل بھی بیان ہوئے ہیں، تعلیمی اور اصلاحی مسایل کے متعلق بھی خاصے اہم نکتے ارشاد فرمائے گئے ہیں، جن کی کوئی مثال نہ محض ہمارے عہد میں بلکہ پیشتر کے اکثر عہدوں میں بھی نہیں ملتی۔ پھر جو کچھ قلم کے نکلا ہے، سراسر مجتہدانہ اور بصیرت و موعظمت کا ایک نادیدہ مرقع ہے۔ بعض مکاتیب اگرچہ مختصر ہیں۔ مگر ان میں سے بھی کوئی کسی اہم علمی یا اخلاقی نکتے سے خالی نہ ہوگا۔

سب سے آخر میں یہ کہ اسلوبِ نگارش کی ندرت کاری اور شخصیت کی خاص چھاپ کا حسن تو سب میں جلوہ گر ہے''۔ (تبرکات آزاد، ص۶)

خطوط کے چار مجموعے جن کا ذکر اس اقتباس کے شروع میں آیا ہے وہ تمام چوں کہ زیرِ نظر مجموعے میں شامل کرلیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کے محاسن کا حوالہ انھیں خطوط کے ساتھ دیا گیا ہے۔

حضرت سیّد صاحب اور مولانا آزاد کے تعلقات ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں مولانا کے خطوط کا ارمغانِ اور اخلاص و محبّت کے نادر پھولوں کا یہ گل دستہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ (ابوسلمان شاہ جہان پوری)

خطوط

(۱) ﴿۱۴۲﴾

صدیقی الجلیل الاعز! انعم اللہ علی بلقائک

والا نامہ پہنچا، افسوس ہے کہ مجھے جناب کا وہ خط نہیں ملا۔ دفتر میں پوچھا تو انکار کیا، سخت افسوس (ہوا)۔ کاش آپ اس کا خلاصہ مکرر لکھنے کی زحمت گوارا فرماتے!

تاریخِ عرب کے لیے حاضر ہوں لیکن آپ میری حالت سے واقف ہیں۔ ذمے داری سے ڈرتا ہوں۔ سیرۃ نبویؐ کے چھپنے کی بھی گفتگو ہو رہی ہے۔ میں سوا لکھنے پڑھنے کے کچھ نہیں کرسکتا۔ آپ ایسا کیوں نہ کریں کہ کتاب لیتھو میں چھپوائیں اور نقشے مجھے بھیج دیں۔ یہاں بن جائیں گے۔ ٹائپ کے لوگ خوگر بھی نہیں ہیں۔

''علوم القرآن'' اتنا ہی تھا؟ اگر مزید سلسلہ مرحمت ہو تو نہایت ممنون (۱)۔

ہاں! ''الحریت فی الاسلام'' کے چند نمبر جو آپ نے لکھے تھے، شاید آپ لے گئے۔ انھیں ضرور ہی بھیج دیجیے۔ اسی طرح چھپ جائیں گے اور سلسلہ مکمّل ہو جائے گا۔ (۲)

ندوہ کے متعلق حسب مقدور کر رہا ہوں۔ آپ نے بہت ہی خوب کیا کہ ''وکیل'' میں اپیل شایع کی۔ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ دیگر اخبارات میں مضامین نکلیں۔ کاش آپ ایک دو مضمون لکھ کر زمیندار میں بھیج دیں۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) ''علوم القرآن'' پر سید صاحب کا مقالہ ۱۱، ۱۸ و ۲۵ر فروری ۱۹۱۴ء (تین قسطیں) اور ۸ر جولائی ۱۹۱۴ء (آخری قسط) الہلال میں کل چار قسطوں میں نکلا تھا اور مقالہ نگار کے نام کی صراحت کے ساتھ، اس زمانے میں سیّد صاحب پونا کالج میں تھے۔ (ا۔س۔ش)

(۲) یہ الہلال کے ایک کالم ''احرار اسلام'' میں شایع ہونے والا ایک مشہور سلسلہ مضمون ''الحریت فی الاسلام'' ہے۔ اس

کی پہلی قسط ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء کو چھپی تھی۔ پھر یہی مضمون بعض ترامیم و واقعات کے اضافے کے بعد ۲۵ جون ۱۹۱۳ء کو شایع کیا گیا۔ یہ گویا آیندہ شروع کیے جانے والے مضامین کی تمہید ہے۔ آیندہ یہ مضمون قسط نمبر ۱ تا ۶ الہلال کے ان نمبروں میں ''نظام حکومت اسلام'' کی مزید سرخی کے اضافے کے ساتھ شایع ہوا: ۲/۹/۱۶ جولائی، ۲۴ اگست، یکم و ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء بعدہ ۱۵ و ۲۲ کے مشترکہ اور ۲۹ اپریل ۱۹۱۴ء کے مشترکہ شمارۂ الہلال اور ۱۷ و ۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء کے مشترکہ شمارۂ البلاغ میں نظام حکومتِ اسلامیہ کی صراحت کے بغیر ''الحریت فی الاسلام'' کے زیر عنوان شایع ہوا۔ پورا سلسلہ دس اشاعتوں میں آیا تھا۔ آخری دو اشاعتوں میں قسط نمبر کی صراحت نہیں تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو یہ لکھا کہ ''ہاں! الحریت فی الاسلام'' کے چند نمبر جو آپ نے لکھے تھے حضرت سید صاحب نے بھی لکھا ہے۔

''حریت اسلام کے سلسلے میں اسلام کے نظام سیاسی'' کا مضمون میں نے لکھا تھا۔

مولانا (آزاد) نے اس میں انقلاب فرانس وغیرہ کے مسایل کا اضافہ فرمایا ہے''۔

اس کی بعض اقساط میں انقلاب فرانس وغیرہ کے مسایل کا ذکر واقعی موجود ہے۔ اس سے یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ ''الحریت فی الاسلام۔ نظام حکومت اسلامیہ'' کا سلسلہ مضمون جو ۲ جولائی تا ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء چھ قسطوں میں شایع ہوا ہے وہ سب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے یادگار ہے البتہ ابتدائی دو مضمون جو درحقیقت ایک ہی مضمون ہے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء و ۲۵ جون ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اور اپریل ۱۹۱۴ء کے الہلال میں اور دسمبر ۱۹۱۵ء کے البلاغ میں شایع ہوئے تھے۔ ان کا نظام حکومتِ اسلامیہ کے سلسلے سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) ﴿۱۴۳﴾

الہلال، کلکتہ

۹ جنوری ۱۹۱۴ء

قضاها لغیری وابتلانی بحبها
فهلا بشیٔ غیر لیلی ابتلاینا

صدیقی الجلیل الاعز!

افسوس کہ میں جس خط کا منتظر تھا، وہ باوجود وعدہ آپ نے نہیں لکھا۔ اس طرح اس صلاح و مشورہ کی سعی نہ کی، جو ایماناً و اخلاقاً آپ پر فرض تھا۔

بہ ہر حال آج میں اپنے شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں

لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے تو غیر از صبر چارہ نہیں۔

معلوم نہیں کہ اس خط کا کیا نتیجہ نکلے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بھی بدگمانیوں کی نذر نہ ہو! تاہم خدائے علیم وبصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہوں کس عالم میں لکھ رہا ہوں۔ خدارا یقین کیجیے کہ سچّائی اور صداقت، محبّت، وداد اور ایک گہرے حزن وملال کے سوا اور کوئی چیز اس وقت میرے دماغ میں نہیں۔ **واللّٰہ علیٰ ما اقول شھید، وانہ لقسم لو تعلمون عظیم.**

آپ نے پونا میں پروفیسری قبول کر لی۔ حال آں کہ خدا نے آپ کو درس وتعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لیے بنایا ہے۔ خدا کے لیے میری سینیے اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجیے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبّت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ میں خود غرض ہوں اور میری غرض میری خواہش میں عنصر اصلی ہے۔ تاہم میری خود غرضی آپ کے لیے مضر نہیں، بلکہ بہتر ہے۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی وعربی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔

میرے تازہ حالات آپ کو معلوم نہیں۔ گھر میں علالت میری موجودگی میں بڑھ گئی اور اب اس درجہ حالت ردی ہے کہ اپنی قسمتِ حیات کے فیصلے کو بہت قریب پاتا ہوں۔ خود میری حالت ایسی ہے کہ خدا شاہد ہے مسلسل چار گھنٹے کام نہیں کر سکتا، ورنہ آنکھوں میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ الہلال ایک تحریک تھی جس نے استعداد پیدا کی، لیکن اس استعداد سے معاً کام لینا چاہیے اور میں نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ ''الہلال'' کی کچھ ہی حالت کیوں نہ ہو، کام شروع کر دیا جائے۔ چناں چہ شروع بھی کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں قیامت ہے کہ اگر آپ باوجود استطاعت وطاقت رکھنے کے میری اعانت سے انکار کر دیں۔

آپ یاد رکھیے کہ اگر ان مصائب وموانع کی وجہ سے میں مجبور وپابہ گل رہ گیا تو

قیامت کے دن یقیناً آپ اس کے ذمے دار ہوں گے کہ آپ نے ایک بہت بڑے وقت کے ردّ عمل کو اپنی علاحدگی سے ضایع کر دیا۔

آپ آ کر ''الہلال'' بالکل لے لیجیے۔ جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجیے۔ مجھے سوا اس کے اصول و پالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلّق نہیں۔ میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں، صرف اپنے مضامین تو دے دیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہوگا۔ عربی کے لیے مولوی عبدالواجد صاحب کا وعدہ گریز کے لیے ہے۔ ایک اور شخص آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے اور علناً وسراً بکلی آپ کی ایڈیٹری میں روز اول سے ہوگا۔

ایک دقت یہ ہے کہ کام کے لیے مالی شرایط کا اظہار ضروری ہے اور ایسا کیجیے تو آپ کہتے ہیں کہ طمع دلاتے ہو۔ استغفر اللہ! لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ بغیر کسی ایسی نیت کے محض شرایط معاملہ کے طور پر چند امور عرض کرتا ہوں،

سر دست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں۔ تیس کلکتہ کے مصارف اور انتظام کے لیے ہیں۔ اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ دو سو پورے ہو جائیں۔

پردف کریکشن کے لیے انور علی آ گئے ہیں اور اب اس کے لیے کوئی زحمت نہیں، صرف ایڈیٹری کا معاملہ ہے۔ یہ ایک بہتر کام ہے جو ''الہلال'' کی گرفتاریوں کی وجہ سے میں شروع نہیں کر سکتا۔ اب اگر اور دیر ہوگئی تو سخت نقصان ہوگا اور اسی لیے میں نے آخری فیصلہ اس کی نسبت کر لیا۔ میں آپ کو پابند نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ خود چاہیں تو جتنی مدت کے لیے کہیں معاہدۂ قانونی بھی ہو جا سکتا ہے۔

آپ معاً وہاں استعفا دے دیں اور کلکتہ تشریف لے آئیں اور اس خط کا جواب لاونعم میں بذریعہ تار دے دیں۔ مجھ کو پوری امید ہے کہ میری یہ سعی بے کار نہ جائے گی، کیوں کہ میں سچّے دل سے آپ کا طالب ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ سچّی طلب و

مودّت ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ اگر مولانا شبلی کا خیال ہو کہ ان کے ذریعے سے پونا تشریف لے گئے ہیں۔ وہ مصر تھے، اب ناراض ہوں گے تو میں خود ان سے اس معاملے کو کہہ کر صاف کرلوں۔ تاہم جو کچھ ہو، جلد ہو۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۳) ﴿۱۴۴﴾

(فروری ۱۹۱۴ء)

صدیقی الجلیل الاعز!

میں تو جواب سے مایوس سا ہو گیا تھا لیکن الحمد للہ کہ آپ نے جواب عنایت فرما کر احسان عظیم کیا۔ جس وقت میرے گھر میں مرض قدیم کا دورہ شروع ہو گیا تھا اور اب تک ہے، پھر باوجود اس حالت کے ایک ضرورت شدید سے دہلی چلا گیا۔ بانکی پور ٹھہرا اور ان اسباب سے جواب میں تاخیر ہو گئی۔ خواستگار معافی ہوں۔

برادرِ جلیل و اعز! سب سے پہلے تو میں آپ کا سچّا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچّائی اور راست بازی کے ساتھ حسبِ وعدہ اپنے خیالات ظاہر کر دیے۔ اور اس کے بعد احسان مند ہوں، اس احسان عظیم کے لیے کہ آپ کے اس اظہار خیال سے مجھے بہت فایدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کا خط میں نے تین بار پڑھا اور اس کے اثر سے دیر تک روتا رہا۔ نہ اس لیے کہ آپ نے جو کچھ لکھا وہ سب کچھ سچ تھا بلکہ اس لیے کہ اس میں سچ بھی تھا۔ جس کے لیے میرے دل نے گواہی دی اور جو حالت ہمیشہ رہتی ہے، اس کے لیے ایک تحریک قوی و مزید ہو گئی۔

آپ نے کل دس باتیں لکھی ہیں۔ ان میں کچھ تو خاص میری ذات کے متعلق ہیں۔ کچھ الہلال کی تحریر و مضامین کے متعلق اور کچھ امانت و خیانت کے متعلق!

ان میں پہلی قسم بالکل سچ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اس احتسابِ حق کا اجر اور مجھے

توفیق عمل دے، دوسری قسم کا تعلق جہاں تک ارادے اور نیت سے ہے، پورے یقین کے ساتھ انکار کرتا ہوں۔ علم اللہ کہ آغاز سے اس وقت تک کبھی بھی میرا خیال اس شیطنت اور ابلیسی ادّعا کا نہیں ہوا۔ واللہ علیٰ اقول شھید. مگر ممکن ہے کہ میری تحریروں سے ایسا خیال ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں ذمے دار ضرور ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

البتہ تیری قسم سے الحمدللہ کہ بہ کلی منکر ہوں۔ آپ کو اس بارے میں وہی غلط فہمی ہوئی، جس کا مجھے خیال ہوا تھا اور تذکرہ آپ نے عبدالرحمٰن گیلانوی سے غالبًا کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجیب طرح کی ہے، میں نے ایک مذہبی سوسایٹی میں پرورش پائی، لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا۔ پھر میں طرح طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور فسق و فجور کا شاید ہی کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔ یہ حالت عرصے تک رہی لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس عالم میں کبھی کبھی انفعال اور انابت کا قوی دورہ ہو جاتا لیکن پھر قایم نہ رہتا۔ تقریباً پانچ برس ہوئے ہیں جب کہ میں بمبئی میں تھا کہ یکایک بعض حالات غم آلود ایسے پیش آئے کہ میری حالت میں انقلاب عظیم ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے توبہ وانابت کی توفیق دی۔ میں نے عہد واثق کیا کہ جمیع منہیات سے محترز رہوں گا اور اس کے بعد اوامر پر عمل کروں گا۔

اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ عملاً اعمال فسق و فجور ترک ہو گئے اور پھر ان کی طرف قدم نہیں بڑھا، لیکن جس چیز کو دل اور جذبات کا تقویٰ کہتے ہیں وہ حاصل نہیں اور دل میں گناہ کی خواہش پیدا ہوتی رہی۔

اس کے بعد وقت گزرتا گیا اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جس قدر ایک آدمی اندر ہی اندر اپنے تئیں بدل دینے کی کوشش کرسکتا ہے، میں نے کی، لیکن سچّی خداپرستی کے حاصل کرنے سے عاجز رہا۔

یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم وصلوٰۃ کا پابند نہیں، لیکن میرے خیال میں ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے، کیوں کہ جو چاہتا ہوں وہ میسّر نہیں ہے۔

اب میری موجودہ حالت جو کچھ ہے وہ میں آپ پر ظاہر کرتا ہوں۔ میں عملاً تو منہیات اخلاق سے بچا ہوا ہوں، لیکن اس پر مطمئن نہیں اور دل اور خیال کا گناہ باقی ہے۔ طبیعت میں استغفار اور ولولۂ انابت نہایت قومی ہے اور جیسا ہے اسے بیان نہیں کر سکتا اور وہی ایک شے ہے جس پر جی رہا ہوں۔ لیکن استقامتِ حاصل نہیں ہوتی اور کوشش کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔

آپ کو معلوم نہیں کہ میں حزب اللہ کے متعلق مضامین لکھ کر کیوں چھوڑ دیتا ہوں؟ حال آں کہ اس کا ابتدائی کام بالکل آسان ہے اور ہر وقت کیا جا سکتا تھا۔ صرف اس لیے کہ ضرورت کے احساس اور طبیعت کے جذبات کی بے خودی میں سلسلہ شروع کرتا تھا اور پھر اپنے تئیں دیکھتا تھا تو اہل نہیں پاتا تھا۔ حتی کہ گذشتہ ذی الحجہ (۱۳۳۱ھ/نومبر ۱۹۱۳ء) میں جب اپنی زندگی کی تمام چیزیں بدل دینے کا قطعی اور آخری فیصلہ کرلیا اور موانع کو ہٹانا شروع کیا تو پھر آخری بار اس کا اعلان کیا اور اب کام شروع کر دیا ہے۔

رہی یہ بات کہ آپ لکھتے ہیں کہ تم کیوں لوگوں کو دینی پابندی کی تعلیم کرتے ہو؟'' (۱) تو یہ سوال صد ہا بار خود اپنے دل سے بھی کر چکا ہوں۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہوں گا:

اوّل تو دینی پابندی سے مقصود بمقابلۂ الحاد و ترک اعمال دینیہ، حتی الامکان اعتقاد وعمل بالاسلام ہے اور اس کا تعلّق جہاں تک ارکان و جوارح سے ہے، کرتا ہوں۔

دوسرے حق اظہار ہر مسلمان کا ویسا ہی فرض ہے، جیسے نماز پڑھنا اور گویا عبادت۔ پھر اگر لوگوں سے کہتا ہوں کہ اچھے کام کریں اور حق کو حق سمجھیں تو اپنا ایک فرض ادا کرتا ہوں۔ باقی فرایض میں اگر مجھ سے قصور ہو تو اس کی وجہ سے اس فرض کو کیوں چھوڑوں! لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ ایک شے البتہ مجھ میں ہے اور اس کا

ہونا میرے لیے اس درجے یقینی ہے کہ میرا تمام غم والم اس کو دیکھ کر دور ہو جاتا ہے۔ یعنی حق کی خدمت کرنے کا غیر متزلزل اور راسخ جذبہ اور اس کی راہ میں فنا ہو جانے کا ناقابل فنا عشق۔ اور آج تین سال سے یہ اس طرح روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے کہ ایک منٹ اور ایک لمحے کے لیے بھی کوئی چیز اس پر غالب نہیں آئی ہے اور اس نے مجھے نہیں چھوڑا ہے۔ دنیا کی محبوب سے محبوب شے پر بھی وہ غالب ہے اور پورے وثوق اور اعتقاد کے ساتھ دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی شخص کیسا ہی جاں نثارِ حق ہو۔ مگر ان شاء اللہ میں اس سے زیادہ جاں نثار اور مستقل ثابت ہوں گا۔

نیز یہ کہ مجھے خدا پر جو اعتقاد ہے، وہ بہت ہی پختہ اور راسخ ہے اور میں مذہب کی نسبت جو کچھ کہتا ہوں، دل کے اصلی اور سچے جوش اور یقین سے کہتا ہوں اور ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو رسماً کہتے ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں کہ مجھ پر کیسے کیسے وقت گزرتے ہیں اور کیسے کیسے خیالات طاری ہوتے ہیں۔ مجھ کو یہی چیزیں روز بروز یقین دلاتی رہتی ہیں کہ خدا مجھ کو پورا تزکیہ اور کامل عمل ضرور عطا فرمائے گا۔ نیز یہ کہ مجھے ضایع نہ ہونے دے گا اور مجھ سے کام لے گا(۲)۔

میں متقی اور کامل الاعمال آدمی نہیں ہوں۔ مگر کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ کیا اس بات کو کہنا چھوڑ دوں جس کو اچھا سمجھتا ہوں؟ اور پھر باوجود اس کے اپنے دلی جوش کو کیسے دباؤں، جو خدا جانتا ہے کہ بڑا ہی قوی اور مجھے مبہوت ولا یعقل کر دینے والا ہے۔

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا اور اپنے یقین کے خلاف یقین دلانا نہیں چاہتا، میرا حال ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بس کیا عرض کروں، کچھ کہہ بھی نہیں سکتا!

میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی بیان آج تک نہیں کیا ہے۔ مذہب وراست بازی وخدا پرستی وحق وحریت کے متعلق، جس کے لیے ایک اصلی جوش اور دل کا ولولہ میرے اندر موجود نہ ہو۔ ولعنة اللہ علی الکاذبین.

ہاں! حال میں ایک شخص کا خط آیا ہے، جو جناب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے۔ میں نے جی میں کہا کہ یہ تو سچ نہیں ہے! معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط؟ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے، میں نے سبھی طرح کی سیہ کاریاں کی ہیں، لیکن الحمدللہ کہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔

الہلال کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دعویٰ الہام و امامت وخود پرستی و تشخص وتحقیر اناس وادعا وتبختر وغیرہ وغیرہ۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کہاں کہاں کیا ہے۔ اگر دعوی الہام سے مقصود وہ مضامین ہیں، جن میں ایک مخصوص طرزِ تحریر سے خدا پرستی اور فدائے حق ہونے کی تعلیم ہے، تو تعجب ہے کہ آپ ایسا سمجھیں۔ اگر اس کے معنی ادعائے الہام کے ہیں تو اس طرز کے چند مضامین آپ نے بھی لکھے ہیں جو از سر تا آخر انجیل کی زبان میں ہیں۔

تحقیرِ اناس سے اگر مقصود بعض خاص اشخاص کی تذلیل ہے، تو اس سے آپ بھی متفق ہیں۔ یعنی ان لوگوں کو جو قوم کو ضرر پہنچاتے اور آزادی کو روکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کسی کی تحقیر کی ہے تو آپ ذرا کھول کر مجھے یاد دلایئے! واللہ باللہ میں سچے دل سے توبہ کروں گا اور اس سے بچوں گا۔

آپ نے لکھا کہ تم ''میں'' لکھتے ہو اور اس سے استدلال کیا ہے۔ لیکن میں نے بہت غور کیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو ''میں'' اور ''ہم'' دونوں لکھتا ہوں۔ بعض موقعوں پر ''ہم'' تحریر میں اچھا نہیں معلوم ہوتا، بر بنائے انشا وحسنِ بیان! دلیل اس کے لیے نہیں دی جا سکتی۔ تاہم اب اسے چھوڑ دوں گا اور کیا کروں۔

حزب اللہ کے متعلق جو آپ نے لکھا کہ اس سے مقصود صرف اپنی پرستش کرانی ہے تو اس کے جواب میں بھی اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ اگر ایسا چاہتا ہوں اور یہی میرا مقصود ہو تو اللہ اور اس کے ملائکہ کی مجھ پر لعنت! تعجب ہے کہ آپ کا ایسا خیال

ہے؟

بیشک حزب اللہ کو انجمن کی طرح نہیں بنایا اور لوگ اس میں شریک نہیں کیے گئے، لیکن فرمایئے اس طرح کے مقاصد کے لیے جو چاہتا ہوں کسے شریک کروں اور کون ہوتا ہے؟

خدا کے لیے تھوڑی سی زحمت اور گوارا کیجیے اور مجھے حوالہ دے کر اور مثالوں کے ساتھ بتلایئے کہ ادعائے نبوت و وحی کا خیال کیوں کر آپ کو پیدا ہوا؟ تاکہ میں سمجھوں اور اس سے بچوں، میں مکمّل نہیں سمجھ سکا! اگر کوئی اور شخص کہتا تو میں جواب نہ دیتا، لیکن آپ سے مجھے حسنِ ظن ہے، آپ کو راست باز اور مخلص سمجھتا ہوں کہ بلاوجہ آپ کوئی بات نہیں کہہ سکتے، ضرور اس کے اسباب ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے چندے کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی واقعہ ہے، جو میں سمجھتا تھا۔ آپ نے لکھا کہ میں نے اپنے سامنے لوٹ پڑتے دیکھی ہے۔ میں اس غلط فہمی پر بہت متاسف ہوا۔ نیز معاف کیجیے گا، سوءِ اتفاق پر ہنسا بھی! اصل واقعہ یہ ہے کہ "انجمن مسجد کانپور۔ کلکتہ" کے جو جلسے ہوئے تھے، اس کے ایک جلسے کا تمام روپیہ جو چارسوئی روپیہ تھا، میرے یہاں آ گیا اور مسٹر قطب الدین نے، جن کے پاس رہتا تھا۔ صندوق یہاں رکھ دیا۔ اسی اثناء میں ٹون ہال کا جلسہ ہوا اور روپے کی ضرورت ہوئی۔ اسی میں سے لے کر روپیہ خرچ کیا۔ پھر ایک دن منشی عبدالجبار نے تنخواہ کے لیے روپیہ مانگا۔ روپیہ پاس نہ تھا اور بینک کا وقت گزر گیا تھا نیز دوسرے دن اتوار تھا۔ انھوں نے کہا روپیہ موجود ہے، اس میں سے لے لیں، پرسوں آپ شامل کر دیجیے گا۔ یہ میں نے ضرور کیا کہ منظور کر لیا اور مسٹر قطب الدین کو بلوا کر یا کنجی لے کر روپیہ لے لیا۔ اس کی تعداد ایک سو اسی تھی جو تنخواہ میں کم ہوتے تھے۔ چندہ متفرق پیسوں، دونیوں، چونیوں میں تھا۔ اس کے ایک ہفتے کے بعد ایک سو روپے کی پھر اسی طرح ضرورت ہوئی اور تین بج چکے تھے، بینک سے آ نہیں سکتا تھا۔ تحویل خالی تھی، میں نے

کہا کہ جس قدر روپیہ باقی ہے سب نکال کر گن لو اور لے لو۔ پیشتر کا بھی روپیہ ہے، میں مسٹر رسول، خزانچی کو چیک مجموعی رقم کا بھیج دوں گا۔ چناں چہ اس کے بعد حساب کیا گیا۔ ٹون ہال کے بعض ضروری مصارف کمیٹی نے منظور کیے اور میں نے تین سو نوے روپے کا چیک مسٹر رسول کو بھیج دیا۔ یہی لوٹ ہے جو جناب نے دیکھی اور اس کے بعد مولوی عبدالرحمٰن نے اس کا تذکرہ کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ بھی لکھیں گے۔ کاش آپ یہیں اس کا ذکر فرماتے، لیکن آپ بالکل خاموش رہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بھی شانِ امانت کے خلاف ہے، مگر میں نے ضرور کیا اور ایک مرتبہ اور بھی کر چکا ہوں لیکن اس مرتبہ پانچویں روز واپس کر دیا اور اس مرتبہ دوسرے دن الگ کیا اور ہفتے کے بعد بھیج دیا۔ پہلی مرتبہ بھی ایک سو تراسی روپے مجبوراً چندے سے لے کر دیے تھے، جو پانچویں دن واپس کر دیے۔

اس بنا پر آپ نے لکھا ہے اور شک کیا ہے کہ چندوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ بے شک آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں ایسا حرام خور اور اخبث ہو گیا۔ لیکن پھر تسکین ہوئی کہ یہ بھی آپ اپنی قوت ایمانی اور راست بازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دیا ہے اور سوائے چھ سو یا قریب چھ سو کی آخری رقموں کے، جو مہاجرین کے لیے آئی تھیں اور نہیں گئیں، کیوں کہ ایک سو پونڈ کے انتظار میں رہا۔ اور الحمدللہ کہ ایک پائی بھی میں نے اپنے علم میں ضائع نہیں کی اور یہ روپیہ بھی اب پرسوں چلا جائے گا۔ کیوں کہ ڈاکٹر انصاری کو ایک شخص نے پچاس پونڈ دیے ہیں اور دونوں شامل چلے جائیں گے۔

آخر میں آپ نے ایک اور اہم بات لکھی ہے یعنی ''تم مصروف و مشغول آدمی ہو، اپنے مکان کے حالات سے بے خبر رہتے ہو''۔ اس کو بھی میں نہ سمجھ سکا۔ خدا کے لیے ابہام اور اشارہ سے کام نہ لیجیے۔ نصیحت جب ہی کامل ہو سکتی ہے، جب مخاطب سمجھ

سکے۔ بہ منت و ہزار عجز کہتا ہوں کہ اسے کھول کر لکھیے!

آپ کا وقت بہت ضایع ہوا۔ یہ تفصیل میں نے اس لیے نہیں کی کہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو اور مجبور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ آیئے۔ اللہ کی مرضی ہماری خواہشوں سے بہتر ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں اور آپ کو نیک اور مخلص آدمی یقین کرتا ہوں، اس لیے آپ کے خط نے مجھے بہت متاثر کیا اور جتنا حصّہ اس کا سمجھ سکا اور مطابق پایا اس سے مجھے بہت نفع ہوا۔ پس ان تفصیلات کا لکھ دینا بہتر تھا۔

آپ مجھے نہ بھولیے اور بھلانے کی کوشش نہ کیجیے اور میرے لیے دعا کیجیے۔ صرف یہی دعا جو میں مانگتا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے اور میری عاجزیوں اور منتوں کو قبول کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور میں گمراہ ہو کر گمراہ کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے دنیا سے اٹھالے (۳)۔

....

تاریخ عرب کی نسبت آپ نے لکھا ہے۔ انتظام ہو تو سکتا ہے، مگر آپ لیتھو میں کیوں نہ چھپوائیں؟ صرف نقشے یہاں چھپوالیں۔ اس میں صرف کم ہوگا اور عام پسند۔ باقی ہر طرح حاضر ہوں، انتظام ہوسکتا ہے۔ ضخامت، تقطیع، کاغذ وغیرہ لکھیے۔

مضامین اگر آپ بھیجیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا بات! آپ کے مضامین شایع کر دیتا ہوں۔

ایک اور معاملہ ہے۔ آپ اس پر غور کیجیے اور جواب عطا فرمایئے۔ اشاعت اسلام کی آواز ہمیشہ بلند ہوتی ہے اور رہ جاتی ہے، کام نہیں ہوتا۔ آپ کے لارڈ ہیڈ لے کے قصّے نے پھر ایک یاد پیدا کردی، لیکن اسے صرف قادیانیوں کے ہاتھ پر چھوڑ دینا اچھا نہیں (اس سے اصل مقصد تبلیغ) بھی پورا نہ ہوگا۔

آغا خاں سے اس بارے میں گفتگو ہوئی، وہ مدت سے کہتا ہے، لیکن اب پوری

طرح آمادہ ہوگیا ہے کہ ایک لاکھ مثل یونی ورسٹی کے دے اور لوگوں سے (بھی دلوائے گا لیکن وہ چاہتا ہے کہ) خود ہی سردست چندے کا خزانچی رہے (۳)۔ راجہ صاحب محمود آباد بھی مدت سے کہتے ہیں اور (کام) شروع ہو تو تیار ہیں (۴)۔

میں اس کے لیے وقت نہیں دے سکتا، کیوں کہ جن کاموں کو سامنے کر چکا ہوں، ان ہی میں رہ سکوں، تو بہت ہے۔ سرِ دست ضرورت اس کی ہے کہ جلد سے جلد مشورے کی کمیٹی ہو اور پھر مرکز کا قیام۔ روپیہ کافی ہو اور کام شروع، تو آدمی خود بخود نکلیں گے۔ سوال اس کا ہے کہ عہدے دار کون ہو؟ میرے خیال میں............ (۵)

ماخذ: مکتوبات سلیمانی (جلد اوّل): مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی، ۱۹۶۳ء، لکھنؤ

حواشی:

(۱) حضرت سید صاحب کی اس مذکورہ خط کے اس جواب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیسی بدگمانی دل میں بیٹھ گئی ہے۔ لیکن اللہ کا کیسا فضل ابوالکلام اور سید صاحب دونوں پر ہوا کہ ایک کی توبہ و انابت قبول فرمائی اور دوسرے کے قلب کو بدگمانی کی معصیت سے صاف کر کے سچے اور پاکیزہ خیالات سے معمور کر دیا۔ مولانا نے یہ خط سید صاحب کو فروری ۱۹۱۴ء میں لکھا تھا۔ ان کے خیالات اسی وقت سے بدلنا شروع ہو گئے تھے، جیسا کہ ان کے خطوط کے جوابات آزاد سے معلوم ہوتا۔ اور تعلقات معمول پر آ گئے تھے۔ ملاقاتیں رہتی تھیں۔ خصوصاً ندوے کے حفظ و بقا کی تحریک کے زمانے میں اور حضرت علامہ شبلی کی وفات کے بعد جب سید صاحب پونا کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے تھے اور دار المصنفین کے قیام کی سعی میں مصروف تھے۔ اور مولانا ترجمان القرآن اور تفسیر البیان کی تالیف میں مصروف تھے۔ دونوں کے تعلقات بہت بہتر ہو گئے تھے۔ خطوط سے کسی رنجش اور شکایت کا پتا نہیں چلتا! دونوں بزرگوں کی آخری ملاقات فروری یا مارچ ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ اپریل کے شروع میں مولانا کو کلکتہ سے خارج البلد کر دیا گیا اور وہ رانچی چلے گئے۔ رانچی پہنچے ہوئے مولانا کو ابھی ایک عشرہ بھی نہ گزرا تھا کہ دونوں میں مراسلت کا رشتہ قایم ہوگیا۔ خطوط سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ گویا حضرت سید صاحب کو کوئی شکایت تھی ہی نہیں! رانچی میں مدرسۂ اسلامیہ کے جلسے میں مولانا نے حضرت سید صاحب کو مدعو کیا سید صاحب نے زحمت سفر اٹھائی اور تقریباً ایک ہفتہ مولانا کے مہمان رہے۔ اعظم گڑھ آئے تو مولانا عبدالماجد دریا بادی کو رانچی کی پرلطف صحبتوں اور مشاہدات کی لذتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "والا نامہ ملا! میں پورا ایک عشرہ اپنے مرکز سے غالب رہا۔ رانچی پہنچا۔ تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ بڑی مسرت ظاہر کی، خوب خوب صحبتیں رہیں۔ وہ بھی تطبیقِ معقول ومنقول کے دیرینہ طریقے سے گھبرا گئے ہیں۔ آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے۔ فقہ وعقاید

میں ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے۔

رانچی کی شور وسنگستانی زمین ان کے سحرِ زبان اور جادوے بیان سے پانی ہو گئی ہے، وہ بھی میٹھا! مدرسے کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شاندار بنی ہے۔ لوگ بہت مانتے ہیں ایک دو تقریریں میری ہوئیں"۔

(مکتوباتِ سلیمانی، (جلد اول) لکھنو ۱۹۶۳ء ص ۱۱۶-۱۱۵)

یہ حضرت سید صاحب کے خیالات تھے جو انھوں نے ایک دوست کے نام پرائیوٹ خط میں لکھے تھے۔ ان کی اشاعت میں ان کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ لیکن اسی زمانے میں انھوں نے "سلسلہ نظر بندانِ اسلام" کے مضمونِ معارف میں مولانا ابوالکلام کے بارے میں اپنے انھیں خیالات کا علی الا علان بھی اظہار کیا تھا اس سے قطعی طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت سید صاحب کو قیامِ کلکتہ کے زمانے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اب ان کا شائبہ بھی نہ رہا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں:

"اگر ہمارے نظر بندوں میں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدی پر فائز ہوا تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجے پر ممتاز ہوئی۔ اور جو زنداں میں بھی جا کر ترانہ سنج "يَا صَاحِبِي السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" ہے۔ جس عزم، استقلال، استغناء اور قوتِ ایمانی کے ساتھ یہ زمانہ مولانا نے بسر کیا ہے۔ وہ ائمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انھوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کیا اور اعانتِ نظر بنداں کا ماہوار عطیّہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عبادی الشکور کے رمز میں پنہاں ہیں۔

یہ معلوم ہوگا کہ رات کو ان کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بنا پر وہ نمازِ عشا کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، لیکن انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ کے اصول سے انحراف کریں انھوں نے حکومت سے اجازت چاہی اور جب اس پر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تو انھوں نے برملا اعلان کر دیا کہ ادائے فریضہ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آ سکتے۔ لَا طَاعَةَ لِمَخلوقٍ فِي مَعصِيَةِ الخَالِقِ آہ! ہم میں سے کتنے ہیں جو آزادی کے بستر سے بھی اٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے! اور ایک وہ عبادِ صالحین ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجدِ الٰہی کی یاد فراموش نہیں کرتے۔

رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسلمان نہایت ذلت و نکبت کی حالت میں تھے۔ جہالت اور باہمی خانہ جنگی نے ان کو گرد و پیش کے حالات سے ناواقف رکھا تھا۔ عیسائی مشنریوں کا جال تار کی طرح پھیلایا تھا۔ عالمِ دین کا اس خطے میں وجود نہ تھا۔ مذہبی احساسات کی روح ان میں مردہ تھی۔ لیکن مولانا کے پرتو صحبت نے چند ہی سال کے بعد وہاں کی زمین و آسمان کو بدل دیا۔ اب ہم وہاں اسلامی انجمن کا نام سنتے ہیں، ایک مدرسۂ اسلامیہ کی بنیاد و تعمیر دیکھتے ہیں، علمائے مشاہیر کے مواعظِ حسنہ کا جلوہ وہاں نظر آتا ہے، مذہب اور ملّت کی رُوح کو ان کے جسم و تن میں جنبش کرتے ہوئے پاتے ہیں، اور وہاں کے فقرا اور خاک نشینوں میں اب یہ حوصلہ دیکھتے ہیں کہ علم کا پہلا کعبہ اس دیار میں وہ خود اپنے زورِ بازو سے قائم کر کے رہیں گے۔ جہاں ایک عالمِ دین کا وجود نہ تھا، وہاں اب کوششیں ہو رہی ہیں کہ سیکڑوں علمائے دین اسی کی خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں۔ جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں، وہاں ایک خورشید سے دیر و حرم میں سب سب اجالا

ہو گیا۔ جمعہ اور عیدین کے مجامع اس سرزمین میں جہاں اسلام کی کوئی صحبت بہم نہ تھی، وہاں اب موکب شاہی کا دھوکا دیتے ہیں!

زمانۂ قیام رانچی سے ایک سال تک جامع مسجد میں انھوں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ زیادہ تر اوقات تالیف و تصنیف میں بسر ہوئے۔ ترجمان القرآن یعنی قرآن مجید کا موثر تفسیری ترجمہ اسی زمانے میں ختم ہوا۔ البیان تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب وسنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد رسایل الصلوۃ، الزکوۃ، الحج، الصیام ترتیب دیے۔ سوانح مجددین کا سلسلہ شروع کیا اور اس میں علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کے سوانح و مجتہدات قلم بند کیے ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے عنوانات علمی پر تحریر کیا۔

ان سطروں کے لکھتے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی اور امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں''۔

(۲) حضرت سید صاحب کے اعتراض کے جواب میں مولانا نے خدا پر اپنے جس اعتقاد اور رسوخ و استقامت کا اظہار ۱۹۱۴ء میں کیا تھا، الحمدللہ کہ اسی پر ان کا خاتمہ ہوا اور جس کامل اور پورے تزکیہ نفس و قلب کی آرزو کی تھی وہ یقیناً پوری ہوئی اور جو امید قایم کی تھی کہ وہ انھیں ضایع نہیں ہونے دے گا اور ان سے کام لے گا۔ ان کی بعد کی ۴۵ سالہ زندگی میں قوم و ملک اور اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمات انھوں نے انجام دیں، وہ اس بات کی گواہ ہیں کہ نہ ان کی زندگی ضایع ہوئی اور نہ ان کی صلاحیتیں! انھوں نے کارنامے انجام دیے ہیں۔

(۳) یہاں تک کہ حضرت سید صاحب کی شکایات یا الزامات کا جواب تھا۔ اس سے آگے چند عام مسایل کا تذکرہ ہے۔ مثلاً ''تاریخ عرب'' کی کلکتہ میں طباعت کا مسئلہ یا اشاعت اسلام کے طریقہ کار اور اس میں قادیانیوں اور آغاخانیوں کی شرکت کا مسئلہ۔

(۴) اس پیراگراف میں جو عبارت قوسین میں آئی ہے وہ قیاسی ہے۔ اگر خط میں یہ الفاظ نہ ہوں تب بھی مفہوم اس کے سوا نہیں ہو سکتا۔ اصل ماخذ میں جو متن ہے اس میں یہ جگہیں خالی ہیں اور مرتب ''مکتوبات سلیمانی'' نے لکھا ہے کہ ''لفظ چل نہ سکا''۔

(۵) خط کا اس کے بعد کا حصہ جو غالباً ایک صفحے یا زیادہ سے زیادہ ایک ورق پر مشتمل تھا دارالمصنفین کے ذخیرۂ علمی سے ضائع ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے کی کمیٹی کی تشکیل کے بارے میں کچھ باتیں لکھی ہوں گی اور اگر وہی بات ہو جس کا مولانا محمد علی کے نام خط میں مولانا نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اس مسئلے میں مولانا آزاد کے خیال سے آگاہی ہو سکتی ہے۔

(۴) ﴿۱۴۵﴾

صدیقی الجلیل الاعز!

انسان کا اپنا فرض نہ ادا کرنا ہمیشہ اس کے لیے موجبِ تاسف وتالم ہوتا ہے۔ اگر میں نے آپ کے خطوط کا جواب دے دیا ہوتا تو آپ کو میری خاموشی سے سوئے ظن نہ پیدا ہوتا۔ استغفر اللہ! لیکن تعجب ہے کہ خطوں کے بارے میں میری اس حالت کے علم کے باوجود آپ کو ایسا خیال ہوا، حال آں کہ ساری دنیا میری اس عادت سے واقف ہے اور یہ نئی بات نہیں ہے۔

میں رمضان اور اس کے بعد کے بعض حالات کی وجہ سے بہت ہی پریشان رہا اور اب تک ہوں۔ اسی وجہ سے خط نہ لکھ سکا اور آج کل پر وقت گزر گیا۔

میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ کتاب جس طرح اور جس اصول پر آپ چاہیں شائع کرائیں، اصل مقصد اشاعت ہے اور اگر میں اس کا ذریعہ ہوں تو یہ خوشی کی بات ہے۔ کتاب کا دیباچہ تیار کر دیجیے، چھپ جائے گا۔ لیکن چند باتوں پر نظر رہے۔

۱۔ آپ کو میرا حال معلوم ہے، نیز پریس سے بھی واقفیت ہوگی۔

۲۔ سرِ دست نیا ٹائپ کوئی نہیں رہا، نسبتاً نئے میں ہفتہ وار اور پرانے میں روزانہ نکلتا ہے۔ اب خود ڈھلوانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس لیے ٹائپ کے خریدنے میں بھی وقت لگے گا، کیوں کہ آرڈر سے ایک ماہ بعد مال دینے کا معاہدہ ہے اور ہمیشہ معاہدے سے بھی زیادہ تاخیر ہو جاتی ہے۔

۳۔ گورنمنٹ بنگال کی ایک کتاب چھپ رہی تھی، نصف باقی ہے۔ جنگ کی وجہ سے روزانہ اخبار نکالنا پڑا ان اسباب سے پریس بہت مصروف ہے۔

پس اگر میں بہت کوشش کروں گا جب بھی کتاب اس وقت سے ایک ماہ بعد شروع کی جا سکے گی۔ البتہ شروع ہو جانے کے بعد کسی نہ کسی طرح ہفتے وار اقلاً دو جز ضرور چھپ جائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ ممکن ہے۔

آپ نے ایک خط میں "الہلال" کے اغلاط وغیرہ لکھے تھے اور بالکل ٹھیک تھے۔ کیا کہوں آیات کے متعلق بعض اوقات عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ "الا ان حزب اللّٰہ ھم الغالبون" کے متعلق دماغ کو غیر محسوس دھوکا ہوا، فان حزب اللّٰہ ھم الغالبون اور الا ان حزب اللّٰہ ھم المفلحون کے تشابہ سے دماغ نے ھم الغالبون پیدا کر لیا اور مادۂ تاریخی ہونے کی وجہ سے تہہت غنیمت معلوم ہوا۔

حدیث "بدأ الاسلام غریبا" کے الفاظ میں بھی واقعی غلطی ہو گئی، اگرچہ غریب کے معنی میں نہیں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ محدثین نے غربت سے فلاکت وادبار و مغلوبیت و مظلومیت و مسکنت ضرور مراد لی ہے۔ حافظ ابنِ رجب صاحبِ طبقات نے شرح میں ایک رسالہ لکھا ہے اور چھپ گیا ہے (۱) مختلف اقوال بھی جمع کیے ہیں اور لکھا ہے کہ تنزلِ مسلمین و مظلومیتِ حق وقلّت صادقین وشیوعِ فسادات وغیرہ مراد ہیں۔ مسافر کی حالت فقر و مسکنت و بے یاری و بے رفاقت کی ہوتی ہے، اس لیے اردو لفظ غریب کا مفہوم ہر حال میں پیدا ہو جاتا ہے۔

مولوی عبدالسلام صاحب نے بالآخر اپنے سوانح و حوادث فراہی دیے، جو بڑے ہی دل چسپ ہیں۔ کاش آپ سنتے!

مولوی آزاد سبحانی کے متعلق اور لوگوں کا بھی یہی بیان ہے۔ یہاں بھی وہ آئے تھے، میں نہ تھا۔ مولوی رکن الدین میں اور ان میں سخت مجادلہ ہو گیا، انھوں نے کہا کہ میری کامیابی میری قوتِ بیانیہ کا نتیجہ ہے۔ دانا صاحب نے نہ مانا۔ (۲)

بیجاپور والے مضمون کا اس قدر تشکر کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ باتصویر رسالہ کی یہ اصلی شے تھی، جو آپ کی بدولت "الہلال" میں شروع ہو گئی۔ جنگ کی وجہ سے وہ اب تک شروع نہ ہو سکا، ورنہ بلاک بن گئے ہیں، آیندہ ان کے بعد والے نمبر میں انشاءاللہ شایع ہوگا، مگر اس کے بعد کا کوئی حصّہ دیجیے تاکہ تسلسل قایم رہے۔ (۳)

علم الحدیث کے مضامین تو ''الہلال'' میں نکل چکے ہیں اور آپ کن کی نسبت فرماتے ہیں؟ ''علوم القرآن'' (۴) میں اور کچھ ملا؟

ابوالکلام (۵)

حواشی:

(۱) غالباً ابن رجب کے رسالے ''کشف الکربہ'' کا ذکر ہے، جس میں حدیث غربت کی شرح کی گئی ہے۔ (مہر) مذکورہ رسالے کا پورا نام اس طرح ہے۔ ''کشف الکربہ فی وصف حال الغربہ ہے''۔ (ا۔س۔ش)

(۲) رکن الدین دانا ندوی سہسرامی جو سید صاحب کے بعد کچھ دنوں ادارۂ الہلال سے وابستہ رہے تھے۔ یہ خط جنوری ۱۹۱۴ء کی کسی تاریخ کا ہے۔ اس لیے کہ مولوی رکن الدین سید صاحب کے جانے کے بعد (وسط دسمبر ۱۹۱۳ء) کے بعد آئے تھے اور جنوری ۱۹۱۴ء کے ختم ہونے سے پہلے چلے گئے تھے۔ دیکھیے: یادگار سلیمان از عبدالقوی دسنوی، جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۳۸، ۴۱ (ا۔س۔ش)

(۳) میں سمجھتا ہوں کہ سیّد سلیمان مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۱۴ء ہی میں بھیج دیا تھا اور بلاک بھی بن گئے لیکن یہ شایع نہ ہو سکا اور الہلال بند ہو گیا۔ نومبر ۱۹۱۵ء میں ''البلاغ'' نکلا تو اس کے پہلے نمبر میں یہ مع تصاویر چھپا۔ (مہر) (یہ مضمون ۱۲ر نومبر اور ۲۶ر نومبر کی دو قسطوں میں سید صاحب کے نام کی صراحت کے ساتھ شایع ہوا تھا، (ا۔س۔ش)

(۴) سیّد صاحب کا یہ مضمون ۱۱ر، ۱۸ر، ۲۵ر فروری اور ۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کے الہلال کی چار قسطوں میں شایع ہوا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۵) اس خط پر تاریخ درج نہیں لیکن دو باتیں قطعی ہیں!

۱۔ اس وقت الہلال کا ضمیمہ روزانہ الہلال جاری ہو گیا تھا۔ یہ اگست ۱۹۱۴ کے پہلے ہفتے کا واقعہ ہے دیکھیے: الہلال ۱۲ر اگست اور شذرہ روزانہ ضمیمہ

۲۔ یہ رمضان (۱۳۳۲ھ) کے عہد رواں کا واقعہ ہے۔ رمضان ۲۲ر اگست کو ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے یقین کر لینا چاہیے کہ اس کے بعد کسی تاریخ کو لکھا گیا تھا۔

﴿۱۴۶﴾ (۵)

الہلال آفس

اخ الجلیل الاعز!

مدت ہوئی آپ کا والا نامہ آیا تھا۔ اس کے جواب میں ایک بہت ہی مفصل خط

رجسٹرڈ بھیجا تھا اور اس کے آخر میں اشاعت اسلام کے متعلق آپ سے ایک ضروری استفسار بھی تھا۔

تعجب ہے کہ جواب سے اب تک محروم ہوں:

برمن منگر برکرم خویش نگر

وہ خط بہت مفصل تھا اور متعدد امور پر مشتمل (۱)۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ سنا ہے کہ آپ نے عبری شروع کر دی ہے۔ دارالعلوم کے تازہ حالات سنے ہوں گے۔

مخلصکم

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) خط نمبر ۳ کی طرف اشارہ ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۶) ﴿۱۴۷﴾

الہلال آفس

میکلوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۲۷ر جنوری ۱۹۱۵ء

عجبت لمن یقول ذکرت الفی
وھل انسی فاذکر من ھویت

صدیقی العزیز الاجل!

کل صبح سفر سے واپس آیا اور خط پڑھا۔ یہ آپ نے پہلے شکایت اس لیے تو نہیں کر دی تاکہ میرے لیے شکایت کا موقع نہ رہے:

بینی وبینك فی المحبة نسبة

مستـــــــــــورة من اهل هذا العالم
نحن اللّذان تفارقت ارواحنا
من قبل خلق اللّٰه طينة آدم

خط سے غالباً مقصود وہ خط ہوگا جو آپ نے بھوپال سے لکھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت مفصّل خط جس میں متعدد ضروری امور تھے، اعظم گڑھ کے پتے سے لکھا اور آج تک اس کے جواب کے لیے ترستا ہوں۔ اب آپ نے خط لکھا تو جواب کی جگہ الٹی شکایتیں ہیں۔

بہ ہر حال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق وہم عنان یقین کیجیے اور ہر دم خدمت گذاری کے لیے تیار۔ افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ کاش اللہ یک جائی کا سامان کرتا، قوتیں مجتمع ہوتیں، تفرق اور عدم توحد نے ان نتائج سے بھی محروم کر دیا جو باایں ہمہ بے سروسامانی حاصل ہو سکتے تھے۔

دارالمصنّفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوے کا حقیقی بدل، بل نعم البدل! اصلی کام وہی ہے، باقی سب کے سب فرعی ہیں۔ آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ آدمی پیدا ہوں۔

اس لیے میں نے لکھا تھا کہ:

ایک اچھے موقع کو ضایع کیا گیا اور بیگم صاحب کے سامنے وسعت و اہمّیت کے ساتھ اس چیز کو پیش نہیں کیا گیا۔ میں نے باوجود سخت موانع کے ارادہ کیا تھا کہ صرف اسی کی خاطر خود ملوں اور کہوں (۱)۔

اس کا مرکز قطعاً لکھنؤ ہونا چاہیے یا اعظم گڑھ ہو، مگر ایک وسیع شاخ لکھنو میں ہو۔ میں نے طریق عمل اور اصول کار کو اسی زمانے میں بصورتِ اسکیم قلم بند کر لیا تھا اور وہ موجود ہے۔

میں اواخر جنوری میں پھر نکلوں گا اور کوشش کروں گا کہ فاتحہ کے لیے اعظم گڑھ

حاضر ہوں (۲) بہ صورت دیگر آپ کو اطلاع دوں گا کہ نسبتاً کسی قریب تر مقام پر ملاقات ہو سکے۔ مولانا عبدالسلام (۳) امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ سلامِ شوق!

ابوالکلام

خط لکھ کر جب پتا دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ اعظم گڑھ میں نہیں، بلکہ پونا میں ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ملاقات کیوں کر ہو۔ بہ ہرحال آپ جلد یکسوئی اختیار کرلیں، یہ بہتر ہے۔ ایک ملاقات آپ سے بہت ضروری ہے، کوئی طریقہ بتلائیں؟

حواشی:

(۱) مطلب یہ کہ نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے سامنے دارالمصنفین کی وسعت و اہمیت واضح کرنی ضروری تھی اور معاملہ صرف سیرۃ النبی کی ترتیب کے سلسلے میں امداد تک محدود نہ رہنا چاہیے تھا۔ (مہر)

(۲) یعنی مولانا شبلی مرحوم کے فاتحہ کے لیے جن کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا۔ (مہر)

(۳) مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔ (مہر)

(۷) ﴿۱۴۸﴾

۴۵۔ رپن لین۔ کلکتہ

صدیقی الاعز!

السلام علیکم۔ شرمندہ ہوں کہ اتنے عرصے کے بعد آپ کے کارڈ کا جواب دیتا ہوں۔ میں یہاں نہ تھا، ذیابیطس کی شکایت نے بالکل مجبور کر دیا ہے۔

مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مکاتیب مشکل ہے کہ اب مل سکیں! افسوس ہے کہ جمع کرنے کا التزام نہیں رہا۔ کچھ ملے تو پرائیویٹ معاملات یا ندوہ کے متعلق ہیں اور ان کی اشاعت غیر ضروری۔

دارالمصنّفین کے قواعد اعظم گڑھ سے آئے ہیں۔ سوائے چند دفعات کے سب بہتر و انسب ہیں۔ اب آپ جلد سے جلد رجسٹرڈ کرالیں اور عملی کام کی صورت نکالیں۔ ایک دو آدمی بھی ہوں تو کام شروع کر دینا چاہیے۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ اس کے متعلق

بالمشافہ صحبتیں ضروری تھیں۔

ادھر فرصت میں، آپ سن کر خوش ہوں گے کہ ترجمان القرآن اور تفسیر کا بہت سارا حصّہ ہو گیا(۱)، نیز شاہ ولی اللہ مرحوم کے سوانح کے کاغذات نکال کر مرتب کر لیے(۲)۔ ترجمہ چھپ رہا ہے اور ترجمہ کا ایک مختصر مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ جو گویا مقدمۂ تفسیر ہوگا اور اصولاً بہت سی نئی باتوں پر مشتمل(۳)۔

ندوے کی نائب نظامت پر مولوی شروانی کے ذریعے میں نے کئی آدمیوں کو استوار کیا تھا۔ پھر معلوم نہیں ہوا کہ ندوے کا کیا حال ہے اور آپ کا کیا منشا ہے؟ مولوی شروانی نے لکھا تھا کہ وہ دارالمصنّفین میں ہیں۔ میں نے لکھا کہ دارالمصنّفین اس کے لیے مانع نہیں(۴)۔

مجھے خوف ہے کہ آپ پونا میں نہیں بلکہ وطن میں ہوں گے۔ لفافہ ابھی لکھا نہیں، جی چاہتا ہے کہ دیسنہ کے پتے سے بھیجوں(۵)۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حواشی:

(۱) اس خط پر تاریخ درج نہیں، لیکن بہ ظاہر یہ ۱۹۱۵ء ہی کا ہے۔ فرصت سے مراد یہ ہے کہ ''الہلال'' بند تھا اور ''البلاغ'' ابھی نکالا نہ تھا (مہر)۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے سوانح سے متعلق جو کاغذات موجود تھے، وہ سب نکال کر مرتب کر لیے (مہر)۔

(۳) یہ ۱۹۱۵ء کا خط ہے۔ اس زمانے میں مولانا نے ترجمان القرآن اور تفسیر کا جو کام کیا تھا اس کا ایک حصہ چھپ بھی گیا تھا۔ البلاغ میں اس کی تکمیل و اشاعت کا اشتہار بھی چھپتا رہا تھا۔ لیکن ''مقدمۂ فاتحۃ الکتاب'' کی اشاعت تک اسے روک لیا تھا۔ اس پر حادثہ یہ گزرا کہ مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا کو کلکتہ سے اخراج کا حکم ملا اور مولانا رانچی چلے گئے۔ پولیس پریس کی تلاشی میں ترجمان اور مقدمے کے مطبوعہ فارموں کو کوئی خطرناک تصنیف سمجھ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ آزادی کے بعد جستجو کی گئی تو مقدمے کے بارھویں باب کے تقریباً پچاس صفحے چھپے ہوئے ہاتھ لگے، جو ترجمان القرآن (جلد اوّل)، ساہتیہ اکادمی نئی دلی ایڈیشن کے ساتھ شامل کر دیے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے متعلقہ ایڈیشن۔ ''فرصت میں ترجمان القرآن اور تفسیر کا جو بہت سارا کام ہوا تھا''۔ اس سے اشارہ اسی طرف ہے (ا۔س۔ش)۔

(۴) اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ مولانا سیّد سلیمان کو نائب ناظم مقرر کرانے کا خیال تھا۔

(۵) دیسنہ (بہار) مولانا سیّد سلیمان کا وطنِ مالوف۔

(۸) ﴿۱۴۹﴾

مکرمی! السلام علیکم

دار المصنّفین کا پراسپکٹس پہنچا۔ آپ مجھے اس سلسلے میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے۔ اگر اس میں کوئی جگہ قلمی کی ہو، جب بھی میں منظور کر لوں گا بشرطے کہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص!

مولوی عبدالسلام کہاں ہیں؟ ان سے کہیے کہ خط لکھیں۔

ابوالکلام

(۹) ﴿۱۵۰﴾

صدیقی الجلیل الاغز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ گرمی پہنچا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ پونا سے روانہ ہو گئے ہوں۔

''امثال القرآن'' کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بالکل درست ہے۔ یعنی حالات وقتِ نزول وطریقِ تمثیل و بیانِ عرب جاہلیہ۔ یہ دو چیزیں نہ صرف امثال القرآن بلکہ تمام قرآن کے فہم و درس کے لیے بمنزلہٗ اساس واصل کے ہیں اور امثال واقسام وانواعِ بیان وتخاطب وتذکیر کے لیے تو اولین نظر انھیں پر ہونی چاہیے(۱)۔

عرصے کے بعد مولوی عبدالباری کا تذکرہ سننے میں آیا۔ وہ کشمیر میں تھے اور انگریزی کی فکر میں معلوم نہیں اس کی تکمیل کا انھیں موقع کہاں تک ملا۔

دار المصنّفین کے دایرے کو جس قدر تنگ رکھیے گا، اسی قدر وہ حقیقی اور عملی ہوگا۔ دو چار آدمی اچھے کام کر سکتے ہیں، لیکن مجمعِ جہلا بے کار ہے۔ بڑی چیز یہ ہے کہ آیندہ ایسے نمونے قایم کیے جائیں، جن میں حقیقت ہو اور رسم پرستی اور رسم سے احتراز کیا

جائے۔ آپ دارالمصنّفین کو اس کا پہلا نمونہ بنائیے۔ مولانا عبدالسلام کو سلامِ شوق۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حاشیہ:

(۱) مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو مثالیں بیان ہوئی ہیں۔ ان پر غور کے سلسلے میں اول حالاتِ وقتِ نزول، دوم طریق تمثیل و بیانِ عرب جاہلیت پیش نظر رکھنے چاہییں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں محض امثال ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے قرآن کے فہم و درس کے لیے بہ منزلۂ اساس و اصل کے ہیں۔ (مہر)

(۱۰) ﴿۱۵۱﴾

۴۵۔ رپن لین۔ کلکتہ

۲۵ / اگست (۱۹۱۵ء)

اخ الاعز الاجل! انعم اللہ بلقائکم و السلام علیکم

والا نامہ پہنچا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ پونا سے چلے نہ گئے ہوں۔ یہ آپ نے کیوں کر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں؟ غالباً تواتر و تسلسلِ مراسلات علائقِ قلبیہ کے لیے شرط نہیں ہے۔ آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحادِ مشرب و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔

ارید لانسی ذکرھا فکانما

تمثل لی لیلیٰ بکلّ سبیل

ترجمۃ القرآن کے متعلق اور امور تو پیش نظر تھے، لیکن ہر پیراگراف کے لیے عنوانات کا قایم کرنا ایک نہایت ہی قیمتی اور مفید ترین چیز ہے، جو آپ نے مجھے بتلا دیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ تھا۔ البتہ رکوع وغیرہ پیشتر سے نظر انداز تھے۔ اصلی رکوع وہی ہے جو کسی مضمون مسلسل کا ایک مستقل ختم بہ علامتِ وقفِ تام ٹکڑا ہو۔ ہفتے عشرے میں سورت بقرہ آجائے گی تو آپ کے پاس بھیجوں گا، لیکن سچ یہ ہے کہ کام

سے پہلے جن مشکلات کا علم نہیں ہوتا وہ کرنے پر اس طرح سامنے آ گئی ہیں کہ قدم قدم پر رک جانا پڑتا ہے۔

ایک چھوٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ مثلاً امثال القرآن ہیں اور ان کی مختلف حالتیں ہیں۔ غالب صورت یہ ہے کہ صرف مثال پر قناعت کی ہے اور سوائے حکم تفکر و تعقل کے اور کوئی چیز اصل میں ایسی نہیں ہے جو مشبہ بہ کو واضح کرے۔ اب اگر ترجمہ میں بھی وہی شکل قائم رہتی ہے تو وضاحت و تفہیم کہ اصل مقصد ہے، فوت ہوتا ہے۔ اگر وضاحت کی جاتی ہے تو اختصار میں زور و بلاغت نہیں اور اطناب میں اصل پر بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعض مقامات پر میں تھوڑا بہت کامیاب ہوا ہوں کہ ایسے الفاظ جمع ہو گئے جن میں ضمناً وضاحت ہو گئی اور متن سے بھی بہت زیادہ دور نہ نکل جانا پڑا، لیکن بعض مقامات کی مشکلیں بہت سرگرداں کرتی رہیں۔

سورۂ بقر کی مشہور مثال مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَنَاراً فَلَمَّا اَضَاءَ ت ...... اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ. میرا خیال ہے کہ قرآن کریم کی پہلی صورت میں یہ مثال بلا وجہ عظیم نہیں ہے اور دراصل اس کے اندر بہت ہی بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اسے محض بعض یہود و منافقین یثرب سے تعلق نہیں، بلکہ اپنے عموم و اطراف میں مجمع انسانی اور ہدایت افراد و امم کی ایک ایسی اصولی تقسیم ہے۔ جس سے باہر کوئی گروہ باقی نہیں رہا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ قدماء میں ابن قیم نے اسے محسوس کیا اور ''اجتماعِ جیوش'' کے آٹھ صفحوں میں اس پر بحث کی ہے، گو پھر بھی حسبِ دل خواہ نہیں ہے(۱)۔

اب فرمائیے کہ اگر اس مثال کو اردو میں لکھ کر چھوڑ دیا جائے تو کیا اثر ہوگا؟ لیکن اگر مسطور مثال سے ربط باقی رکھ کر مطلب کو بڑھایا جائے اور کھولا جائے تو کس قدر زیادہ اضافہ اصل پر ہو جائے گا؟ علی الخصوص اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ...... الخ

بہ ہر حال کسی نہ کسی طرح کام کو جاری رکھا۔ یہ کام دراصل یوں تھے کہ باہم یکجائی

ہوتی ہے اور دیر دیر تک صحبتیں اس بارے میں کی جاتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو جس حال میں جو کچھ ہو جائے اور توفیق مساعد ہو اسی پر شکر کرنا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سوانح موجودہ ٹونک کی خبر دے کر آپ نے مجھے بے چین کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ حالات ہوں۔ تصانیف میں خاندان وغیرہ کی تفصیل ملتی ہے، لیکن سلطنتِ مغلیہ کے آخری عہد میں ان کے سالہا سال کیوں کہ بسر ہوئے اور ایک شخص جسے ہم حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھتے ہیں، عملاً کیسی زندگی بسر کر گیا؟ اس کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مولانا شبلی کی بدولت مجھے ایک عمدہ شے ملی اور میں نے نقل لے لی، یعنی ذخیرہ دائرہ الہ آباد۔ شاہ صاحب کے لیے اس سے زیادہ کہیں نہیں ملے گا (۲)۔

لیکن خدارا کسی قدر مفصّل لکھیے کہ ٹونک کی نسبت کس نے کہا؟ کس کے پاس ہے؟ ٹونک میں اپنے بہت سے مخصوص احباب ہیں۔ نیز حکیم برکات احمد صاحب سے باوجود تو ہب خط و کتابت ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تم ایک اچھی قسم کے گوارا وہابی ہو۔ ممکن ہے کہ ان کے ذریعے کام نکلے۔ بہ ہر حال اپنی معلومات نسبت رسالۂ ٹونک مفصّل لکھیں۔

''الہلال'' کا وہی حال ہے جو میں نے آپ سے کہا تھا، گو آپ لوگوں نے کبھی میرے اس وعدے کو صحیح نہیں سمجھا کہ میں دوبارہ جاری کروں گا۔ البصائر'' البلاغ''، ''البیان''، ''ترجمان'' اتنے پریس جب میں چاہوں قانوناً قائم کر سکتا ہوں اور جب چاہوں ان میں الہلال چھاپ سکتا ہوں۔ ان میں سر دست ایک کو اختیار کیا ہے اور اب آج کل کی بات ہے۔ تفسیر القرآن باسم ''البیان فی مقاصد القرآن'' ماہوار رسالے کی شکل میں نکلے گی (۳)۔

اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں۔

قضاها لغیری وابتلانی بحبّها

آپ نے لکھا ہے کہ آپ اکتوبر سے فارغ ہیں، لیکن پونا سے کہاں جائیں گے؟ اعظم گڑھ یا وطن؟ اگر دیسنہ کا قصد ہو تو اس سے کلکتہ دور نہیں اور ویسے تو پونا اور اعظم گڑھ سے بھی ایک لمحۂ محبّت میں بُعد قرب ہو سکتا ہے۔

دارالمصنّفین کے لیے بہت ضروری ہے کہ اسے حقیقت اور اصلیت کا نمونہ بنایا جائے اور اس کے دایرے کو اتنا وسیع نہ کیا جائے کہ ہر ایڈیٹر، اہل قلم اور ہر مضمون نگار، مصنّف ہو، ورنہ سب کچھ بے سود! وہ وقت ابھی سے پیدا کرنا چاہیے کہ اس کا نام سند اور سرٹیفکیٹ کا کام دے(۴)۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حواشی:

(۱) ''اجتماع جیوش اسلامیہ'' مطبوعۂ امرتسر کے صفحہ ۱۲ سے بحث شروع ہوتی ہے اور بلاشبہ ایسے نکتے بیان فرمائے ہیں، جن کی کوئی مثال پیشتر یا بعد میں نہیں ملتی۔ (مہر)

(۲) اس سے ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ کے سوانح کے لیے بہت پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ الہ آباد کے دایرہ شاہ اجمل کے ذخیرے میں شاہ صاحب کے متعلق جو کچھ محفوظ تھا، فرماتے ہیں اس سے زیادہ اور کہیں کیا ملے گا۔ (مہر)

(۳) اس مکتوب سے ظاہر ہے کہ ''البلاغ'' کے اجرا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چناں چہ نومبر ۱۹۱۵ء میں یہ جاری ہوا۔ ساتھ ہی ''البیان فی مقاصدِ القرآن'' کا اشتہار نکلا لیکن مولانا ابھی اطمینان سے کاموں کو درست اور ان کی بنیادوں کو مستحکم نہیں کر پائے تھے کہ اخراج کا حکم جاری ہو گیا اور سب کچھ چھوڑ کر انھیں رانچی چلے جانا پڑا۔ (مہر)

(۴) اصل مکتوب میں سال درج نہ تھا۔ میں نے داخلی شہادت کی بناء پر درج کر دیا اور یہ بالکل درست ہے۔ (مہر)

(۱۱) ﴿۱۵۲﴾

اخ الجلیل الاعز! انعم اللہ علی بلقائک

خط پہنچا۔ ایسی حالت میں کہ آپ کے عدم تعینِ مکان و عالم اطلاق مقامِ سے سخت پریشان اور حیران تھا کہ کیوں کر خط و کتابت کروں۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ

میری فرصت موجودہ اب قریب الاختتام ہے اور مشیتِ الٰہی جس طرح مہلت دے کر اپنا کام کرانا چاہتی تھی، اسی طرح آخری ابتلا کو بھیج کر کوئی عظیم الشان مقصد پورا کرانا چاہتی ہے۔ آثار گویا ہیں اور علائم قطعی، اخبار موثق اور اطلاعات معتمد (۱)۔ تاہم سب اس کے ہاتھ میں ہے اور میں نے اس دورِ حیات میں بڑے بڑے کرشمے دیکھے ہیں۔ پس کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ٹھیک ٹھیک کیا ہوگا اور وہی ہو جو اس کی مرضی ہے۔ ایسی حالت میں بہت سوچتا ہوں، لیکن آپ کے سوا کسی کو نہیں پاتا، جس سے امید رکھوں۔

مدت ہوئی جب آپ کلکتہ میں تھے اور ایسے ہی ایک اطلاع ملی تھی۔ شب کو میں نے اپنے کمرے میں آپ کو بلایا تھا اور آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ خدارا اسے سامنے لائیے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے وقعت دیجیے (۲)۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسی وقت اپنے کاموں میں کوئی تبدیلی کیجیے۔ البتہ اگر بذریعۂ تحریر مجھ سے وعدہ کریں کہ جب وقت آئے گا تو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک کام کے ہو رہیں گے، تو میں بڑی تسکین پاؤں اور اطمینان کے ساتھ آنے والی حالت کو قبول کرلوں۔ وہ تسکین جو بدبختی سے اور کسی کے پاس نہیں۔

آپ مجھ سے بلا تاخیر بذریعۂ تحریر وعدہ کریں کہ اگر میری نسبت آپ کو کوئی نئی خبر ملے تو آپ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ فوراً کلکتہ آئیں اور البلاغ کو جو نکل چکا ہے (اور ان شاء اللہ محفوظ ہے)، اپنی ایڈیٹری میں لے لیں اور ایک خالص دینی واصلاحی رسالے کی شکل میں مع اس کے خصایص کے اس کو جاری رکھیں۔ کسی پُر خطر راہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، نہ جنگ پر رائے زنی کی ضرورت ہے۔ صرف قرآن وسنت کے معارف ودعوت کو باندازِ واصولِ مخصوص البلاغ جاری رکھنا چاہیے اور جب تک اس طرح کیا جائے گا، اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

یہاں تمام لوگ آپ کے استقبال کے لیے منتظر ملیں گے اور وہ آپ کا اسی طرح ساتھ دیں گے، جس طرح میرا دے رہے ہیں اور اسی طرح حکم مانیں گے اور ماتحت

رہیں گے جیسے میرے رہتے ہیں۔

دوسرا اس سے بھی اہم مسئلہ دارالارشاد کا ہے(۳)۔ افسوس کہ یہ بہت دیر میں شروع ہوا اور اس کی ناتمامی کا داغ بڑا ہی داغ ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ تاہم اگر قرآن حکیم اور علومِ اسلامیہ کا درس ان اصولوں پر، جو آپ سے پوشیدہ نہیں، آپ جاری رکھ سکیں اور لکھ دیں تو وہ بھی بہ صورت موجودہ آپ کے تصرف میں آجائے گا اور پہلے کام سے بھی بڑھ کر کام ہوگا۔ اگر آپ نے اسے بند نہ ہونے دیا تو جو لوگ یہاں مقیم ہیں، ان کے مخارج وضروریات سب بدستور مہیّا رہیں گے۔

ضرورت صرف اس کی ہے کہ قرآن حکیم پر، تفسیر بالرائے وعقلیت سے الگ رہ کر، احادیثِ ناقابلِ انکار کا ساتھ دے کر، لغت وادب کی بالکل نئی تحقیقات وکاوش سے مدد لے کر (جس سے نصف مشکلات حل ہوجاتی ہیں) قرآن کے حقایقِ اجتماعی کے انکشاف پر زور دے کر اور اس کے درس کو تمام مسایل وعقاید واعمال مہمۂ اقوام و امم ومہماتِ مسئلہ اصلاح وتبلیغ اہل اسلام پر محیط کر کے درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور مسایلِ اصلاح وتبلیغ، نیز تمام علومِ اسلامیہ پر مجتہدانہ لیکچر دیے جائیں(۴)۔

اگر آپ ایسا کرنے کے لیے تیار ہوں تو دارالارشاد بھی مع کتب خانے کے آپ کے سپرد کر دیا جائے گا۔ تاکہ آپ اس کو قایم رکھیں اور جب تک خدا مجھے دوبارہ مہلت نہ دے، آپ میرے بعد کاموں کو التوا سے بچالیں۔

زندگی چند روزہ ہے۔ ہم سب کو خدا کے حضور میں جانا ہے اور اپنے فرایض کے متعلق جواب دہی کرنی ہے۔ کام نہ میرا ہے نہ آپ کا۔ اگر آپ نے اس خط کے پڑھنے کے ساتھ ہی تحریری وعدہ بھیج دیا تو میں مطمئن ہو جاؤں گا، ورنہ انشاء اللہ دعوت حق رُکنے والی نہیں۔ وہ غیب سے کسی نہ کسی آدمی کو اس کے لیے بھیج دے گا اور اس نے ہمیشہ بھیجا ہے۔

''البلاغ'' کے علاوہ، بالکل علاحدہ ایک معتدل مسلک کا روزانہ اخبار ''اقدام''

بھی جاری ہوا ہے(۵)، وہ بھی آپ کے تحت ہو جائے گا اور ایک بڑا اسٹاف اپنے ماتحت آپ پائیں گے۔ امید ہے کہ دارالمصنّفین وغیرہ اس میں مانع نہ ہوں گے، کیوں کہ اس کو تو ہر حال میں قایم رکھ سکتے ہیں۔

فقیر ابوالکلام کان اللّٰہ لہٗ

حواشی:

(۱) یہ مکتوب نظر بہ ظاہر ۱۹۱۵ء کے اواخر یا ۱۹۱۶ء کے اوایل کا ہے، جب البلاغ نکل چکا تھا اور دارالارشاد جاری ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مولانا کو معتبر ذرایع سے اطلاع مل گئی تھی کہ ان کے لیے بنگال سے اخراج کا حکم جاری ہونے والا ہے اور انھیں پریشانی تھی تو یہ کہ کسی طرح کاموں کے بے خلل جاری رہنے کا بندوبست ہو جائے۔ (مہر)

(۲) یہ غالباً اس زمانے کی بات ہے جب سید سلیمان ندوی ''الہلال'' کے اسٹاف میں شامل تھے اور میرے اندازے کے مطابق یہ زمانہ چند مہینے سے زیادہ کا نہ تھا۔ غالباً وہ مئی یا جون ۱۹۱۳ء میں شریک ہوئے اور اکتوبر یا نومبر میں الگ ہو گئے۔ (مہر) مئی ۱۹۱۳ء میں کسی وقت آغاز ہوا اور وسط دسمبر تک جاری رہا (اس ش)۔

(۳) دارالارشاد کی بنیاد رمضان ۱۳۳۳ھ (جولائی ۱۹۱۵ء) میں رکھی تھی اور ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ (اکتوبر ۱۹۱۵ء) سے درس شروع ہو گیا تھا۔ (مہر)

(۴) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک تفسیر قرآن کے اصول ومبانی کیا تھے؟ (مہر)

(۵) یہ روزنامہ اخبار مولوی محی الدین احمد قصوری نے کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ افسوس کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کا داخلہ مختلف صوبوں میں بند ہو گیا اور مولوی محی الدین احمد بھی اسے بند کر کے وطن آنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ (مہر)

(۱۲) ﴿۱۵۳﴾

ڈاک بنگلہ۔ رانچی

۸/اپریل ۱۹۱۶ء

برادرم! السلام علیکم

میں سرِ دست رانچی آ گیا ہوں۔ البلاغ جاری رہے گا۔ آپ اور تو کچھ نہیں کر سکتے، کم سے کم اتنا کیجیے کہ ہر دو ہفتہ میں ایک مضمون بقدر آٹھ کالم کے بھیج دیا کیجیے

اور مولوی عبدالسلام سے کہیے کہ ہر دو ہفتے میں وہ بھی ایک مضمون اتنی ہی مقدار کا لکھ کر بھیجیں۔ اس طرح دو فارم کا انتظام ہو جائے گا۔ باقی تین فارم میں خود لکھوں گا(۱)۔ مولوی عبدالسلام صاحب سے کہیے کہ یا تو علمی ذوق سے لکھیں یا معاوضہ لیں۔ میں ہر طرح تیار ہوں۔ کم سے کم چند نمبر تک تو ایسا کیجیے۔ اس کی نسبت میں کچھ نہیں لکھتا کہ ایسا کرنا کہاں تک ضروری ہے؟ اس پر آپ خود غور کر سکتے ہیں۔

"البلاغ" کے ابواب آپ کو معلوم ہیں: مقالات، اسوۂ حسنہ، مذاکرۂ علمیّہ، انتقاد، تاریخ وغیرہ۔ ان کے مقاصد بھی آپ کو معلوم ہیں۔ باب التفسیر میں خود لکھا کروں گا۔ براہِ عنایت جلد جواب دیجیے۔ زیادہ وقت و فرصت نہیں۔

افسوس کہ باوجود اس قدر شور و غل کے، کاموں کو جاری و باقی رکھنے والا کوئی نہ نکلا اور تمام چیزوں کے لیے بحمد اللہ لوگ مستعد ہو گئے، اس کے لیے کوئی نہیں۔

فقیر ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) یہ بنگال سے اخراج کے بعد رانچی (بہار) پہنچنے کے بعد پہلا مکتوب ہے۔ اس وقت تک مکان کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا اور مولانا کو ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنا پڑا تھا۔ بعد ازاں مکان کا انتظام کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اخبار کے جاری رہنے کا کیا امکان تھا؟ چناں چہ مولانا کی روانگی کے بعد کوئی بھی پرچہ نہ چھپا۔ (مہر)

(۱۳) ﴿۱۵۴﴾

رانچی (بہار)

۱۷ر رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ (۲۶ر جون ۱۹۱۸ء)

صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"انقلاب الامم" کے لیے شکریہ۔ ایسی ہی علمی اور گراں مبحث کتابوں کا سلسلہ جاری رہا تو آپ کا مجمع وہ کام کرے گا جو انجمن سازوں سے آج تک نہ ہو سکا۔

''انقلاب الامم'' کو جونہی کھولا تو دیباچے کے صفحہ ۱۲ پر نظر پڑی اور ایک سخت غلطی نظر آئی۔ مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے ''وَالنَّاسُ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُونَ'' اور پھر اس سے ایک خاص استدلال کرتے ہیں اور کتاب کے بیان کردہ اصول سے قرآن کو تطبیق دیتے ہیں۔ میں حافظ نہیں ہوں، لیکن جہاں تک حافظہ کام دیتا ہے، قرآن اس جملے سے بری ہے۔ مولوی صاحب کے حافظے نے دھوکا کھایا اصل آیت یوں ہے ''وَ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ. یہ دو جگہ ہے سورۂ مومنون میں اور سورۂ روم، والناس بما لدیھم فرحون کہیں بھی نہیں ہے۔ بہتر تھا کہ وہ تحریر کے وقت قرآن کی طرف رجوع کرتے۔ تعجب ہے کہ آپ نے بھی غلطی کو محسوس نہیں کیا۔

پھر ان کا استدلال بھی صحیح نہیں۔ مبحث یہ ہے کہ ہر قوم کے اخلاق و امیال اور رجحان دماغی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور اس کی تمام حیاتِ اجتماعیہ اس کے مطابق ہوتی ہے۔ لیبان وغیرہ اس کو اقوام کی فطرتِ اجتماعی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن اس اصول کو اصل آیت کریمہ سے کوئی تعلق نہیں، نفیاً و اثباتاً، کیوں کہ اس میں تو انسان کو اس کی ضلالتِ اختلاف و تعدّد، فرق و تشتّت و تحزّب پر ملامت کی گئی ہے، جس کو جا بجا قرآن ''بَغْیًا بَیْنَھُمْ'' سے تعبیر کرتا ہے اور مقصود قرآنی یہ ہے کہ اللہ کی شریعت نے لوگوں کو ایک ہی راہ سعادت کی طرف بلایا اور وحدت و تالیف و جمعیّت کی دعوت دی، لیکن بہ ایں ہمہ وہ ایک ہو کر پھر متفرق و متشتّت ہو گئے اور اسی طرح ہدایت کے بعد ضلالت اختیار کی۔ پھر کہاں اقوام کی فطرتِ اجتماعی اور اس کے خصایص و امتیازات کی بحث، جس کا وجود ناگزیر اور اس لیے موجبِ تحسین ہے اور کہاں مخاطبینِ شرایع کی ضلالتِ تشتت و تفرق جس پر قرآن ماتم کرتا ہے!

سورہ مومنون میں اس آیت کا سیاق و سباق یہ ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ o وَجَعَلْنَا ابْنَ

مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّآوَيْنٰهُمَآ إِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ٥ يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا، إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ٥ وَإِنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ٥ فَتَقَطَّعُوْا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ٥ فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ٥

(۲۳:۴۹تا۵۴)

سورہ روم میں یوں ہے:

وَاتَّقُوْهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ٥ (۳۰:۳۱۔۳۲)

آپ ان دونوں موقعوں کو دیکھتے ہیں کہ ان میں بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اقوام گزشتہ کا ہدایتِ الیٰ صراط مستقیم کے بعد اتباعِ سبل متعدد و تفرق و تشتت پر مایل ہونا، بیان کیا گیا ہے اور بتلایا ہے کہ اصل دین و تعلیمِ الٰہی وحدت و تالیف تھی، مگر انسانوں نے اپنی ضلالت کی وجہ سے راہِ تعدد اختیار کی۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ میں اُن کی کسی فطری حالت کی خبر نہیں دی گئی بلکہ سیاق و سباق و نظم بیان بتلا رہا ہے کہ ان کے متفرق ہو جانے اور ہر گروہ کے اپنے کو برسرِ حق سمجھنے اور اس پر قانع و مسرور رہنے کو بہ لہجۂ مذمت بیان کیا ہے اور یہ امر بالکل واضح ہے۔

معارف میں جو مضامین چھپتے ہیں، ان میں بھی بعض اوقات ایسی غلطیاں رہ جاتی ہیں، جن پر مخالفین اعتراض کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود تمام مضامین کو نہیں دیکھتے! پچھلے دنوں مولوی عبدالقادر پونا کا ایک مضمون ابوحمزہ اصفہانی صاحب ''تاریخ ملوک الارض'' پر چھپا تھا اور کسی پارسی کے انگریزی مضمون کا ترجمہ تھا۔ اس میں جابجا سامانی کی کتاب الانساب کا حوالہ دیا ہے، حال آں کہ آپ کو معلوم ہے کہ ''کتاب

الانساب'' ''سمعانی'' کی ہے نہ کہ ''سامانی'' کی۔ انگریزی میں الف اور عین کا فرق مشکل ہے، اس لیے یا تو مضمون نگار نے یا مترجم نے سمعانی کو سامانی سمجھ لیا، لیکن آپ کو درست کر دینا تھا۔ بات بالکل واضح تھی۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حواشی:

(۱) سورۂ مومنون کی آیات نمبر ۴۹ تا ۵۳، مولانا آزاد کا ترجمہ یہ ہے:

''اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم نے اس واقعے کے بعد موسیٰ کو الکتاب (یعنی تورات) دی تھی، تا کہ لوگ ہدایت پائیں۔ اور اسی طرح ابن مریم (یعنی مسیح) اور اس کی ماں کو (اپنی سچائی کی) ایک بڑی نشانی بنایا اور انھیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی، جو بسنے کے قابل اور شاداب تھی۔ اے گروہ پیغمبران! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ جیسے کچھ تمھارے اعمال ہوتے ہیں، مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اور (دیکھو!) یہ تمھاری امت در اصل ایک ہی امت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں، پس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرو۔ ان تمام پیغمبروں کے ذریعے سے جو تعلیم دی گئی، وہ یہی تعلیم تھی۔ لیکن لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کٹ کر الگ ہو گئے اور اپنا دین الگ الگ کر لیا، اب جو جس کے پلے پڑ گیا ہے اسی میں مگن ہے''۔

(۲) سورہ روم کی آیت نمبر ۳۱، ۳۲، آیت ۳۱ کا ابتدائی ٹکڑا ''منیبین الیہ'' حوالے میں نہیں ہے۔ یہاں پوری آیت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کا ترجمہ یہ ہے:

''اسی ایک خدا کی طرف متوجہ رہو، اس کی نافرمانی سے بچو اور نماز قایم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ، جنھوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اس میں مگن ہے''۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مسئلے پر اگلے خط میں بھی مفید اشارات کیے ہیں۔

(۱۴) ﴿۱۵۵﴾

رانچی

صدیقی العزیز الاجل! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ پہنچا۔ آپ لکھتے ہیں کہ مجھے علم نہ تھا کہ سلسلۂ مراسلت جاری رہ سکتا ہے۔

آپ ایسے باخبر کی یہ مایوسی تعجب انگیز ہے۔ مجھ سے پہلے اور لوگ نظر بند ہو چکے ہیں اور ان کی نسبت آپ کو ضرور معلوم ہے کہ زیرِ احتساب خط و کتابت کر سکتے ہیں اور کیوں جناب اگر واقعی ایسی حالت ہو جائے، سلسلۂ مراسلت کا اجرا ممنوع ہو، تب تو آپ قطعاً مجھے خط نہ لکھیں گے جیسا کہ بہ خیالِ سدِ بابِ مراسلت آپ نے اب تک نہیں لکھا؟

یہ آخری بات محض مزاحاً لکھی ہے!

اصل یہ ہے کہ میں خود اس بارے میں احتیاط کرتا ہوں۔ زمانے کی حالت دوسری ہے، لوگ اپنے سایے سے بھڑکتے ہیں اور ایمان کے لیے اگرچہ یقین و اثبات کے طالب ہیں مگر ڈرنے کے لیے وہم و خیال کو کافی سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں بے کار کسی ایسے شخص کو خط لکھنا جس نے خود نہ لکھا ہوا، اس پر ناقابلِ تحمّل بوجھ ڈالنا ہے۔ نظر بندی کے بعد میں نے خود اپنی طرف سے پیش قدمی چھوڑ دی ہے۔ جو لکھتا ہے، جواب دیتا ہوں۔ جو خاموش ہے اس کو بولنے پر مجبور نہیں کرتا۔

آپ کو بھی میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ معارف کے ایک پرچہ کی ضرورت ہوئی تو دفتر کے نام کاروباری قسم کا خط لکھ دیا۔ اب جب کہ آپ نے کتابیں بھیجیں اور ایک فروگذاشت نظر آئی تو ضروری معلوم ہوا کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے عرض کر دوں۔

یہ آپ نے خوب کیا کہ چٹ چھپوا کر تصحیح کر دی، لیکن اصل استدلال کی تصحیح کا اب کوئی علاج نہیں اور وہ کسی طرح صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ قرآن سے اس طرح کا استنباط کرنا قطعاً تحریف معنوی میں داخل ہے(۱) کجا آیت کا سیاق و سباق و مضمون اور کجا لیبان کا اصول! اصل سوال یہ ہے کہ اس آیت میں بیان واقعہ و خبر محض ہے یا اس پر ملامت کی گئی ہے؟ ''كُلُّ حِزْبٍ الخ'' نصف ٹکڑا ہے، ''فَتَقَطَّعُوْا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا'' کا اور اس میں ضلالتِ اختلاف و تفریق پر ملامت کی ہے، جو خدا کی مرضی کے

خلاف ہے اور جس کو دور کرنے کے لیے انبیاے کرام آتے ہیں۔ پھر کیا انبیاء اس لیے آتے ہیں کہ اقوام کی فطرت کو مٹائیں؟ بما لدیہم اختلافِ مزاج و رجحان و امیال وغیرہ نہیں بلکہ اَلَّذِينَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ الخ.

اب میں نے پورے مقدمے کو دیکھا۔ افسوس کہ صرف یہی استدلال نہیں بلکہ قرآن و حدیث سے لیبان کے اجتماعی اصولوں کے استنباط و تطبیق کی جتنی کوشش کی ہے، سب محلِ نظر ہے اور قریب قریب زبردستی کی تاویل۔ اگر وہ چاہتے تو اس سے زیادہ موثر و مدلل لکھ سکتے تھے یا تو ان مباحث کو علمی نظر سے لکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا لکھنا چاہیے تو اس طرح کہ قرآن ان مباحث کے مقابلے میں آکر پھیکا اور بے اثر نہ نظر آئے۔ انگریزی خوانوں پر اس کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اتنا ہی ہے تو کچھ بھی نہیں۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے اصل کتاب کا ترجمہ اتنا پرزور، موثر، بلیغ اور دلچسپ کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ یہ کافی تھا اور مقدمہ میں قرآن کو لیبان سے ٹکرانے کی ضرورت نہ تھی۔ ہاں! ابن خلدون وغیرہ بہت مناسب اور بہتر تھا۔ بہ ہر حال خوشی اس کی ہے کہ ایک عمدہ اور علمی کتاب اردو میں شایع ہوگئی۔

اسی احمد فتحی زغلول نے ایک اور کتاب کا ترجمہ کیا ہے: "سر تقدم الانکلیز السکسونین" کتاب اس درجے علمی نہیں لیکن تربیت و تعلیم وارتقاے امم کے مسئلے پر بہت ہی مفید اور ضروری ہے۔ اگر اس کا ترجمہ بھی آپ شایع کر دیں تو بہت بہتر ہے۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو میں بھیج دوں۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) اس سلسلے میں تفصیل ملاحظہ ہو، ۲۶ رجون ۱۹۱۸ء کے مکتوب میں مولانا سید سلیمان نے غالباً لکھا تھا کہ قرآن کی آیت کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اصل معاملہ استدلال کا ہے۔ قرآن سے اس طرح کا استنباط تحریف معنوی ہے۔ آیت کی تصحیح کیوں کر ہو؟ (مہر)

(۱۵)

﴿۱۵۶﴾

رانچی (بہار)

۲۱ر مئی ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آج بعض مسایل کی نسبت سخت گمراہی پھیل رہی ہے اور اگر اس کا سدِ باب نہ ہوا تو ایک نہایت مفید دروازہ کھل کر بند ہو جائے گا۔ اس کے متعلق میں نے ایک مختصر تحریر اخبارات میں شایع کرانی چاہی تھی، لیکن لکھنا شروع کیا تو بہت بڑھ گئی اور اب اخبارات کے لیے حدِ تحمّل و اندراج سے باہر ہوگئی ہے۔ مجبوراً آپ کو بھیجتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حتی الوسع جلد اور بہ عنوان مناسب اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

صورتیں اس کی دو ہیں، ایک یہ کہ ''معارف'' میں نکل جائے، اگر آپ پسند کریں، لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اس ماہ کا نمبر عنقریب شایع ہونے والا ہوگا۔ اس میں گنجایش نہ ہوگی اور آیندہ ماہ پر رکھا جائے تو بہت زیادہ تاخیر ہو جائے گی اور مقصود بہ وجوہ و مصالح تعجیل ہے، بلکہ جتنی دیر باوجود تکمیل تحریر بھیجنے میں بہ وجہِ قیودِ لاحقہ ہوگئی، اس کو بھی نہ ہونا تھا۔ پس اگر اس ماہ کے نمبر میں اس کا اندراج ممکن ہو، اقلاً نصف اول تو اس کی کوشش کیجیے نصف ثانی آیندہ نمبر میں نکل جائے گی۔ اگر اس کا موقع باقی نہیں رہا ہے تو پھر ایک صورت اور ہے، یعنی اس تحریر کو نسبتاً خفی قلم اور زیادتی سطور و مسطر کے ساتھ لکھوا چھپوا کر بہ صورت ضمیمۂ زاید کے اسی نمبر کے ساتھ نکال دیا جائے اور چند دنوں کے لیے اس نمبر کی اشاعت ملتوی رہے۔ اس صورت میں میرا دوسرا مقصد بھی حل ہو جائے گا۔ یعنی مستقلاً بشکلِ رسالہ بھی اس کی کچھ کاپیاں چاہتا ہوں۔ بس وہی ضمیمہ تین سو الگ بھی معمولی کاغذ پر چھپوا لیا جائے۔ علاحدہ ٹائٹل اس پر لگا دیا جائے گا۔

اس صورت میں ''معارف'' کے زاید اوراق اور علاحدہ رسالے کے لیے، غرضے

کہ جس قدر یہ ٹکڑا چھپے، اس کی اجرت وخرچ میرے ذمے ہے، کیوں کہ ''معارف'' پر اس کی معین ضخامت سے زیادہ بوجھ نہیں پڑنا چاہیے اور بہ ہر حال مجھ کو چھپوانا ہی ہے۔ رقم مطلوب سے آپ مجھے مطلع کریں تا کہ بھیج دی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو موجبِ کمال تشکر ہوگا۔

لیکن اگر یہ دونوں صورتیں ممکن العمل نہ ہوں تو پھر از راہِ عنایت جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو بہ صورت رسالہ چھپوا دینے کا انتظام فرما دیجیے۔ پانچ سو نسخے کافی ہوں گے۔ مطبع ''معارف'' میں چھپے اور اگر کسی وجہ سے دقت ہو تو لکھنؤ یا کان پور میں چھپوا دیجیے۔ اعظم گڑھ میں چھپتا تو تصحیح کی طرف سے آپ کی موجودگی اطمینان دلاتی، کیوں کہ جو مسودہ بھیج رہا ہوں اس میں کاٹ چھانٹ جا بجا ہے۔ اس صورت میں بھی فوراً اجرتِ طباعت سے مطلع کیجیے تا کہ روپیہ بھیج دیا جائے۔

مقصودِ اصلی اشاعت اور جلد اشاعت ہے۔ اگر الگ چھپے تو تقطیع معارف سے چھوٹی رکھی جائے یعنی مخزن کی تقطیع۔ کاغذ معمولی ہونا چاہیے اور خط زیادہ جلی نہ ہو۔

ایک اور ضروری بات ہے۔ ابتدا میں چوں کہ خیال نہ تھا کہ تحریر بڑھ جائے گی اس لیے بلا فصل وعنوانات محض نمبروں کی ترتیب سے لکھنا شروع کیا گیا، لیکن اب دیکھتا ہوں تو تحریر بہت بڑھ گئی اور بیچ میں کہیں موڑ نہیں۔ پڑھنے والے اکتا جائیں گے۔ پس اب عنوانات کا قایم کرنا تو خالی از اشکال نہیں، البتہ جب کاتب شروع کرے تو اتنی ہدایت کر دی جائے کہ تحریر میں جہاں جہاں سے نیا نمبر شروع ہوتا ہے، وہاں بین السطور وسط میں صرف لفظ فصل جلی قلم سے لکھ دیا جائے اور نمبروں کو نکال دیا جائے (۱)۔ مسودے ہی میں ایسا بنا دیا جائے۔ اس طرح کل بائیس جگہ فصل آئے گا۔ کیوں کہ کل بائیس نمبر ہیں۔

امید ہے کہ اس بارے میں پوری توجہ کام میں لائیں گے (۲)۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) نمبر نکالے نہ گئے۔ ''معارف'' میں بہ دستور باقی رہے اور یقیناً فصلوں کے مقابلے میں نمبر بہتر تھے۔

(۲) یہ اس مضمون کا ذکر ہے جو ''مساجد اور غیر مسلم'' کے عنوان سے نصف معارف کے مئی نمبر میں اور نصف جون نمبر میں شائع ہوا تھا۔ (مہر)

(۱۶) ﴿۱۵۷﴾

رانچی (بہار)

مئی ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

قلبی یحدثنی بانك ستلقی. ایک ہفتے سے زاید زمانہ گزرا کہ ایک رسالہ رجسٹرڈ بھیجا(۱)۔ اب تک جواب و رسید سے محروم ہوں۔ حیرانی ہے کہ کیا معاملہ ہے؟ شاید آپ اعظم گڑھ میں نہ ہوں، رمضان المبارک کی وجہ سے وطن آ گئے ہوں۔ لیکن اتنی مدت گزر چکی ہے کہ خط اعظم گڑھ سے آپ تک پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے جواب آ سکتا تھا۔ بہ ہر حال حقیقت حال سے جلد مطلع کریں۔ اگر کسی وجہ سے رسالۂ مذکور کی اشاعت کا سامان نہ ہو سکے تو بلا تاخیر بیرنگ ''داروغہ الطاف حسین صاحب سیکریٹری انجمن مدرسہ اسلامیہ، اپر بازار، رانچی'' کے نام بھیج دیں۔ بہ وجوہ جلد از جلد اس کی اشاعت مقصود تھی، مگر مشیتِ الٰہی کہ یکے بعد دیگرے تاخیر ہوتی گئی، پہلے یہاں حصولِ اجازت وغیرہ میں۔ پھر آپ کی طرف سے بھی جواب نہیں ملتا۔ بہ ہر حال طالبِ جواب ہوں اور خاموشی سخت موجبِ اضطراب۔

ایک اور ضروری معاملے کے لیے لکھتا ہوں۔ مولوی فضل حق صاحب پرنسپل مدرسۂ عالیہ (رام پور) کا مدرسہ سے قطع تعلق ہو گیا ہے۔ وہ ڈھاکہ اور کلکتہ جانے کے لیے مستعد تھے، مگر خیال ہوا کہ اگر دار العلوم ندوہ میں قیام ہو تو بہتر ہو گا۔ دار العلوم میں پرنسپل و صدر مدرس کی جگہ خالی ہے۔ ایک زمانے میں مولانا شبلی مرحوم ان کو بلا رہے

تھے اور کلکتہ میں میرے مکان پر گفتگو ہوئی تھی۔علوم درسیہ ومعقولات میں آج ممتاز سمجھتے جاتے ہیں اور تجربہ کار وغیر متعصب وخوش تقریر وتدریس ہیں۔باقی علوم دینیہ میں جو حال اکثر مدرسین وقت کا ہے، وہی ان کا ہے۔اصلاحِ تعلیمات وتغیّرات کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں مولوی سید عبدالحی صاحب کو خاص طور پر بہ تاکید لکھیں کہ وہ جلد بلا لیے جائیں، ہر طرح بہتر وموزوں ہوگا۔

رسالہ وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھنا ہو داروغہ الطاف حسین صاحب کو لکھیے۔مولوی سلطان رخصت پر بھوپال چلے گئے اور وہ معاملہ داروغہ صاحب ہی سے اب متعلق ہے۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حاشیہ:

(۱) یہ یقیناً رسالہ ''مساجد اور غیر مسلم'' کا ذکر ہے۔

(۱۷) ﴿۱۵۸﴾

صدیقی العزیز! السلام علیکم

معافی خواہ ہوں۔جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن بلا عذر نہ تھی۔مولوی مسعود علی صاحب نے ازراہِ عنایت سیرت وغیرہ بھیج دیں، جس کے لیے شکر گذار ہوں۔دارالمصنّفین سے تحایف تو ہمیشہ پہنچتے ہیں لیکن کبھی کوئی بل نہیں آیا۔آخر آپ نے کوئی سالانہ، ماہوار فیس تو رکھی؟

جلسے کے موقع پر ملاقات کی امید تھی مگر پوری نہ ہوئی۔تمر بہ الایّام وھی کما ھیا آپ کے ہموم وغموم کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا(۱)۔مجھے یہ تفصیل معلوم نہ تھی لیکن آپ کی شاعرانہ مایوسیوں سے متفق نہیں ہوں۔اوایل حوادث میں ایسے ہی

احساسات ہوتے ہیں لیکن فان ماتحذرین قد وقع کے بعد خود بہ خود طبیعت سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے لکھا کہ معنوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر بہ قول آپ کے معنوی زندگی کے لیے مادی سروسامان و محرکات ناگزیر ہیں اور نیز بہ قول آپ کے چاک دامنی کے لیے ایام گل کا اشارہ، تو بتدریج خود ہی طبیعت اس کا انتظام کر لے گی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ ہنگامہ آرائیوں کی شرکت چھوڑ دی۔ سچ یہ ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ اس وقت مزاج مبتلائے بحران ہے۔ ترک علاج ہی شاید علاج ہو۔ آپ کا عمل ابوثعلبہ والی وصیّت پر ہے۔ حتی اذا رایتم شحاً مطاعاً وھوی متبعاً واعجاب کل ذی رای برایہ فعلیك بنفسك ودع عنك امر العوام.

اعجاب کل ذی رای برایہ کا فتنہ موجودہ فتنے سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ پہلے فتنۂ استبداد تھا۔ اب فتنۂ حریت ہے۔ علم، اخلاق، مذہب، تقویٰ، طہارتِ نفس کوئی شے بھی زمانے کو مطلوب نہیں۔ صرف چند الفاظ مجہولہ کی ضرورت ہے۔ جو شخص ان لفظوں کو بلند آہنگی سے بول دے وہ امام العصر ہے "مقاماتِ مقدسہ"، "نظر بندانِ اسلام"، "قربانی کا وقت آ گیا"۔ صرف ان لفظوں کی بغیر مزج معانی پرستش ہو رہی ہے۔ شاید ایسا ہونا بھی ضروری تھا، اس لیے زیادہ شکایت بھی نہیں کرنی چاہیے۔

افسوس و تعجب ہے کہ "محی الملۃ" وغیرہ خطاب کے قضیے میں آپ نے بھی شرکت کی۔ اندرونی مصالح کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بہ ایں ہمہ اگر کوئی بات مفید مصالح ہو، تو اس کو بہ عنوانِ مناسب و معتدل بھی طے کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ شیطان اور فرشتے کے درمیان اور کوئی متوسط درجہ نہ ہو(۲)۔

"معارف" کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد للہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنّائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی جو صرف خدمتِ علم و تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے۔

آپ نے تاریخِ وفات کی نسبت لکھا ہے(۳) سچ یہ ہے کہ اس کا کوئی صاف حل نہیں۔ ربیع کی کوئی بھی تاریخ، قرار دیجیے۔ حجۃ الوداع سے حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا، الّا یہ کہ اس سال کے لگاتار تینوں مہینے ۳۰۔۳۰ یا ۲۹۔۲۹ کے مانے جائیں۔ اس صورت میں ۶/ اور ۱۳/ کو دوشنبہ پڑتا ہے۔ غالبًا واقعۂ وفات بارھویں گزر کر رات کو علی الصبح ہوا ہے۔ دوسرا دن تیرھویں کا تھا اور لوگوں نے بارھویں سے ہی تعبیر کر دیا۔

فقیر ابوالکلام

حواشی:

(۱) غالبًا اہلیہ کی وفات کا ذکر ہوگا۔

(۲) یہ میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد کو خطاب دینے کا مسئلہ ہے۔ مولانا نظر بند تھے۔ علماء کے مختلف گروہوں نے جمع ہو کر ''محی الملت والدین'' کا خطاب تجویز کیا تھا۔ غالبًا یہ سب کچھ اس غرض سے ہوا تھا کہ ترکوں کے ساتھ جنگ شروع تھی اور انگریز چاہتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کی توجہ کا مرکز کسی دوسری جگہ قایم کر دیں۔

(۳) یعنی تاریخ وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں رویتِ ہلال کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام مستند روایتوں کی بناء پر یکم ربیع الاول ۱۱ ہجری (۲۷/ جون ۶۲۲ء) تاریخ وفات بتائی گئی ہے۔ دلایل سیرۃ النبی جلد دوم میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔

(۱۸) ﴿۱۵۹﴾

صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ کے دلچسپ خط نے پوری ملاقات کا لطف دیا۔ آپ کو اس قدر جلد اعظم گڑھ کے گوشۂ عافیت سے برداشتہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ ساری باتیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں جہاں دلچسپیوں کی شورش ہے وہاں امن و جمعیّتِ خاطر کہاں!

اسباب خواہ کچھ ہوں مگر ''محی الملت'' خطاب والا معاملہ بہت ہی برا ہوا۔ باقی رہا الناظر کا شوروشغب، تو اس میں بھی وہی غلو تھا جو مویدین خطاب کی تحریرات میں (تھا)۔ اس کارروائی سے بجز چند اشخاص کے ذاتی فواید یا چند انجمنوں کے وظایف کے اور کوئی نتیجہ نہیں، لیکن یہ بات بہ عنوان مناسب بھی حاصل ہوسکتی تھی۔ انصاف

کیجیے یہ کیسی بدعت ہے کہ جہاں کسی والی ریاست نے چند علماء یا چند انجمنوں کو کچھ روپیہ دے دیا یا حکم دے دیا کہ پرانے قرآن جمع کرلو "محی الملۃ والدین" ہوگیا! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو صدر الصدور کر دینا بہت عمدہ بات ہے، مگر احیاے ملّت و دین نہیں۔ مقصود اگر یہ تھا کہ امرا سے کام نکالا جائے اور جرأت و ہمت افزائی کی جائے تو اور بہت سے نسبتاً کم ناموزوں القاب ہوسکتے تھے۔ اتنے بڑے لفظ کو خراب کرنا اور وہ بھی مجمع علماء کا بہت ہی افسوس ناک ہے۔ فرض کیجیے اب حضور نظام واقعی کوئی کام احیاے ملّت کا کریں یا کوئی اور رئیس کرے تو اس کے لیے اب کون خطاب باقی رہے گا؟ "نصیر الملت" پھر غنیمت تھا لیکن مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ نہیں وہی وکیل والی بات ہونی چاہیے(۱)۔

خیر! اب دیکھیے خود ندوے کو بھی کچھ حصّہ ملتا ہے یا نہیں۔ فرنگی محل اور دیو بند کی شرکت کا آپ نے ذکر کیا ہے، لیکن یہ تو کچھ تعجب انگیز نہیں۔ دونوں جگہوں کو وظایف مل رہے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ مولوی اشرف علی صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی تو ان کی بہت تعریف کرنی چاہیے۔ بلا شبہ یہ کارروائی شرعاً جایز نہ تھی۔ اذا رایتهم المدّاحین فاخشوا فی وجوههم التواب کا معاملہ بہت سخت ہے اور غالباً بخاری میں ہے۔ من کان منکم مادحاً لامحالة فلیقل احسب فلاناً و اللّٰہ حسیبه ان کان یریٰ انه کذٰلك ولا یزکی علی اللّٰہ احداً. اور یہاں تو لامحالہ کی بھی گنجایش نہیں۔ فقہا نے تو خطبہ میں بھی بجز دعاے خیر کے سلطانِ وقت کے لیے اور تمام باتوں سے روکا ہے۔ و اذا مدح الفاسق غضب اللّٰہ تعالیٰ واهتزله العرش.

آپ نے "ارض القرآن" میں صائبین کی نسبت کتاب الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ کی عبارت نقل کی ہے(۲)۔ اس کے متعلق فرمایئے کہ یہ عبارت آپ نے کس صفحے سے نقل کی ہے؟ یعنی وہ کتاب آپ کے پاس موجود ہے؟ تفسیر فتح البیان میں نواب

صاحب (۳) نے اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوْا وَالَّذِینَ ھَادُوْا والصابئون............ الآیه (المائدہ:۶۹) کی تفسیر میں پوری عبارت نقل کی ہے اور بعض اور کتابوں میں بھی ہے۔ اگر آپ کے پاس کتاب مذکور موجود ہے تو میں خواستگار ہوں کہ ایک ہفتے کے لیے مجھے عنایت فرمائیے۔ بہ حفاظت واپس کردوں گا۔ سید علی بلگرامی کا نسخہ مولانا شبلی مرحوم کے پاس تھا۔ دوسرا نسخہ حکیم نورالدین صاحب قادیان کا تھا، جو دیوبند آیا، مولانا عبیداللہ صاحب (۴) کے پاس رہا، پھر غائب ہوگیا۔ ممکن ہے مولانا مرحوم والا نسخہ اعظم گڑھ میں ہو۔ بہ ہر حال مجھ کو اس کی سخت ضرورت ہے اور ایک کام اس کی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ بہ صورت موجودگی آپ کو ترسیل میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ موجبِ کمالِ امتنان و تشکر ہوگا۔ صرف ایک ہفتے بلکہ اس سے بھی کم کے لیے مطلوب ہے (۵)۔

آپ نے دارالمصنّفین کی موجودہ مالی حالت کا ذکر کیا ہے۔ نہایت درجے خوشی ہوئی۔ یہ سب آپ کے قیام و سعی کا نتیجہ ہے۔ بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بارآور ہوئیں، لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں۔ اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہوجائے گا۔ کوئی ایسا انتظام کیجیے کہ ''سہ ماہ مے خورد نہ ماہ پارسامی باش'' کی اسکیم پر عمل درآمد ہوسکے (۶)۔ مستقل قیام وہاں رکھیے عارضی ہر جگہ۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حواشی:

(۱) مطلب یہ کہ ''وکیل'' اخبار نے جو تجویز پیش کردی ہے وہ پوری ہونی چاہیے۔ (مہر)

(۲) ارض القرآن جلد دوم ص ۱۴ـ۲۱۳ (مہر)

(۳) نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی (ا۔س۔ش)

(۴) مولانا عبیداللہ سندھی (ا۔س۔ش)

(۵) کتاب الرد علی المنطقیین کئی سال ہوئے خود مولانا ہی کے ارشاد کے مطابق بمبئی میں چھپ چکی ہے۔ (مہر)
(۶) مطلب یہ کہ سال کا تھوڑا حصہ باہر گزاریے، زیادہ حصہ دارالمصنفین میں قیام کیجیے۔ (مہر)

(۱۹) ﴿۱۶۰﴾

صدیقی العزیز!

مضمون جلدی میں لکھ کر بھیج دیا، مگر ایک بات کھٹکتی تھی۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ نپولین کے قیامِ مصر کے زمانے میں یہی مسئلہ چھڑا اور شیخ اسماعیل زرقانی نے فتویٰ دیا۔ اس وقت تحفۃ الناظرین پاس نہ تھی، کلکتہ کی کتابوں میں تھی۔ مسٹر فضل دین نے اب ڈھونڈ کر بھیج دی تو معلوم ہوا کہ حافظے نے ایک سخت غلطی کی ہے۔ یعنی فتویٰ شیخ جبرتی صاحبِ تاریخ نے دیا تھا اور اس فتویٰ کی بنا زرقانی کا ایک فتویٰ تھا۔ پس براہِ عنایت مضمون میں تصحیح کر دیجیے۔ اسماعیل زرقانی شارح موطا و مواہب کی جگہ شیخ عبدالرحمٰن جبرتی صاحبِ ''تاریخ عجایب الآثار'' بنا دیجیے۔ نپولین کے داخلۂ مصر سے کئی سال پہلے زرقانی کا انتقال ہو چکا تھا(۱) کہیں لوگ پڑھ کر ابن مبارک والی بات نہ کہہ بیٹھیں: ان بینهما مفاوز تنقطع فیها اعناق المطی،

ابوالکلام

حاشیہ:
(۱) یہ تصحیح مضمون میں ہو گئی تھی۔

(۲۰) ﴿۱۶۱﴾

رانچی (بہار)

۲۶ر رمضان ۱۳۳۷ھ (۲۵ر جون ۱۹۱۹ء)

صدیقی العزیز! السلام علیکم

یہ تو اپنے کامل معنوں میں کشف ہے۔ خود مجھے خیال ہوا تھا کہ تین سو کی تعداد کافی

نہیں زیادہ ہو، لیکن اس لیے نہیں لکھا کہ شاید کتابت رسالۂ معارف و رسالہ کی ایک ہی رکھی گئی ہو۔ اور مئی نمبر کا حصہ بہ شکل رسالہ بھی چھپ چکا ہو۔ بہ ہر حال یہ خوب کیا کہ تعداد پانچ سو کر دی۔ علاوہ عبارتِ ہدایہ کے معمولی غلطیاں کتابت کی بھی بہت تھیں، امید ہے کہ درست ہو گئی ہوں گی۔

ٹائٹل کے متعلق استصواب کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے خود کچھ لکھ دیا ہوتا۔ بہ ہر حال اختصار کے خیال سے میں نے صرف ادلۂ شرعیہ بنا دیا۔ سیکریٹری انجمن کے اہتمام کی تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن دقت یہ ہے کہ آپ وطن جا رہے ہیں۔ اگر یہ خط آپ کی عدم موجودگی میں پہنچا تو کیا اعظم گڑھ میں کوئی صاحب کھول کر ٹائٹل لکھنے کے لیے دے دیں گے؟ غالباً یہ آپ کو دیسنہ میں ملے گا۔

امید ہے کہ علاوہ رسالے کے معارف میں تصحیح کر دی گئی ہو گی (۱)

مولوی فضل حق صاحب رام پوری کی نسبت معلوم نہیں ہوا کہ ندوہ والوں کا کیا قصد ہے اور مولوی عبدالحی صاحب نے کیا جواب دیا (۲)؟ ادھر ان کا خط آیا تھا امید ہے کہ آپ نے مکرر لکھا ہو گا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ موجودہ مدرسین دارالعلوم میں سے کسی کو پرنسپلی پر مقرر کرنا بہتر نہ ہو گا۔ کوئی مدرس ایسا نہیں ہے۔ بالکل غیر معروف آدمی کے ہونے سے مدرسے کی شہرت و وقعت پر بھی مضر اثر پڑتا ہے۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) یہاں تک ذکر جامع الشواہد کا ہے (ا۔س۔ش)

(۲) مولوی عبدالحی سے مراد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ہیں۔ (ا۔س۔ش)

(۲۱)

صدیقی الاعز! السلام علیکم

آپ کا خیال درست ہے۔ آج بھوپال سے مولوی سلطان نے آپ کا خط بھیجا اور آپ کا کارڈ بھی ملا۔ تعجیل اشاعت کے لیے ممنون ہوں، علی الخصوص ایسی حالت میں کہ ''معارف'' کی اشاعت کی تاخیر تک گوارا کر لی گئی۔ امید ہے کہ نمبروں کی جگہ فصل بنا دیا گیا ہوگا۔ واقعی بہ شکل رسالہ کوئی دوسرا نام ہونا چاہیے۔ آپ ہی کوئی تجویز کر کے رکھ دیں۔ آپ نے جو نام لکھا ہے اس کا سجع ثانی بہت خوب ہے، یہی ہونا چاہیے۔ مگر رد الجاحدین سے مانعین ومخالفین پر چوٹ پائی جاتی ہے اور نسبت جحود، اس لیے رسالہ حدودِ مناظرہ وجدال میں داخل ہو جائے گا اور یہ مقصود نہیں۔ پس اس کو کسی دوسرے قافیہ سے بدل دیجیے۔ مثلاً ''الشاہد'' ''الشواہد'' یا ''الفوائد'' یا ''جامع الشواہد'' آخری نام بہت پامال ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ ''جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد'' تک موجود ہے۔ یہ خوب ہوگا کہ وہاں اخراج وہابیین تک کی کوشش اور یہاں دخول مشرکین تک کی توسیع (۱)۔

فنحن بوادٍ والعذول بوادِ

بہرحال کوئی اور قافیہ تجویز کریں اور وہی لوح پر درج ہو۔ پہلے خیال تھا کہ نمازِ جنازۂ غائب والے حصّے کو بھیج دوں گا کہ رسالہ کے آخر میں درج کر دیا جائے، لیکن جب ستر تک صفحات پہنچ چکے تو اب مزید اضافہ خوب نہیں۔ اس کے اختتام کے بعد ''معارف'' میں نکل جائے گا۔

اجرت طباعت وغیرہ کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ یقیناً آپ کا میرا معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ اجرت ومخارج کے معاملے کی نسبت کوئی تردد ہو اور اس بارے میں یقین کامل رکھتا ہوں، مگر یہ ظاہر ہے کہ رسالہ چھپے گا اور پریس کا وقت ومال خرچ ہوگا۔ پریس آپ کی ذاتی ملکیّت نہیں، بلکہ دارالمصنّفین کا ہے۔ پس روپیہ کی

ضرورت ناگزیر ہے۔ ازراہِ عنایت مقدار لکھ دیں تا کہ مرسل خدمت ہو۔

''معارف'' کا پچھلا نمبر سلطان صاحب کے پاس دیکھا تھا، میرے پاس نہیں آیا(۲)۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) آخر'' جامع الشواہد'' ہی نام رہا۔ پورا نام'' جامع الشواہد فی دخولِ غیر المسلم فی المساجد'' ہے۔ اب اس کا ترجمہ و تصحیح شدہ ہندستان اور پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔ پاکستانی ایڈیشن ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مرتب کیا ہے اور پس منظر کے حالات و واقعات کا جامع مفید و تحقیقی مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ہندستانی ایڈیشن میں یہ بات نہیں۔

(۲) یہ مکتوب ۲۵/ جون ۱۹۱۹ء والے مکتوب (نمبر ۲۱) کے بعد کا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۲۲) ﴿۱۶۳﴾

(جون ۱۹۱۹ء)

صدیقی العزیز الاجل! السلام علیکم

''معارف'' پہنچا۔ آپ کے پریس کے خوشنویس کا خط نسخ بہت اچھا ہے اور کیا چاہیے، البتہ کتابت کی غلطیاں جا بجا رہ گئی ہیں۔ علی الخصوص عربی عبارتوں میں اور یہ نقص دراصل میرے خط کی خرابی کا ہے کہ کاتب بہ آسانی پڑھ نہیں سکتا۔ ہمیشہ تجربہ ہو چکا ہے آپ کے اور مولوی عبدالسلام کے مضامین میں کتابت کی غلطیاں بالکل نہیں ہوتیں، اس لیے کہ مسودہ واضح و خوشخط ہوتا ہے۔

البتہ ایک غلطی اہم ہے، اس کی تصحیح ناگزیر ہے۔ کاتب نے ص ۵۸۲ نمبر ۹ میں کئی سطریں درمیان سے چھوڑ دی ہیں اور چوں کہ پورا حصّہ منقول عبارت کا ہے اس لیے بہ ظاہر عبارت میں کوئی بے ربطی نظر نہیں آتی۔ اس لیے مصحح کی نظر نہیں پڑی۔

نمبر ۹ میں پہلے ''اشباہ والنظائر'' کی عبارت نقل کی تھی پھر ہدایہ کی اور ہدایہ کی عبارت کے ترجمہ کے بعد ''تکملہ فتح القدیر'' قاضی زادہ کی۔ لیکن کاتب نے ''اشباہ

والنظائر'' کی عبارت کے بعد اس کا ترجمہ اور ''ہدایہ'' کا حوالہ اور پھر عبارت ''ہدایہ'' کا ابتدائی حصہ بالکل چھوڑ دیا ہے اور عبارت ''ہدایہ'' کے ایک ٹکڑے کو ''اشباہ والنظائر'' سے ملا کر نقل کر دیا ہے، اس لیے بعد کی جس قدر بحث متعلق ''ہدایہ'' تھی وہ اشباہ سے متعلق ہوگئی۔ لوگ حیران ہوں گے کہ ''ہدایہ'' کا نام بھی نہیں آیا اس کی عبارت کی شرح واشکال کی کیا بحث ہے اور قاضی زادہ نے اس کی شرح کب لکھی؟ پس براہِ عنایت اصل مسودہ کا وہ موقعہ ملاحظہ کریں۔ غالباً اصل یوں ہے کہ عبارت اشباہ کی ''ولو کان المسجد الحرام'' پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اشباہ کے صفحہ وکتاب کا حوالہ ہوگا اور غالباً ترجمہ بھی، پھر کوئی اور حوالہ ہوگا یا صرف یہ ہوگا کہ ہدایہ میں ہے:

''ولا باس بان یدخل! ھل الذمۃ المسجد الحرام وقال الشافعي یکرہ ذالك''

اس کے بعد تھا (الیٰ ان قال) ولنا ماروی، الخ، کاتب نے درمیان کا تمام حصّہ چھوڑ کر (الیٰ ان قال) ولنا الخ کو عبارت ''اشباہ'' سے ملا کر نقل کر دیا اور اس طرح بعد کا ترجمہ وبحث اشباہ سے متعلق ہوگیا۔

بہ ہر حال آیندہ نمبر ''معارف'' میں اس کی تصحیح کر دیں اور حوالۂ صفحہ وسطر دے کر چھوٹی ہوئی عبارت نقل کر دیں اور اگر رسالے کی شکل میں یہ فارم مزید چھپ چکے ہیں تو کسی پرچہ پر الگ اتنا حصّہ چھاپ کر نمبر ۹ والے صفحہ کے ساتھ رکھ دیا جائے (۱)۔

کیوں جناب یہ ''فاضل'' وہی مولوی غلام محمد صاحب ہوشیار پوری کی تشریحات کا مشتق تو نہیں؟ ان کی تحقیق یہ ہے کہ ''فاضل'' فضول سے مشتق ہے۔

آپ ہمارے مولوی عبدالسلام صاحب کے حسن اخذ وترتیب وتزئینِ مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں؟ صرف بغدادی کی ایک کتاب ''الفرق'' سے ایک اچھا خاصا پورا مضمون لکھ لیا۔ چوں کہ اس میں بعض تفصیلات نئی ملتی ہیں، اس لیے ہمیشہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو لکھا جائے، لیکن مولوی عبدالسلام صاحب نے ایک مستقل مضمون تیار

کرلیا(۲)۔ سخت افسوس ہوتا ہے کہ بہ ایں ہمہ استعداد اہلوں نے اپنے آپ کو کیوں گرا رکھا ہے؟

مولوی عبدالباری صاحب کی برکلے اور اس کا فلسفہ چھپ گئی ہو تو بھجوا دیجیے۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) یہ پوری تفصیل اس مضمون کے متعلق ہے جو ''مساجد اور غیر مسلم'' کے عنوان سے ''معارف'' کے دو نمبروں میں شائع ہوا (مئی ۱۹۱۹ء و جون ۱۹۱۹ء) یہ مضمون مولانا نے ۲۴ ر رجب ۱۳۳۷ھ کو مکمل کیا تھا۔ (۲۵ ر اپریل ۱۹۱۹ء) جیسا کہ مضمون کے آخر میں مرقوم ہے، پھر ''جامع الشواہد'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا تھا جس تصحیح کے لیے مکتوب میں تاکید کی گئی وہ مضمون کے آخر میں جون ۱۹۱۹ء کی اشاعت میں کر دی گئی تھی۔ (مہر)

(۲) یہ تحسین ہے مولانا عبدالسلام مرحوم ندوی کے اس مضمون کی، جو ''اسلام میں مختلف فرقوں کی نشو و نما'' کے زیر عنوان اپریل ۱۹۱۹ء کے ''معارف'' میں شایع ہوا تھا۔

(۲۳) ﴿۱۶۴﴾

رانچی (بہار)

۱۰ ر جولائی ۱۹۱۹ء

صدیقی الاعز! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

معلوم نہیں آپ اعظم گڑھ میں ہیں یا وطن میں۔ رسالہ کی نسبت بھی معلوم نہیں ہوا کہ اس کی اشاعت میں کیوں تاخیر ہوئی؟

امید ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔

ابوالکلام

(۲۴) ﴿۱۶۵﴾

(اگست یا ستمبر ۱۹۱۹ء)

صدیقی العزیز! السلام علیکم

عرصے سے آپ خاموش ہیں۔ ''معارف'' کا جدید اہتمام دیکھ کر جی نہایت خوش

ہوتا ہے۔ آپ کے پریس سے ''جامع الشواہد'' کا بل اب تک نہیں ملا۔ برابر انتظار رہا۔ براہِ عنایت بھجوا دیجیے۔

بالفعل ضروری بات یہ ہے کہ انجمن اسلامیہ، رانچی کا دوسرا سالانہ جلسہ ۲۴، ۲۵، ۲۶ راکتوبر ۱۹۱۹ء کو قرار پایا ہے(۱)۔ اس سال آپ کی شرکت نہایت ضروری ہے۔ خواہ کچھ ہو، مگر آپ کو آنا ہی پڑے گا۔ اگر آپ شریک نہ ہوئے تو بڑا اقلق ہوگا۔ بہار کا جو حال ہے، پوشیدہ نہیں رنگون تک سے لوگ آئے، مگر خود اس صوبے میں کسی کو توفیق نہ ملی۔ آپ ہی اس فرض کفایہ کو فرض عین بنائیے۔ کیا اچھا ہوتا، اگر آپ صوبہ بہار کی گذشتہ علمی زندگی و تعلیمی حالت پر ایک لیکچر دیجیے۔...... (الفاظ مٹ گئے ہیں)

مولوی ابوالحسنات صاحب کو بھی ساتھ لائیے، گو افسوس کہ عمادی حیدر آباد میں ہیں اور بلائے نہیں جا سکتے اور حادثۂ کانپور پر بھی بڑا زمانہ گزر چکا۔

ایک دن کا جلسہ صرف صوبے کے تعلیمی و علمی مذاکرے کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ مولوی ابوالحسنات صاحب بھی کوئی تحریر تیار کریں تو بڑی خوشی ہو۔

مشورۃً لکھیے کہ صوبۂ بہار کے علما میں کون کون قابلِ دعوت اور مستحق سعی خاص ہیں؟ آپ لکھیں گے کوئی نہیں! لیکن یہ جواب تو تمام ملک بلکہ تمام دنیا کے لیے بھی دیا جا سکتا ہے۔

مولوی فضلِ حق صاحب کو ندوہ کے لیے دوبارہ لکھ چکا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ انھوں نے حکیم صاحب کو کوئی تحریر بھیج دی ہے اور جانے کے لیے مستعد ہیں۔ دراصل مدرسۂ عالیہ کی تنخواہیں ان کے پیشِ نظر ہیں۔ چاہتے ہیں کہ رام پور سے زیادہ توقعات ہوں، تب نکلیں۔ میرے خیال میں تو ضرور پرنسپل کی تنخواہ بڑھا دینی چاہیے۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) مولانا نے رانچی پہنچ کر ایک انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھ دی اور ایک مرتبہ خود مجھے سنایا کہ ابتدا میں مٹھی مٹھی بھر آٹا وصول کیا

جاتا تھا۔ پھر سالانہ جلسے ہونے لگے۔ اس کے زیر اہتمام ایک اسکول جاری ہوا، جسے اس وقت کالج کا درجہ حاصل ہے۔ ابتدا میں داروغہ الطاف حسین اس کے سکریٹری تھے۔ مولانا نے اپنے بعض رسائل انجمن کے حوالے کردیے تھے۔ (مہر)

جیسا کہ مہر مرحوم نے لکھا ہے کہ "مولانا نے اپنے بعض رسایل انجمن کے حوالے کردیے تھے"۔ اگر ایسا تھا تو یہ چھپے بھی ہوں گے۔ انھیں تلاش کرنا چاہیے۔

ملک کی آزادی کے بعد اس علاقے نے بہت ترقی کی۔ رانچی نے تاریخی مقام حاصل کرلیا۔ اب یہ علاقہ جھارکھنڈ کے نام سے بہار سے الگ ایک صوبہ بن گیا ہے اور جہاں مولانا نے "مدرسہ اسلامیہ" کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ قایم کیا تھا، وہاں یونی ورسٹی قایم ہوچکی ہے۔ (اس ش)

(۲۵) ﴿۱۶۶﴾

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آپ نے شرکت کی امید تو دلائی، لیکن فیہ دخن۔ صرف اتنا ہی کافی نہیں۔ آپ کو ۲۴ر تک ضرور تشریف لانا چاہیے۔ کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ مسئلۂ تزدیج کی اہمیّت سے کس فرد و بشر کو انکار ہوسکتا ہے، لیکن تاریخوں کا ردو بدل تو آپ کے اختیار میں ہے۔ یا تو پہلے فراغت ہوجائے اور جلسے میں تقریر کریں، تو قلب و دماغ بالکل مطمئن و فارغ ہوں، یا رانچی سے واپسی پر رکھیے کہ یہاں کا قیام آتشِ شوق کے تیز ہونے میں بسر ہوگا۔ وکلًا وعداللہ الحسنٰی۔ آپ حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح والی سنت پر کیوں نہ عمل کریں (۱)۔

بہ ہرحال آپ ۲۴ر تک رانچی ضرور پہنچیں، بلکہ پیشتر اور مولوی ابوالحسنات صاحب کو بھی ضرور لائیں۔ ان کی علالت کا حال سن کر سخت رنج ہوا۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) یعنی نکاح بذریعہ وکیل (مہر)

(۲۶) ﴿۱۶۷﴾

رانچی (بہار)

۲رجنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَاقَنَطُوْا کا مصداق تھا،

اذ کتبکم لم تدن منی تشوقا

بعثت لکم کتبی بشوقی الیکموا

جب بہت عرصہ گزر گیا تو مولوی ابوالحسنات کو لکھا۔ معلوم ہوا وطن میں ہیں اور ھلا بکراً تلاعبھا وتلاعبك کی تعمیل میں مشغول۔ اس مشغولیت میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا(۱)۔ اگر آپ کو قیام رانچی میں میری کوتاہیاں محسوس نہ ہوئیں تو اس سے ان کا عدم نہیں بلکہ آپ کی محبّت کا استغراق ثابت ہوتا ہے۔ اس بات نے دل کی ندامت واعتراف کو اور زیادہ کر دیا۔

سیرت حضرت عمرؓ کا شکریہ(۲)۔ یہ بڑی کمی تھی جو پوری ہوگئی۔ یہ آپ بہت ہی خوب کر رہے ہیں کہ دارالمصنّفین کے سلسلے میں مقدم واہم کتابیں شایع کرتے ہیں۔ عنوانات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالسلام صاحب نے اختصار بہت کیا۔ فقہ واجتہاد اور مراسیل عمرؓ ابن عبدالعزیز وغیرہ کے مباحث نہایت اہم تھے۔ ائمہ کی بعض عمارتیں انھی کی بنیادوں پر کھڑی ہوئی ہیں۔ علی الخصوص امام شافعیؒ۔ ان چیزوں کو غالباً چھوڑ دیا ہے۔ ائمۂ فقہ وحدیث نے ان کی فقہ کو بہت اہمیّت دی ہے۔

''حقیقت'' کی نسبت آپ نے لکھا ہے، لیکن لوگوں کے مذاق کی شتر گربگی کا کیا علاج؟ وہی ''ہمدرد'' کا حال ہوگیا ہے۔ حاجی بغلول اور تجاہل عامیانہ اور کیا کیا جاری ہے۔ یہ حالات دیکھ کر طبیعت بالکل مکدر ہوجاتی ہے۔ اس اخبار کا شان نزول کیا ہے؟ کیا ''الناظر'' نے نکالا ہے؟ آج کل آپ علم اسباب النزول کے مسلمہ ماہر ہیں۔

خصوصاً لکھنؤ کی تنزیلات کے لیے۔

ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں، تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس کم بخت ''تذکرہ'' کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا، میں نے واپس نہیں بھیجا۔ اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصّہ کر کے شایع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شایع کر دی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا حد درجہ ضمنی مطولات وعدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمے کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انھوں نے بجنسہ چھاپ کر، جلد باندھ کر، یکا یک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرزِ تحریر واستدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ جب وہ جلسے کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیوں کہ تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا، جو کبھی کہا تھا۔ حال آں کہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں وہی ہے، جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

''معارف'' کے لیے سیرت ابن تیمیہ کا ایک ٹکڑا جو عقل ونقل کی نسبت ہے، بھیجنا چاہتا ہوں۔ مولوی یوسف نقل کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا تھا، مذہب سلف وتفویض کی تائید صرف تخریب ہے، تعمیر نہیں۔ آپ کی یہ بات میرے لیے نہایت تعجب انگیز تھی۔ بہ ہر حال یہ ٹکڑا دیکھیے گا۔

آج باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ''جامع الشواہد'' کا خرچہ طبع اب تک انجمن

سے نہیں گیا۔ گو یہ معاملہ آپ سے متعلق نہیں، لیکن اس تاخیر کے لیے اپنا افسوس اور لاعلمی ظاہر کرتا ہوں۔ ان سے کہہ دیا ہے کہ فوراً بھیج دیں۔

ہاں سید احمد بھوپالی تعلیم ہی کی غرض سے لکھنو چلے گئے ہیں۔ اس میں طلب وشوق واقعی ہے، لیکن آپ کی اصطلاح میں وہ بھی اصلاحِ عالم کے فتنے میں اسیر ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ تعلیم کے سوا اور ساری باتوں کو اپنے اوپر حرامِ قطعی کر لو اور مولوی سید عبدالحی صاحب کو لکھا کہ کوئی انتظام کر دیں۔ انھوں نے بڑی مہربانی کی اور خارج از مدرسہ تعلیم کا انتظام کر دیا۔

''الرد علی المنطقیین'' کا جو مکمل نسخہ حیدر آباد میں مولانا حمید الدین کو ملا تھا، اسی کا ٹھیک پتا بتلا دیجیے۔ کیا کتب خانۂ آصفیہ میں ہے؟ امید ہے کہ مولانا موصوف سے دریافت کر کے مطلع فرمائیں گے۔

آپ امرتسر نہیں گئے؟ (۳)۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

حواشی:

(۱) یہ غالباً سید سلیمان مرحوم کی دوسری شادی کا ذکر ہے، جو پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد ہوئی تھی۔ (مہر)

(۲) حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سیرت جو مولانا عبدالسلام کی تصنیف تھی۔ (مہر)

(۳) اس سال کانگریس کا اجلاس نہایت خوفناک حالات میں بہ مقام امرتسر منعقد ہوا تھا۔ جلیاں والا باغ کا دردناک واقعہ پیش آ چکا تھا۔ پنجاب میں مارشل لا کے ماتحت ایسے ظلم ہوئے تھے کہ جگہ جگہ ماتم کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رہائی کے بعد سیدھے اس اجلاس میں پہنچے تھے اور رئیس الاحرار کی تقریروں نے جوش وفداکاری کی ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ یہیں غالباً سب سے پہلی مرتبہ مجلس خلافت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جسے جلد لباس عمل پہنایا گیا۔ خود مولانا ابوالکلامؒ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تھے، اس لیے رانچی سے امرتسر پہنچنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ (مہر)

مولانا مہر مرحوم نے تحریر فرمایا کہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں امرتسر میں پہلی مرتبہ مجلس خلافت قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ روشن مستقبل کے حوالے سے مولانا سید محمد میاں نے لکھا ہے کہ ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پہلی خلافت کانفرنس ہوئی تھی اور

اس میں شریک علماء نے مفتی کفایت اللہ دہلوی کی تحریک پر جمعیت علماے ہند کے قیام کا فیصلہ کیا تھا اور دسمبر میں بہ مقام امرتسر اس کے قواعد وضوابط کی منظوری اور عہدے داروں کا انتخاب وغیرہ عمل میں آیا تھا۔ یہ تمام کارروائی مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے زیر صدارت عمل میں آئی تھی۔ اسی کو جمعیت کا پہلا اجلاس قرار دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا مہر کا منشا اسی کا بیان تھا۔ مجلس خلافت کا نام محض سہو قلم ہے۔ چودھری خلیق الزمان کا دعویٰ ہے کہ پہلی خلافت کانفرنس کا اہتمام انھوں نے دہلی کانفرنس سے کچھ عرصہ پہلے لکھنو میں کیا تھا۔ اور میں نے چودھری صاحب کے دعوے کی تردید میں پڑھا ہے کہ مجلس خلافت اس سے بھی پہلے تشکیل پا کر سرگرم عمل ہو چکی تھی۔ (ا۔س۔ش)

(۲۷) ﴿۱۶۸﴾

۲۰ رمئی ۱۹۲۳ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آج مولوی عبدالرزاق صاحب نے آپ کا خط اور ''الجامعہ'' کا وہ نسخہ دکھایا جس میں آپ نے پنسل سے اشارات کر کے بعض اغلاط واضح کیے ہیں۔ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ کو اس کام کی صحت وخوبی کا اس درجہ خیال ہے۔ فی الحقیقت یہی سب سے بڑی مدد ہے جو ہم ایک دوسرے کی کر سکتے ہیں اور ہمیں باہم ایسی ہی توقع رکھنی چاہیے۔

آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ ''الجامعہ'' کے دونوں نمبر میری عدم موجودگی میں نکلے ہیں۔ پہلے نمبر کے لیے میں صرف ''فاتحۃ الجامعہ'' اور ''حرکۃ الخلافۃ ومطالبہا'' دے گیا تھا۔ خیال تھا کہ جلد لکھنؤ سے واپس آجاؤں گا اور تمام مضامین میری موجودگی میں ترتیب پائیں گے، لیکن مجھے آگرہ و پنجاب کا سفر پیش آ گیا اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے اپنے شوق میں بلا انتظار پرچہ مرتب کر کے شایع کر دیا۔ لاہور میں جب مجھے پرچہ ملا تو اشاعت کی جتنی خوشی ہوئی تھی، اتنا ہی اغلاط پر افسوس بھی ہوا۔ تاہم مولوی عبدالرزاق صاحب کو مستحق ملامت نہیں سمجھتا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، یہ بھی بہت ہے۔ ان کے شوق ومناسبت میں کلام نہیں۔ صرف ضرورت مشق کی ہے۔ چند

دنوں تک مشق جاری رہی تو قلم محفوظ ہو جائے گا۔

آپ نے "فاتحة الجامعه" پر بھی تین نشان کیے ہیں۔ پہلی غلطی صریح کمپوز کی غلطی ہے۔ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ یعنی "انما الدعوة الی الجامعة الشرقیه" میں ضمیر رہ گئی ہے۔ باقی رہے بقیہ دو مقام تو ان میں ایک کی نسبت بلاشبہ آپ کی اصلاح بالکل صحیح ہے۔ یعنی "یتحد المتخاصمون" کی جگہ "یتصالح" ہونا چاہیے۔ واقعی خصومت کے لیے اتحاد موزوں نہیں ہے، صلح موزوں ہے لیکن دوسری اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ نے لکھا کہ "سنزید المقالات" کی جگہ "سنضیف" ہونا چاہیے لیکن میں خیال کرتا ہوں "سنزید" بھی صحیح ہے۔

بقیہ مضامین میں جو غلطیاں دکھلائی ہیں، ان میں زیادہ تر کمپوز اور تصحیح کی غلطیاں ہیں۔ مثلاً وطنیین وغیرہ جمع میں ایک "ی" کی کمی۔ جاءت کی جگہ غلط رسم الخط جائت، نتفان کی جگہ نتفاني وغیره ذلك. آپ کو کمپوزیٹروں کا حال معلوم ہے، جو اردو صحیح کمپوز نہیں کر سکتے وہ عربی میں جس قدر باعث مصائب ہوں، کم ہے۔ بڑی وقت تصحیح کی ہے۔ مولوی عبدالرزاق ابھی تصحیح میں بہت کچے ہیں۔ غلطیاں رہ جاتی ہیں اور وہ تصحیح سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

لیکن چند غلطیاں واقعی کتابت اور تراکیب کی ہیں اور آپ کے اشارات بالکل صحیح ہیں۔ مثلاً الذی کا استعمال، انعقادِ عقد کی جگہ، انفضاض، نفض کی جگہ، من الترشیح انفسهم میں مفعول کا حذف وغیرہ۔

لیکن ایک دو مقام پر آپ سے بھی تسامح ہو گیا ہے۔ مثلاً یهنئه هو کی جگہ یهنئه ایاه آپ نے لکھا ہے، حال آں کہ یهنئه هو بھی صحیح نہیں ہے اور یهنئه ایاه بھی نہیں ہونا چاہیے۔ صرف یهنئه وہاں کافی و صحیح ہے۔ اسی طرح بہ اہتمام زائد کی جگہ آپ نے بالغ بنا دیا ہے حال آں کہ زائد بھی ٹھیک ہے اور امثال موجود ہیں۔ ایک جگہ

محکومین میں من نفس تلک الدولہ کی جگہ بنفس ہے لیکن بہ ظاہر تو وہاں ''من'' ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

بہ ہر حال اغلاط ضرور ہیں، خصوصاً بعض تراکیب کی۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ دوسرا نمبر اغلاط سے محفوظ ہے لیکن شاید ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں۔ اس میں بھی نہ صرف کمپوز کی بہ کثرت غلطیاں ہیں بلکہ الفاظ وغیرہ کی بھی۔ ''الحرکة الهندیه'' میں ایک جگہ وکانوا یصرفون قواهم لکھ گئے ہیں۔ یعنی صرف بمعنی خرچ۔ یہ اردو کا محاورہ ہے اور عربی میں لکھ گئے۔

اس سے بھی بڑھ کر غلطی یہ کی کہ سید رشید رضا کا مضمون بلا مناسب رد کے شایع کر دیا۔ بہتر یہ تھا کہ شایع ہی نہ کرتے یا میرے دیکھ لینے کے بعد شایع کرتے۔ یہ بات اس درجے نامناسب ہوئی کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟

آپ آیندہ بھی جو اغلاط دیکھیں۔ مولوی عبدالرزاق صاحب کو ضرور لکھ دیں یا مجھے مطلع کریں۔ اس کی بڑی ضرورت ہے، اس میں مضایقہ وتغافل نہ کیجیے گا۔

مولوی مسعود علی صاحب اور مولوی عبدالسلام صاحب کو سلامِ شوق۔

ابوالکلام

(۲۸) ﴿۱۶۹﴾

جمعیتِ خلافت کا تیسرا وفد، جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے، شروع فروری ۱۹۲۶ء میں ہندستان واپس آ گیا تھا۔ ۹/ مارچ ۱۹۲۶ء کو دہلی میں جمعیّتِ خلافت مرکزیہ کا اجلاس ہوا۔ جس میں وفد نے اپنی دو رپورٹیں پیش کیں۔ پہلی رپورٹ مولانا عرفان اور شعیب قریشی کی مرتبہ تھی، دوسری رپورٹ مولانا ظفر علی خاں کی مرتب کی ہوئی تھی۔ دونوں رپورٹوں میں اختلاف تھا۔ یہ اختلاف جمعیّتِ خلافت کے فیصلوں اور صدرِ خلافت مولانا آزاد کی یادداشت اور ہدایات کی تعبیر کے بارے میں بھی تھا اور حجاز کے حالات کے تجزیے کے

بارے میں بھی۔ اس کا لازمی نتیجہ جمعیتِ خلافت کے حلقے میں بھی انتشار اور بدنظمی کی صورت میں نکلا اور اس کا اثر عوام پر افسردگی اور بے دلی کی صورت میں پڑا۔ مولانا آزاد کے اس مکتوب میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے۔

ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت مولانا آزاد کے نزدیک مسئلۂ حجاز کو وہ اہمیت حاصل نہ رہی تھی جو اس سے قبل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ حجاز میں پوری طرح سلطان ابن سعود نے پیر جما لیے ہیں، اپنے مخالفوں پر قابو پالیا ہے، اب اسے اس قدر نہیں جھکایا جا سکتا کہ حجاز کی امارت سے دست بردار ہو جائے اور انتظام ایک مجلس کے سپرد کر دے۔ جو عالمِ اسلامی کے نمایندوں پر مشتمل ہو۔ پھر اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی مخالفت بھی صحیح نہیں کہ اس سے انگریزوں کو تقویت پہنچے گی۔ اس لیے مولانا آزاد کا خیال تھا کہ اب مسئلۂ حجاز کو اس کی حالت پر چھوڑ کر اپنی توجہ ہندستان میں تعمیری کاموں اور مسلمانوں کے تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی مسایل کو حل کرنے کی کوششوں پر مبذول کرنی چاہیے۔ اس طرف مولانا کے اس خط میں بھی اشارہ ہے۔

مولاناؒ نے ۱۹/اپریل ۱۹۲۶ء کو جمعیّت خلافت کے جس جلسے کے انعقاد کی خبر دی ہے وہ ۱۸/اپریل کو ہوا تھا۔ اس کا سب سے اہم فیصلہ صرف یہ تھا کہ موتمر اسلامی کا اجلاس جو مکّۂ معظّمہ میں ہونے والا تھا اور جس میں حکومتِ حجاز کی تشکیل کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، اس میں شرکت کے لیے ایک وفد بھیجا جائے۔ موتمر کا اجلاس ۲/جون ۱۹۲۶ء کو ہونے والا تھا لیکن بعض اسلامی ممالک کے نمایندے اس وقت تک نہ پہنچ سکے، اس لیے کئی مرتبہ کے التوا کے بعد ۷/جون کو اس کا افتتاح ہوا۔

جمعیتِ خلافت مرکزیہ (ہند) کی جانب سے حسبِ ذیل افراد پر مشتمل ایک وفد نے شرکت کی تھی:

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی (رئیسِ وفد)، ۲۔ مولانا شوکت علی (رکن)، ۳۔ مولانا محمد علی (رکن)، ۴۔ شعیب قریشی (رکن و سیکریٹری)

مولانا آزادؒ کی جانب سے تحریک خلافت میں دلچسپی لینے کی یہ آخری

تحریک تھی، لیکن مولانا آزادؒ جس انداز پر خلافت کی تحریک کو لے جانا چاہتے تھے اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

یہ خط صرف سید سلیمان ندوی کے نام نہ تھا، بلکہ خلافت کمیٹی کے تمام اراکین کو بھیجا گیا تھا۔ (ا۔س۔ش)

جنابِ من!

السلام علیکم، جو صورت حال ملک کی ہو رہی ہے، وہ آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا تعلّق ہے، روز بروز افسردگی، بے دلی، بدنظمی اور انتشار بڑھتا جاتا ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ اب مسلمانوں کو پوری قوت ہندستان کے اندر کے تعمیری کاموں پر خرچ کرنی چاہیے، لیکن چوں کہ کوئی معین راہِ عمل سامنے نہیں ہے۔ اس لیے مایوسی اور بے دلی بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف واقعہ نفس الامر یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی کمزوریوں کے نتائج اب اس درجہ آشکارا ہو چکے ہیں کہ ان کی طرف سے اب مزید غفلت کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہوگا۔

پچھلے دو تین برسوں کے اندر طرح طرح کے نئے ہنگامے اٹھے، لیکن جس تیزی سے اٹھے تھے، اسی تیزی کے ساتھ بیٹھ بھی گئے اور صورت حال میں کوئی مفید تبدیلی نہ پیدا ہوئی۔ اب حالت یہ ہے کہ ملک کی مایوسی اور بدنظمی انتہائی درجے تک پہنچ چکی ہے اور ان تمام لوگوں کے لیے جو صورت حال کا احساس رکھتے ہیں اور اپنی ذمے داریوں سے بے خبر نہیں ہیں، ایک فیصلہ کن سوال پیش آ گیا ہے۔ ضروری ہے کہ موجودہ معلّق اور منتظر حالت ختم کر دی جائے اور ایک آخری فیصلہ ہو جائے، یا تو ہمیں چاہیے کہ جلد از جلد سعی و عمل کا قدم اٹھائیں اور مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کو ایک سخت تاریک مستقل سے بچالیں، یا پھر ایک مدتِ دراز کے لیے ان تمام قومی امیدوں سے دستبردار ہو جائیں جن کے رکھنے اور پرورش کرنے کے ہم آج تک مدعی رہے ہیں، میں امید

کرتا ہوں کہ آپ کم ازکم اس کے لیے تو تیار نہ ہوں گے کہ آخری صورتِ حال اختیار کریں۔

اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو خدارا اٹھیے! ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ نئی ہمت، عزم سے کام لیجیے اور تجربہ کر کے دیکھ لیجیے کہ آپ کے قدم ہمت کے اٹھتے ہی کس طرح تمام ملک آپ کی گردِ راہ کو راہنما بنانے کے لیے تیار ہے۔ یقین کیجیے! ملک کی سرگرمیوں کے قویٰ شل نہیں ہو گئے، صرف تھوڑی سی تھکن پیدا ہوگئی، جس کو ہماری ایک جان دار حرکتِ قدم دور کر دے سکتی ہے۔ ساری مشکل اسی اولین قدم میں ہے، اگر یہ اٹھ جائے تو راستہ صاف ہے۔

اس بات میں ایک آخری فیصلہ کر دینے کے لیے ۱۹/اپریل ۱۹۲۶ء کو دہلی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو آپ اس جلسے میں ضرور شریک ہوں اور ایک مرتبہ وہ چند باتیں میری زبان سے سن لیں، جن کے سنانے کے لیے میرا دل مضطرب ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ آیندہ بھی اپنا وقت دیں۔ یہ آپ کے ارادے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر موقوف ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک مرتبہ یہ سفر کر کے ہم سب اکٹھے ہو جائیں اور جو صورت حال درپیش ہے، اسے سن لیں۔

میں جانتا ہوں آپ کے سفر کے لیے موانع ہوں گے، مگر میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان پر غالب آجائیں گے۔ یہ خلافت کمیٹی کے پچھلے جلسوں کی طرح محض رسمی تجاویز کا جلسہ نہیں ہے۔ یہ ایک آخری اور فیصلہ کن اجتماع ہے۔ ہمیں سات کروڑ مسلمانوں کے لیے فیصلہ کرنا ہے کہ ان کی آیندہ قسمت روشنی کے حوالے کی جائے یا تاریکی کے؟ کس قدر درد اور قلق کی بات ہوگی، اگر آپ ایسے اجتماع کے لیے وقت نہ نکال سکے!

میں یہ بات بھی آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس افسردہ اور پر

آشوب سال کی صدارت کی ذمے داری چند ارادوں اور امیدوں کی بنا پر منظور کی تھی۔ میری بقیہ زندگی کے قلیل اوقات میں اب اس کی گنجایش نہیں رہی ہے کہ کانفرنسوں اور انجمنوں کی رسمی صدارتوں سے زیب و زینت پائیں، میں نے مجبور ہو کر اور کسی کو قدم نہ بڑھاتے پا کر یہ بار اٹھایا اور اس لیے اٹھایا کہ خلافت کمیٹی کے ذریعے مسلمانوں کی موجودہ خطرناک بدحالی و بدنظمی دور کی جائے۔ اور ان کے سامنے ملک کے اندر کی قومی ضرورتیں نمایاں ہوں۔ میں اسی لیے اپنے تمام ذاتی کاموں کو انتہائی ابتری کی حالت میں چھوڑ کر برما گیا اور باوجود ملک کی افسردگی کے ۵۰ ہزار روپے کے فنڈ سے ہمارے نئے سال کا آغاز ہو گیا۔ یہ حالت ہر طرح امید افزا ہے لیکن مجھے افسوس اور درد کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی خلافتِ کمیٹی کے حلقے میں وہ مستعدی نہیں دیکھتا، جس کے اعتماد پر میں نے یہ بار اپنے سر لیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اب سب کے علم میں آجائے کہ میں ۱۹۲۶ء کے بقیہ ایام ضایع کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ضروری ہے میں معلوم کرلوں کہ مطلوبہ کام انجام پا سکتا ہے یا نہیں اور ہمرہانِ کار آمادۂ سفر ہیں یا درماندۂ کار؟ اگر کام کی امید نہیں تو بہتر ہے کہ میں بھی یکسوئی کرلوں اور ان کاموں کے لیے ہمہ تن وقف ہو جاؤں، جن کے لیے اپنے آپ کو کمیٹی کے کاموں سے کہیں زیادہ موزوں اور بہت زیادہ مضطرب پاتا ہوں۔

بہر حال آیندہ جلسہ ہمارے لیے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اس فیصلے میں مجھے اپنی زندگی اور اوقات کا فیصلہ ڈھونڈنا ہے۔ ملتجی ہوں کہ اس موقعے پر کم سے کم اتنا تو کیجیے کہ تھوڑی سی زحمت برداشت کر کے آیئے اور جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے، ایک مرتبہ سن لیجیے۔ اگر اس قدر گذارش حال پر بھی آپ کی جانب سے اغماض ہوا تو پھر مجھے یہ تصور کر لینے کی اجازت دے دیجیے کہ میری صدائے کار اور التجائے ہمرہی کا جواب آپ کی جانب سے ردِ دعوت اور عدم سماعت ہے اور میرے لیے بھی آپ کا آخری فیصلہ ہے۔

وفقنا اللہ سبحانہٗ وایاکم بمایحبّہٗ ویرضاہ.

اند کے باتو بگفتم غمِ دل، ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

فقیر ابوالکلام
کلکتہ، ۲۵ / مارچ ۱۹۲۶ء

(۲۹) ﴿۱۷۰﴾

دریا گنج۔ دہلی
۷/ جنوری ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز!

''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد کسی نہ کسی طرح چھپ کر نکل گئی۔ آپ کو اس لیے نہیں بھیجی گئی کہ خیال تھا کلکتہ سے مجلد نسخے آ جائیں تو بھجواؤں، لیکن آج ایک تار سے معلوم ہوا کہ دو ہفتہ کی مزید دیر ہوگی۔ ادھر پولیٹیکل حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کتنے دنوں بلکہ گھنٹوں تک جیل سے باہر رہ سکوں گا، اس لیے طبیعت نے تقاضا کیا کہ غیر مجلد ہی بھجوا دوں:

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگزارید کہ ایں نسخہ مجزا ماند

امید ہے مع الخیر و عافیت ہوں گے۔ مولوی عبدالسلام صاحب کے مشاغل کا کیا حال ہے؟ ملتے ہوں تو سلامِ شوق پہنچا دیجیے۔ مولوی مسعود صاحب نہیں معلوم وہاں ہیں یا نہیں، اگر ہوتے تو آپ کے ذریعے کہلاتا کہ ٹوپیوں کا اب تک انتظار ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

(۳۰) ﴿۱۷۱﴾

دہلی

۲۰ رجنوری ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز!

چند دنوں کے لیے کلکتہ چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو لکھنو جانا پڑا۔ اب مہلت ملی تو سب سے پہلے آپ کے خط پر نظر پڑی۔ سحر کا وقت ہے، چاے کا دور چل رہا ہے اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ رمضان میں یہی دور میرے لیے جام صبوحی کا بھی کام دیتا ہے اور سفرۂ افطار کا بھی۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیا فتند
جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

آپ نے جس بات کی شکایت کی ہے، یقین کیجیے میں خود اسے بطور واقعے کے محسوس کرر ہا ہوں۔ میں نے ادھر ارادہ کرلیا تھا کہ اب تمام کاموں سے الگ ہوکر محض تصنیف وتالیف کے لیے وقف ہوجاؤں گا اور اگر موجودہ صورت حال اس طرح پیش نہ آ گئی ہوتی، جس طرح پیش آئی ہے، تو میں قطعاً یکسوئی کر لیتا۔ لیکن کیا کیا جائے رفتارِ زمانہ ہماری خواہشوں کی پابند نہیں:

تجری الریاح بما لاتشتهی السفن

آپ نے ''ترجمان القرآن'' جلد دوم کی اشاعت کے لیے جو آمادگی ظاہر کی ہے، یقین کیجیے اس سے میرا دل نہایت درجہ متاثر ہوا: یہ محبّت واخلاص کا بڑے سے بڑا ثبوت ہے، جس کا میں آپ سے متوقع ہوسکتا تھا۔ فعلاً یہ بات ظہور میں آسکے یا نہ آسکے، لیکن میرے دل پر آپ کی محبّت کا نقش ثبت ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم ''معارف'' پریس کا اب کیا حال ہے؟ کیا آپ بہ آسانی ایسی کتابیں چھپوا لے سکتے ہیں جو زیادہ مقدار میں چھپیں؟ اگر آپ نے انجن لگالیا ہے

تو آپ بڑی سے بڑی تعداد چھاپ سکتے ہیں۔

جی چاہتا تھا آپ سے ملاقات ہو۔ دیکھیے اب کب ہوتی ہے؟

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

(۳۱) ﴿۱۷۲﴾

۳۔ اسٹوررروڈ، کلکتہ

۸؍جون ۱۹۳۲ء

صدیقی الاعز!

اُمید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔ مدت ہوئی آپ نے لکھا تھا، ابن تیمیہ کی الردعلی المنطقیین نقل کرائی ہے۔ اگر نقل قابلِ اشاعت ہو اور کسی وجہ سے شایع نہ کر سکتے ہوں تو بہتر ہوگا شیخ محمد منیر ازہری کے حوالہ کردی جائے۔ وہ ابن تیمیہ کی تمام بقیہ مصنفات شایع کرنا چاہتے ہیں اور الردعلی المنطقیین کے خواہشمند ہیں۔ میں نے انھیں قاضی شوکانی کی تفسیر ''فتح القدیر'' کی نسبت لکھا تھا۔ وہ انھوں نے شایع کردی۔

براہِ عنایت کتاب کی صورت حال سے مطلع کیجیے۔ مجھے جیل میں دورانِ سر کی شکایت ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے طبیعت بے حد مضمحل رہی۔ اب گونہ افاقہ ہے۔

مولوی مسعود صاحب اگر ہوں تو سلام پہنچا دیجیے۔ معلوم نہیں مولوی عبدالسلام صاحب آج کل کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں؟ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۳۲) ﴿۱۷۳﴾

۳۔ اسٹوررروڈ، کلکتہ

۲۸؍جون ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز!

خط پہنچا تفسیر ''فتح القدیر'' کا نسخہ خود مصنّف کا لکھا ہوا صنعا میں موجود تھا۔ ان کی نقل چھاپی گئی ہے۔ مدت ہوئی میں نے اس کی پہلی جلد نواب علی حسن خاں کے یہاں دیکھی تھی۔ مگر بالاستیعاب دیکھنے کا اب موقع ملا اور بہت مایوسی ہوئی۔ کوئی خصوصیّت ایسی نہیں جس کی بنا پر اسے ممتاز تصور کیا جائے۔

آپ نے خط میں کسی اخبار کے مضمون کا ذکر کیا ہے، مگر اشارہ اس درجہ مبہم ہے کہ سمجھ نہ سکا۔ کس اخبار کی طرف اشارہ ہے۔ علاوہ بریں عبارت میں بعض الفاظ بھی غالباً چھوٹ گئے ہیں۔

''معارف'' کا آخری پرچہ میں نے دیکھا، اس میں کسی اخبار کا ذکر نہیں براہِ عنایت لکھیے کون مضمون اور کس اخبار میں شایع ہوا ہے؟ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

(۴۳) ﴿۱۷۴﴾

۴۔ اسٹور روڈ، کلکتہ

۱۳/ اگست ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز!

ایک کارڈ اعظم گڑھ سے ہو کر دفتر میں پہنچا ہے، جس میں ''ترجمان القرآن'' کی درخواست ''معارف'' کے حوالہ سے درج ہے۔ کیا آپ نے معارف میں کچھ لکھا ہے؟ میری نظر سے وہ پرچہ نہیں گزرا اگر ممکن ہو تو بھجوا دیں۔

جلد دوم بقول آپ کے ''مصروف استراحت'' ہے، لیکن مسند ''تصنیف'' پر نہیں، آغوشِ کتابت وطباعت میں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس مرحلے کی مصیبتیں کیوں کر حل کی جائیں۔

میں نے تو اب فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کے بقیہ انفاس صرف اسی کام کے لیے

وقف کردوں۔ دیکھیے مہلت ملتی ہے یا نہیں (۱)۔

ان شاء اللہ کوشش کروں گا کہ ''معارف'' کے لیے وقت نکالوں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) مہلت نہ ملی اور یہ ارادہ بارہا فسخ ہوا۔

(۳۴) ﴿۱۷۵﴾

۳۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ

۲۰ راگست ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز!

چوں کہ ایک درخواست میں ''معارف'' کا حوالہ دیا گیا تھا، اس لیے خیال ہوا تھا کہ شاید کوئی تحریر نکلی ہے۔ اب معلوم ہوا وہ اشتہار تھا۔ آپ نے اشتہار کی مزید اشاعت کے لیے جو آمادگی ظاہر کی ہے، اس کے لیے شکرگزار رہوں۔

خیام پر اگر کچھ آپ نے لکھا ہے تو یہ بے کار کام کیوں ہوا؟ خیام کے بعض رسایل کا مجموعہ روس سے شایع ہو چکا ہے کیا ان کے علاوہ نئے رسایل دستیاب ہوئے ہیں؟ اگر غیر مطبوعہ رسایل ہیں تو یقیناً یہ ایک قیمتی اضافہ ہوگا، انھیں ضرور شایع کیجیے۔

یادش بخیر! مولوی عبدالسلام صاحب آج کل کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں؟ اگر اعظم گڑھ میں ہوں تو سلام پہنچا دیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

﴿۱۷۶﴾ (۳۵)

۲۷/اگست ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز!

مدت ہوئی میں نے ایک مجموعۂ رسایل دیکھا تھا جس میں خیام کے بھی دو رسالے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ روس کا چھپا ہوا تھا۔ غالباً ایک روسی مستشرق کی سالگرہ کی تقریب پر مرتب کیا گیا تھا۔ قیمت زیادہ تھی، اس لیے میں نے اس وقت نہیں لیا۔ کچھ دنوں کے بعد دریافت کیا تو معلوم ہوا موجود نہیں ہے۔

یہ مجموعہ مولوی شرف الدین مرحوم نے ممبئ میں منگوایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جرمنی یا ہالینڈ کا ایک مجموعۂ رسایل ہے، جس میں بوعلی سینا کے رسایل ہیں۔ اس مجموعے میں غالباً ''الکون والتکلیف'' چھپ گیا ہے۔ یہ مجموعہ میرے پاس ہے، لیکن دہلی میں ہے اور مکان بند ہے۔ میں ہفتے عشرے میں جا رہا ہوں، جاتے ہی دیکھوں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا۔ ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو، لیکن آپ کے ناموں میں ''الکون والتکلیف'' اور ''کلیات الوجود'' مجھے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

غور کرنے سے یہ بات بھی یاد آتی ہے کہ ''الکون والتکلیف'' بہت مختصر ہے، زیادہ سے زیادہ چار پانچ صفحات ہوں گے اور غالباً کسی سایل کے جواب میں ہے۔

یہ تاثر بھی یاد ہے کہ اس میں کوئی قابلِ اعتنا بات نظر نہیں آئی تھی۔

آپ کے پاس ''اکتفاء القنوع'' کا نیا ایڈیشن ہے یا نہیں، جو ڈاکٹر اڈورڈ نے کئی جلدوں میں ازسرِ نو مرتب کر کے شایع کیا ہے؟ اگر ہو تو اس میں دیکھیے، اگر نہ ہو تو شرف الدین اینڈ سنس بمبئ، بھنڈی بازار کے پاس موجود ہے، منگوا لیجیے۔ مطبوعاتِ عربیہ کے لیے بہت حد تک یہ اب مکمّل فہرست ہوگئی ہے، خصوصاً مطبوعاتِ یورپ کا پورا استقصا کیا ہے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۳۶) ﴿۱۷۷﴾

۶ راگست ۱۹۳۵ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

انجمن اصلاح المسلمین کان پور کئی سال سے ذکرِ سیرت کا اجتماع منعقد کیا کرتی ہے۔ گذشتہ سال تمام ارکان انجمن اس کے خواہش مند تھے کہ آپ وقت نکالیں اور جلسے میں تقریر کریں، لیکن آپ وقت نہ نکال سکے۔ امسال پھر ربیع الاول میں جلسہ ہونے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو سکے، آپ وقت ضرور نکالیں اور ارکانِ انجمن کو نا امید نہ کریں۔ یہ لوگ اخلاص و مستعدی کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں اور ضروری ہے کہ ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۳۷) ﴿۱۷۸﴾

کلکتہ

صدیقی العزیز!

مصری وفد کی بڑی لمبی داستان ہے۔...... نے سب کو بے وقوف بنانا چاہا، لیکن چوں کہ مسلمانوں میں بے وقوف بننے کی استعداد زیادہ ہے، اس لیے سب سے زیادہ یہی بنے۔ سب سے پہلے ممبئی کے چند فرصت طلبوں نے ڈاکٹر امبیڈ کر کے اعلان اور ''مولانا عبداللہ گاندھی'' کے معاملے کو ہر طرح کے مبالغوں سے آراستہ کر کے مصر پہنچایا۔ پھر عبداللہ فوزان بھی اس چکر میں آ گئے اور جمعیتِ شبان، قاہرہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی کہ ہندستان کے تمام اچھوت مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ علمائے ازہر کا ایک تبلیغی وفد ضرور بھیجنا چاہیے۔ مالابار کے ایک طالب علم عبدالقادر نے

بھی بہت سی غلط سلط باتیں لکھ دیں اور غالباً لاہور کے علامہ گابا نے بھی اس میں کافی حصّہ لیا۔ وہ قاہرہ میں ڈاکٹر عبدالحمید سے مل چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے ان سے خط و کتابت کی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے جب ترسیل وفد کے انتظامات مکمّل ہو گئے تو شیخ ازہر اور ارکان جمیعت نے یکا یک محسوس کیا کہ صورت حال قابل اعتماد نہیں ہے۔ مزید معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ چناں چہ اکتوبر میں شیخ مراغی کا ایک خط مجھے وصول ہوا تھا اور بعد کو ممبئی سے عبداللہ فوزان کا بھی ایک خط ملا تھا۔ دونوں نے استفسار کیا تھا کہ کسی تبلیغی وفد کی ترسیل سود مند ہو گی؟ میں نے انھیں لکھا تھا کہ اچھوتوں کے لیے مصر کا وفد یہاں آ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس غرض سے وفد کا بھیجنا نہ صرف بے سود ہو گا بلکہ کئی اعتبار سے مضر ثابت ہو گا۔ لیکن اگر آپ وفد کا اہتمام کر چکے ہیں تو اسے ایک صحیح اور ضروری مقصد کے لیے کیوں نہ کام میں لائیں؟ یعنی مصر اور ہندستان کے علمی اور اسلامی روابط کے استحکام و ترقی کے لیے بھیجیں۔ یہ وہ کام ہے جو برسوں پہلے ہونا تھا کم از کم اب شروع کیا جائے۔

معلوم نہیں پھر کیا ہوا؟ مصر ہی میں یہ بات قرار پا گئی تھی یا بمبئی پہنچ کر اور صورت حال دیکھ کر قرار دی گئی؟ مگر بہ ہر حال وفد نے محض تعلیمی نوعیت اختیار کر لی اور یہ بہت اچھا ہوا۔ علماے وفد بہ ہر حال ازہری ہی ہیں، اس لیے کوئی زیادہ توقع تو کی نہیں جا سکتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اب ازہر وہ ازہر نہیں رہا جو پچاس برس پہلے تھا اور جس سے شیخ محمد عبدہ کو بالکل مایوس ہو جانا پڑا تھا۔ اب ازہری مولوی بہ ہر حال وقت کی عام مولویانہ سطح سے بلند تر ذہنیت رکھتا ہے اور شیخ مراغی کی اصلاحات نے تو واقعی اسے بالکل ایک نئے عالم میں پہنچا دیا ہے۔

میں نے آپ کی موجودگی کا حال جس غرض سے دریافت کیا تھا، اس سے عنقریب مطلع کروں گا۔ فروری کے دوسرے ہفتے تک تو آپ اعظم گڑھ ہی میں ہیں؟

یادش بخیر! مولانا عبدالسلام صاحب کا کیا حال ہے؟ اگر اعظم گڑھ میں ہوں تو

سلام پہنچا دیجیے۔افسوس ہے مولوی مسعود علی صاحب نے ٹوپیاں نہیں بھیجیں (۱)۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) صحیح تاریخ کا پتا نہ چل سکا۔میرا اندازہ ہے کہ یہ خط ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء کا ہے۔(مہر)

۷رجنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں مولانا مسعود علی اور ٹوپیوں کا ذکر آیا ہے۔لیکن کیا چار پانچ سال تک ٹوپیوں کے وعدے کا انتظار کیا جاسکتا ہے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء ہی کا یہ خط ہوگا۔(ا۔س۔ش)

(۳۸) ﴿۱۷۹﴾

۱۰/اکتوبر ۱۹۳۶ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

معاف کیجیے گا، جواب میں تاخیر ہوئی۔ میں کلکتہ میں نہیں تھا۔ ڈاک یہیں جمع ہوتی گئی۔آپ کا خط بھی اسی میں رہا۔واپسی کے بعد علالت نے دو ہفتے تک مہلت نہیں دی۔اب جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بلاشبہ آپ کی شکایت بجا ہے۔ ہمیشہ خیال رہا کہ اعظم گڑھ کے لیے وقت نکالوں اور ہمیشہ یہی ہوا کہ قدم نہ اٹھا سکا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے میرے لیے کون بلانا چاہتا ہے؟ جو بلاتا ہے، کسی جلسے کے لیے، مدرسے کے لیے اور وعظ وتقریر کے لیے اور میرا یہ حال ہوگیا ہے کہ کوئی بات بھی طبیعت پر اس درجے گراں نہیں گزرتی، جس قدر جلسوں کی شرکت اور فرمایشی تقریریں! اگر میں اعظم گڑھ آؤں تو وہاں بھی یہی مصیبت ہوگی۔آپ تک اس کے خواہش مند ہوں گے کہ ایک جلسہ اور تقریر ضرور ہونی چاہیے!

اس بارے میں میں اپنی طبیعت کا حال بیان نہیں کرسکتا۔ بیان کروں تو امید نہیں کہ احباب اسے سمجھنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس بارے میں تمام دنیا کو شاکی پاتا ہوں، مگر میں بھی صورت حال پر قانع ہوگیا ہوں۔

ادھر مدرسہ سرائے میر کے مولوی رشید الدین صاحب(۱) نے اصرار شروع کیا۔ پھر لکھنؤ آئے اور اصرار کو انتہائی حد تک پہنچا دیا، میرے لیے بہت ہی دشوار تھا کہ ان کے اصرار کے مقابلے میں اپنی عذر خواہی پر قایم رہ سکوں۔ مدرسے کے متعلق میرے تاثرات یہ ہیں کہ یہ ایک صحیح معنوں میں مخلصانہ کام انجام دیا گیا ہے۔ میں مدرسے کے لیے جو کچھ کرسکتا ہوں، ضرور کروں گا، لیکن وہاں جو کچھ اصرار ہے جلسے اور وعظ گوئی پر ہے۔ میرے لیے یہ زیادہ سے زیادہ دشوار اور نا قابل برداشت کام، ان کے لیے یہی سب سے زیادہ ضروری۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تعمیل کروں۔ انشاءاللہ کوتاہی نہیں کروں گا۔ بڑی بات یہ بھی ہوگی کہ اعظم گڑھ آنے اور آپ لوگوں سے دارالمصنّفین میں ملنے کا قدیم ارادہ پورا ہوجائے گا۔ کاش سرائے میر میں یہ جلسے کا معاملہ نہ ہوتا۔ میں جاتا مدرسے کو دیکھتا، اور کارکنوں سے ملنے کی خوشی وقتی حاصل کرتا۔

ابوالکلام

حاشیہ:

(۱) مولانا حمید الدین فراہی مرحوم (وفات، ۱۱رنومبر ۱۹۳۰ء) کے چھوٹے بھائی مولوی رشید الدین، اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

(۳۹) ﴿۱۸۰﴾

صدیقی العزیز!

خط پہنچا

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ماخوش کردی!

آپ نے میرے دل کا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اعظم گڑھ میں بھی جلسے اور وعظ کی مصیبت آئے گی۔ یہ معاملہ میرے لیے ایک قطعاً نا قابلِ علاج ہو گیا ہے۔ میری کوئی سعی، کوئی فصاحت و بلاغت، کوئی بحث اس بارے میں سود مند نہیں

ہوتی۔ میں اگر لوگوں سے کہوں کہ تقریر کرنا میرے لیے مہلک ہے اور آدھ گھنٹے کے بعد مر جاؤں گا، جب بھی لوگ بہ خوشی آمادہ ہو جائیں گے کہ کم از کم آدھ گھنٹہ تک بکواس کرالیں، پھر ہجوم مصافحہ کی جگہ تجہیز و تکفین کا اہتمام کیوں نہ کرنا پڑے، کوئی مضایقہ نہیں بلکہ اصل مقصد جس طرح میری زندہ لاش سے حاصل ہوسکتا ہے مردہ لاش سے بھی حاصل کرلیا جاسکتا ہے۔ شاید بعض اعتبار سے دوسری حالت زیادہ نافع اور نتیجہ خیز سمجھی جاتی ہو۔

آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرے ان احساسات کو سمجھنے سے انکار نہیں کیا، یقین کیجیے آپ کا خط پڑھ کر بے حد شکر گذار ہوا ہوں۔

میں خود چاہتا ہوں دارالمصنّفین میں ٹھہروں اور بجز وہاں کے حلقے کے اور کوئی دعوت التفات نہ دے۔ جب آپ نے اس طرف سے مطمئن کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں متامل ہوں۔ تین دن تو نہیں دو دن ضرور وہاں صرف کر دوں گا۔

مولوی رشید الدین صاحب کہتے ہیں کہ جمعہ سرائے میر میں بسر ہو۔ پس یہ پروگرام سمجھیے کہ پہلے سرائے میر اور پھر دارالمصنّفین میں ایک دن پہنچنا اور دوسرے دن روانہ ہو جانا میں سمجھتا ہوں کہ دونوں جگہ کا درمیان فاصلہ بہت ہی کم ہے۔

مولوی مسعود علی صاحب (۱) کی مسرت میں میری مسرت کا انعکاس ہے۔ معلوم نہیں مولوی عبدالسلام صاحب (۲) بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں؟ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

۲۵/اکتوبر ۱۹۳۶ء

حواشی:

(۱) مولانا مسعود علی ندوی۔ بھیارہ (قصبہ مسولی ضلع بارہ بنکی) کے رہنے والے اور قدوائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھیارہ اور مسولی میں اور اعلا تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل کی۔ علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں سے تھے، لیکن وہ علمی سے زیادہ عملی انسان تھے۔ ان کے بے تکلف دوست انھیں سالار مسعود غازی کے نام سے پکارتے تھے۔ دارالمصنفین کے قیام و تنظیم میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ سیاست میں نیشنلسٹ اور کانگریسی خیالات رکھتے تھے۔ آخر عمر میں مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہو گئے تھے۔ بڑے دوست نواز اور مجلس طراز شخصیت کے مالک تھے۔ ۲۷/اگست ۱۹۶۷ء کو اعظم گڑھ میں وفات پائی اور دارالمصنفین میں دفن ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے بہت قریبی اور بے تکلفانہ تعلقات تھے۔

(۲) مولانا عبدالسلام ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نامور فرزند اور علامہ شبلی کے قابلِ فخر شاگرد تھے، ۸۳-۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، اور ۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اعظم گڑھ میں انتقال ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے انتقال پر ۱۹/اکتوبر کے صدقِ جدید (لکھنؤ) میں جو شذرہ لکھا تھا من وعن درج ہے:

''صاحبِ شعرالہند'' و ''صاحبِ اسوۂ صحابہ'' مولانا عبدالسلام ندوی گو جیتے جی ادھر سالہا سال سے مرحوم ہو چکے تھے اور عرصۂ دراز سے ان کا تصنیفی مشغلہ گویا بند تھا۔ بالآخر ۴/اکتوبر کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے اور اپنی خواب گاہ کے لیے اپنے استاد مولانا شبلی کے پہلو میں احاطۂ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں جگہ پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون''۔

ان کی تصانیف میں ''اقبالِ کامل'' بہت مشہور ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام مولانا آزاد کے متعدد خطوط میں محبت کے ساتھ ان کا ذکر آیا ہے اور مولانا آزاد نے ان کے حسنِ اخذ مضامین، ترتیب و تزئین مطالب اور سلیقۂ تالیف کی تعریف کی ہے۔ مولانا آزاد سے دوستانہ تعلق تھا۔ سید صباح الدین عبدالرحمن نے ان کے انتقال پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔ اس آئینے میں ان کی شخصیت بہت حسین اور دل چسپ نظر آتی ہے۔ سید صباح الدین کا یہ مضمون ''بزمِ رفتگان'' حصۂ اول میں شامل ہے۔

(۴۰) ﴿۱۸۱﴾

کلکتہ

۳/فروری ۱۹۳۷ء

صدیقی العزیز!

یوپی میں پولنگ تو ۸/ (فروری ۱۹۳۷ء) تک ختم ہو جائے گی اور پھر جو کچھ بھی ہو۔ آپ سے اور دارالمصنفین سے اس کا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ آپ کا وقت ہوگا، جو آدھ گھنٹہ میں آپ دے آئیں گے یا کسی دوست کے لیے ساعی ہوں گے تو جہد و سعی کا زمانہ اب ختم ہو رہا ہے۔ آپ لکھتے ہیں، ۲۸/فروری کے بعد موسم اچھا

ہو جائے گا۔ اچھا کیا خاک ہوگا؟ گرمی شروع ہو جائے گی۔ آپ کے اس مقدمے سے مجھے قطعاً اختلاف ہے کہ موسم کی موجودہ حالت اچھی نہیں اور اچھا موسم اس وقت ہوگا جب اچھا موسم ختم ہو جائے گا۔

براہِ عنایت مجھے بلاتاخیر مطلع کیجیے کہ لکھنؤ سے کب واپسی ہوگی یا لکھنؤ سے جس دن چلیے، مجھے تار دے دیجیے کہ اعظم گڑھ جا رہا ہوں۔

کیا آپ سمجھتے ہیں میں نے مولوی عبدالرزاق صاحب (ملیح آبادی) کو نہیں سمجھایا ہوگا؟ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت نے دوسرا رنگ اختیار کرلیا ہے اور اب نصح و تذکیر بے فایدہ ہے۔ ادھر عرصے سے وہ ملے بھی نہیں۔ ان کا اخبار بھی میری نظر سے نہیں گزرتا، کیا ادھر انھوں نے اس قسم کا کوئی مضمون شایع کیا ہے؟ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۴۱) ﴿۱۸۲﴾

صدیقی العزیز! والسلام علیکم

آپ نے کہا تھا، ''الرد علی المنطقیین'' ابن تیمیہ کا نامکمّل نسخہ آپ کے پاس منقولۂ حیدرآباد موجود ہے۔ کیا آپ اس کی مجھے ایک نقل دے سکتے ہیں؟ نقل کی اجرت دے دی جائے گی یا ممکن ہے کہ ایک ماہ کے لیے آپ وہ نسخہ میرے پاس بھیج دیں(۱)؟

ابوالکلام

حواشی:

(۱) خط کی تاریخ تحریر کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا، لہٰذا اسے تمام خطوط کے آخر میں جگہ دے دی ہے۔

(۲) الرد علی المنطقیین ''ابن تیمیہ کا ذکر مکتوب ۸ (بلا تاریخ)، مکتوب ۲۷، مورخہ ۲رجنوری ۱۹۲۰ء اور مکتوب: ۳۲، مورخہ ۸رجون ۱۹۳۲ء میں آیا ہے۔ ۸رجون کے مکتوب میں جس انداز سے ذکر آیا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ خط بھی اسی زمانے (۱۹۳۲ء) کا ہوگا۔ (ا۔س۔ش)

مولانا محمد علی ایڈیٹر ہمدرد (دہلی):

﴿۱۸۳﴾

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس خط میں ایک مستقل مذہبی کانفرنس مثل ایجوکیشنل کانفرنس کی تجویز کی جو تائید فرمائی ہے۔ وہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جس پر توجہ نہیں دی گئی اور افسوس کہ آج بھی کسی ایسی اسلامی تبلیغی اور مذہبی کانفرنس کا وجود نہیں ملتا جو مذہبی گروہی اختلافات سے بلند ہو۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان روز بہ روز اشتقات وافتراق کے سمندر میں غرق ہوتے چلے جارہے ہیں۔ انھیں اس اہم واقدم ضرورت کا احساس بھی نہیں اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں کہ ایک روز ''وحدتِ ملّت'' کی ایسی تحریک بھی اتحادِ ادیان کی دعوت اور کسی نئے دینِ الٰہی کے قیام کی کوشش سمجھی جائے گی!

بخدمت ایڈیٹر صاحب ہمدرد

جنابِ من!

آگرہ کی مجلس اشاعت اسلام کے بعد میں نے اس مبحث پر کچھ نہ لکھا، حتی کہ اس مجلس کے تذکرے کی بھی الہلال میں مہلت نہ ملی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اس کا تذکرہ ملتوی کر دینا ہی بہتر نظر آیا، جب تک کہ اعلان کے ساتھ ہی کام کی بھی ایک مقدار نہ دکھلائی جا سکے۔

آج میں نے ایک لیڈنگ آرٹیکل لکھ کر الہلال میں بھیج دیا ہے۔ اس سے تفصیلی حالات معلوم ہوں گے، لیکن سردست ایک غلط فہمی کا تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں جو آگرہ کی ''مجلس اشاعت اسلام'' کی نسبت پیدا ہوگئی ہے اور بعض حضرات کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اصل حالات معلوم نہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ آگرے میں جو عظیم الشان مجمع منعقد ہوا تھا، وہ اس غرض سے تھا کہ ایک مذہبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی جائے اور اسی بنا پر بعض حضرات دریافت

فرماتے ہیں کہ اس کی عملی کارروائی کیا ہوئی؟ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس (۱) کے انعقاد سے پہلے مجھے خیال ہوا کہ اس مجمع سے اس مبحث اہم واقدم کے متعلق بھی کچھ کام لینا چاہیے۔ چناں چہ بعض اخبارات میں تار کے ذریعے اعلان کیا کہ ایک خاص جلسہ تبلیغ اسلام کے مقصد پر غور کرنے کے لیے منعقد ہو۔ آگرہ پہنچ کر بعض دیگر احباب سے بھی مشورہ کیا۔ قرار پایا کہ ۲۹ ر کو کانفرنس کے پنڈال میں اس کا انعقاد بہتر ہوگا اور اس بارے میں جو خیالات میرے ہیں، اس جلسے میں انھیں ظاہر کروں۔ میں نے ایک مفصّل تقریر میں اپنے خیالات ظاہر کیے اور اس مسئلے کے ان موانع ومشکلات کو ایک ایک کر کے بیان کیا جن کی وجہ سے اب تک کوئی تحریک قابلِ ذکر عملی کام نہ کر سکی۔ آخر میں حاضرین سے التجا کی کہ اگر چہ ممالک خارجہ کا کام میرے خیال میں آخری کام ہے، لیکن چوں کہ فضل الٰہی سے خود بخود اس کی تحریک پیدا ہوگئی ہے، اس لیے اس کو بھی زیادہ وسعت دیں۔ نیز ہندستان کے کام کے لیے ایک مرکزی مشن قایم کریں۔

اس کے بعد بعض اور حضرات نے تقریریں کیں اور ایک مقرر نے تجویز پیش کی کہ مثل کانفرنس ولیگ کے ایک مذہبی کانفرنس بھی قایم کرنی چاہیے۔ یہ تجویز لوگوں کو بہت پسند آئی لیکن پسندیدگی اور عمل میں فرق ہے۔ اس کے لیے نہ تو لوگ تیار تھے اور نہ غور کرنے کے لیے وقت تھا۔ بہ ہر حال ایک سرسری کارروائی کے بعد جلسہ ختم ہوگیا۔

پس میں یہ ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ:

۱۔ مذہبی کانفرنس کی تجویز میں نے نہیں پیش کی بلکہ ایک اور بزرگ نے پیش کی تھی! البتہ یہ تجویز فی نفسہ بہت اچھی اور ضروری ہے اور اگر ہو سکے تو ہونا چاہیے۔

۲۔ لیکن اس کے لیے آگرہ کی مجلس کے آخری ریزولیوشن کافی نہیں۔ ایک اور مجلس منعقد ہونی چاہیے جو اس تجویز کو اپنے ہاتھوں میں لے اور اس کی تاسیس وتشکیل کے تمام مراتب ضرور یہ طے کرے اور اسی سال اس کے زیرِ اہتمام اس کا جلسہ منعقد

ہو سکے۔

۳۔ رہا تبلیغِ اسلام کا مسئلہ تو اس کی شکل دوسری ہے۔ میں عارضی طور پر اس کام کے لیے کچھ کوشش کر رہا ہوں۔ نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ ''عارضی'' اس لیے کہ میرے سامنے ایک کام موجود ہے اور وہ بھی تبلیغِ اسلام ہی کی ایک زیادہ اقدم صورت ہے۔ جب اس کے انجام دینے ہی کی پوری طاقت نہیں پاتا تو اور کاموں کی کیا فکر کروں۔

البتہ اس وقت تک بہ قدرِ امکان صرفِ وقت و فکر کروں گا، جب تک کہ میرے پیشِ نظر حضرات اس کام کو پوری قوت سے شروع نہ کر دیں گے۔ واللہ الہادی وعلیہ اعتمادی۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

ماخذ: ہمدرد (دہلی)، ۱۴؍فروری ۱۹۱۴ء

حاشیہ:

(۱) آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا ستائیسواں سالانہ اجلاس آگرہ میں دسمبر ۱۹۱۳ء کے آخری ہفتے میں جسٹس شاہ دین جج ہائی کورٹ پنجاب کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں مولانا آزاد نے بھی شرکت فرمائی تھی اور جیسا کہ اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس کی ایک خاص نشست میں اشاعت اسلام کے مسئلے پر مولانا آزاد نے اظہارِ خیال فرمایا تھا۔

انھی دنوں میں مسلم لیگ کا آٹھواں سالانہ اجلاس سر ابراہیم رحمت اللہ ممبر امپیریل کونسل کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور مولانا آزاد نے جنوری ۱۹۱۴ء کے پہلے شمارۂ الہلال ہی میں اس اجلاس پر اظہارِ خیال فرمایا اور سر ابراہیم رحمت اللہ کا خطبۂ صدارت الہلال میں تین قسطوں میں شایع کیا اور اس پر تبصرہ بھی کیا۔

خریداران الہلال:

۱۸۴

ستمبر ۱۹۱۳ء میں "الہلال" سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی تھی جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ضبط کر لی گئی، اس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لینے کے بعد دس ہزار کی ضمانت مانگی جاتی تھی، چناں چہ "الہلال" سے بھی مانگی گئی، یہ ضمانت بھی شاید داخل کر دی جاتی مگر چوں کہ اس کے بھی ضبط ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لیے ضمانت داخل کرنے کے بجائے "الہلال" بند کر کے دوسرا اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ یہ نیا اخبار "البلاغ" کے نام سے جاری ہوا جس کا پہلا نمبر ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو شایع ہوا تھا۔

(اوایل فروری ۱۹۱۵ء)

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
زما السلام رسانید ہر کجا ہستند (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے اس عاجز کی خدمات کی قبولیت کے لیے اپنے بندوں کے دل کھول دیے ہیں اور انھیں مقبول ومحبوب بنا دیا ہے۔ اگر "الہلال" نے اپنی زندگی کے لیے دستِ سوال پھیلانا جائز سمجھا ہوتا تو دس بیس ہزار کی فراہمی میں دو چار دن سے زیادہ مدت نہ لگتی۔ لیکن اس نے اسے پسند نہ کیا اور یہ تمام امر تمام بزرگوں پر روشن ہے۔

"الہلال" کے دوبارہ جاری کرنے کے لیے اب تمام انتظامات مکمّل ہو چکے ہیں اور صرف روپے کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے، اس لیے صرف اتنی تکلیف خریدارانِ "الہلال" کو دینا چاہتا ہوں کہ وہ چھ ماہ کی قیمت پیشگی مرحمت فرمائیں۔ جو دفتر "الہلال" کے ذمے ان کا قرضِ حسنہ ہوگا اور جسے خریداری کے حساب میں مجرا کیا جائے گا۔ "الہلال" کی شش ماہی قیمت اصل چھ روپے بارہ آنے ہے لیکن وہ صرف

چھ روپے بھیج دیں۔

بعض خریداروں کی قیمت ختم ہونے کے قریب ہے، بعضوں کا سال شروع ہوا ہے، لیکن یہ درخواست تمام خریداروں سے ہے۔ انھیں اپنے حساب کا خیال نہ کرنا چاہیے جس وقت ان کی پچھلی قیمت ختم ہو جائے گی، اس کے بعد ہی اس رقم کو ان کے حساب میں جمع کر لیا جائے گا قیمت انھیں بہ ہر حال آیندہ دینی ہی ہے۔

"الہلال" صرف اتنی ہی اعانت اپنے وسیع حلقۂ معاونین سے چاہتا ہے، اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس موقعے پر دفتر کو روپے کی دقت کا سامنا نہ ہوگا۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ مبتلاے مشکلات رہا ہے۔ اگر اس تحریر کو دیکھتے ہی روپیہ آپ نے روانہ کر دیا تو ہفتے کے اندر "الہلال" شایع ہو جائے گا۔

دوسری درخواست نئے خریداروں سے پیشگی قیمت بھجوانے کی ہے، جس سے بہتر، جائز طریقہ پریس کی اعانت کا اور کوئی نہیں۔

فقیر ابوالکلام

۱۴۔ میکلوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

حاشیہ:

(۱) ایک دوسری جگہ مولانا ہی کے قلم سے اس شعر کا مصرعۂ ثانی اس طرح بھی ہے:

سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

سید افتخار عالم مارہروی:

﴿۱۸۵﴾

از فقیر ابوالکلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تاخیر جواب کے لیے شرمندہ وخواستگار معافی۔ علالت، ہجومِ افکار وعدم قیامِ کلکتہ!

ا۔ بلاشبہ نواب صاحب(۱) سے امیر خسرو(۲) کے ہندی کلام، علی الخصوص مکرنیوں کے مجموعے کا ذکر کیا تھا، مگر وہ نسخہ میرے پاس نہیں ہے۔ نواب سید محمد آزاد (اودھ پنچ والے) کے پاس تھا اور عرصہ ہوا میں نے دیکھا تھا(۳)۔ نواب صاحب کے اصرار پر میں نے ان سے ذکر کیا مگر معلوم ہوا کہ مولوی عبدالغفور شہباز(۴) کے سامان کے ساتھ ضایع ہوگیا یا کم از کم عسیر الحصول ہے۔ اب آپ کے لیے پھر مزید تحقیق کرتا ہوں۔

۲۔ حضرت امیر خسرو کے حالات عام ومتعارف کتابوں سے تو آپ نے فراہم کر ہی لیے ہوں گے۔ باقی مخصوص کتابیں تو جہاں تک فقیر کے علم میں ہے کسی ایسی کتاب کا وجود ہی نہیں ہے۔ مشہور ہے کہ خواجہ حسن سجزی(۵) نے ایک کتاب ''مجالس خسروی'' لکھی تھی اور اس میں حضرت امیر کے تمام حالات وسوانح جمع کیے تھے۔ نیز مخصوص ان مجالس کا حال جو حضرت نظام الدین کی صحبت وارادت سے تعلّق رکھتی ہیں، ایک زمانے میں، میں نے بڑی تلاش کی لیکن ناکامی رہی۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کے بزرگوں کی سوانح نویسی کے لیے رجال وتراجم پر بالکل اعتماد نہ کرنا چاہیے، بلکہ تمام تر محنت ان کی تصنیفات کے مطالعہ وکاوش میں کرنی چاہیے۔ ضمناً ان سے ایسے ایسے سراغ لگ جاتے ہیں کہ پوری لائف مرتب ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے آپ یہ کیجیے کہ کلیات نظم و نثر بہم پہنچایئے اور اس کا بالاستیعاب مطالعہ من اوّلہ الی آخرہٖ کر ڈالیے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ الہلال جولائی سے جاری ہو جائے گا تاخیر جواب کے لیے مکرر خواستگارِ معافی اور سوانح نذیر احمد مرحوم کی عدم تبصرہ نویسی پر متاسف و انشاء اللہ براجراے دومینِ الہلال محول۔

۲۲/ جون ۱۹۱۵ء، از کلکتہ

ماخذ: نقوش، لاہور (خطوط نمبر ۱)، ۱۹۶۸ء

نوٹ: یہ خط ''تاریخ نثر اردو'' مرتبہ احسن مارہروی سے لیا گیا ہے۔ اس میں مضمونِ خط کی ترتیب اسی طرح ہے۔ یعنی مکتوب نگار کا نام ''از فقیر ابوالکلام'' ابتدا میں اور تاریخ تحریر ''۲۲/ جون ۱۹۱۵ء'' اختتام خط پر درج کی گئی ہے۔

حواشی:

(۱) نواب صاحب سے مراد نواب محمد اسحاق خان (ف ۱۹۱۷ء) ابن نواب مصطفیٰ خان شیفتہ آنریری سیکریٹری ایم اے او کالج علی گڑھ ہیں۔ ان کا ایک کارنامہ امیر خسرو کی تصنیفات کی تحقیق و تدوین کا انتظام و انصرام تھا جو ۱۹۱۵ء' میں کیا گیا تھا۔ اسی منصوبے کے تحت افتخار عالم بھی امیر خسرو کا ہندی (اردو) کلام مرتب کرنا چاہتے تھے، نواب صاحب کے منصوبے کے تحت آٹھ کتابیں شایع ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے افتخار عالم صاحب کے کام کا کوئی ڈول پڑ نہیں سکا تھا۔

(۲) امیر خسرو، خواجہ ابوالحسن (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) ابن امیر محمود سیف الدین ایک ترک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ تغلق عہد کے نامور امیر، شاعر اور نثر نگار متعدد تصنیفات نظم و نثر ان کی یادگار ہیں۔ مولد و منشاے طفولیت پٹیالی ضلع ایٹہ (یو پی) تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا کے مریدوں میں تھے۔ ان کے حالات میں متعدد تصانیف ہیں اور اردو فارسی شعرا کے تذکروں میں بھی ان کے حالات مل جاتے ہیں۔

(۳) نواب سید محمد آزاد، خان بہادر (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۱۶ء) ابن سید اسدالدین حیدر۔ اردو کے مشہور، شاعر، نثر نگار، ادیب طناز۔ انگریزی زبان و ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ وقت کے اخبارات و رسایل کے معروف لکھنے والوں میں تھے۔ وطن جہانگیر نگر (ڈھاکا) تھا۔ زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزرا۔

(۴) عبدالغفور شہباز، پروفیسر مولوی سید (۱۸۵۸ء۔ ۱۹۰۸ء) استاد، شاعر اور نثر نگار۔ اردو کے علاوہ بنگلہ، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں کے ادب پر بھی نظر رکھتے تھے۔ وطن باڑہ ضلع پٹنہ اور مسکن کلکتہ تھا۔

(۵) خواجہ حسن سجزی (۱۲۵۲ء۔۳۶۔۱۳۳۵ء) ابن خواجہ ابراہیم یا علاؤ الدین، تغلق عہد کے مشہور امیر، فارسی شاعر اور صوفی، امیر خسرو کے معاصر اور دوست، حضرت نظام الدین اولیا کے مرید اور حضرت کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' کے مؤلف و مرتب۔ ان کے حالات فارسی شعرا کے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ ''ہم سخن'' (مجلّہ گورنمنٹ جناح کالج) کراچی کی خصوصی اشاعت ''حضرت امیر خسرو'' میں پروفیسر شفقت رضوی کے تحقیقی مضمون ''امیر خسرو کے ہم عصر اردو شعرا'' میں خواجہ حسن سجزی کے حالات وکلام پر مفصل تبصرہ ہے۔ ان کی تالیف ''فوائد الفواد'' کو مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی نے مرتب کر دیا ہے۔ دہلی اور کراچی سے شایع ہو چکی ہے۔

(۶) نظام الدین اولیا بدایونی ملقب بہ سلطان المشائخ (۱۲۳۶ھ۔۱۳۲۵ء) ابن سید احمد حضرت نظام الدین حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے مرید و خلیفہ اور امیر خسرو اور خواجہ حسن سجزی کے پیر و مرشد تھے۔ حضرت کے حالات صوفیہ کے تذکروں میں عام طور پر مل جاتے ہیں۔

(۷) ''الہلال، کلکتہ'' نومبر ۱۹۱۴ء میں ضمانت جمع نہ کرانے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس کا دورِ ثانی ''البلاغ'' کے نام سے شروع ہوا لیکن وہ جولائی کے بجائے نومبر ۱۹۱۵ء سے نکل سکا تھا۔

(۸) سوانح نذیر احمد سے مراد افتخار عالم مارہروی کی مشہور تالیف ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' ہے۔ بلاشبہ مولانا آزاد اس پر تبصرہ کرنا چاہتے ہوں گے لیکن البلاغ میں تبصرہ شایع نہیں ہوا۔

مولانا اکرام اللہ خاں ندوی شاہ جہان پوری:

﴿۱۸۶﴾

کلکتہ

جنوری ۱۹۱۶ء(۱)

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آج آپ کا خط مولوی عبدالواجد صاحب (۲) نے دیا لیکن باوجود اس خط کے مطالعے کے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ چند کلمات مزید مشورے کے طور پر لکھوں۔ آپ غور فرمائیں؛

آپ نے اس پر غور کیا ہوگا کہ موجودہ عہد میں کام کرنے والے آدمیوں کی اتنی کمی نہیں ہے جس قدر لوگ سمجھتے ہیں۔ ہر گوشے میں کچھ نہ کچھ آدمی موجود ہیں، لیکن اصلی مصیبت یہ ہے کہ اجتماع وانضمام کہیں بھی نہیں۔ تفرق وتشتت نے قوتِ علمی واصلاحی کو نابود کر دیا۔ خدا علیم وشاہد ہے کہ میں نے جب کبھی کسی اہلِ قلم وعلم کو دعوتِ ورود دی ہے تو صرف یہی خیال پیشِ نظر رہا ہے کہ کسی طرح ایک مقام پر کام کرنے والے آدمیوں کا اجتماع ہو اور ایک ایسا مجمع وجود میں آسکے جیسے کہ پہلے ہوا کرتے تھے۔

کاموں کی دو قسمیں ہیں، علم اور دعوت واصلاح، دونوں میں اس کی ضرورت ہے۔ مولوی عبدالواجد صاحب نے جب آپ کا ذکر کیا تو مجھے اسی چیز کا خیال ہوا مولانا سلیمان وعبدالسلام سیرت نبوی میں ہیں اور وہ کام بھی نہایت اہم ہے۔ اس لیے ان کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرنا بہتر نہیں اور وہ خود بھی اس کو پسند نہ کریں گے۔ ندوے کا جو کچھ راس المال ہے اس میں اب آپ ہی باقی ہیں۔ اور ستم ہے اگر اپنی قوت اور جوہر عمل کو نشو ونما وبروز سے محروم رکھیں۔

یہ تو اصل مقصد ہے!

اس کے بعد میری حالت پر نظر ڈالیے دائم المرض ہوں، طبعاً ضعیف القویٰ

ہوں۔ اس پر البلاغ، دارالارشاد، تفسیر القرآن، ترجمۃ القرآن، اور وقت و زندگی وہی ایک! ایک بھی رفیق راہ نہیں، معینِ عمل نہیں، دردمند و غمگسار نہیں! میں ہمیشہ تیار رہا ہوں اور اب بھی کہ کوئی شخص اگر میرا سچّا ساتھ دے تو میں اپنے آپ کو اور نیز جو کچھ میرے ساتھ ہے اس کے سپرد کر دوں۔ لیکن مشیتِ الٰہی! خریداروں کا وجود ہی نہیں۔

آپ لکھتے ہیں کہ الندوہ کو چھوڑ نہیں سکتا (۳)۔ نہ چھوڑیے! لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے لیے آپ کا قیامِ لکھنو کیوں ضروری ہے؟ وہ ایک ماہوار رسالہ ہے صرف مضامین کی ضرورت ہے، میری طرف سے بخوشی اجازت ہے کہ آپ کلکتہ میں رہ کر اس کے لیے بھی کافی وقت نکالیں اور لکھ کر بھیج دیا کریں۔ دو تین ماہ اس طرح تجربہ کر کے دیکھیے اس کے بعد آپ کو اختیار ہو گا۔

الندوہ کا خیال ضروری ہے لیکن اس کو بھی دیکھیے کہ البلاغ کی تحریک اصلاً ملک بھر میں ایک ہے اور اس لیے مقدم ترین تحریک ہے۔ اگر اسے آپ کی ضرورت ہے تو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ کی نظر روپے پر نہیں ہے لیکن اطلاعاً لکھ دیتا ہوں کہ آپ آجائیے کچھ دنوں تجربہ کر کے دیکھیے۔ سر دست ۵۰ حاضر کیے جائیں گے اور آپ نے میری مشکلات کو کچھ بھی کم کر دیا تو ان شاء اللہ یہ رقم دوسرے ہی ماہ میں دوہری ہو جائے گی۔ میں نے اپنے ایک مخلص و دردِ کار رکھنے والے کے لیے اقلاً رقم ۸۰ روپے رکھی ہے اور میں تیار ہوں۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس کا جلد فیصلہ کیجیے اور زیادہ انتظار نہ کرائیے۔ منظوری اور عدم منظوری کی اطلاع بہ ذریعہ تار دیجیے۔ تاکہ یک سوئی ہو جائے۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

حواشی:

(۱) اس خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے، ڈاک خانے کی مہر میں ۲۰/۱/۱۹۱۶ء کلکتہ درج ہے۔

(۲) مولوی عبدالواجد ندوی کان پور کے رہنے والے تھے۔ الہلال میں ان کے ذمے عربی اخبارات سے نقل واقتباس اور ترجمے کا کام تھا۔ ۱۹۱۳ء میں کچھ عرصہ ادارۂ الہلال سے وابستہ رہے تھے۔ پھر کان پور چلے گئے تھے اور ایم اے کرنے کے بعد کسی کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ البلاغ سے بھی وابستہ رہے تھے یا نہیں؟ ۱۹۶۳ء تک حیات تھے۔

(۳) مکتوب الیہ اس زمانے میں الندوہ (لکھنو) کو مرتب کر رہے تھے۔ یہ الندوہ کا آخری دور تھا۔ اس کے بعد الندوہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (علی گڑھ):

﴿۱۸۷﴾

نومبر ۱۹۱۵ء کے اواخر میں حضرت مولانا آزادؒ نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) جوائنٹ سیکریٹری آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے نام ایک خط میں لکھا کہ سالہائے گذشتہ کی طرح اس سال بھی پونا میں کانفرنس کے پروگرام میں میری تقریر کے لیے وقت رکھیں اور میری تقریر کا موضوع ''صراط مستقیم'' ہوگا۔ حضرت مولاناؒ کے اس خط کے جواب میں صاحبزادہ مرحوم نے جو خط مولاناؒ کے نام بھیجا تھا اس میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا اور بعض ایسی وضاحتیں چاہی تھیں، جو مولانا کے نزدیک ہرگز درست نہ تھیں۔ صاحبزادہ مرحوم نے کانفرنس کے گذشتہ اجلاس کانفرنس راولپنڈی میں مولانا کی تقریر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ کانفرنس کے اثر کو زایل کر دینے والی تھی۔ چناں چہ انھوں نے مولانا سے یہ وضاحت چاہی کہ:

''ایسی حالت میں سب سے اوّل یہ امر صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جس تعلیمی تحریک کی اشاعت کے لیے یہ کانفرنس قایم ہے اور جن اصول کے مطابق اور جن مقاصد کے لیے سرسید علیہ الرحمہ نے اس کی بنا قایم کی تھی ان کو آپ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے مفید اور ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کو قوم میں مقبول عام کرانے کی کوشش کرنا کانفرنس کے ممبروں کا فرض تصور کرتے ہیں یا نہیں؟ اس امر کی نسبت جواب آنے پر جناب کے اول خط کے متعلق جواب عرض کیا جائے گا''۔

مولانا نے صاحبزادہ کے جواب میں یہ خط تحریر فرمایا:

الہلال آفس۔ کلکتہ

جنوری ۱۹۱۶ء

حبی فی اللہ!

جس دن آپ کا والا نامہ پہنچا، اسی دن سے نزلہ و درد گلو میں مبتلا ہوں۔ تمام کام

معطل ہیں، آج تھوڑی سی مہلت ملی تو سب سے پہلے آپ یاد آئے۔

افسوس ہے کہ مجھ کو ان حوادث کی خبر نہ تھی جن کا ذکر آپ نے آغازِ خط میں کیا ہے ورنہ تاخیر جواب کے لیے کسی طرح اظہارِ شکایت نہ کرتا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن. اعظم الله امجد کم بمصائبکم.

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اپنے خیالات صاف ظاہر کر دیے اور مصنوعی اور نمایشی عذرات سے بالکل کام نہ لیا جو آج کل ایسے مواقع میں عموماً اخفاے اصلیت کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔ یہی شان ایک مسلمان کی تمام معاملات میں ہونی چاہیے۔ اگر ہم سب ایسا ہی کیا کریں تو نصف اندرونی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔

لیکن جناب نے اپنے خط میں (معاف فرمایئے گا) ترتیبِ مقدمات و طرزِ استدلال کے ایسے متعدد تسامحات جایز رکھے ہیں جن کی وجہ سے مجھے عرض جواب میں بڑی ہی مشکل پیش آ گئی ہے۔ اگر ان امور کے متعلق لکھتا ہوں تو صفحوں کے صفحے چاہییں، مگر نہ مجھے اس کی مہلت نہ آپ کو۔ اعراض کرتا ہوں تو جو خلطِ مبحث آپ نے کر دیا ہے، وہ کسی مقصود کو صاف و واضح نہیں ہونے دیتا۔

ایک چیز آپ کی اور آپ کے ہم خیال بزرگوں کی خواہش ہے اور ایک چیز ہے کسی کام کے اصول و مقصد اور شرایط وغیرہ کا مسئلہ! کچھ ضروری نہیں کہ پہلی چیز کی بنیاد ثانی الذکر ہی کی بنیاد پر رکھی جائے۔ آپ اگر دونوں مسئلوں کو الگ الگ رکھتے تو بات زیادہ صاف اور روشن تھی۔

آپ نے کیسی تعجب انگیز غلطی کی ہے، جب کہ خود ہی ایک مقدمہ قایم کیا ہے اور قبل اس کے کہ مخاطب تسلیم کر لے، یا اس کا مقدمہ مسلمہ ہونا ثابت ہو جائے، پوری شکل بھی قایم کر لی ہے اور پھر نتیجہ بھی نکال لیا ہے؟

آپ لکھتے ہیں کہ کانفرنس کا موضوع تعلیمی ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کا نام

ہی اس کے لیے شاہد!

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد!

لیکن اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ان اصولوں کے مطابق جو سرسید مرحوم نے قایم کیے، گذارش ہے کہ مقدمے کا یہ ٹکڑا کہاں سے ماخوذ ہے؟ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔

کانفرنس کے مقاصد کی فہرست، دفعات وقواعد، شرایط وضوابط، عہد اوّل کی مجلسیں، ارکانِ اساسی کی تقریریں، خود سید صاحبؒ کی تقریر جو انھوں نے علی گڑھ کے دونوں جلسوں اور لکھنؤ میں کی، نیز اس کی تمام رپورٹیں، یہ تمام ذخیرہ موجود ہے، میں بہت ممنون ہوں گا۔ اگر آپ ان سے ثابت کر دکھائیں کہ خود سید صاحب مرحوم نے یہ کہاں لکھا ہے؟ اور کانفرنس کی تقریروں کے متعلق یہ فیصلہ امر ونہی کس نے قرار دیا ہے؟

بلاشبہ سرسید مرحوم اس کے بانی تھے۔ لیکن بانی ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مسئلہ تعلیم کو انھوں نے ایک خاص اصول کے ماتحت کر کے کانفرنس کے حوالے کر دیا ہے اور اب اس کے پلیٹ فارم پر اس کے ایک حرف سے بھی انحراف واختلاف جایز نہیں؟

قرآن حکیم سے ہمارے مجتہدین وفقہا، مسایل کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس استخراج واستنباط کی انھوں نے متعدد قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک یہ کہ صاف صاف کسی آیت میں حکم ہو وہ اس کو صراحۃ النص کہیں گے۔ ایک یہ کہ صاف صاف حکم نہ ہو تو اس کے لیے ''دلالۃ النص'' اور اشارۃ النص وغیرہ اصطلاحات قایم کی ہیں۔

آپ کے لیے بھی یہ دروازہ باز ہے۔ صراحۃ النص کا تو اصلی مطالبہ ہے، لیکن خیر دلالۃ النص ہی سہی۔ کسی نہ کسی طرح یہ واضح کر دیجیے کہ جناب کا پیش کردہ اعتقاد فلاں نصِ سرسید سے ماخوذ ہے۔

یا للعجب ! آپ لوگ فخر کرتے ہیں، اگر ایک نصرانی پلیٹ فارم پر آکر بہت سی ایسی باتیں کہہ جائے جو آپ کے عقاید و اغراض کی بالکل ضد ہوں، لیکن آپ لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ کوئی مسلمان اختلاف نہیں کرسکتا؟

پھر کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ کا یہ مقدمہ کس طرح ہمیشہ پامال کیا جاچکا ہے اور کتنی نظیریں اس کے لیے مخالف وضد موجود ہیں۔

کیا بمبئی کانفرنس کے پریسیڈنٹ مسٹر بدرالدین طیب جی نہیں بنائے گئے، جو یکسر علی گڑھ کی تحریک ہی کے مخالف تھے؟ کیا انھوں نے اپنے اختتامی ایڈریس کے اندر وہ کچھ نہ کہا جو سر سید مرحوم کے مشن اور عقاید و اصولِ تعلیم کے سرتا سر خلاف تھا؟ ان سے یہ شرط نہیں کرائی گئی تھی!

سر سید مرحوم پردۂ نسواں کے کس قدر اشد شدید حامی تھے؟ اور خارجی تعلیم نسواں کے ولولوں پر کیسے غضب ناک ہوجاتے تھے۔ حتیٰ کہ میر ممتاز علی کے رسالہ ''حقوقِ نسواں'' کو پھاڑ کر ردی کے ٹوکرے میں ڈال دیا تھا، لیکن آپ کے پیشرووں نے مسٹر طیب جی کو صدر بنایا اور انھوں نے پردے کی علانیہ مخالفت پریذیڈنشل ایڈریس میں کی۔

پھر دوسری دہلی کانفرنس کی صدارت کے لیے سر آغا خاں لائے گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے تنزّل کے جو اسباب اساسی بتلائے، ان میں عورتوں کا پردہ بھی تھا، کیا یہ سر سید کے عقاید کے خلاف نہ تھا؟

اسی پونا کانفرنس کا صدر آپ نے جسٹس عبدالرحیم کو بنایا ہے جو سر سیدؒ کے بہت سے بنیادی اصولوں ہی کے مخالف ہیں، کیا ان سے بھی آپ نے یہ مقدمہ طے کرالیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ وہ ایڈریس میں کیا کہیں گے؟ آپ کو معلوم نہیں، مگر مجھے معلوم ہے۔

مدراس کانفرنس کا صدر ایک مسیحی عہدے دار (جسٹس آیڈم) تھا۔ اس مقدمے کا

اثر زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ سرسید مرحوم کے مذہب تعلیم سے انحراف نہ ہو۔ لیکن ایک مسیحی شخص کے متعلق تو یہ سوال بھی پیدا ہوسکتا تھا کہ کہیں وہ نفس اسلام ہی کے خلاف کوئی بات نہ کہہ دے۔ آپ تو اس وقت اس جگہ پر نہ تھے، لیکن مرحوم محسن الملک کے کاغذات میں اس اقرار نامے کی تلاش کیجیے، جو انھوں نے جسٹس موصوف سے کرایا تھا!

پہلی لکھنو کانفرنس میں تو خود سرسید مرحوم نے مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر ''اودھ پنچ'' سے یہ مقدمہ طے نہ کیا تھا۔ حال آں کہ بڑی ضرورت اس مقدمے کی اس وقت تھی۔ معلوم نہیں آپ کو وہ واقعات معلوم ہیں یا نہیں؟

معاف فرمایئے گا، آپ نے یہ ایک اصولی سوال چھیڑ دیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آل انڈیا کانفرنس جس کو تمام مسلمانوں کی نیابت دی جاتی ہے۔ اپنے پلیٹ فارم کے لیے ایک خاص مذہب رکھتی ہے اور جو اس کے خلاف رائے رکھتا ہو، اسے وہاں قدم رکھنے کا حق نہیں۔ یہ کانفرنس کا ایک خطرناک اقفال ہے اور ضروری ہے کہ ایک بار اس مسئلے کو پبلک کے سامنے ٹھیک فیصل کرلیا جائے۔ آج تک کسی کو بھی اس کا خیال نہیں ہوا تھا۔

(۲) بہر حال یہ تو آپ کا مقدمہ ہے۔ رہی اصل حقیقت تو یہ بھی صحیح نہیں کہ میں نے راولپنڈی کانفرنس میں، کانفرنس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اس کا رد کیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصد عام طور پر مسئلہء دعوت کا مبحث تھا اور یہ دکھانا مقصود تھا کہ مسلمانوں کی ہر دعوت کو اصولاً مذہبی ہونا چاہیے اور اسی کے واسطے سے تعلیم بھی پھیلانی چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مذہب سے الگ رہ کر ایک مستقل تعلیمی دعوت قرار دی جائے، جس میں کبھی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

نیز یہ کہ اسلام میں تعلیم کی کوئی دعوت نہیں ہے۔ اس کی دعوت ایک ہی ہے اور اس کے اندر سب کچھ موجود ہے۔

لیکن معاف فرمائیے گا، یہ جو کچھ کہا گیا، اس کو آپ حضرات بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ قدیم و جدید جماعتوں میں آج کوئی گروہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس حقیقت کا صحیح اندازہ شناس اور محرم و خبردار ہو۔ گذشتہ صدی کے تمام مسایلِ اصلاح و دعوت میں سے آپ حضرات کو صرف سرسید مرحوم ہی کی تحریک کا حال معلوم ہے۔ اس کے استغراق سے مہلت نہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ مسئلہ "تحریک جدید" و "دعوتِ تعلیم جدید" (متعلق اہلِ اسلام) خود ایک موضوع مستقل ہو گیا ہے اور گذشتہ صدی کے اندر تمام عالم اسلامی نے اس پر نظر ڈالی ہے اور ایک وسیع لٹریچر اس کا موجود ہے۔ اس کے دیکھنے سے ایک شخص ان تمام مشارب و مذاہب وطرق و اسالیب کو معلوم کر سکتا ہے، جو اس مسئلے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اور اسلام کی دینی تعلیمات اور مسلمانوں کے قومی خصایص ومقومات کے علمِ صحیح کا اس پر اضافہ کر کے حقیقت شناسی کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے۔ میرے گذشتہ دس سال کے لیل و نہار، سفر و حضر، صحت و مرض ہر حال کے مطالعۂ دایمی کا ایک خاص موضوع یہ چیزیں رہی ہیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مختصر رسایل و اخبارات و مجلّات عالمِ اسلامی کے سوا خاص اس موضوع پر کم از کم پچاس کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جن کے وجود کا بھی خبردارانِ ہند کو علم نہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی الحمدللہ میں نے اس بارے میں ایک مجتہدانہ بصیرت پائی ہے اور اسلامی تاریخ کے استقرائی نتایج نے میری مدد کی ہے اور قرآن و سنت نے مجھے دلایل و براہین کے ساتھ بتلایا ہے کہ اس مسئلے کی صحیح وسعید راہ کیا ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

پس اس بارے میں میرا تخاطب آپ حضرات سے نہیں ہے، اور نہ میں اس بارے میں آپ حضرات سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ موضوع دوسرا ہے اور اس کی کاینات اس دنیا سے بالکل مختلف ہے، جس میں آپ لوگ بستے ہیں۔ موجودہ مسئلے سے اس کا کوئی تعلّق نہ تھا اور یہ بالکل بے سود تھا کہ آپ نے اپنی خواہش کو کانفرنس کے

ایک اصول کی شکل میں پیش کر دیا۔

آپ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ آپ سر سید مرحوم کے مشن کے داعی ہیں۔ سر سید کا بڑا کارنامہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ انھوں نے تقلید کا قلع قمع کیا اور اجتہادِ رائے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ لیکن آپ لوگ خود ہی ایک بدترین تقلید اعمیٰ میں گرفتار ہو گئے ہیں اور یہ تقلید اس تقلید سے ہزار درجے افسوس ناک ہے جو مقلّدینِ فقہ ہدایہ یا مقلّدینِ تفسیرِ جلالین و مدارک کی بیان کی جاتی ہے۔ تاہم میں اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا، کیوں کہ کہنا بیکار ہے، تقلید کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔

ولکن لاحیاۃ لمن تنادی

(۳) بہ ہر حال آپ نے میرے (شخص خاص کے) معاملے کو کانفرنس کا اصولی مسئلہ بنا کر ایک اہم بحث چھیڑ دی ہے، جس کو اگر صاف نہ کیا گیا تو کانفرنس کے دروازوں پر مسلمانوں کے لیے قفل چڑھا دیے جائیں گے۔ اس کا صاف کرنا تو اب ناگزیر ہو گیا ہے، لیکن اب اِن دو چار دنوں کے اندر آپ کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخصی معاملے کو کسی اصولِ موضوعہ کے حوالے کر کے الگ ہو جائیں۔

(۴) سر دست اس مسئلے کو یوں صاف کیا جا سکتا ہے کہ آپ مجھ سے شخصاً دریافت کر لیں کہ آیندہ کانفرنس میں کس موضوع پر تقریر کروں گا؟ اور پھر اس سے اندازہ کر لیں کہ یہ تقریر کیسی ہو گی؟

میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ اب بالتشریح لکھتا ہوں کہ میری تقریر کا موضوع "صراطِ مستقیم" ہو گا۔ اس کی تشریح وہ بیانات ہیں جو قرآنِ حکیم نے "صراطِ مستقیم" کے متعلق کہے ہیں، اس موضوع کے کسی حصّے کو نہ تو سر سید کے تعلیمی مشن سے کوئی تعلّق ہے اور نہ کچھ اس کی بحث ہے۔ یہ ایک خالص مذہبی موضوع ہے اور از سر تا پا قرآن و سنت سے متعلق۔

(۵) الحمد للہ کہ خدا نے ہندستان کے ہر گوشے کو میری آواز کی پذیرائی کے لیے

آمادہ کر دیا ہے اور ہر جگہ ہزار ہا دل پیدا کر دیے ہیں، جو میری آواز کے استقبال کے لیے مستعد ہیں وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ کوئی روک جو آپ حضرات اس کے لیے پیدا کریں، سود مند نہیں ہو سکتی، اور گیند کی قوت جذب کا فعل جس قوت سے ہوتا ہے، اتنی ہی طاقت سے قوتِ دفع جواب بھی دیتی ہے۔ راولپنڈی میں خود آپ لوگوں نے میری مخالفت کر کے پبلک کو اپنے سے بدظن کرایا، اور پھر اس کے نتائج لازمی ہیں۔ علے الخصوص پونا کو تو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کانفرنس کا پنڈال آپ مجھ پر بند کر کے دیکھ لیں، میں کسی اور گوشے میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام مسلمانوں کو پہنچا سکتا ہوں۔ میرا ذاتی نقصان اس سے کچھ نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص اس حماقت میں گرفتار ہے کہ کانفرنس کا پلیٹ فارم میرے لیے ایک بہت ہی بڑی عجیب و غریب دولت ہے جس سے محروم ہو کر لٹ جاؤں گا، تو اس کی حماقت بہت ہی افسوس ناک ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس میں میری تقریر روک کر کوئی بھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں تو بسم اللہ، اس کا بھی تجربہ ہو جائے، جیسا کہ چار پانچ سال سے بیسیوں تجربے آپ لوگ کر چکے ہیں۔ مجھے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات کو کہنا، لکھنا، مدون کرنا ہے، جن کو میری بصیرت حق سمجھتی ہے اور میرا معاملہ اب وہاں تک پہنچ گیا ہے کہ آپ لوگوں کے یہ ارادے اس کے لیے بالکل خارج از بحث ہیں۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمۃ القرآن آپ کے پاس شاید ہوگا، اس میں سورۂ جن کو نکالیے اور کسی وقت فرصت ملے تو اس آیت پر غور کیجیے! وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰهِ يَدۡعُوۡهُ كَادُوۡا يَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِ لِبَدًا ۝ (۲)

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حوالہ: البلاغ، کلکتہ۔ ۱۴ تا ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء، صفحہ ۳۱۔۲۹

حواشی:

(۱) والدہ کی علالت اور جوان گریجویٹ بھانجے کے حادثۂ انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) یہ سورہ جن (۷۲) کی آیت (۱۹) ہے۔ مولانا آزاد نے اس آیت کے دو ترجمے کیے ہیں۔ یہاں دونوں ترجمے نقل کیے جاتے ہیں:

ا۔ ''اور جب خدا کا بندہ مخلص (یعنی حضرت داعی اسلام) اللہ کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، تو لوگ اس کے گرد اگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح نزدیک آآ کر دیکھتے ہیں، گویا قریب ہے کہ لپٹ پڑیں گے''۔

(الہلال۔ کلکتہ، ۸/اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۹)

۲۔ ''اور جب اللہ کا بندہ (عبد) تبلیغ حق کے لیے کھڑا ہوتا ہے تا کہ اللہ کو پکارے، تو کفار اس کو اس طرح گھیر لیتے ہیں، گویا قریب ہے کہ اس پر آ گریں گے''۔ (البلاغ۔ کلکتہ، ۱۴/۲۱ و ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء، ص ۸/الف)

حکیم عبدالغنی (جھوائی ٹولہ) لکھنؤ:

﴿۱۸۸﴾

(تار)

۱۱/اپریل ۱۹۱۶ء

حکیم عبدالغنی (لکھنؤ)!

مسلم یونیورسٹی میٹنگ کے نتیجے سے بہ ذریعۂ تار آگاہ کریں۔

اے۔ کے آزاد

ڈاک بنگلہ پرولیا۔ رانچی۔(۱)

حاشیہ:

(۱) بہ شکریہ جمشید قمر صاحب رانچی۔ اب بہار کے جنوبی علاقے کو جھارکھنڈ کے نام سے ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا ہے۔ رانچی اس کا صدر مقام ہے۔

چیف سیکریٹری گورنمنٹ بہار واوڑیسہ:

(۱) ﴿۱۸۹﴾

رانچی

۱۲؍دسمبر ۱۹۱۶ء

بخدمت چیف سیکریٹری گورنمنٹ بہار اینڈ اوڑیسہ

جناب والا!

میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھ کو معاف فرمائیں گے اگر میں ایک ایسی زبان میں خط لکھنے کی (جرأت کروں)، جو سرکاری مراسلات میں مستعمل نہیں ہے یعنی ہندستانی زبان میں۔ میں انگریزی زبان سے ناواقف ہوں اور جب کبھی انگریزی زبان میں مراسلت کی ضرورت پڑتی ہے تو ایسے لوگوں سے مدد لینے پر مجبور ہوتا ہوں، جو میری تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کر دیں، لیکن سوءِ اتفاق سے اس وقت کوئی شخص ایسا میرے پاس موجود نہیں ہے، اور اگر ترجمہ کے لیے کلکتہ بھیجتا ہوں تو اس میں بہت (زیادہ) تاخیر کا اندیشہ ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے جسارت کی ہے کہ جس زبان میں خود لکھ سکتا ہوں اسی میں اظہار خیال کروں، بلاشبہ یہ ایک خلافِ قاعدۂ مراسلت بات ہے، لیکن میری موجودہ بے سروسامانی اور مجبوری پر نظر رکھتے ہوئے (امید ہے) کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

میں نے جو عریضہ ۲۵؍اکتوبر کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا، اس کا جواب ۲۶؍نومبر ۱۹۱۶ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس رانچی کے ذریعے مجھ کو ملا۔ اس کے متعلق مجھ کو حسبِ ذیل امور عرض کرنے ہیں؟

۱۔ میں نے اپنے عریضے میں لکھا تھا کہ ڈیفنس ایکٹ کے ماتحت جو آرڈر نظر بندی کا ۲۳؍اکتوبر سنہ رواں کو (ملا ہے، اس) کی دفعہ نمبر ۷ کا یہ منشا ہے (۱) کہ میں ہر روز تھانے میں حاضری دوں۔ میں ملتجی ہوں کہ اس دفعہ کی تعمیل سے مجھ کو معاف (رکھا

جائے) اس درخواست کے لیے میں نے دو وجوہ عرض کی تھیں۔ ایک اصلی اور ایک ضمنی، اصلی وجہ یہ تھی کہ جو پوزیشن میں سوسایٹی میں رکھتا ہوں اور گزران زندگی کے جن اصولوں پر آغاز عمر سے کار بند ہوں، اس کے لحاظ سے یہ بات میرے لیے سخت (تکلیف دہ) اور موجبِ ذلت ہے۔ ساتھ ہی ضمناً یہ بھی عرض کیا تھا کہ میں تھانے سے دور رہتا ہوں اور روزانہ سواری کا (انتظام) میرے لیے دشوار ہے۔ یہ آخری وجہ ضمنی تھی نہ کہ اصلی۔

۲۔ اس کا جواب مجھ کو یہ ملا ہے کہ اس بارے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی مکان تھانے سے قریب (لے لوں)۔ میں نہایت ادب کے ساتھ گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ یہ میری اصلی شکایت کا جواب نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صورت میری شکایت کے لیے ایک طرح کا علاج ہو جاتا ہے (مگر کافی نہیں کیوں کہ تھانے سے قریب رہنے کی صورت میں بھی سواری کا انتظام (بہر حال) ہوگا۔ گو وقت کسی قدر ضرور بچ جائے گا) لیکن اصلی شکایت کے لیے اس میں کوئی تشفّی نہیں۔ چوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے (جس کے لیے میں) بوجوہ نہایت قوی اور ناگزیر احساس رکھتا ہوں، اس لیے مجبور ہوں کہ دوبارہ اس کی نسبت اپنی معروضات پیش کروں۔

۳۔ میں نے اس دفعہ کے متعلق جو کچھ عرض کیا تھا، وہ محض نقصان وقت اور انتظام سواری کا سوال نہ تھا بلکہ اصلی مقصود یہ تھا کہ ہر روز حاضری دینے کے لیے تھانے میں جانا میری پوزیشن کے خلاف ہے، جو میں سوسایٹی میں رکھتا ہوں، اس لیے مجھ کو اس سے معاف رکھا جائے۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ خواہ گورنمنٹ کے پاس میرے مجرم ہونے کے لیے کیسے ہی وجوہ و دلایل کیوں نہ ہوں، لیکن میں قانوناً مجرم نہیں ہوں۔ کیوں کہ (کسی عدالت نے) میرے مجرم ہونے کی نسبت فتویٰ نہیں دیا ہے اور نہ کوئی باقاعدہ شہادت اس بارے میں پیش ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں گورنمنٹ

سے طلب گار ہوں کہ میرے ساتھ بلاوجہ ایسا سلوک نہ کیا جائے جو میری عزت اور پوزیشن کے خلاف ہو تو کسی طرح ایسی خواہش (بے جا) نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی عدالت نے مجھ کو مجرم قرار دے دیا ہوتا تو یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ میرے ساتھ وہ سب کچھ ہونا چاہیے تھا جو ایک مجرم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی جاتیں، جب بھی مجھ کو اعتراض کا کوئی حق نہ تھا۔ حتی کہ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالت دوسری ہے۔ مجھ کو بلا کسی عدالتی کارروائی کے نظر بند کر دیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ میری نقل وحرکت محدود اور میری خط و کتابت زیرِ نگرانی کر دی جائے۔ جب حالت ایسی ہے تو کم از کم مجھ کو اس کا حق تو ملنا چاہیے کہ اپنی پوزیشن اور طریق زندگی کی خودداری وعزت کو محفوظ رکھوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خواہش ایک ایسی قدرتی خواہش ہے، جو ہر ذی عزت آدمی رکھتا ہے اور بحالت موجودہ کوئی ایسی خواہش نہیں جو حالات کے خلاف ہو۔ گورنمنٹ نے مجھ کو نظر بند کیا ہے، میں اس کی ٹھیک ٹھیک تعمیل کر رہا ہوں اور اس وقت تک کرتا رہوں گا، جب تک خود گورنمنٹ اپنے حکم میں تبدیلی نہ کرے۔ البتہ صرف اتنی با ن کا ملتجی ہوں کہ بلاضرورت ایسا سلوک نہ کیا جائے جو میرے احساسات کے لیے بہت ہی جانکاہ اور الم بخش ہے۔

۴۔ میں امید کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کے علم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ میں اپنی جماعت اور قوم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہوں اور خواہ میرے خلاف گورنمنٹ کی معلومات کیسی ہی ہوں، تاہم اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ برٹش گورنمنٹ کی ہزاروں رعایا مجھ کو اپنے اعتقاد میں قابل عزت یقین کرتی ہے اور میں اپنی زندگی کے لیے ایک خاص طرح کے طریقِ زندگی کا عادی ہوں۔ اگر ایسی حالت میں میری خواہش ہے کہ میں تھانے کی روزانہ حاضری سے معاف رکھا جاؤں تو میں کوئی حد سے گزری ہوئی بات نہیں چاہ رہا ہوں۔ میں اب تک اس طریقِ زندگی کا عادی رہا ہوں

کہ اپنے گھر سے نکل کر ملنے کے لیے کسی معزز شخص کے یہاں بھی بلا مجبور کن ضرورت کے کبھی نہیں جاتا تھا۔ اگر میں اب تھانے کی روزانہ حاضری سے معافی چاہتا ہوں تو یہ میرے لیے ایک قدرتی خواہش ہے۔

۵۔ میں اس طرف بھی آپ کی توجہ کو مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہ دفعہ نظر بندی کے مقصد کے لیے لابدی اور ضروری نہیں ہے۔ روزانہ حاضری کا صرف یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ میری موجودگی کا پولیس کو علم ہوتا رہا ہے۔ لیکن یہ علم بغیر میری روزانہ حاضری کے بھی پولیس کو پوری طرح حاصل ہوتا ہے۔ حتی کہ میرے مکان کے قریب پولیس کی ایک (چوکی) بٹھائی گئی ہے جس میں پانچ چھ کانسٹبل ہر وقت موجود رہتے ہیں اور اپنی نظروں سے کبھی میرے مکان اور اس کے دروازے کو اوجھل (نہیں ہونے دیتے) کوئی شخص ان کے علم کے بغیر میرے یہاں نہیں آسکتا اور نہ جاسکتا ہے۔ (۲) اس لیے یہ امر پیش نظر رہے کہ میری نسبت ایسا خیال کرنا کہ میں جب تک روزانہ حاضری نہ دوں، اپنی موجودگی کے لیے ثبوت نہیں رکھتا کس قدر تعجب انگیز ہے، جب کہ میں بغیر حکم نظر بندی کے یہاں مہینوں (سے مقیم ہوں) اور کوئی واقعہ ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر میری نسبت ایسا گمان بھی کیا جاسکے۔ مجھ کو نظر بندی کا حکم مل چکا ہے اور مجھ کو معلوم (ہے کہ اس کی) خلاف ورزی ایک سخت سزا رکھتی ہے۔ بس اس قدر میرے لیے کافی ہے، اور مقامی پولیس کو پورا موقع حاصل ہے کہ وہ میری (نسبت کافی) معلومات حاصل کرتی رہے۔

۶۔ میں اس طرف بھی آپ کی توجہ دلاؤں گا کہ ایک سے زیادہ مثالیں ایسی موجود ہیں، جن میں نظر بندوں کے (ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جاتا)، مثلاً: مسٹر محمد علی ایڈیٹر کامریڈ دہلی اور مسٹر شوکت علی دو سال سے نظر بند ہیں اور اس وقت چھنڈواڑا (سی پی میں ہیں) مجھ کو قابل یقین ذرائع سے معلوم ہے کہ نہ تو ان کو روزانہ حاضری کا حکم دیا گیا ہے، نہ ان کے لیے یہ دفعہ لازمی قرار دی گئی ہے کہ رات کو چھ بجے کے بعد گھر سے

نہ نکلیں اور کسی ملاقاتی سے نہ ملیں، اور نہ ان کے دروازے کے قریب پولیس کی چوکی (اور پہرا بیٹھا ہے۔)

۷۔ پس میں مکرر گورنمنٹ کی توجہ فرمائی کا خواستگار رہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری اس گذارش (کو قبول کیا جائے گا) اور اس دفعہ کو اٹھا دیا جائے گا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے قایم رکھنے میں گورنمنٹ کا کوئی نفع نہیں، مگر اس کے نہ ہونے (میں میرے) لیے بڑی ہی ممنونیت اور شکر گذاری ہے۔ اور شاید ان ہزار ہا انسانوں کے لیے بھی، جو مجھ سے تعلّق رکھتے ہیں جن کو (میری نظر بندی کا) تو علم ہو گیا ہے، مگر اس طرح کی دفعات کا علم نہیں ہے اور علم ہونے کی صورت میں ان کے لیے بھی یہ حکم بہت تکلیف (دہ ہوگا۔)

۸۔ آخر میں مجھ کو ایک اور امر کی نسبت عرض کرنا ہے۔ اب تک گورنمنٹ کی جانب سے جس قدر جوابات (میری) تحریرات کے مجھ کو ملے ہیں، ان کا یہ طریقہ رہا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس رانچی نے زبانی جواب سنا دیا ہے (میں چاہتا ہوں) کہ آیندہ مجھ کو تحریری جواب عنایت ہو اور اگر کسی وجہ سے براہ راست گورنمنٹ نہیں بھیجنا چاہتی تو سپرنٹنڈنٹ (پولیس ہی) کی معرفت تحریری جواب بھیج دیا جائے۔

میں ہوں آپ کا نیازمند

ابوالکلام آزاد

حواشی:

(۱) مولانا کے خط سے یہ اہم بات معلوم ہوتی ہے کہ نظر بندی کے آرڈر کی تعمیل مولانا کے رانچی پہنچنے کے تقریباً سات ماہ بعد ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو کرائی گئی تھی۔

(۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ مولانا کو رانچی میں آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ مولانا کی رہائش کے قریب ۵، ۶ سپاہیوں کی ایک پولیس چوکی بٹھا دی گئی تھی۔ اس کے باوجود انھیں مکان سے دور تھانے میں جا کر اپنی حاضری کا ثبوت دینے کے لیے پابند کرنے کا مقصد مولانا کی تذلیل کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا کا شمار حکومت کے سخت ترین دشمنوں میں ہوتا تھا۔

(۲) ﴿۱۹۰﴾

رانچی۔

۲۱؍جنوری ۱۹۱۷ء

بخدمت چیف سیکریٹری گورنمنٹ بہار اینڈ اوڑیسہ

جناب من!

مندرجۂ ذیل امور کی طرف میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں؛

(۱) ۱۲؍دسمبر کو میں نے ایک چٹھی آپ کی خدمت میں بھیجی تھی اور اس میں اس دفعہ کی نسبت عرض کیا تھا جو نظر بندی (کے ساتھ عاید) کی گئی ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ میں روزانہ تھانے میں حاضری دوں۔ میں نے بہ تفصیل ان وجوہ کو لکھ دیا (تھا جن کی بنا پر) یہ دفعہ گورنمنٹ کے مقاصدِ نظر بندی کے لیے بالکل غیر ضروری اور میرے لیے سخت تکلیف دہ اور نا قابلِ (برداشت ہے)۔لیکن افسوس ہے کہ مجھ کو اب تک اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں مکرر آپ کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں اور امید کرتا (ہوں اب مجھ کو) مزید انتظار میں نہ رکھا جائے گا۔

(۲) میں نے اپنے اس میموریل میں جو ہز آنر لیفٹننٹ گورنر کی خدمت میں بھیجا تھا، درخواست کی تھی کہ میرے (لیے کوئی ایسی رقم) مقرر ہونی چاہیے، جو میرے اخراجات کے لیے کافی ہو۔ اس کے جواب میں مجھ کو مطلع کیا گیا تھا کہ (اس پر غور کیا جارہا ہے۔) اس کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ اس بارے میں مزید تحقیقات بھی کی گئی، لیکن تعجب ہے کہ اب تک کوئی نتیجہ (اس کا نہیں نکلا)۔ تقریباً تین مہینے التوا وانتظار میں گزر چکے ہیں۔ مجھ کو اب مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ تمام وسایل معاش (کے بند ہو جانے) کی وجہ سے میری مالی مشکلات حد درجے تک پہنچ گئی ہیں اور اگر اس ماہ کے آخر تک اس معاملے کا (فیصلہ نہ ہوا) تو میں نا قابلِ علاج مالی مشکلات سے گھر جاؤں گا۔

(۳) میں یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر مجھ کو پوری طرح

یقین نہ ہوتا کہ یہ (میری ایک) صحیح اور جایز درخواست ہے اور گورنمنٹ کے طرز عمل نے اس کو ایک جائز خواہش تسلیم نہ کر لیا ہوتا (تو میں ہرگز اس کو) پسند نہ کرتا کہ اپنی مالی مشکلات کا بار گورنمنٹ پر ڈالوں۔ پھر تعجب ہے کہ ایک ایسے جایز مطالبے کی تعمیل میں اس قدر تاخیر کی جا رہی ہے؟ کیا یہ قرینِ انصاف ہے کہ ایک شخص کو بغیر کسی باقاعدہ تحقیقات (وعدالتی کارروائی) کے اس کے تمام وسایل معاش سے محروم کر دیا جائے اور اس کے بعد مہینوں اس فیصلے میں گزر جائیں کہ (اس کے اخراجات کے لیے) کیا انتظام ہو؟ اور اس امر سے بالکل چشم پوشی کر لی جائے کہ اس (عرصے میں اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟)

۴۔ ایک اور اہم معاملہ ہے جس کی جانب میں گورنمنٹ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جو دفعات (میری نظر بندی کی ہیں)، ان میں ایک دفعہ یہ ہے کہ چھ بجے شام سے چھ بجے صبح تک اپنے مکان سے باہر نہ نکلوں (میں اس) دفعہ پر اب تک عمل کرتا رہا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کی تعمیل میرے مذہبی فرایض میں خلل انداز (ہوتی ہے) اور بہ حیثیت مسلمان ہونے کے جو اعمال مذہبی میرے فرایض میں داخل ہیں ان کی بجا آوری سے میں باز (رہنے پر مجبور) ہوتا ہوں۔ اسلام نے جو احکام مسلمانوں پر فرض کیے ہیں، من جملہ ان کے ایک یہ حکم ہے کہ پانچ (وقت مسجد میں) حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ مسجد قریب ہو۔ ان پانچ وقتوں میں سے دو وقت تو دوپہر اور عصر کے ہیں، لیکن تین وقت شام اور رات سے تعلّق (رکھتے ہیں)۔ صبح کی نماز کا وقت سورج نکلنے سے پہلے ہے۔ شام کی نماز کا سورج ڈوبنے پر، اور (رات کی نماز کا) تقریباً آٹھ نو بجے۔ موجودہ حالت میں چار وقت کی نماز کے لیے تو نکل سکتا ہوں، (لیکن رات) کی نماز کے لیے جس کا وقت آٹھ بجے ہے، نہیں جا سکتا۔ اور چند دنوں کے بعد جب موسم (بدل جائے گا اور) آفتاب جلد طلوع ہونے لگے گا، صبح اور شام کی نماز سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ مجھ کو

یقین ہے کہ (گورنمنٹ) کا کبھی یہ مقصد نہیں ہوسکتا کہ کسی شخص کو اس کی مذہبی عبادتوں کی بجا آوری سے (باز رکھے)۔ میں ملتجی ہوں کہ اس دفعہ کو اٹھا دیا جائے تاکہ میں بہ آزادی اپنے مذہبی فرایض بجالاسکوں۔

میں اس امر پر بھی گورنمنٹ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہندستان (کے بعض دیگر نظر بندوں) پر یہ دفعہ عاید نہیں کی گئی ہے۔ نظیر میں مسٹر محمد علی و شوکت علی کو پیش کرتا ہوں (جو چھنڈواڑا۔ سی پی) میں نظر بند ہیں۔

امید ہے کہ ان امور کے متعلق جلد مطلع کیا جاؤں گا۔(۱)

میں ہوں آپ کا نیازمند

ابوالکلام آزاد

حوالہ: مذکورہ بالا دونوں خطوط ''مولانا آزاد کا قیام رانچی'' از جمشید قمر، رانچی، ۱۹۹۴ء سے ماخوذ ہیں۔

حاشیہ:

(۱) ان دونوں خطوط کے جو عکس جمشید قمر کے سامنے تھے ان کے بائیں کنارے اوپر سے نیچے تک عکس میں کٹ گئے تھے۔ اس لیے جملوں کی تکمیل قیاساً کی گئی ہے اور قوسین میں ان لفظوں کو ممیز کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ قیاس اصلی لفظوں سے زیادہ دور نہ ہوگا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس ۔ رانچی:

﴿۱۹۱﴾

رانچی

یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء

بخدمت سپرنٹنڈنٹ پولیس رانچی

جناب من!

کل جب شام کو میں مسجد سے آیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں نواب نصیر حسین خیالؔ آئے تھے اور مع سامان کے آئے تھے کچھ دیر انتظار کر کے اور کارڈ چھوڑ کے واپس گئے ۔ سامان ساتھ ہونے کی وجہ سے خیال کرتا ہوں کہ شاید ان کا ارادہ یہاں قیام کرنے کا تھا۔

یہ پٹنہ کے رئیس ہیں اور کلکتہ میں بھی ان کا قیام رہتا ہے۔ کلکتہ میں ان کا ایڈریس (غالباً) ''نمبر۷۔ چاندنی بازار'' ہے۔

یہ سن کر کہ ایک شریف ومعزز آدمی سامان لے کر میرے مکان پر آیا اور واپس گیا، مجھے جس قدر تکلیف وشرمندگی ہوئی، اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ آپ سے ملتمس ہوں کہ ازراہِ عنایت مجھے اجازت دی جائے کہ ان کو اپنے یہاں ٹھہراؤں اور اگر اس میں عذر ہو، تو خیر، کم سے کم ملنے، بلانے اور کھانے کے لیے مدعو کرنے کی اجازت دی جائے۔ امید ہے کہ آپ اس درخواست پر پوری توجہ فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص

ابوالکلام

حوالہ: ''مولانا آزاد کا قیامِ رانچی'' از جمشید قمر

نشاط النساء بیگم حسرت موہانی:

﴿۱۹۲﴾

۱۹۱۶ء میں مولانا حسرت موہانی کو حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ انھیں دو سال قید کی سزا ہوئی۔ تقریباً ایک سال کے بعد حکومت نے انھیں بعض شرایط پر رہا کرنا چاہا، لیکن یہ شرایط قید سے بدتر صورت پیدا کرنے والی تھیں۔ اس لیے مولانا حسرت موہانی نے ان شرایط پر رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی سلسلے میں بیگم حسرت نے حکومت کو ایک خط لکھا جس میں لکھا:

''حکومت کی پیش کردہ شرایط پر رہائی سے قید بہ ہر حال بہتر ہے۔ حسرت نے رہائی سے انکار کر دیا، اچھا کیا۔ مجھے ان سے یہی توقع تھی''۔

مولانا آزادؒ اس زمانے میں رانچی میں نظر بند تھے۔ اس مکتوب میں انھوں نے مولانا حسرت کی رہائی کے سلسلے میں حکومت کے کمیونک، اور بیگم حسرت کے خط کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی مجبوری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

(۱۹۱۷ء)

تحیۂ وسلاما!

اخبارات میں صوبجات متّحدہ کی گورنمنٹ کا مولوی حسرت کے متعلق کمیونک نظر سے گزرا اور آپ کا خط بھی جو سینٹرل بیورو نے شایع کیا ہے(۱)۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگوں نے ''اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا'' کی مجسّم تصویر دنیا کو دکھلا دی۔ قرآن نے ان کامل انسانوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور پوری استقامت کے ساتھ اس پر جم گئے ہیں، پھر وعدہ کیا ہے کہ ایسی پاک ہستیوں کے لیے نہ تو کوئی چیز ڈرانے والی ہے اور نہ غم گین کرنے والی۔ مولوی حسرت نے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ ایسے کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی بالکل خالی نہیں ہوئی ہیں۔ یہ مقام یوسفی کا کامل ترین درجہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے دو راہیں کھولی گئی تھیں۔

آزادی اور معصیت، قید خانہ اور طاعتِ حق! انھوں نے آخری راہ اختیار کی اور فرمایا

"رَبِّ السِّجنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّایَدعُونَنِی اِلَیہ"

"خدایا! قید خانہ مجھ کو کہیں زیادہ محبوب ہے، اس چیز سے جس کی طرف مجھ کو بلایا جارہا ہے"۔

الحمدللہ کہ اُس نے اپنے فضل وکرم سے حسرت کو مقام یوسفی کے کامل اتباع کی توفیق دی اور اس فضیلت میں کوئی دوسرا ان کا شریک ونظیر نہیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤتِیہِ مَنْ یَّشَآءُ.

البتہ موجودہ عہد سے اس مقام کے فہم وقدر شناسی کی امید نہیں۔ یہ عہد صرف تخم ریزی کا ہے جو کاشتکاری کے کاموں میں سب سے زیادہ محنت طلب اور مشکل وقت ہے۔ فصل کاٹنے کا وقت نہیں ہے۔ جب وہ آفت آئے گا تو دنیا ان لوگوں کو یاد کرے گی جنھوں نے بیج بونے کی محنت اپنے ذمے لی تھی۔ اور پھل کھانے کی لذت آنے والوں کے لیے چھوڑ دی تھی۔ اس وقت آسمان وزمین ان لوگوں کی بڑائی پر شہادت دیں گے اور وہی دنیا جو اس وقت سو رہی ہے، اٹھے گی تا کہ ان کی پرستش کرے۔ حسرت جو کچھ کر رہا ہے ہندستان اس کو پچاس برس بعد سمجھے گا۔ اس وقت اس سے زیادہ امید نہ رکھیے کہ چند اخباروں میں دو چار مضمون نکل جائیں، اور وقت کی حالت دیکھتے ہوئے یہ بھی خلاف توقع ہے جو حالت اس بارے میں دنیا کی متفقہ تاریخ بتاتی ہے، اس کا مقتضی تو یہ ہے کہ ہر طرف سے تحسین کی جگہ ملامت کی صدائیں اُٹھیں اور لوگ کہیں کہ انہ لمجنون۔ یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ اقوام وممالک کی صلاح وخدمت کا اصل منبع وسر چشمہ انبیاے کرامؑ کی زندگی اور ان کا پاک نمونہ ہے۔ سو ان کا حال جو قرآن نے بتلایا ہے، وہ معلوم! جب کہ وہ اپنی قوم کو زندگی اور کامیابی بخشنا چاہتے تھے تو قوم پتھروں کی بارش سے ان کا استقبال کرتی تھی۔

جب میں آپ کے عزم واستقامت اور اس کے ساتھ تنہائی وکس مپرسی کو سوچتا

ہوں تو کہہ نہیں سکتا کہ قلب کا کیا حال ہوتا ہے؟ یہ اللہ ہی کی مدد ہے اور اس کے روح القدس کا القا، جس نے آپ کو ان مصایب و شدائد میں بھی وہ درجۂ عزم بخشا ہے جو کسی ایک مرد کو بھی آج نصیب نہیں۔

افسوس میں خود مجبور و معطل ہو رہا ہوں اور اپنے وجود ناکارہ کو آپ کے لیے کچھ سود مند نہیں پاتا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں کیوں کر آپ کے لیے مفید ہو سکتا ہوں؟ کوئی ضرورت، کوئی کام، کوئی خدمت مجھے لکھیے، شاید میں کچھ کر سکوں اور اس طرح اپنے قلبِ نادم و خجل کو تسکین دے سکوں۔ آپ کی مالی حالت آج کل کیسی ہے؟ مصارف ضروریات کا کیا انتظام ہے، مکان قائم ہے یا نہیں، اگر قایم ہے تو کیوں کر اس کا انتظام ہوا ہے؟ امید ہے کہ ان امور کو مفصّل لکھیں گی۔

آپ نے فوٹو کی نسبت لکھا تھا۔ یہاں ایک شخص نے اپنے شوق سے لیا تھا۔ میں نے ایک کاپی کے لیے اس کو کہا ہے کہ آپ کو بھیج دے(۲)۔ میں تو اس کو ایک محض بے کار شے سمجھتا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو اس کے لیے اصرار ہے۔

مخلص

ابوالکلام والخیر

حواشی:

(۱) انجمن نظر بندان اسلام۔ دہلی کی مرکزی مجلس

(۲) یقیناً فضل الدین احمد مرتب ''تذکرہ'' مراد ہیں، جو مولانا آزاد کو اپنا تذکرہ لکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے رانچی میں کچھ دنوں تک مقیم رہے تھے اور مولانا کا فوٹو بھی لیا تھا۔ مولانا کی یہی تصویر ہے، جو تذکرہ کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ الہلال پریس، کلکتہ میں شامل ہے۔

ایڈیٹر العصر: لاہور:

﴿۱۹۳﴾

(۱۹۱۹ء)

ایڈیٹر العصر کے نام مولانا کا یہ خط العصر ہی میں شائع ہوا تھا۔ اس خط کا ایک حصہ اخبار ''پبلک'' لاہور میں اس کے ایڈیٹر کے تبصرے کے ساتھ نقل کیا گیا۔ شیخ ضیاء الحق نے مولانا ظفر علی خاں کے خلاف جب کتاب مرتب کی تو خط کا یہ اقتباس مع تبصرۂ پبلک اس میں شامل کرلیا۔ اور اگرچہ مولانا ظفر علی خاں کا نام اس میں کہیں نہ آیا تھا لیکن مقصد اس سے یہی حاصل کیا کہ گویا حکومت سے معافی مانگنے والوں میں ظفر علی خاں شامل تھے۔ یہاں مولانا آزاد کے خط کا یہ اقتباس شیخ صاحب کی اسی کتاب سے لے کر شایع کیا جاتا ہے۔ اس پر پبلک لاہور کا ابتدائی نوٹ یہ ہے:

> ''چند روز ہوئے ہمارے لوکل ہم عصر ''العصر'' نے مولانا حسرت موہانی کی ایک تحریر کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بعض آزادی پسندوں کی آزادی پسندی کا ستون امتحان کے وقت اپنے مرکز ثقل سے ہٹ گیا ہے۔ اس پر مولانا ابوالکلام آزاد سابق ایڈیٹر الہلال نے جو آج کل رانچی (بہار) میں نظر بند ہیں۔ ہم عصر مذکور کو ایک چھٹی لکھی ہے، جو معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ نگرانی کی نظر سے گزر چکی ہے۔ کیوں کہ اس پر محکمۂ نگرانی کے دستخط موجود ہیں۔ اس چھٹی میں آپ ایڈیٹر صاحب ''العصر'' کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں کہ حضرت! بتایئے وہ منتیں کرنے والے اور معافیاں مانگنے والے نظر بند حضرات کون ہیں''؟

اس نوٹ کے بعد مولانا کے خط کا اقتباس نقل کیا ہے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ''پبلک'' لکھتا ہے:

ہم عصر ''العصر'' نے مولانا ابوالکلام آزاد کی اس چھٹی کے جواب میں ان نظر بند اصحاب کے نام بتانے سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان ناموں کی تلاش اور

تجسس بیکار ہے لیکن ہماری رائے میں یہ معاملہ بالکل صاف ہے اور نہ مولانا ابوالکلام کو اس اصرار سے دریافت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہم عصر ''العصر'' کی سیر چشمی سے اس پر پردہ پڑ سکتا ہے۔ اگر ان رعایتوں کو جو حال میں نظر بندوں کو حاصل ہوئی ہیں ان کی درپردہ منتوں اور اظہار توبہ و استغفار کا نتیجہ سمجھ لیا جائے تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ پنجاب میں حال میں کس نظر بند کو گورنمنٹ کی طرف سے خاص رعایتیں عطا ہوئی ہیں اور سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہوگی؟''

اخبار کے مضمون میں مولانا آزاد کے خط کا یہ ٹکڑا نقل کیا گیا تھا:

'' آپ نے العصر میں نظر بندوں کے متعلق ایک نوٹ درج کیا ہے جس میں آپ لکھتے ہیں کہ بعض اشخاص نے نظر بند ہونے کے بعد گورنمنٹ کی خدمت میں عرض داشتیں بھیجی ہیں اور ان میں طلب عفو و اعتراف خطا و اظہار عجز و توبہ کے ایسے طریقے اختیار کیے ہیں کہ اگر وہ پبلک کے سامنے آ جائیں تو لوگوں کو سخت حیرانی و تعجب ہو۔

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیماں شدہ ام
کافرم باز نہ گوئی کہ مسلمان شدہ ام

آپ کا اشارہ جس طرف ہے شاید لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اشاروں سے کام لینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کا مقصد اعلانِ حقیقت ہے تو چاہیے کہ جو معلومات اس بارے میں آپ کو حاصل ہوئی ہیں اور جن اشخاص کی نسبت وہ ہوں ان کو صاف صاف بلا تامل شائع کر دیں۔ تاکہ اس مصیبت کے زمانہ و حصرِ امتحان و دورِ امتیاز عشق و ہوس میں دنیا حقیقت سے بے خبر نہ رہے۔ یہ وہ موسم ہے جس کے انتظار میں امتحان (کے لیے) طالبانِ عشق ہمیشہ مضطرب رہا کرتے ہیں۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز

آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

شرعاً بھی آپ کا فرض ہے کہ یا تو آپ شہادت نہ دیں یا دیں تو وہ مجہول و مبہم نہ ہو۔ بلکہ صاف ہو۔

خاندانِ سعادت قصور

اور

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا محی الدین احمد قصوری کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے ستائیس خط ابھی آپ کے مطالعے میں آرہے ہیں۔ ان خطوط میں زیرِ بحث آنے والے افکار و مسایل کے بارے میں نہایت مفید حواشی بھی آپ کی نظر سے گزریں گے۔ یہ تقریباً تمام حواشی مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے کلک گہر بار کی یادگار ہیں۔ آزاد شناسوں میں مہر مرحوم کا مقام بہت ہی نہیں، ہندستان پاکستان میں سب سے بلند ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت مجموعہ کمالات اور یادگار شخصیت کے مالک تھے۔

مولانا آزاد کے ان خطوط میں خاندانِ سعادت قصور کے جن بزرگ اور ان کے اخلاف کے نام آئے ہیں، ان سے رشتوں کی وضاحت کے بغیر سوانح اور افکار و خدمات کے مطالعہ و تعارف کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی تھی، اور چوں کہ خاندان کی روایات و خصوصیات کا اظہار افراد خاندان کے ذوق و مزاج اور خصایل و سیرت سے ہوتا ہے۔ اس لیے خاندان کے تعارف کا پہلو بھی تشنہ رہ گیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کا یہ طریقہ مناسب معلوم ہوا کہ خطوط کے خاتمے پر خاندان کے بزرگ اور اخلاف کا کم از کم اس حد تک ضرور تعارف کرا دیا جائے کہ اس سے نہ صرف افراد خاندان کے ضروری سوانح اور سیرت و خدمات کے نکات مرتب ہو جائیں، بلکہ خاندانِ سعادت

کی خصوصیات بھی ایک خاص حد تک ضرور نمایاں ہو جائیں۔

اگر چہ اس خانوادۂ محترم کی روایات و خصوصیات اور دینی و سیاسی دایروں میں قوم وملّت کی خدمات کا مقام بہت بلند ہے اور یہ ہیچ مدان، علم سے تہی، کوتہ نظر، شکستہ قلم اس کا اہل نہیں کہ ان کی عظمت کا اندازہ اور خصوصیات کا شمار کر سکے۔ سوچتا ہوں کہ اس خانوادۂ معظّم سے اظہارِ عقیدت میں کیسے شریک کروں اور اپنے شوق کا بار کس پر ڈالوں۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خود ہی کچھ لکھنے کی ہمت کیوں نہ کروں اور خدا سے مدد کی امید رکھوں!

اس خاندانِ عظیم الشان کے گل سرسبد حضرت مولانا عبدالقادر قصوری رحمہ اللہ کے نام بھی مولانا کے دو مکتوبات گرامی قارئین محترم مکتوبات کی دوسری جلد میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ لیکن مکتوب الیہ کے تعارف کے لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ فخر خاندان کا تذکرہ ارکانِ خاندان کے ساتھ اسی مقام پر کر دیا جائے۔

حضرت استاذی و مخدومی مولانا غلام رسول مہر رحمۃ اللہ علیہ نے خاندانِ سعادت قصور کے گل سرسبد حضرت مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے صاحب زادۂ معظّم مولانا محی الدین قصوری کے نام خطوط مرتب کیے تھے اور ان پر ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ مفید حواشی بھی تحریر فرمائے تھے۔ یہ ''خطوط تبرکاتِ آزاد'' کا سب سے اہم حصّہ ہے۔

درحقیقت مولانا مہر نے ''تبرکات'' انھیں کو قرار دیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے خطوط اس مجموعے کی زینت میں اضافہ کے لیے تھے۔ اصحابِ ذوق و نظر کو معلوم تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے نام مولانا کے خطوط کئی کئی بار جراید میں شایع ہو چکے تھے اور خانوادۂ قصور کے دونوں بزرگوں کے نام خطوط پہلی بار شایع کیے جا رہے تھے۔ اس لیے تبرک کی حیثیت انھیں کو حاصل تھی اور دوسرے پہلو سے بھی یہ خطوط اپنا ایک امتیاز رکھتے تھے۔

میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک طویل اور اہم خط جو سورۂ یوسف کے بعض اشکال کے بارے میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے سوالات کے جواب میں تھا۔ یہ خط ''تبرکات آزاد'' میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ نیز چند خطوط مولانا قصوری نے ایک پبلشر کو اشاعت کے لیے دیے تھے جن کے ساتھ ان کے اپنے قلم سے بعض نہایت قیمتی تحریریں تھیں اور ان کا محفوظ ہو جانا نہایت ضروری تھا، تبرکات میں وہ بھی نظر انداز ہوگئی تھیں۔ اب ان خطوط کی اشاعت کا جو انتظام کیا گیا ہے اس میں نہ صرف مذکورۂ بالا تفسیری خط بلکہ مکتوب الیہ کے قلم سے یادگار تحریروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

مولانا محی الدین احمد کے نام حضرت مولانا کے خطوط میں خاندان کے جن افراد کے نام سلام دعا اور خیریت پرسی کے سلسلے میں آئے ہیں یا کسی اور حوالے سے خاندان کے کسی فرد کا ذکر آیا تھا، اس کا تعارف بھی نہیں ہوا تھا، اب ان پر بھی ضروری حواشی لکھ دیے ہیں۔ لیکن ان کی تالیف کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ خطوط کی ترتیب کے بعد سربراہ خاندان کے ساتھ بہ ترتیب خاندان کے افراد کا تذکرہ بھی مرتب کر دیا ہے اور اس طرح کہ شجرۂ خاندان کے گل دستے میں جس شاخ اور پھول پتی کی رشتے کے لحاظ سے جو قدرتی جگہ تھی اس کو اس کی وہی قرار واقعی جگہ دی گئی ہے۔ اگر یہ حواشی خطوط کے پچاس صفحات میں الگ الگ دیے جاتے تو ان کا وہ حسن جو اس گلدستے کی شکل میں نمایاں ہوا ہے، ہرگز ظاہر نہ ہوتا۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس انداز کو پسند فرمائیں گے۔

اگرچہ اس خانوادۂ سعادت کے ایک دور افتادہ نیاز مند کا یہ مقام نہیں کہ وہ اس کے خصائص و امتیاز کے بیان میں قلم اٹھائے لیکن سوچا کہ اس وقت ذوق و استعداد سے محروم اس تہی دامن کو کام کا ابتدائی نمونہ پیش کر دینا چاہیے۔ امید ہے کہ آئندہ اس کی تاریخ و روایات اور خصوصیات سے زیادہ واقف اہل علم قلم اٹھائیں گے اور اس علمی و دینی کام کو اس کے شایانِ شان انجام دیں گے اور کیا تعجب کہ اخلاف خاندان ہی میں

سے خدا کسی فاضل کو اس کی توفیق دے کہ وہی اپنے نیک نام خاندان کا ایک مکمّل اور جامع الاطراف تذکرہ مرتب کر دے کہ یہ اسی کا حق ہے اور اسی کو زیب دے گا۔ خاک سار تو اس خاندانِ عظیم الشان کے اخلاف کو اس طرف توجہ دلائے گا کہ ان پر اپنے خاندان کے موروثی خصایص و امتیازات کو برقرار رکھنے کی جو ذمے داریاں ہیں، وہ انھیں فراموش نہیں کر دینی چاہییں!

مولانا عبدالقادر قصوری:

یہ بزرگ خاندان سعادت قصور کے سربراہ اور گل سرسبد تھے۔ ان کے وجود گرامی اور ذات ستودہ صفات نے اپنے اسلاف کو تاریخِ علم و تہذیب اور دعوتِ توحیدِ کتاب و سنت کا ایک حصّہ بنا دیا، ان کے نیک نام کو روشن کیا اور اخلاف کی تعلیم و تربیت سے اس دور میں انھیں قوم و ملّت کی رہنمائی کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے جانشین اور اخلاف کے قابلِ فخر بزرگ تھے۔ ان کے خاندان کا شمار دین کے خدمت گذار گھرانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے دادا پردادا اپنے دور کے نام ور علماے دین میں سے تھے۔

ان کے والد گرامی مولانا غلام احمد خاندان کے پہلے شخص تھے جو کتاب و سنت کے سرچشمۂ حیات سے سیراب اور جامِ توحید کے لذت شناس اور سلف صالحین کے جادۂ قویمہ پر گام زن ہوئے تھے۔ ان کے کلام میں ایسی تاثیر اور سیرت میں قدرت نے ایسی کشش پیدا کر دی تھی کہ ایک عالم کو انھوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور ان کی اولاد و اخلاف کے قلوب میں بھی اس تاثیر کی ایسی تخم ریزی ہوئی اور اس کا اثر ان کی روح و جسم میں ایسا سرایت کر گیا کہ پونے دو سو برس کی تاریخ میں اس خانوادۂ سعادت کے کسی فرد کو صحت و عیش اور رنج و الم کی کسی حالت میں کتاب و سنت کے دارالصحت کے سوا کسی اور دارالعلاج سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ہر فرد اسی مے

خانۂ توحید کا لذت شناس اور ذوقِ تمسک بالکتاب والسنہ کا آشنا اور کیف سے سرشار ہے۔

اولاً ان کا خاندان اورنگ آباد ضلع سیال کوٹ سے آکر موضع دلاور چیمہ (تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ) میں آباد ہوا تھا۔ مولانا عبدالقادر ۱۸۶۳ء میں اسی موضع (دلاور چیمہ) میں پیدا ہوئے۔ گھر کے بزرگوں سے اردو، عربی، فارسی کی تعلیم پائی۔ کالج کی پڑھائی کے لیے لاہور کا رخ کیا اور اورینٹل کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز ہی سے قصور میں پہلے عارضی اور پھر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تاریخ کے دور جدید میں ان کے خاندان کے قیام سے قصور کی نیک نامی اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ وہ قصور کا سب سے قدیم اور مال دار یا جاگیر دار خاندان نہ تھا، لیکن وہ قصور کا بہت محترم، مہذب اور نیک نام خاندان ضرور تھا۔ ان جیسے کسی بھی خاندان کا کسی شہر وقریہ سے منسوب ہو جانا اس بستی کی عزت وشرف کا موجب ضرور ہوتا۔ قصور سے اس خاندان کی نسبت بلاشبہ اس کی نیک نامی اور شہرت کا موجب ہوئی۔

مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ پنجاب کے کامیاب وکلا میں اور سیاست میں صف اول کی شخصیت شمار ہوتے تھے۔ تحریک مجاہدین سے تو ان کا تعلق بہت زمانے سے تھا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء کے بعد ملکی اور قومی تمام تحریکوں میں انھوں نے حریت پسند اور قوم پرور نقطۂ نظر کے مطابق حصہ لیا۔ ملی تحریکات میں مذہبی، تعلیمی، اصلاحی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق دام و درم سے امداد کے ساتھ عملی تعاون اور صلاح ومشورے کی راہ سے حصہ لیا۔

وہ اپنی دین داری، شرافت، نیک نفسی، اخلاص وایثار کے لیے پورے پنجاب میں اور اس سے باہر تک قومی وملی حلقوں کی ایک مشہور ومحترم شخصیت تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ قابلیت نے ان کی شہرت اور نیک نامی کو دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ قومی وملی

خدمات کے سلسلے میں وہ کئی بار قید و بند اور کاروبار معیشت کی تباہی کی سخت آزمائشوں سے گزرے۔ ایثارِ وقت و مال، اخلاص و تدبر اور تحمّل و استقامت میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۱۲ء میں ان کا تعارف ہوا تھا۔ جلد ہی دونوں بزرگوں میں بہت قریبی اور گہرے تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔ قومی و ملی تحریکات میں دونوں بزرگوں کا ایک ہی نقطۂ نظر تھا اور دونوں فکر و رائے میں ایک دوسرے پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ پھر حضرت قصوری کے چھوٹے بھائی مولوی عبداللہ، اور بیٹوں میں مولانا محی الدین اور مولانا محمد علی کی مولانا سے عقیدت اور قریبی تعلقات نے ان بزرگوں کے مابین تعلقات اور روابط و اعتماد کو زیادہ مستحکم کر دیا تھا۔ قومی و ملی خدمت گذاروں کا یہ خاندانِ رفیع الارکان اب بھی مولانا آزاد کا عقیدت مند خاندان ہے۔ اس خاندان کے بزرگوں اور خردوں نے تحریک مجاہدین سے لے کر تحریک پاکستان تک، تحریک آزادی وطن، تحریک نظم جماعت، تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت، ترک موالات، تحریک ہجرت، تحریک تطہیرِ حجاز، اور دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں میں دل و جان سے حصّہ لیا اور خدمت کی راہ میں کبھی کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔

قومی تحریکات میں ۱۹۳۱ء کی شہزادہ ویلز کے استقبال کے بائی کاٹ، ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے واپس جاؤ کے ہنگامے، ۱۹۲۸ء میں دستور سازی اور نہرو رپورٹ میں ملی مفاد کے تحفّظ کے مساعی، ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی، نمک سازی اور یوم آزادی کے اہتمام کی تحریکات، دوسری عالمی جنگ میں حکومت سے عدم تعاون، ستمبر ۱۹۳۹ء میں کرپس مشن کی آمد، ۱۹۴۲ء (اگست) میں ہندستان چھوڑو تحریک میں کانگریس اور دوسری قوم پرور جماعتوں اور مولانا ابوالکلام کو مولانا عبدالقادر اور ان کے خاندان کا مکمّل فکری اور عملی تعاون حاصل رہا تھا۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد تعمیر وطن کے مساعی، آمریت کے غلبے سے نجات اور جمہوریت کے قیام کی تحریکات میں صف اول میں رہ

کر اپنا قومی اور ملی فرض ادا کیا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا قصوری علیہ الرحمہ نہایت عالی ظرف، متحمل مزاج، وسیع القلب، فراغ حوصلہ، نہایت متخیر، وضع دار، عالم دین، پختہ فکر سیاست داں، شریف النفس، مہذب اور بردبار شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۴۲ء کی شام کو لاہور میں انتقال ہوا اور قصور میں تدفین عمل میں آئی۔

عبدالحق اور محمد عبداللہ ان کے دو چھوٹے بھائی اور محی الدین احمد، محمد علی، احمد علی اور محمود علی ان کے چار بیٹے تھے۔ سب دین دار، قوم و وطن اور دین و ملّت کے خدمت گذار، نیک نفس، بلند خیال، کھلے ذہن و دماغ کے مالک اور تعصّبات دینی و سیاسی سے دور و نفور تھے۔ کتاب و سنت کے سب عاشق، اسلاف کے مسلک کے پیرو اور دین کے ذوق و عمل کے سب لذّت شناس اور سوسایٹی میں اپنا امتیاز رکھتے تھے۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے بھائی (۴):

(۱) مولوی عبدالحق مولانا غلام احمد کے منجھلے بیٹے تھے۔ ۱۸۷۰ء ان کا سالِ پیدائش تھا۔ روایت کے مطابق گھر میں ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور کا رخ کیا اور فارسی میں منشی فاضل اور عربی میں مولوی عالم اور قانون میں بی او ایل کے امتحان پاس کیے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد گوجرانوالہ سے وکالت کا آغاز کیا اور پھر مستقل رہایش بھی وہیں اختیار کرلی۔ قانون میں بڑی وست درس رکھتے تھے۔ خصوصاً دیوانی کے قانون میں ان کی قابلیت مسلّم تھی اور بڑے کامیاب وکیل تھے۔

ممتاز بیگم اور فاطمہ بیگم نامی ان کی دو بیٹیاں اور یہ تین بیٹے تھے، جن میں

۱۔ مولوی محمد شبلی۔ انھوں نے ٹھیکے داری کے کاروبار کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا۔

۲۔ محمد جنید۔ جنھوں نے برطانیہ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی اور انڈین آرمی میں ملازمت اختیار کرلی تھی اور کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔

۳۔ تیسرے بیٹے محمد مسعود نامی تھے۔

فقط یہ چند معلومات عبداللہ ملک کی تالیف ''میاں محمود علی قصوری'' سے اخذ کی ہیں۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے مولوی عبدالحق کے حالات میں اس جملے کا اضافہ کیا ہے:

''انھیں سیاست سے کوئی دل چسپی نہ تھی''۔

(۲) مولانا محمد عبداللہ، مولانا عبدالقادر قصوری کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۷۵ء میں دلاور چیمہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ میٹرک کا امتحان وزیر آباد کے ہائی اسکول سے پاس کیا۔ پھر لاہور چلے گئے۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان گورنمنٹ کالج سے اور بی اے کا امتحان اسلامیہ کالج سے پاس کیا تھا۔ فراغت کے بعد چند برس انھوں نے کابل میں بسر کیے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ فراغتِ تعلیم کے بعد سے اب تک سارا زمانہ انھوں نے تعلیم وتدریس کے مشاغل میں گزارا تھا۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے کاموں کا انھیں خاص شوق تھا۔ بہت اچھے مناظر تھے۔ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ بہت خوبیوں کے مالک اور نہایت متقی پرہیز گار بزرگ تھے۔

سیاست سے انھیں دل چسپی تھی۔ اگرچہ ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل سوانح نگار کی زبانِ قلم پر نہیں آئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت مانوس تھے۔ زیادہ وقت ان کا دعوت و ارشاد اور تبلیغ و اشاعت کے کاموں میں اور عواید و رسوم کے خلاف سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ ''جمعیتِ دعوت وتبلیغ'' کی سرگرمیوں کے تذکرے میں ان کا نام بار بار آیا ہے۔

لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اور یہی ان کی سرگرمیوں کا میدان تھا۔ ۱۹۴۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا عبداللہ قصوری کی اولاد نرینہ میں ان کے تین بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ عبداللہ

ملک نے ان کی تین بیٹیوں بلقیس بیگم، رضیہ بیگم اور رشیدہ بیگم کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کے بیٹوں میں یہ نام آئے ہیں؛

۱۔ بڑے بیٹے کا نام غلام احمد فاروق تھا۔ وہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔

۲۔ دوسرے بیٹے ممتاز احمد خالد تھے۔ وہ کاروبار تجارت میں مشغول تھے۔

۳۔ تیسرے بیٹے ابوبکر نامی شعبۂ تعلیم سے وابستہ اور زولوجی کے پروفیسر تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں خدمات انجام دیں اور کئی تحقیقی منصوبوں پر کام کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۴ر مئی ۱۹۹۷ء کو ہوئی۔

مولانا عبدالقادر قصوری کی اولاد (۵):

(۱) مولانا محی الدین احمد، مولانا عبدالقادر قصوری کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ اپریل ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام برکت علی رکھا گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم سے گریجویشن کی تکمیل تک ان کا یہی نام رہا۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ کالج سے انھوں نے بی اے پاس کیا تھا۔ ڈگری میں ان کا یہی نام درج ہے۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا تعارف ہوا اور مولانا ان کے دینی ذوق اور افکار و عقاید سے واقف ہوئے؛ دونوں کے مابین اعتماد پیدا ہوا اور رشتہ مضبوط ہوا تو مولانا آزاد نے برکت علی ان کا نام بدل کر محی الدین احمد رکھ دیا جو ان کا اپنا نام تھا۔ اور اپنے خاندانی افکار و عقاید سے آزاد ہو کر والد کا رکھا ہوا نام ''غلام محی الدین'' ترک کر کے ''محی الدین احمد'' خود رکھ لیا تھا۔ قصوری صاحب کو اپنا نام دینا اور ان کا قبول کر لینا مولانا آزاد کی شفقت اور قصوری صاحب کی سعادت مندی اور حسن ارادت کی بڑی دلیل ہے۔ اس کے بعد خود انھوں نے اپنا نام برکت علی کبھی استعمال نہیں کیا۔ الا یہ کہ قانون اور ضابطے کی کوئی ضرورت کبھی پیش آ گئی ہو۔ البتہ سی آئی ڈی

نے ہر موقعے پر ان کا نام محی الدین عرف برکت علی استعمال کیا۔ علمی، دینی اور سیاسی حلقوں میں ان کا نام محی الدین خوب مشہور ہو گیا تھا۔

۱۹۱۲ء میں الہلال کے نکلتے ہی ملک میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ ہمارے ممدوح کا الہلال سے تعلّق اس کے اجرا کے وقت ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی دعوت سے بہت متاثر اور اس کے مؤید تھے۔ الہلال کی زبان، اس کا اسلوبِ تحریر، اس کے مضامین کی ترتیب و تدوین اس کی پیش کش کے پہلو بھی شایقین کے لیے کشش کا موجب تھے۔ الہلال کے اس پہلو نے انھیں بھی متاثر کیا۔ انھوں نے اس کی دعوتِ حق کے سامنے سمع و طاعت کا سر جھکا دیا۔ پھر جب مولانا آزاد نے جماعت ''حزب اللہ'' پر مضمون لکھا تھا اور ''من انصاری الی اللہ'' کی دل کو تڑپا دینی والی صدا بلند کی تو وہ اس کے نخچیر ہو گئے۔ درحقیقت انھوں نے مولانا آزاد کی دعوت حق کے اعلان کے پہلے ہی روز اپنی جان نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی تھی کہ نہ جانے کب اور زندگی کے کس موڑ پر یہ نذرانۂ جاں پیش کرنے کی ضرورت پیش آ جائے اور ان کے عزم راسخ کو عمل میں لانے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو!

مولانا محی الدین قصوری نے اپنے ذوقِ کتاب وسنت اور خدمت ملّت کے عزم صادق وراسخ اور گونا گوں خوبیوں کی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد کے [illegible] جو جگہ بنالی تھی۔ اس کا اثر صرف انھی کی ذات تک محدود نہیں رہا تھا [illegible] بزرگ اور خورد تک متعدی ہو گیا۔ مولانا آزاد اگرچہ ان سے عمر میں [illegible] ایک سال بڑے تھے اور مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا آزاد میں تو باپ بیٹے کی عمر کا تفاوت تھا، لیکن خاندان میں مولانا آزاد کا احترام مثل ایک بزرگ کے ہوتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں ہجرت کی بیعت وشوریٰ کے لیے بزرگ باپ اور سعادت مند بیٹا۔ دونوں قصور اور لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے مامون ومجاز بالاعلان تھے۔ اور مشورے اور عمل و اقدام کے فیصلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قایم مقام

تھے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ ان دونوں بزرگوں نے مولانا آزاد کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ لیکن یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس عملِ شریعت کی ادائیگی کے بغیر اعتماد کا یہ مقام حاصل کر لینا ممکن ہی نہ ہو سکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا محی الدین احمد قصوری پر جو اعتماد تھا، وہ معلوم ہے اور ان کی ذات سے تحریک رجوع الی القرآن کے سلسلے میں بہت توقعات رکھتے تھے۔ مولانا قصوری مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذوق اور لذت کے شوق سے نوازا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس مضمون سے بہ خوبی ہو جاتا ہے جو الہلال کی دعوت کی نسبت ''صدائے ملّت'' کے زیرِ عنوان ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو الہلال میں شائع ہوا تھا۔ یہ درحقیقت ایڈیٹر الہلال کے نام ایک خط ہے، جو دعوتِ الہلال پر تبصرے، اپنے بیان کی اہمیّت اور اسلوب تحریر کی دل نشینی کی نسبت سے ایک مقالے کے حدود اور خصوصیات کو چھو لیتا ہے۔ ان کی اِنھیں خوبیوں کی بنا پر مولانا آزاد ان پر بہت شفقت فرماتے تھے اور انھیں بہ شوق قرآن حکیم کے اسرار و رموز کی تعلیم دیتے اور ذوق کی تربیت فرماتے تھے۔

مولانا محی الدین کو مولانا آزاد سے تعلقات اور ان کی شفقت پر بڑا ناز تھا۔ بعض مواقع پر انھوں نے مولانا آزاد سے بڑے جارحانہ سوالات کیے، لیکن یہ ان کے ناز کی بات تھی۔ مولانا آزاد نے اس کا بُرا نہیں مانا اور نہایت شفقت کے ساتھ ان کے سوالات کا جواب دیا۔ مولانا قصوری کے نام ان خطوط پر ان کے نوٹس مولانا آزاد کے جوابات کے مطالعے سے دونوں بزرگوں کے باہمی روابط محبّت و اعتماد اور ناز و نیاز کا پتا چلتا ہے۔

کلکتے میں مولانا آزاد کے قریب رہ کر تقریباً ایک سال مولانا کی صحبت، دارالارشاد کے درس میں شرکت اور مولانا آزاد کی نگرانی میں روزنامہ ''اقدام'' کے اجرا کے زمانے میں مشورہ و ہدایات سے جو فیض اٹھایا تھا، اس کی مثال ان کے ہم فکرو

ہم مشرب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سوا کسی اور میں نہیں ملتی۔ اس میں بھی مولانا قصوری مرحوم کو ایک درجۂ امتیاز حاصل تھا۔

مولانا محی الدین نے اپنی زندگی میں جو تکالیف اٹھائی تھیں اور جو دکھ جھیلے تھے ان کا سلسلہ صرف انھی کی ذات تک محدود نہیں رہا، ان کے والد گرامی اور برادرانِ عزیز مولانا محمد علی اور میاں محمود علی قصوری تک دراز ہو گیا اور سب کو قید و نظر بندی کے دکھ جھیلنے پڑے۔ پولیس کے چھاپوں، اِن ٹیلی جینس کی خانہ تلاشیوں، ذرائع معیشت کے نقصان، زندگی کے عیش و راحت کے فقدان اور بے شمار مسایل و مصایب نے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کے اسباب و پس منظر میں مولانا ابوالکلام آزاد سے سیاسی رشتے اور شخصی روابط کا بھی حصّہ ہے۔ لیکن ان بزرگوں اور خردوں کی زبان سے کبھی کوئی شکایت کا لفظ نہیں سنا گیا۔ مولانا آزاد سے تعلقات پر ہمیشہ فخر ہی کیا۔ نہ ان تعلقات کے اظہار و اعتراف میں کبھی حکومت کے جبر و تشدد کے خوف کا دل میں گزر ہوا اور نہ کسی کے طعن و ملامت اور نکتہ چینی کی پروا کی۔ مولانا آزاد کے ایک خط کی تقریب تعارف میں مکتوب الیہ لکھتے ہیں:

> ”مجھے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۱۲ء میں شرف نیاز حاصل ہوا۔ جب کہ الہلال جاری ہوئے چند ہی مہینے ہوئے تھے۔ مجھے فخر حاصل ہے کہ اس وقت سے لے کر تقسیم ہندستان تک میں ہمیشہ ان کی مخصوص عنایات کا مدار رہا ہوں۔ جب میں ان سے دور بھی رہا ہوں تو انھوں نے مجھے ہمیشہ محبّت آمیز خطوں سے نوازا ہے“۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان سے اپنے رشتہ و تعلّق کا اس وقت اظہار و اعتراف کیا، جب وہ خود رانچی میں جلا وطنی اور نظر بندی کی صلیب پر چڑھے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان کی نظر بندی و گرفتاری کی خبر سنی تو تڑپ اٹھے۔ یہ وقت تھا جب تذکرہ اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اسی وقت قلم اٹھایا اور کاغذ پر اپنے تاثرات کا ایک دایمی نقش ثبت

کر دیا۔ یہ نقش تذکرہ“ کی آخری اور اڑتیسویں فصل کی صورت میں جگمگا رہا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

”یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ڈاک ملی اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد بی اے کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کرلیا گیا ہے۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایامِ جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعے کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں:

دردے کیں نامہ می کردم رقم

کان یجر الدمع ممزوجاً بہ دم

عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصایص ایمانی و جوش اسلامی و ایثار اللہ وفی اللہ کے اعتبار سے عہدِ سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق اور استعداد کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس! فتنۂ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں، لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے؟ بہ ظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے راہ ورسم رکھتے ہیں! سبحان اللہ اپنی آشنا پروری اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے! جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے، ہمارا دوست ہی نہیں بن سکتا:

اے ہم نفساں! آتشم از من بگزیرید

ہر کس کہ شود ہمرہِ ما دشمن خویش است!“

(تذکرہ: کلکتہ، البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۱۹ء، ص ۱۵۔۳۱۴)

غور فرمائیے! مولانا ابوالکلام آزاد نے مولوی محی الدین اور ان کے خاندان کے بارے میں کیا کہا ہے؟

ا۔ مولانا نے خاندانِ سعادت قصور کے بارے میں؛

”خصایص ایمانی، جوشِ اسلامی اور ایثار للہ فی اللہ...... تین خصوصیت بیان کر

کے ایمان کے رسوخ، عقیدے کی محکمی اور عزایم کے باب میں جوشِ عمل وخدمت اور کارزارِ حیات میں استقامت اور ایثارِ جان ومال کی طرف اشارہ کر کے اور ''عہدِ سلف کو زندہ کرنے والا'' کہہ کر کیا کچھ نہیں کہہ دیا، جو اس بارے میں کہا جانا چاہیے تھا''۔

ا۔ ایک صاحبِ عزم کے بارے میں کیا پوچھنا چاہیے تھا کہ اس میں ذوق واستعداد کامل اور طلبِ صادق کا کیا حال ہے؟ ہر کوئی جانتا ہے کہ میدانِ عمل میں نتایج کا دارو مدار انھی دو باتوں پر ہوتا ہے اور اس سے چند در چند امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں، جس میں یہ دو خوبیاں موجود ہوں۔ آپ سوچیے کہ یہ بات کون کہہ سکتا ہے کہ

''مولانا محی الدین احمد قصوری میں استعداد کامل اور طلبِ صادق کی خوبیاں نہ تھیں یا انھوں نے اپنے وقت میں قوم ووطن اور دین وملّت کی خدمت کی راہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی امیدوں کو پورا نہیں کر دکھایا؟''

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ انھوں نے شعبۂ تعلیم میں درس وتدریس کے شوق میں گزارا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ۱۳/ جولائی کو الہلال کلکتہ کا پہلا نمبر شایع ہوا تھا۔ ہم اس تاریخ کو مولانا محی الدین میں ایک مبارک انقلاب اور ان کے عہدِ سعادت کے آغاز کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو الہلال میں ان کا مضمون شایع ہوا۔ اس مضمون کے مطالعے سے کتاب وسنت سے ان کے جس عشق کا مولانا آزاد کو اندازہ ہوا۔ پھر ۱۶۔۱۹۱۵ء میں ان کے قیامِ کلکتہ کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں ان کے فکر وعقاید، ذوقِ علمی ودینی اور ذہنی صلاحیتوں اور قابلیتوں اور سیرت کے جن اعلیٰ و عمدہ خصایص کا علم ہوا پھر ۱۹۔۱۹۱۸ء میں رانچی میں نظر بندی کی خلوتوں میں ان کی استعداد کامل اور طلبِ صادق کے بارے میں غور وفکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچے تھے۔ ان کی خانہ تلاشی اور گرفتاری اور آیندہ ان کی زندگی میں خطرات کا خیال آیا تو دل میں چھپی ہوئی محبّت اور مولانا قصوری سے وابستہ امیدوں سے پردہ اٹھ گیا اور یہ بات ان کے قلم سے بے ساختہ نکل گئی کہ یہ کیا ہوا؟

”........اس عزیز کے طلبِ صادق اور استعدادِ کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں، افسوس! فتنۂ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا“!

مولانا قصوری کی زندگی کے آخری دور کی سرگرمیوں میں اور مشاغل اور دعوتِ قرآن اور اصلاحِ امت کے شوق اور ولولوں کو دیکھ کر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اپنے استاد اور پیر و مرشد کی آرزوؤں اور امیدوں کو پورا نہیں کیا۔ ان کی زندگی کے شب و روز انھیں مشاغل میں گزرے جس کی مولانا آزاد نے ان سے امید کی تھی۔ مولانا محی الدین احمد قصوری نے ۲۴ رجنوری ۱۹۷۱ء کو لاہور میں انتقال کیا اور میت کو قصور لے جا کر ان کے والد گرامی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے چار بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ صلاح الدین احمد: مولانا محی الدین قصوری کے بڑے بیٹے اخلاق وتہذیب کا مجسّمہ اور بے شمار خوبیوں کے جامع تھے۔ کاروبار وتجارت ان کا ذریعہ معاش تھا۔ ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۲۔ معین الدین احمد قریشی: یہ مولانا محی الدین قصوری کے وہ نام ور اور لایق و فایق بیٹے اور پاکستان کے وہ محسن فرزند تھے، جو ۱۹۹۳ء میں معاشی بحران اور کرپشن کے منجدھار میں پھنسی پاکستان کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کے لیے نگران وزیر اعظم کی صورت میں یورپ کے آسمان سے اتارے گئے تھے اور شاید ایک ڈیڑھ سال کے اندر حالات سدھار کے، الیکشن کروا کے اور نئی انتظامیہ کو حکومت کی باگ ڈور حوالے کر کے پھر اپنے مرکز کی طرف پرواز کر گئے تھے۔ پاکستان کی مخلوق ان کی قابلیت، ان کے اخلاص اور بے لوثی و بے غرضی پر حیران و ششدر ہے اور کہتی ہے: ”ضرورت ہے ایک ایسے مخلص، ایمان دار، مدبر، منتظم و کارگذار محسنِ پاکستان کی!

عبداللہ ملک نے خالص تاریخی زبان میں لکھا ہے کہ معین الدین احمد قریشی جو

عالمی بینک کے اعلیٰ ترین عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، انھیں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے اتفاق اور پاکستان فوج کے مشورے سے ۱۸؍ جولائی ۱۹۹۳ء کو نگراں وزیراعظم بنایا گیا۔ نگراں حکومت نے نومبر میں نئے انتخاب کرائے، جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی لیڈر بےنظیر بھٹو (شہید) برسرِ اقتدار آئیں اور مسلم لیگ کے میاں نواز شریف نے حزب اختلاف کا کردار ادا کیا"۔ (میاں محمد علی قصوری: از عبداللہ ملک، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷۔ ۱۷)

۳۔ سلمان قریشی: محکمہ پولیس کے ایک نہایت فرض شناس آفیسر تھے۔ ڈی آئی جی تک ان کی ترقی کا پتا چلتا ہے۔

۴۔ بلال قریشی: یہ مولانا محی الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے انھیں کراچی میں مصروف کاروبار لکھا ہے۔

(۲) مولانا محمد علی ایم اے (کنٹب): مولانا محمد علی مولانا عبدالقادر قصوری کے منجھلے بیٹے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں قصور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) سے بی اے پاس کیا۔ ۱۹۱۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ کیمبرج یونی ورسٹی سے ریاضی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر قانون پڑھنا شروع کیا تھا کہ جولائی ۱۹۱۴ء میں مختصر عرصے کے لیے وطن آئے تھے۔ ستمبر میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور پھر وہ لندن نہ جا سکے۔

سیاسی ذوق رکھتے تھے۔ وطن کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے اور ترکی خلافت کی بقا اور استحکام کو ملتِ اسلامیہ کی آبرو سمجھتے تھے۔ جنگ عظیم چھڑ جانے سے ترکی خلافت اور اسلامی ممالک کے لیے گونا گوں خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ قوم کے رعایت پسند، خطاب یافتہ اور جاگیر و سرمایہ رکھنے والے برٹش استعمار کے معاون اور ہمدرد تھے لیکن استعمار دشمن اور حریت پسند رہنما برٹش حکومت کو کوئی امداد پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ دہلی کی انقلابی پارٹی جس کے

اراکین حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، محمد علی آف کامریڈ اور دیو بند اور کلکتہ کے انقلابی، مولانا محمود حسن رحمہ اللہ محدث دیو بندی اور مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر الہلال بھی ان کے رابطے میں تھے۔ حریت پسندی اور ملّت پروری کے رشتے میں سب منسلک تھے۔

اسی زمانے (۱۵۔۱۹۱۳ء) میں حضرت محدث دیو بندی کی تحریک اس کی تربیت گاہ ''جمعیّت الانصار'' دیو بند اور اس کے دوسرے مرکز دہلی کے مدرسہ ''نظارت المعارف القرآنیہ'' میں مولانا عبیداللہ سندھی اس کے انچارج تھے۔ ترکی خلافت کے تحفّظ اور اسلامی ممالک کے لیے خطرات نے سب کو بے چین کر دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ کوئی خاص منصوبہ اور واضح پروگرام کسی کے سامنے نہ تھا، اُس بات پر سب متفق تھے کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اور ملک میں اور ملک سے باہر تک آزادی اور بیداری کی ایک زبردست تحریک پیدا کر دینی چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ طے پایا کہ جماعت کے چند افراد کو کابل پہنچ کر آزادیِ وطن اور ملتِ اسلامیہ کے مفاد و مصالح کے مطابق حالات کا رخ بدلنے اور حالات سے فایدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس شوریٰ کے سب سے کم عمر لیکن فاضل ترین رکن مولانا محمد علی قصوری تھے۔ قرعۂ فال ان ہی کے نام نکلا کہ ایثار و عزیمت کی راہ میں پہلا قدم وہ اٹھائیں گے! یہ محض اتفاق تھا کہ حبیبیہ کالج۔ کابل کی پرنسپل شپ کی پیش کش موجود تھی اور اس کے لیے نوجوان قصوری میں مطلوبہ شرایط سے زیادہ اور غیر معمولی قابلیت موجود تھی، انھیں کو حکم ہوا کہ وہ فوراً کابل روانہ ہو جائیں۔ کابل جانا مولانا عبیداللہ سندھی کا بھی طے ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی فوری روانگی میں چند در چند موانع تھے۔ اس لیے انھیں کچھ عرصے ٹھہرنا پڑا۔

مولانا محمد علی قصوری مارچ ۱۹۱۵ء میں کابل روانہ ہوئے اور مولانا عبیداللہ سندھی دہلی سے تو اسی زمانے میں نکل گئے تھے۔ چند ماہ سندھ میں گزارے۔ سفر کے چند رفقا

کو تیار کیا، سفر کے انتظامات کیے۔ وہ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۵ء سے پہلے کابل نہ پہنچ سکے تھے۔ حضرت مولانا محمود حسنؒ نے اپنے طور پر فیصلہ کرلیا کہ انھیں حجاز پہنچ کر ترکی خلافت کی امداد اور وطن کی آزادی کے لیے حالات کو سازگار بنانا چاہیے۔ چناں چہ وہ وسطِ ستمبر میں اپنے مرکز دیو بند سے نکلے اور اوایل اکتوبر ۱۹۱۵ء میں حجاز پہنچے اور اسی وقت سے اپنا کام شروع کر دیا۔

مولانا محمد علی قصوری نے کابل پہنچ کر کالج کا چارج سنبھالتے ہی اپنے سیاسی مقصد کے مطابق کام کا آغاز کر دیا۔ ان کا پہلا کام اربابِ حکومت میں رسوخ اور ان کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ ان کی یہ مشکل حبیبیہ کالج کی پرنسپل شپ نے دور کر دی۔ کالج چھوٹا سا اور زیادہ سے زیادہ ہائی اسکول کی سطح کا تھا۔ لیکن اس کی پرنسپلی ایک بڑا منصب تھا۔ ان جیسی قابلیت کا شخص کابل میں کوئی نہ تھا۔ کالج کے تعلّق سے عوام اور حکومت کے عمال سے اونچی سوسایٹی اور امیر حبیب اللہ اور ان کے دربار تک انھیں احترام اور عزت کا بلند مقام حاصل ہو گیا۔ انھوں نے کابل کی اونچی سوسایٹی میں جلد ہی اعتماد پیدا کر لیا۔ اسی دوران انھوں نے آزاد علاقے میں مجاہدین سے رابطہ پیدا کر لیا۔ یہ ان کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس باب میں ان کے والد گرامی مولانا عبدالقادر کی شہرت، نیک نامی اور تحریک مجاہدین کے امرا و سفرا سے ان کے تعلقات اور شناسائی بہت کام آئی۔

کابل کی سوسایٹی میں ادنیٰ تا اعلیٰ رسوخ حاصل کرنے اور اعتماد پیدا کرنے میں خصوصاً حکومت کے اونچے طبقے میں جگہ بنانے میں جرمن، ترکی، ہندستانی مشن نے بڑا کام کیا۔ اس وقت انگریزی زبان میں ان کی قابلیت اور فارسی سے ان کی واقفیت بہت کام آئی۔ یہ مشن اکتوبر ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتے میں اچانک کابل پہنچا تھا اور جرمن، آسٹرین، ترک اور ہندستانی نمایندوں پر مشتمل تھا۔ مشن کے ارکان کی حکومت سے گفتگو میں مولانا علی کو حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے حصّہ لینا پڑا۔ اس طرح

حکومت کابل کے سبھی ارکان میں نہ صرف ان کی علمی قابلیت کی بلکہ تدبر کی دھاک بیٹھ گئی اور مشن کے ارکان میں بھی ان کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس صورت حال نے مولانا قصوری کے لیے موقعے سے فایدہ اٹھانے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ہندستان سے کابل میں تازہ وارد تھے۔ ہندستان کے بارے میں ان کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔ جب کہ مشن کے ہر دو ہندستانی ممبر راجہ مہندر برتاب اور مولانا برکت اللہ بھوپالی ہندستان سے برسوں پہلے نکلے تھے اور جنگ چھڑ جانے کے بعد ہندستان میں موسم کی تبدیلی کا انھیں کچھ پتا نہ تھا۔ مولانا قصوری زیادہ صحیح اور تازہ معلومات رکھتے تھے اور بہ دلایل پرزور زبان میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کر سکتے تھے۔ یہ بات چوں کہ جرمن آسٹرین ممبران نے محسوس کر لی تھی۔ اس لیے عارضی حکومت کی تشکیل میں ان کا زیادہ دخل رہا۔ عارضی حکومت میں انھیں وزارت خارجہ کا جو اہم منصب دیا گیا تھا، اس کا یہی پس منظر تھا۔

یہ خصوصیت مولانا عبیداللہ سندھی میں بھی تھی، لیکن انگریزی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے جرمن اور آسٹرین کو تو وہ اپنی قابلیت سے بالکل متاثر نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ان ملکوں کے ممبران اور ترکی کے رکن گفتگو کے بعد ان کے تدبر کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ ہندستانی ممبران تو ایک حد تک ان کے زیر اثر گئے تھے۔ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت تو نہیں لیکن جو حالات مطالعے میں آئے ہیں ان سے یہ بات بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ ان کو عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے جانے میں مولانا قصوری کی ذہانت کی کارفرمائی اور کوشش کا بھی دخل تھا۔ یہ بات نظر انداز نہ کر دینی چاہیے کہ مولانا قصوری کو ہندستان کی عارضی حکومت کی تشکیل وقیام کے بعد، اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ آزاد قبایل کے جنگ جوؤں اور مجاہدین کو آزاد حکومت کی فوج قرار دینا اور مولوی محمد بشیر کو وزیر دفاع بنوانا تو مولانا قصوری کے تدبر اور اعلیٰ دماغی کا ثبوت ہے۔ ان کی منشا کے بغیر یہ بات ظہور

میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس بات اور اس کی اہمیّت سے راجہ صاحب اور مولانا بھوپالی بالکل بے خبر تھے اور جنود ربانیہ کے بارے میں مولانا سندھی کا منصوبہ اس سے بالکل مختلف اور قطعی طور پر غیر واضح تھا۔ اس کی عملی تشکیل اور قیام کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قصوری سازشوں کو شکار نہ ہوتے اور انھیں کابل نہ چھوڑنا پڑتا تو تاریخ کا فیصلہ بالکل دوسرا ہوتا!

مولانا محمد علی کی خدمات جتنی اہم تھیں اسی کے مطابق ان کی ذمے داریاں بھی تھیں اور ویسی ہی انھیں سخت آزمایشوں سے گزرنا پڑا۔ کابل میں ان کا پہلا سابقہ ان مزدور انگریزوں سے پڑا جو انجینئر بنے ہوئے تھے اور حکومت کو لوٹ رہے تھے۔ وہ ان کے دشمن بن گئے۔ پھر حکومت کے خود غرض اور نااہل عمال تھے جو ان کے دشمن بن گئے۔ ان کا جال تمام محکموں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان سے اوپر برٹش حکومت کے آلۂ کار اور جاسوس تھے۔ مولانا قصوری بہت قابل تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان سب دشمنانِ دین و وطن سے نمٹنے کی صلاحیت اور ان سے مقابلے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ ان دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ یہ سازشیں رنگ لائیں اور بالآخر مولانا قصوری کو ۱۹۱۶ء کے ختم ہوتے ہوتے کابل چھوڑ دینا پڑا۔

مولانا قصوری نے اپنی زندگی قوم کی آزادی اور ملّت کی بہبود کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ کابل میں عزت و احترام کے ایک منصب سے دامن جھاڑ کر اٹھے اور کابل سے نکل کر آزاد قبایل کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے مجاہدین کے نظم و تربیت کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک عرصے تک کامل توجہ اور تن دہی سے اس کام میں مصروف رہے۔ متعدد معرکوں میں فتوحات نے ان کی حیثیت اور مقام کو بہت بلند کر دیا، ان کی نیک نامی کا تذکرہ ہر کہہ و مہہ کی زبان پر آ گیا۔ ان کے وجود گرامی سے تاریخ مجاہدین میں ایک روشن باب کا اضافہ ہوا۔ لیکن جب عالم گیر جنگ نے اپنے

آغاز و عروج اور فتوحات کے بعد نتائج کا مال غنیمت سمیٹنا شروع کیا، حالات نے پلٹا کھایا اور افراد جماعت اور اقوام و قبایل کے طرزِ فکر میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور انجام صاف نظر آنے لگا کہ اب قدیم طرزِ سیاست و طاقت اور اسلحہ کے ذریعے سے ملک و ملّت کی خدمات انجام نہیں دی جا سکتیں تو مولانا قصوری کو بھی قوم و ملّت اور مذہب و وطن کی خدمت کے لیے طرزِ سیاست اور میدان کار کو بدلنے اور سعی و جہد کے نئے میدان کی جستجو ہوئی۔ قدرت نے اس کا انتظام بھی کر دیا۔ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ ہندستان لوٹ آئے۔ انھیں خود سوچنے اور اکابر داعیان اور اعزہ و احباب سے مشورہ و مذاکرہ کرنے اور پر سکون ماحول میں فیصلہ کرنے کی مہلت مل گئی تھی۔

اس مہلت کے ساتھ انھیں اعلیٰ سرکاری ملازمت، کسی کالج اور یونی ورسٹی میں کوئی عہدہ چن لینے، تحقیق و تالیف کا کوئی ادارہ قایم کر لینے میں امداد کی پیش کش موجود تھی۔ یہ بات اس سلسلے میں کہی گئی تھی کہ وہ اگر اپنی ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی زندگی کے تجربات مرتب کر دیں تو بہ طور رایلٹی ایک لاکھ روپے دیے جائیں گے۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے تجربات سے برٹش استعمار کو قوم و وطن اور ملّت کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت کی ہر پیش کش کی انھیں ایک قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اس لیے انھوں نے حکومت کی کوئی پیش کش قبول نہیں کی۔

انھوں نے حکومت کی ہر تجویز سے رخ پھیر لیا اور ہر پیش کش کے فواید سے بے پروا ہو کر اپنے آزادانہ فیصلے اور والد گرامی کے مشورے اور امداد سے کاروبار تجارت کے میدان میں قدم رکھا۔ میرے علم کے مطابق اگر چہ اس وقت انھوں نے کسی قومی و سیاسی تحریک کے رد و قبول سے کوئی تعلّق نہیں رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنی سرگرمیوں کے لیے حکومت کو کسی یقین دہانی کرانے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ حکومت بھی کسی ایسے شخص سے مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ حکومت نے انھیں معاف نہیں کر دیا تھا۔ اس نے ان کے

کاروبار میں اڑچنیں پیدا کیں، قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ کاروبار تباہ ہو کر ہی رہا، جس کا اثر نہ صرف ان کے خاندان کی معاشیات پر پڑا بلکہ دینی خدمات کے ان سلسلوں پر بھی پڑا جن سے ملّت کی فلاح اور دعوت وارشاد کے بہترین نتایج کی امیدیں وابستہ تھیں۔

مولانا محمد علی قصوری کا شمار رجال کار اور اصحابِ عزیمت میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی قومی وملی خدمت کے عملی میدانوں میں گزری۔ وہ تصنیف وتالیف کے مردِ میدان نہیں تھے۔ ان کی زندگی میں تصنیف وتالیف کی مشغولیتوں کے ہنگامے نظر نہیں آتے۔ اس کے باوجود ان جیسے صاحب علم وفکر، شایق مطالعہ وجہاں دیدہ شخص کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ اسے کبھی کسی ''موضوع پر قلم اٹھانے کا اتفاق ہی نہ ہوتا۔ ان کی زندگی میں یہ اتفاقات پیش آئے ہیں۔ چناں چہ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے ''اللہ کی بادشاہت'' اور ''قرآنی دعوتِ انقلاب'' نامی دو تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ اور ایک اہم اور نادر مضمون ''فتنہ انکارِ حدیث کا عقلی اور تاریخی تجزیہ'' کے عنوان سے خود مولانا بھٹی صاحب نے اپنے ہی زیر ادارت الاعتصام۔ لاہور کے ''حجیت حدیث نمبر'' میں چھاپا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا بھٹی صاحب نے ہفت روزہ ''توحید'' امرتسر میں ان کے مضامین کی نشان دہی کی ہے۔ ''مشاہدات کابل ویاغستان'' ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ میری دست رس میں ان کی یہی ایک کتاب ہے۔ یہ ان کی زندگی کے چار سالوں کی معرکہ آرا حیات بخش اور بصیرت افروز سرگزشت ہے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے زیرنظر مضمون کے مطالعے کے دوران حاشیے میں لکھا ہے کہ

> ''انھوں نے انگریزی میں قرآنِ مجید کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا اور پانچ پاروں کا ترجمہ مکمل ہو گیا تھا جو ٹائپ بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ وفات پا گئے اور کام آگے نہ بڑھ سکا''۔

زندگی کے آخری دور میں دینی کاموں سے ان کی دلچسپی خصوصاً درس وتعلیم قرآن

کے اہتمام میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا تھا۔ ۱۲/جنوری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مریم صادقہ، عائشہ خالدہ، حفصہ زاہدہ، عارفہ، منیہ سمیہ اور اسماء نامی نیک سیرت اور صالح و سعادت مند چھ بیٹیوں کے انعام سے نوازا تھا۔

۳۔ احمد علی: مولانا عبدالقادر قصوری کے تیسرے بیٹے احمد علی تھے۔ وہ ۱۸۹۵ء کے قریبی زمانے میں بہ مقام قصور پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پائی، پھر اسکول میں داخل ہوئے۔ میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شروع ہی سے کاروبار میں مشغول ہو گئے تھے۔ اسی تعلّق سے طویل عرصے تک امرتسر میں مقیم رہے۔ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے لاہور آ گئے تھے اور آزادی کے کچھ عرصے بعد لاہور ہی میں وفات پائی۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے ان کی حلیم الطبعی، خوش مزاجی اور تواضع کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ خاندان کے موروثی اخلاق و سیرت میں شرافت و نجابت کے اوصافِ حمیدہ سے متصف تھے۔ محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی نے ان کے ایک بیٹے محمد کا ذکر کیا ہے جو فوج میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ مولانا آزاد کے خطوں میں کئی بار ان کے لیے سلام آیا ہے۔

۴۔ محمود علی قصوری: مولانا محی الدین احمد قصوری کے چوتھے اور سب سے چھوٹے بھائی محمود علی قصوری تھے۔ وہ ۳۱/دسمبر ۱۹۱۰ء کو قصور میں پیدا ہوئے۔

سیاست کا شوق انھیں شروع سے تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ممبئی کانگریس کمیٹی کے سیکریٹری تھے۔ ۲۶/جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے پہلا یومِ آزادی منایا تھا۔ ہندستان میں آج تک اسی تاریخ کو ''یومِ آزادی'' منایا جاتا ہے۔ میاں محمود علی قصوری پہلا یوم آزادی منانے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور چار مہینے کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ بعد کے برسوں میں انھوں نے ممبئی یونی ورسٹی سے بی اے ایل کی سند حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں

وہ قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے اور ۱۹۳۵ء کے اواخر میں بار ایٹ لا کی ڈگری لے کر وطن لوٹے۔

۱۹۳۷ء کے آغاز سے قانون کی پریکٹس اور اس کے ساتھ لا کالج میں پروفیسری سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن یورپ کی زندگی کا اثر تھا یا وطنی سیاست کا، ان کی توجہ خاندان کے بزرگوں کی روایت کے خلاف لیگ کی سیاست کی طرف تھی۔ یہ ۱۹۴۰ء کے آغاز کا واقعہ ہے کہ لاہور کے سفر کے موقع پر مولانا عبدالقادر قصوری اپنے دو بیٹوں مولانا محمد علی اور میاں محمود علی کے ساتھ، مولانا آزاد سے ملاقی ہوئے۔ اس ملاقات کا ذکر خود مولانا آزاد نے مولانا محی الدین قصوری کے نام ۲/ مارچ ۱۹۴۰ء کے خط میں کیا ہے۔ مولانا نے لکھا:

> ''لاہور میں آپ کے والد بزرگوار اور مولوی محمد علی و محمود علی کی موجودگی کی مسرت میں اگر کوئی کمی تھی تو آپ کی عدم موجودگی کی! تاہم یہ ظاہری کمی تھی، ورنہ آپ بھی میرے ساتھ تھے''۔

میاں محمود علی کے حوالے سے اس ملاقات کی خاص بات یہ تھی کہ خاندانِ سعادت قصور کے بزرگ وگل سرسبد حضرت مولانا عبدالقادر قصوری نے مولانا ابوالکلام آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''اب تک ہمارے گھر میں مسلم لیگ کا چرچا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب محمود علی لندن سے تعلیم مکمّل کر کے آئے ہیں تو مسلم لیگ میں شرکت کے لیے پر تول رہے ہیں''۔

مولانا آزاد نے جواب میں فرمایا:

> ''نوجوانوں کا راستہ نہیں روکنا چاہیے۔ یہ جدھر جاتے ہیں جانے دیجیے۔ گھوم پھر کر خود ہی اپنی منزل تلاش کر لیں گے۔''

پھر میاں صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''آپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیے اور اس کے پلیٹ فارم سے ملک اور قوم کی

خدمت کیجیے"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو یقین تھا کہ جب وہ ملک کی آزادی اور اسلام کی خدمت کے پُر اخلاص نظریے اور ملّت کے فلاح و بہبود کے جذبۂ صادق کے ساتھ اپنے بزرگوں کے اخلاص و ایثار کی روایات کے مطابق کسی جماعت میں شریک ہوں گے تو ان کی شرکت یقیناً اچھے نتائج پیدا کرے گی اور اگر انھوں نے فضا سازگار نہ دیکھی تو وہ اس پارٹی سے ضرور باہر نکل آئیں گے۔

چنانچہ میاں صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کے مطابق مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی اور نتیجہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جس کی طرف مولانا نے اشارہ کیا تھا۔

میاں صاحب نے ایک مدت لیگ میں گزاری۔ پورے شوق اور سرگرمی کے ساتھ اس کی سیاست میں حصّہ لیا۔ لیکن جلد ہی انھیں اور خصوصاً خضر حیات ٹوانہ کے خلاف لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں لیگی اندازِ سیاست کا ایسا تجربہ ہوا کہ دل کھٹا ہوگیا اور قیامِ پاکستان کے بعد جو حالات پیش آئے اس نے تو نہ صرف لیگ کی سیاست سے بدگمان کیا بلکہ مایوس اور متنفر کردیا۔ مذہبی ذوق کی بنیاد پر سیاست کی تعمیر انھیں پہلے ہی پسند نہ تھی۔ جمعیّت علماے ہند، مجلس احرار اسلام (ہند) اور خدائی خدمت گار کی سیاست کا دور گزر چکا تھا۔ کانگریس کا نقش پاکستان سے مٹ گیا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اہلِ ہمت میدان میں نکلیں اور نئے طرز سیاست کی بساط بچھائیں اور اس سے پہلے کہ حالات مزید بگڑیں اور قابو سے باہر ہو جائیں، وطن کی فکر کرنی چاہیے۔ مسلم لیگ کئی ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ اس سے نئے حالات میں رہنمائی کی توقع غلط تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی کی تشکیل اور محمود علی قصوری کی، اس میں شرکت کا کچھ یہی پس منظر تھا۔ اس دور کی سیاست میں انھوں نے سرگرمی سے حصّہ لیا۔ لیکن ان کی خدمات کا اب اصل میدان قانون اور وکالت تھی۔ پھر ان کا تعلّق ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی سے ہوگیا تھا۔ وہ بھٹو کابینہ میں وزیر قانون کی حیثیت سے شامل

ہوئے۔ انھوں نے قوم کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وزیر بننا ان کے لیے کوئی قابل فخر بات نہ تھی۔ ان کا مقام اس سے بہت بلند تھا۔ البتہ یہ بات ضرور لایقِ تحریر ہے کہ انھوں نے بھٹو صاحب کی اس وقت مدد کی جب وہ ایک آمر کے غضب اور ذوقِ انتقام کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ہر شخص ان کے قرب وصحبت سے دور بھاگ رہا تھا۔ لیکن بھٹو صاحب کی قسمت بھی کیا خوب تھی کہ ایک آمر کے ظلم سے نجات پائی اور دوسرے کے انتقام کی سولی پر چڑھ گئے۔

سیاست کے علاوہ بلکہ اس سے پہلے عوام کی خدمت کا میدان اور ان کا ہتھیار قانون اور قانون کی سچّائی تھا۔ اس ہتھیار کا استعمال میدان کارزار میں تلوار چلانے سے زیادہ کاری اور دانش مندی کا متقاضی ہوتا ہے۔ انھوں نے قانون کے ذریعے عوام کی، سیاسی کارکنوں کی، سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کی صلے اور ستائش سے بے پروا ہو کر اتنی خدمات انجام دیں کہ ان کی خدمات کو جمع کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں ذوقِ خودنمائی سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ سیاسی مقدمات کی کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ انھوں نے پچاسوں مقدمات کسی فیس کے بغیر لڑے اور مقدمہ جیت کر کامیابی کا تحفۂ مسرت موکل کی جھولی میں ڈال دیا۔

میاں محمود علی قصوری قانون اور سیاست دونوں میں درک رکھتے تھے اور صف اول کی شخصیت شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے ہر دو میدانوں میں شان دار کامیابی حاصل کی تھی اور نیک نامی کی زندگی گزاری تھی۔ ۱۳/اپریل ۱۹۸۷ء ان کی زندگی کا آخری دن تھا۔ ان کا انتقال لاہور میں ہوا تھا۔ تدفین قصور میں والد گرامی اور برادرِ معظّم کے پہلو میں ہوئی۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے خانوادۂ سعادت کے تمام ارکان سلف کے مسلک کے پیرو اور کتاب وسنت کے ذوقِ تمسک کے لذت شناس تھے۔ خاندان کا ہر فرد اپنے عقیدے میں راسخ، شریعت کا پابند اور تعصّب وتقشّف سے دور ونفور نظر آیا۔ اکابر سے

اصاغر تک سب تہذیب کے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے، اخلاص و ایثار کا پیکر، اللہ کی مخلوق سے محبّت کرنے والے اور یگانہ و بےگانہ ہر کسی کی خدمت کے لیے ہر وقت و ہمہ تن مستعد رہنے والے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا عبدالقادر کے خاندان کو ''خاندانِ سعادت قصور'' کہا تھا تو سچ ہی کہا تھا۔ ان کے اسلاف سے اخلاف تک کے جو حالات تاریخ علم و تہذیب اور سیاست کا حصّہ بن چکے ہیں، وہ اس خاندان کی نیکی، دین داری، لیاقت اور خدمت قوم وملّت کا تذکرہ ہی تو ہے۔ حضرت مولانا عبدالقادر قصوری کے والد گرامی، جد امجد، برادرانِ عزیز و محترم اور ان کی اولاد میں سب ہی نیک بخت و سعادت مند ہوئے۔ اس خاندان کے نوجوانوں اور موجودہ نسل کی شہرت بھی ان کے انھیں خصایص وخصایل جمیلہ کے تذکار سے معمور ہے۔

اس خاندان کے بزرگ تو بزرگ تھے ہی، ان کے خورد بھی اپنے بزرگوں کا نام روشن کرنے والے ہوئے۔ خصوصاً اس خانوادۂ علم وتہذیب کے آخری دور کے تین ناموروں نے تو پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ پاکستان سیاسی اعتبار سے بانجھ نہیں ہوگیا۔ اس کے فرزندوں میں قابل، فرض شناس، پختہ سیرت، قابل ترین اور وطن کے سچّے خدمت گذاروں کی کمی نہیں۔ ان کے وجود گرامی ملک اور قوم کے لیے موجب فخر اور نمونہ ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک مولانا عبدالقادر قصوری رحمۃ اللہ کے چھوٹے بیٹے محمود علی قصوری، دوسرے ان کے پوتے معین الدین قریشی ابن محی الدین قصوری اور تیسرے ان کے پوتے خورشید محمود قصوری ابن میاں محمود قصوری اس دعوے کی سچّائی کی شہادتِ حق ہیں۔

پاکستان کے موجودہ دور میں خاندان سعادت قصور کی نامور شخصیت میاں خورشید محمود قصوری کی ہے۔ وہ اپنے ذوق دینی اور تہذیب و معاشرت میں اپنے خاندان کی

روایات کی زندہ تصویر اور قومی وملکی سیاست میں بصیرت وتدبر اور اخلاصِ عمل کی اعلیٰ مثال ہیں۔ وہ نہ صرف خاندان کے لیے بلکہ ملک وقوم کے لیے بھی قابلِ فخر فرزند اور لایق ستایش سپوت ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کے ہمرہیانِ سیاست میں خورشید محمود قصوری واحد شخصیت تھے جو سرخ رو نکلے۔ ان کی قابلیت، ان کا اخلاص اور دیانت شک وشبہ سے پاک ہے۔ مشرف حکومت کے خاتمے کے بعد اگر اس کا کوئی رکن سر اٹھا کے بات کر سکتا ہے تو وہ خورشید محمود قصوری کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور دین اور ملک وقوم کی بیش از بیش خدمات انجام دینے اور اپنے اسلاف کرام کے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

خطوط پر ایک نظر

مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے نام مکاتیب کے اس مجموعے میں کل پچیس خطوط ہیں۔ سب سے پہلے اس مجموعے کے دو خط مرسل الیہ کی عنایت سے ادبستان۔ لاہور سے شایع ہونے والے مجموعہ ''مکاتیب ابوالکلام'' میں شایع ہوئے تھے۔ بعدۂ مرسل الیہ نے یہ تمام مکاتیب مولانا غلام رسول مہر کو عنایت فرما دیے اور ''تبرکات آزاد'' میں شامل ہوئے۔ تبرکات میں چھبیس خط تھے۔ ان میں سے دو خط مرسل الیہ کے والد ماجد مولانا عبدالقادر قصوری کے نام تھے۔ جو اس مجموعے میں الگ درج کیے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کا ایک خط اسی عزیز و فاضل کے نام تھا جو ''تبرکات آزاد'' کی ترتیب کے وقت دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس خط کی فراہمی کے لیے ہم محترم ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کے شکر گزار ہیں۔ یہ خط انھیں مرحوم مکتوب الیہ سے دستیاب ہوا تھا۔ اس طرح مولانا محی الدین قصوری کے نام اس مجموعے میں کل پچیس خطوط آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس کے علاوہ مولانا کے قلم سے مکتوب الیہ کے بارے میں ایک سہ سطری نوٹ جو مولانا نے ان کے کسی خط پر نقش کر دیا تھا اور ایک یک سطری خط جو مولانا کے ارشاد کے مطابق مزاج پرسی کے خط کے جواب میں اجمل خان نے لکھا تھا۔ ان دو تبرکات کو بھی اس مجموعے میں شامل کر لیا ہے۔ اس طرح ۲۵ خط اور ایک نوٹ حضرت مولانا کے قلم سے اور مزاج پرسی کے خط کا جواب مولانا کی طرف سے بہ قلم اجمل خان مرحوم،

کل ۲۷ آثارِ علمیّہ وتبرکات قارئین محترم کے مطالعے میں آئیں گے۔

برکات کی اشاعت سے پہلے اس ذخیرے کی دو خط

مجموعے کے تین خطوں پر مرسل الیہ کے قلم سے تمہیدی وتعارفی نوٹس ہیں۔

۱۔ پہلا خط جو سورۂ یوسف کے حقایق ومعارف میں ہے۔ اس پر مرسل الیہ کے قلم سے ایک طویل نوٹ ہے جس میں ان سوالات کی وضاحت فرمائی ہے جن کے جواب پر یہ مکتوب مشتمل ہے۔

۲۔ چوتھا خط جس کے نوٹ میں مرسل الیہ نے مولانا سے اپنی نیاز مندی کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور خط کا پس منظر بیان کیا ہے۔

۳۔ چھٹا خط بھی اسی پس منظر کے بیان پر مشتمل ہیں جو اس خط کی تحریر کا باعث ہوا۔

تبرکات کی اشاعت سے پہلے اس ذخیرے کے دو خط نمبر ۴ و ۶ مولانا محی الدین قصوری نے اپنے ایک مخلص محمد رفیق ملک کو عنایت فرمائے تھے، جو انھوں نے اپنے مرتبہ مجموعے ''مکاتیب ابوالکلام'' میں شایع کیے تھے۔ ان پر مولانا قصوری کے قلم سے نوٹس بھی تھے۔ میرے مطالعے میں پہلے یہی دو خط آئے تھے۔ تبرکات کی اشاعت اس کے بہت بعد کی بات ہے۔ مولانا مہر کی نظر سے شاید یہ مجموعہ نہ گزرا تھا یا مذکورہ دو خطوط پر مولانا قصوری کے نوٹس کو ان کے حافظے نے فراموش کر دیا تھا! یا مولانا مرحوم نے ان نوٹس کے نقل کی ضرورت نہ سمجھی تھی! بہر حال کوئی وجہ ہو انھوں نے تبرکات میں خطوط تو مرتب کر دیے لیکن مکتوب الیہ کے قلم سے تمہیدی عبارتیں نظر انداز ہو گئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ان تحریروں کو ہر گز نظر انداز نہ کرتے! مولانا مہر سے بڑھ کر ان تحریروں کا قدر دان اور کون ہو سکتا تھا؟ ان تحریروں کے مطالعے سے مکتوب الیہ سے مولانا آزاد کی شفقت ومحبّت اور تعلقات کی تاریخ پر بہت قیمتی روشنی پڑتی ہے۔

اس مجموعے کا پہلا خط جو سورۂ یوسف میں قصّے کے کرداروں کے بعض پہلوؤں کی وضاحت اور تفسیری نکات میں ہے، نہایت فکر انگیز ہے، یہ اگر چہ سورۂ یوسف کی مربوط

و مکمل تفسیر نہیں ہے لیکن بہت اہم مباحث اور نادر تفسیری نکات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح سوادِ اعظم کے مسئلے پر مولانا کا خط نہایت فکر انگیز ہے۔ اس سے احادیث میں مولانا کی گہری نظر اور تبحر کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح مولانا کے دوسرے خطوط بھی بیش قیمت اور معلومات کا خزانہ ہیں۔

ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مہر مرحوم نے حضرت مولانا آزاد کے جو خطوط مرتب کیے ہیں۔ ان میں مطالب کو نمایاں کرنے کے لیے ذیلی عنوانات قایم کردیے ہیں۔ یہ عنوانات مولانا کے اصل خطوط میں نہیں تھے۔

''تبرکاتِ آزاد'' کے خطوط پر حواشی مولانا غلام رسول مہر کے قلم کی یادگار ہیں۔ صرف پہلے خط میں آیات قرآنی کی تخریج وحوالہ اور ترجمان القرآن سے ان آیات کے ترجمے کا اضافہ خاکسار نے کردیا ہے۔ مولانا مہر مرحوم نے تبرکات میں ان خطوط پر ایک مختصر تعارف بھی لکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

> ''ان میں ''تبرکاتِ آزاد'' کے چار مجموعوں میں (سے بہ لحاظ مطالب حددرجہ بیش قیمت مجموعہ وہ ہے جو مولوی محی الدین قصوری نے مرحمت فرمایا۔ ان مکاتیب میں سے زیادہ تر خود مولوی صاحب کے نام اور چندان کے والد کے نام آئے تھے۔ افسوس کہ موصوف کے پاس تمام مکاتیب محفوظ نہ رہ سکے۔ وجہ یہ نہیں کہ انھیں ان کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ تھا یا حفاظت کا جتنا اہتمام ہونا چاہیے تھا، نہ کیا جاسکا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مولوی محی الدین احمد کا خاندان انگریزی حکومت کے نزدیک عتاب کا مورد بن گیا تھا؛
>
> اوّل اس لیے کہ پورے خاندان کو مولانا کے ساتھ گہرا تعلق تھا،
>
> دوم اس لیے کہ خاندان کے مختلف افراد خصوصاً مولانا عبدالقادر مرحوم، مولوی محمد علی مرحوم اور مولوی محی الدین احمد آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے۔
>
> اس لیے بارہا خانہ تلاشی کی نوبت آئی اور ایسے اوقات میں مولانا کی تحریرات کو پولیس کے ہاتھوں محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ (لیکن اس کے باوجود کئی

قیمتی تحریریں ضایع ہوگئیں)۔

مولانا محی الدین احمد سناتے تھے کہ ایک مرتبہ میں نے سورۂ ملک کے متعلق چند سوالات کیے تھے۔ اس زمانے میں مولانا بہ مقام رانچی نظر بند تھے۔ انھوں نے قلم اٹھایا تو سوالات کے جوابات میں سورۂ ملک کی تفسیر مرتب فرمادی جو کم از کم تیس صفحات پر پھیلی ہوئی تھی اور اس میں اس سورت کے ضروری معارف کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اس اثناء میں پولیس تلاشی کے لیے آگئی تو اس مکتوب کو اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا۔ تلاشی کے بعد چھت پر پہنچ کر دیکھا تو ہوا کے جھونکے اوراق کو خدا جانے کس طرف اڑا کر لے جا چکے تھے۔ مولوی محی الدین احمد اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔

غرض اس طرح متعدد مکاتیب تلف ہوگئے۔ جو شایع کیے جا رہے ہیں، ان میں سے بھی ایک ناقص ہے۔ مولوی محی الدین احمد بتاتے ہیں کہ یہ کسی صاحب کو بغرض اشاعت دیا گیا تھا۔ چھپ نہ سکا اور اسے واپس لے آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خط کا آخری حصہ غائب ہے۔ ہر چند تلاش کیا نہ مل سکا"۔

(ا۔س۔ش)

مولانا محی الدین قصوری:

(۱) ﴿۱۹۴﴾

آیندہ صفحات میں مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے نام امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک غیر مطبوعہ اور نادر خط پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد مرحوم کے خط کے ساتھ مولانا قصوری کی تحریر شامل کی جا رہی ہے۔ اس میں وہ سوالات بھی کیے گئے ہیں جن کے جواب میں مولانا آزاد کا یہ خط ہے۔ اس کے لیے ہم ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ڈائریکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور کے شکر گذار ہیں۔ (ا۔س۔ش)

مولانا قصوری لکھتے ہیں:

''دسمبر ۱۹۱۸ء میں جب میں نظر بندی سے واپس آیا ہوں تو غالباً اسی زمانے میں میں نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد غفراللہ ونوراللہ مرقدہ واعلیٰ اللہ مقامہٗ کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا جس میں میں نے ان سے چند امور کی وضاحت چاہی تھی جو مجھے سورۂ یوسف کے مطالعے یا تلاوت کے درمیان کھٹکا کرتے تھے۔ یوں بھی میری عادت رہی ہے کہ مجھے کبھی کبھی کسی دینی مسئلے میں کسی قسم کا خلجان واقع ہوا تو میں نے دو ہی ینابیع ہدایت کی طرف ہمیشہ رجوع کیا۔ ایک اپنے والد ماجد مرحوم ومغفور رفع اللہ درجاتہ کی طرف اور دوسرے حضرت مولانا ابوالکلامؒ کی طرف۔ اس لحاظ سے میں اس چیز کو بطور فخر کہہ سکتا ہوں کہ آج جو تحریری طریق تدریس نہ صرف یورپ وامریکہ میں بلکہ ہمارے مدارسِ حدیث میں رائج ہے، اس کے مطابق مجھے حضرت مولاناؒ (ابوالکلام آزاد) سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ حضرت مولانا کی بعض نہایت قیمتی تحریریں مارشل لا وغیرہ کے انقلابات میں ضایع ہوگئیں اور بعض پولیس کی نذر ہوگئیں۔ تاہم جو چند چیزیں باقی رہ گئی ہیں ان میں (۱) میرا یہ خط سورۂ یوسف کی تفسیر کے متعلق اور مولانا کا جوابی مکتوب بھی ہے۔ اس میں سورۂ یوسف کی بعض مبہمات کی تشریح آگئی ہے، اس لیے درج کر رہا ہوں۔

میں نے اپنے خط کا ابتدائی حصہ چھوڑ دیا ہے۔ صرف وہ سوال درج کیے دیتا ہوں جن کی وضاحت مطلوب تھی۔

اولاً: حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بیٹوں کو دوسری مرتبہ مصر جاتے وقت نصیحت فرمائی: یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ (سورۃ یوسف ۱۲، آیت: ۶۷)

(میرے بیٹو! دیکھو جب مصر پہنچو تو شہر کے ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا)

اس نصیحت میں کیا مصلحت تھی؟

ثانیاً: یہ حکم بیٹوں کو دوسری مرتبہ مصر جانے کے وقت ملا تھا، جب وہ بن یمین کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پہلی مرتبہ ایسا حکم کیوں نہ دیا گیا؟

ثالثاً: جب پہلی مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انھیں اپنے ساتھ جنگل کی طرف لے جانے کی اجازت مانگتے ہیں تو ان کے والد فرماتے ہیں:

وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ غَافِلُوْنَ (۱۲:۱۳)

(اور میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، بھیڑیا کھالے اور تم اس سے غافل ہو!)

پھر جب وہ جنگل سے واپس ہوتے ہیں تو باپ کے روبرو روتے ہوئے اپنا عذر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

وجَاءُوْا اَبَاهُمْ عِشَاءً يَّبْكُوْنَ o قَالُوْا يٰاَبَانَا اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ o (۱۲۔۱۷)

اور وہ اپنے باپ کے پاس شام کو روتے پیٹتے آئے۔ انھوں نے کہا" اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے دوڑ میں لگ گئے تھے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ پس ایسا ہوا کہ بھیڑیا آنکلا اور یوسف کو (مار کر) کھالیا اور ہم جانتے ہیں کہ آپ ہماری بات کا یقین کرنے والے نہیں۔ اگرچہ ہم کتنے ہی سچے ہوں)

قصے کے اس حصے میں کچھ تصنع سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے حل کی کیا صورت ہے؟ یا یہ محض ان کا بچپنا تھا کہ ایسا عذر پیش کر دیا؟

رابعاً: کیا تاویل الاحادیث (۶:۱۲) سے محض تعبیرِ رویا مراد ہے؟ یا اس سے کچھ زیادہ وسیع و بلند چیز مقصود ہے؟

خامساً: شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِهَا (۲۶:۱۲) سے کون شخص مراد ہے؟ ''بچہ'' جیسا کہ عامۃ المفسرین لکھ رہے ہیں؟ کیا اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہے؟

سادساً: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَآئُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ (۴۰:۱۲)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے صرف بت پرستی ہی کی تکذیب نہیں کی گئی بلکہ مظاہر الوہیت کی تکذیب بھی کی گئی ہے۔ مثلاً خود فراعنہ مصر جن کی تعظیم عبادت کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ کیا میرا یہ خیال درست ہے؟

سابعاً: قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ (۵۹:۱۲)

(یوسف نے کہا اب کے آنا تو اپنے (سوتیلے) بھائی (بن یمین) کو بھی ساتھ لانا)

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ الفاظ کیوں کہے؟ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کا ایک اخیافی بھائی بن یمین بھی ہے حال آں کہ وہ اپنے بھائیوں سے بالکل انجان بن کر باتیں کر رہے ہیں؟ یہ جملہ ساری گفتگو کے اک گونہ معارض معلوم ہوتا ہے، پھر اسی قسم کی ''غلطی''؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے دوبارہ اس وقت کی جب ان کے بھائی بن یمین کو ساتھ لے کر حضرت یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چناں چہ:

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶۹:۱۲)

[اور جب ایسا ہوا کہ یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی [بن یمین] کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے (پوشیدگی میں) اشارہ کر دیا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں۔ پس جو (بدسلوکی) لوگ تیرے ساتھ) کرتے آئے ہیں، اس

پر غمگین نہ ہو، (خوش ہو جا کہ اب زمانہ پلٹ گیا)

ثامناً: قرآن حکیم کے بعض جملوں سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بذریعۂ وحی، الہام یا بذریعۂ فراست و بصیرتِ نبوت اس امر کا علم ہو چکا تھا کہ یہ صاحبِ اقتدار ہستی جس کے ہاتھ میں غلّہ کی تقسیم ہے، یوسف علیہ السلام ہیں، چناں چہ ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ وَاِنَّهٗ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ (۱۲:۶۸)

(اور بلا شبہ وہ صاحبِ علم تھا کہ ہم نے اس پر علم کی راہ کھول دی تھی)

۲۔ برادران یوسف علیہ السلام جب بن یمین کو دربارِ مصر کے حوالے کر کے واپس باپ کی خدمت میں پہنچتے ہیں تو وہ ان کا عذر تسلیم نہیں کرتے اور فرماتے ہیں:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (۱۲:۸۳)

(نہیں یہ تو ایک بات ہے جو تمھارے جی نے تمھیں سجھا دی ہے)

۳۔ پھر پورے اذعان اور یقین قلبی کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں،

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا (۱۲:۸۳)

(اللہ (کے فضل) سے کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ (ایک دن) ان سب کو میرے پاس جمع کر دے)۔

۴۔ اور اگر یہ بات تھی تو اس قدر گریہ و بکا اور رونا دھونا کیوں تھا؟

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (۱۲:۸۴)

(اور شدتِ غم سے (روتے روتے) اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں، اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا)

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَاْيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (۱۲:۸۷)

(اے میرے بیٹو! (ایک بار پھر مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)

تاسعاً: برادران یوسف آخری بار جب غلہ لینے آتے ہیں تو وہ ان لفظوں میں سوال کرتے ہیں:

قَالُوا يَا اَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجٰةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ٥ [۱۲:۸۸]

انھوں نے کہا: اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھر کے آدمیوں پر بڑی سختی کے دن گزر رہے ہیں [پس مجبور ہو کر غلے کی طلب میں ہمیں پھر نکلنا پڑا] ہم تھوڑی سی پونجی لے کر آئے ہیں [اسے قبول کر لیجیے] اور غلے کی پوری تول عنایت کیجیے [اور اسے خرید وفروخت کا معاملہ نہ سمجھیے بلکہ ہمیں [محتاج سمجھ کر] خیرات دے دیجیے۔ اللہ خیرات کرنے والوں کو ان کا اجر دیتا ہے۔

اس اپیل کے جواب میں حضرت یوسفؑ فوراً پوچھتے ہیں؟

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ [۱۲:۸۹]

[یہ حال سن کر] یوسفؑ [کا دل بھر آیا۔ اس] نے کہا: تمھیں یاد ہے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب کہ تمھیں سمجھ بوجھ نہ تھی؟

یہ سوال و جواب کچھ اس قدر ریکا یک اور اچانک ہو گئے ہیں کہ پورا معاملہ ہی کچھ بناوٹی سا نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی توجیہہ کس طرح پر کی جا سکتی ہے؟

عاشراً: اس سارے قصے کے بعد جب حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کے قافلے کو اپنا قمیص دے کر روانہ کرتے ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان میں یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں:

اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ [۱۲:۹۴]

[اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی تو میں کہوں گا مجھے یوسف کی مہک آرہی ہے۔

اس ارشاد کا مخاطب کون تھا کیوں کہ بیٹے تو ابھی راہ ہی میں تھے؟''

ان سوالات کے جواب میں حضرت مولانا آزاد نے جو مکتوب گرامی تحریر فرمایا تھا، اسے مطالعہ فرمائیے:

یا صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ،(۱)

بعض اوقات افکار و حوادث میں کچھ عجیب طرح کا توافق و توارد ہو جاتا ہے۔ حکمائے اشرافین اور صوفیہ اسی کو موثراتِ ربط و علاقہ سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک نظام روحانی کے ماتحت ہے۔ کم از کم آپ کے اور فقیر کے باہمی معاملات میں تو یہ مسئلہ بالکل درست ثابت ہوتا ہے۔ میں پرسوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں اور مشورہ دوں کہ آیندہ آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ کلکتہ میں جب علاحدگی ہوئی ہے تو حالات اور تھے اور آمالِ عزائم، تکمیل اطلاعات، کشفِ محجوبات و تصحیح مظنونات نے بہت جلد ان میں تبدیلی پیدا کر دی اور بالکل نئے نظام فکر و عمل کے ماتحت زندگی سپرد کر دینی پڑی۔ اس تغیّر کے بعد یک جائی کی صورت نہ نکلی اور آپ کو بالکل علم نہیں کہ موجودہ افکار و آرا کیا ہیں؟ اب میں نے ارادہ کیا کہ موجودہ حالات کے ماتحت آپ کو مشورہ دوں۔ گو آپ نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا، مگر میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ہر حال میں آپ کی زندگی اور وقت کو اپنی زندگی کا ایک جز و لاینفک یقین کرتا ہوں اور علم اللہ کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی آرزو نہیں رکھتا کہ جو اللہ نے مجھے دیا وہ آپ کو من و عن سپرد کر دوں۔

میں اسی قصّے میں تھا کہ کل آپ کا خط پہنچا اور تقریباً وہی خیالات ان میں پائے جس کے لیے میرا دل مضطرب اور بے چین ہو رہا تھا۔ الحمد للہ آپ اپنے ذوقِ قدیم میں بدستور استوار ہیں اور گزشتہ ایام کے بعض ہمت شکن واقعات نے جو گو فی الحقیقت بہت زیادہ نہیں مگر اکثر ضعفا کے لیے اس میں بڑی ہی سخت آزمائش ہوتی ہے، آپ پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے متعلق

جو امیدیں میرے دل میں ابتدا سے ڈالی ہیں ان کا ظہور ہوگا اور گو حوادث و موانع وقت ان کو مؤخر کر دیں، مگر ظہور کو روک نہیں سکتے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے چند دن باقی ہیں، ان کو بہ خیر و عافیت ختم کر لیجیے، اس کے بعد یک جائی ہوگی اور خدا نے چاہا تو تمام باتیں ظہور میں آجائیں گی۔ میں آپ سے پہلے خود ہی اس امر کو لکھنے والا اور آپ کے سکوت پر آپ کو ملامت کرنے والا تھا۔

یہ پڑھ کر کہ آج کل آپ تمام وقت تامل اور تدبیر قرآن حکیم میں خرچ کرتے ہیں اور حتی الوسع مشغول تبلیغ بھی ہیں، نہایت خوشی ہوئی۔

ایک عالمگیر غلطی مسلمانوں کی یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ایک شخص رازی اور کشاف نہ ہو، اس وقت تک اس کو قرآن کے متعلق کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اس عقیدے نے دعوت و تبلیغ کی راہ بالکل بند کر دی اور لوگ جس قدر جان سکتے تھے اور جان کر دوسروں تک پہنچا سکتے تھے، اس کے لیے بھی ان کے اندر کوئی جوش نہیں رہا، ''راسخون فی العلم'' کی جماعت ہمیشہ محدود رہی ہے اور رہے گی۔ قوم کا ہر فرد درجۂ رسوخ حاصل نہیں کر سکتا، لیکن بآسانی سماعاً روایتاً معلومات حاصل کر سکتا ہے اور حفظ و یقین اور تقویٰ و خشیت کے ساتھ دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ سلف صالح کا یہی طریقہ تھا۔ صحابہ میں ہر شخص ابن عمر اور ابن مسعود نہ تھا اور نہ تابعین و ائمہ اطہار میں ہر مبلّغ سالم و زیدی و وکیع۔ لیکن حفظ و سماع کا حلقہ عام تھا اور تبلیغ و دعوت کے لیے وہ شرطیں نہ تھیں جو تحملِ حدیث و روایت و افتا کے لیے تھیں۔ پس چاہیے کہ صحت و حفظ کے ساتھ جو کچھ معلوم ہو، اس کے درس و تبلیغ میں دریغ نہ کیا جائے اور جو کچھ معلوم نہ ہو، اس کے لیے مزید تجسس و طلب کو کام میں لایا جائے یا چھوڑ دیا جائے، توصیۂ حق و علم، مومن پر فرض کر دیا گیا ہے اور من جملہ خصایص و خواص و علائم اصلیۂ ایمانیہ کے ہے:

''وَتَوَاصَوا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوا بِالصَّبْرِ'' اور ''تَكُونُوا شُهَدَا عَلَى النَّاسِ''

اگر شہادت وتوصیۂ حق کے لیے تکمیل علوم و ''رسوخ فی العلم'' کی شرط ہو تو پھر کتنے آدمی اس خصوصیّت کو پیدا کر سکتے ہیں؟

آپ نے لکھا ہے کہ آپ ''نظارۃ المعارف'' کے نوٹس نقل کرتے ہیں[۲]۔ یہ عمدہ بات ہے لیکن مطلوبہ مقصد کے لیے وہ بالکل غیر مفید ہیں۔ کلکتہ میں خواجہ صاحب [خواجہ عبدالحی] کے پاس میں نے یہ نوٹس دیکھے تھے۔ مگر مجھے تو بڑی ہی مایوسی ہوئی۔ کوئی بات اس میں ایسی نظر نہیں آئی جو وقیع ہو۔ اصل کام یہ ہے کہ مشکلاتِ قرآن کو حل کیا جائے۔ جواب تک مستور رہا اور یہ دکھلایا جائے کہ کیوں کر یہ کتاب دنیا کی عالم گیر محیط الکل، امتِ صالحہ اور مدنیت فاضلہ کو پیدا کر سکتی ہے اور کیوں کر اس کتاب کے ذریعے ہم دنیا کے ان امراض کو دور کر سکتے ہیں، جن کا علاج ہزاروں برس سے انسان ڈھونڈ رہا ہے، مگر نہیں پاتا۔ ساتھ ہی اصولِ فن کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے اور بیان و بلاغتِ قرآنی کے ان حقایق لُغویہ کو آشکار کیا جائے، جن کو صدیوں کے ابتلاے عجمیت واختلاط کو دخلا نے بالکل چھپا دیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اصول ونظام روایت کے ساتھ ایک ذخیرۂ تفسیرِ صحابہ وتابعین وآئمۂ محدثین وسلفِ صالح کا موجود ہے، رسوخِ فن کے ساتھ اُس کی بھی تنقیح کی جائے۔ اختلافات دور ہو جائیں اور جو کچھ بیان کیا جائے وہ علوم سلف اور صحابہ کے مخالف نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر سر سید مرحوم کی تفسیر کافی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی غیر مدلل وغیر مستند تاویلات تسلیم کر لی جائیں اور سر سید واقرانہ مردود ہوں۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن کے بغیر تفسیر قرآن کا مرحلہ طے نہیں ہوسکتا۔ محض ربط کوئی چیز نہیں ہے اور اس کے پیچھے پڑا رہنا کچھ مفید نہیں۔

ایک سب سے زیادہ اعظم واہم کام یہ ہے کہ قرآن حکیم کے تمام حقایق ومعارف کی جزئیات کا احاطہ کیا جائے اور ان کے لیے کلیات وضع کیے جائیں پھر کلیات کو بھی ایک نظام کے ماتحت لایا جائے اور اس کے لیے تمہیدات ومقدمات درست کیے

جائیں۔ یہ لوگ اس سے بالکل بے خبر ہیں اور یہ راہ دوسری ہے۔

اس کام کے لیے نہایت وسیع اور مجتہدانہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ مولوی عبیداللہ صاحب سندھی کی اصلی وقعت ان نوٹس کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اس کے وجوہ اور ہیں۔ دیوبند میں تعلیم پا کر ایک شخص کا کام کرنے پر مائل ہونا اور آزادانہ راہ اختیار کرنا اور قرآن مجید کی اشاعت و درس پر وقت صرف کرنا ایسی چیزیں ہیں جو آج کل بالکل ناپید ہیں۔ رہا مسئلہ ربط تو اس کو شیخ محمد عبدہ وغیرہ سب کہتے ہیں۔ امام رازی اور علی مہائمی نے راہ کھول دی ہے۔ ہندستان میں تو اس کو زیادہ تر مولوی حمید الدین [فراہی] نے روشناس کیا ہے۔ ''سورۂ کافرون'' وغیرہ کی تفسیر بھی۔ ''والعصر'' کی تفسیر شیخ محمد عبدہ کی ''والعادیات'' کی مولوی نورالدین قادیانی کی اور اصل یہ ہے کہ ان چیزوں میں کچھ بھی نہیں ہے، عمدہ باتیں ہیں مگر تنہا بیکار ہیں۔ چوں کہ آپ اپنا وقت اس کام میں صرف کرنا چاہتے ہیں اس لیے ضروری تھا کہ آپ کو ان امور سے واقف کر دیا جاتا، تاکہ آپ کا دماغ غیر وقیع چیزوں کو وقیع سمجھ کر ابتدا ہی میں ٹھوکر نہ کھائے ورنہ میں تعین کے ساتھ ان خیالات کا اظہار پسند نہیں کرتا، آپ بھی احتیاط کیجیے۔ ہمارے ہم مشرب لوگ آزادیٔ رائے اور وقّت فہم سے محروم ہیں اور مقلّدانہ حسن ظن بڑی ہی آفت ہے۔ پس چاہیے کہ مقصد اعظم کی راہ میں سب کو متّحد و منسلک رکھا جائے۔ البتہ علوم و فن اور نظر و تحقیق کی راہ میں اپنی بصیرت دوسری اور بحمدللہ اسی پر اعتماد ہے۔

جب آپ ملیں گے تو اس میں مفصّل باتیں ہوں گی۔ اب میں مختصراً آپ کے سوالات متعلق سورۂ یوسف کا جواب دیتا ہوں۔ جوابات نمبروار ہیں، آپ کا پرچۂ سوالات بھی اس کے ساتھ ملفوف ہے تاکہ آپ اپنے سوالات کے نمبروں سے اعدادِ جواب کو ملا سکیں۔

قرآن حکیم کا ایک اندازِ بلیغ بیان قصص و اخبار میں یہ ہے کہ وہ عموماً واقعے کے انھی اجزا کو بیان کرتا ہے۔ جو نتائج و عبرت و موعظت و موضوع حکایت کے لحاظ سے قصّے کے ضروری و ناگزیر اجزا ہیں اور ان چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتا ہے، جن کے بیان سے موضوع استدلال و مقصدِ موعظت کو کوئی تعلّق نہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ تورات سامنے رکھ لی جائے اور کسی مشترک [قصّہ] کو دونوں میں دیکھ لیا جائے۔ تورات کا مقصد بیان قصص سے عبرت و موعظت و استخراج و عرض نتائج نہ تھا، اس لیے وہ ایک مورخ و راوی کی طرح اول سے لے کر آخر تک تمام واقعات کو بیان کرتی ہے اور اس میں صرف جمع و استقصاً و احاطہ کو پیش نظر رکھتے ہیں، نفع و عدم نفع و احتیاج کو نہیں، اس کے برخلاف قرآن حکیم کا مقصد ''کتاب پیدائش و خروج'' کی طرح جمع واقعات و تاریخ نہیں ہے بلکہ ہدایت و موعظت ہے۔ وہ کسی قصّے کو لیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ مورخ کی طرح مرتب کردے بلکہ اس لیے کہ اس سے کسی تعلیم کے استشہاد کا کام لے، فقط واقعات و تاریخ دنیا کے لیے بیکار ہے، بجز اس کے کہ اس کے نتائج مستقبل میں کام آئیں، فلسفۂ تاریخ کا یہی مطلب بتایا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے اور اس معنی میں دنیا کے پاس قصصِ اولین کے لیے بجز قرآن کے اور کوئی کتاب نہیں، قرآن حکیم اقوام و امم کے مشہور ایام و سنین و انقلابات سے استخراج نتائج، استنباط و شواہد اور تعلیل و توجیہ امور کرتا ہے اسی کا نام بصائر و موعظت ہے۔

اختصارِ بیانِ قصص و عدم اعتناء ببعض جزئیاتِ واقعہ کی ایک علت یہ ہے۔ دوسری ایجاز بلاغت و عدم اعادہ و تکرار جزئیات ہے۔ یعنی جن جزئیات کو سامع قرینے سے خود سمجھ لے گا کیوں کہ ان کی طرف پہلے اشارہ ہوچکا ہے، ان کا اعادہ بالکل ترک کردیا جاتا ہے یا جو جزئیات ضمناً واضح ہوجاتے ہیں، ان کی طرف مستقلاً اشارہ نہیں کیا جاتا یا جن الفاظ کو اتصال و ربط سیاق و قرینہ بتلا رہا ہے اس کو ترک کردیتا ہے۔

ایک قسم اور ہے یعنی تیسری، قرآن مجید میں بڑا حصّہ قصص کا بنی اسرائیل و اہل کتاب سے متعلق ہے۔ یہ قصص نہایت شرح و بسط سے تورات و روایات یہود میں موجود تھے اور یہود و نصاری عموماً ان سے واقف تھے۔ پس قرآن مجید ان کے بعض اجزا کو اس بنا پر چھوڑ جاتا ہے کہ سامع ان کے بیان کا محتاج نہیں اور پورا قصّہ اس کے علم میں موجود ہے، صرف اشارہ کافی ہوگا۔ اشارہ کر کے اس کے ذہن کو اس نتیجے کی طرف پھیر دیا جائے جو اس قصّے میں موجود ہے، مگر غفلت و ضلالت کی وجہ سے وہ معرض ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ آپ کو جنگ جرمنی و بلجیم کے تمام واقعات معلوم ہیں، میں کسی خاص مقصد کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں تو اس صورت میں میں یہ نہیں کروں گا کہ ایک نتیجے کے لیے فضول پوری تاریخ جنگ آپ کو سنا دوں بلکہ میرا طریق بیان یہ ہوگا کہ صرف یاد دہانی کراؤں گا اور اپنے مقصد کو پیش کروں گا۔ میں کہوں گا کہ غور کیجیے۔

جب جرمنی نامور [Namor] کے قلعوں (۳) کی طرف بڑھا تو کس طرح دنیا کی نظریں ان کے استحکامات پر لگی ہوئی تھیں؟ جرمنی، اس کا بڑھنا، نامور کے قلعے، حملے کے ایام، اس کے جزئیات، یہ سب آپ کو معلوم ہیں۔ پس اشارہ کافی ہوا مخاطب کے لیے۔ اس میں کاوش اور دلچسپی بھی ہے۔ ورنہ وہ ایسی باتیں سننے سے گھبرا جائے گا جو اس کو پہلے سے بشرح تمام معلوم ہیں۔

پس قصص معلومہ و مشہورۂ اہل کتاب کے بیان میں قرآن اشارات پر اکتفا کرتا ہے، البتہ اس میں اس کے دو مقصد اور بھی ہیں، اکثر واقعات ایسے تھے جن کی روایت و کتابت میں سخت غلطیاں پڑ گئی تھیں، یا راویوں اور کاتبوں کے اوہام و ظنون، رسوم و عواید سے متخلط ہو گئے تھے، یا عدم اسباب تامۂ حفظ کی وجہ سے بعض کڑیاں معدوم ہو گئی تھیں یا تقلید و پرستش قدماء کی وجہ سے مکتوبات تورات پر احبار و علماء کی تفسیر و تاویل کو مقدم کر دیا گیا تھا، سو ان امور کی اصلاح و تصحیح بھی قرآن حکیم نے اپنے اعمال مہمہ

میں داخل کی۔ کیوں کہ اختلافات کے لیے حکم اور ظنون و اوہام کے لیے وہ "کتاب مبین" تھا۔ پس جن قصص میں اور قصے کے جن حصص میں ایسے اغلاط پیدا ہو گئے تھے، ان کو خاص طور پر بیان کر کے اصلیتِ مستور کو واضح کر دیا ہے یا بعض عقاید کی غلطیاں تھیں، جو بعض واقعات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھیں اور ان کی وجہ سے لاکھوں انسان ضلالت میں مبتلا ہو گئے تھے، تو بیان واقعات کے ضمن میں ان کی حقیقت بھی کھول دی اور اہلِ کتاب پر واضح کر دیا کہ ان کی معلومات اس بارے میں لایق احتجاج نہیں ہیں۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن مجید قصص اہل کتاب کو جب بیان کرتا ہے تو اس کا انداز اور مقصدِ بیان کیا ہوتا ہے؟ تصحیح بعض واقعاتِ مہمہ اور بعض عقاید مبنی علی القصص۔ ان تینوں صورتوں میں وہ صرف ان ٹکڑوں سے تعرض کرتا اور بیان کرتا ہے جن سے استدلال و موعظت یا تصحیحِ واقعات یا تصحیح عقاید مقصود ہو، باقی کے لیے مخاطبین کے علم اور قصص کی شہرت پر اعتماد کرتا ہے۔ پس قرآن مجید کے اختصار بیان کی تین قسمیں ہوئیں:

۱۔ مقصود تاریخ نہیں بلکہ بعض ایام و سنین مشہورۂ عام سے استدلال اور استشہاد اور بعض نتایج عبرت و ہدایت کے لیے نظایر و امثال و استقراے تاریخی، اس لیے صرف مطلوبہ اجزا کو لے لیا۔

۲۔ ایجاز بلاغت وعدم تکرار غیر ضروری وقناعت بہ قراین ودلالتِ معنوی۔

۳۔ مخاطبین میں وہ واقعات جو شہرت رکھتے ہیں اور ان کی تفصیل ان کے پاس موجود ہے، پس اشارت پر اکتفا اور باقی کے لیے سامع کے علم پر اعتماد الا یہ کہ تصحیح واقعات یا تصحیح عقاید مقصود ہو اور اس لیے باوجود علم مخاطبین ان اغلاط سے الگ کر کے صورتِ صحیحہ میں جلوہ گر کیا جائے۔

پہلی قسم کی مثال میں تقریباً تمام حصہ قصص پر نظر ڈال لیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

و بنی اسرائیل کے واقعات، تورات کی چار کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں، کیوں کہ مقصود تاریخ محض تھا، لیکن قرآن حکیم نے جس قدر بیان کیا وہ زیادہ سے زیادہ تین چار صفحوں میں آ سکتا ہے، کیوں کہ مقصود عبرت و موعظت، استدلال و استشہاد و جمع نتائج تھا۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کی پیدائش، خروج، محاربہ فلسطین، عمالقہ، پھر بعد کو اس سے صرف قصۂ طالوت و عہد داؤد و سلیمان کو بالاختصار بیان کرتا ہے اور ان کے نتائج پر توجہ دلا کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ حضرت لوط کے واقعات کتاب پیدائش کے تین صفحوں میں آتے ہیں، لیکن قرآن حکیم تمام سوانح لوط میں سے صرف اس قدر حاصل سخن لے لیتا ہے:

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيْءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ٥ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ اِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ قَالَ يٰقَوْمِ هٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُونِ فِيْ ضَيْفِي اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ ٥ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ٥ قَالَ لَوْ اَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيدٍ ٥ قَالُوْا يٰلُوطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ٥ فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ ٥ مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِينَ بِبَعِيدٍ ٥ [۱۱:۷۷تا۸۳]

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو وہ ان کے آنے

سے خوش نہیں ہوا۔ ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ بولا: آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے! اور اس کی قوم کے لوگ [اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر] دوڑتے ہوئے آئے، وہ پہلے سے برے کاموں کے عادی ہو رہے تھے۔ لوط نے ان سے کہا ''لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں [یعنی بستی کی عورتیں جنھیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا، اور جنھیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا] یہ تمھارے لیے جائز اور پاک ہیں! پس (ان کی طرف ملتفت ہو۔ دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو۔ میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ ان لوگوں نے کہا'' تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور تو اچھی طرح جانتا ہے، ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لوط نے کہا: کاش تمھارے مقابلے کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا! [تب] مہمانوں نے کہا: ''اے لوط۔ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ [گھبرانے کی کوئی بات نہیں] یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پا سکیں گے، تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل چل اور تم میں سے کوئی اِدھر اُدھر نہ دیکھے [یعنی اور کسی بات کی فکر نہ کرے] مگر ہاں! تیری بیوی [ساتھ دینے والی نہیں وہ پیچھے رہ جائے گی اور) جو کچھ ان لوگوں پر گزرنا ہے وہ اس پر بھی گزرے گا۔ ان لوگوں کے لیے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔ پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا تو [اے پیغمبر] ہم نے اس [بستی] کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں۔ [یعنی تمام بلند عمارتیں گرا کر زمین کے برابر کر دیں] اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے کہ تیرے پروردگار کے حضور [اس غرض سے] نشانی کیے ہوئے تھے۔ یہ [بستی] ان ظالموں سے [یعنی اشرار مکہ سے] کچھ دور نہیں ہے۔ [یہ اپنی سیر و سیاحت میں وہاں سے گزرتے رہتے ہیں اور اگر چاہیں تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں]''

اب غور کرو سارے قصۂ لوط کا حقیقی حاصل یہی ہے اور جتنا واقعہ بیان کیا ہے اگر

کے انداز بیان، خواتیم آیات اور جابجا کے اشارات میں کس طرح ہدایت وتنبیہ و موعظت وبصیرت کو ملحوظ رکھا ہے، برخلاف اس کے صفحات تورات ان حکم وبصائر سے یکسر خالی ہیں۔ البتہ نہایت تفصیل سے ایک بے اثر قصّہ جمع کردیا ہے۔ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ. اسی طرح قصہ نوح وقصہ طالوت کو دیکھیے اور مقابلہ کیجیے۔

حضرت لوط وغیرہم کا لقب، نام، وطن کی حالت، قوم کی بدکاریوں کے مشرح واقعات آپس کا سوال و جواب، بعد از عذاب کی حالت ان تمام امور کو قرآن نے بالکل نظر انداز کردیا ہے۔

دوسری قسم کی مثال بھی تمام قصص قرآنی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی سورہ یوسف کو دیکھیے غیر ضروری ٹکڑوں کو کس طرح نظر انداز کردیا ہے؟ بھائی مشورہ کرتے ہیں کہ باپ سے جا کر یہ کہیں گے، اب چاہیے کہ ان کا باپ کے پاس جانا اور طے شدہ مشورہ کے مطابق باتیں کرنا بھی بیان کیا جائے۔ ''داستان امیر سرا اس قسم کے ٹکڑوں کو ہمیشہ دو جگہ دکھلائے گا(۴)۔ ایک مشورے کے وقت، ایک ملاقات پدر کے وقت۔ تورات میں ایسا ہی ہے۔ لیکن قرآن صرف ایک موقعے کو لے لیتا ہے اور چوں کہ دوسرے موقعے پر اسی کے مطابق کام ہوا ہے، اس لیے اس کو بیان نہیں کرتا۔ [سورہ یوسف میں ہے]

ارْجِعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ٥ وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ٥ [۱۲:۸۱-۸۲]

تم لوگ اپنے باپ کی طرف لوٹ جاؤ اور اس سے کہو! اے ہمارے باپ! (ہم کیا کریں) تیرے بیٹے نے (پرائے ملک میں) چوری کی! جو بات ہمارے جاننے میں آئی، وہی ہم نے ٹھیک ٹھیک کہہ دی اور ہم غیب کی باتوں کی خبر رکھنے

والے نہ تھے (کہ پہلے سے جان لیتے بن یمین سے ایسی بات سرزد ہونے والی ہے۔)

[اور یہ بھی کہہ دینا کہ] آپ اس بستی سے دریافت کرلیں جہاں ہم ٹھہرے تھے اور اس قافلے کے آدمیوں سے پوچھ لیں جس میں ہم پاس آئے ہیں۔ ہم [اپنے بیان میں] بالکل سچے ہیں''۔

[چناں چہ بھائیوں کا مشورہ ہے، نے ایسا ہی کہا) اس کے بعد ہی باپ کا جواب ہے:

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (۱۲:۸۳)

نہیں! یہ تو ایک بات ہے جو تمھارے جی نے تمھیں سجھا دی ہے''۔

اس دوسری قسم میں اس کو بھی دیکھیے کہ جس مقام پر اشخاص کے ناموں سے کوئی خاص نتیجہ یا اثر مرتب نہیں ہوتا، وہاں ان کے نام بھی نہیں لیے جاتے۔ چناں چہ یوسف کے بھائیوں کے نام نہیں بتلائے کیوں کہ ان سے کوئی خاص فایدہ نہ تھا اور [تمام] کتاب پر نظر ڈالیے! ایک بڑا نمونہ یہی سورۂ یوسف ہے اور آپ کے پہلے سوال کا جواب یہیں سے مل جاتا ہے، مگر اس کو آخر میں بیان کروں گا۔

پہلے اس قسم کے ایک ضمنی حصے کی مثال آپ دیکھ لیں۔ قرآن مجید بقیہ حصے کے لیے مخاطبین یعنی اہل کتاب پر اعتماد کرتا ہے الا یہ کہ تصحیح واقعات و رفع اختلافات و عقاید باطلہ کی ضرورت پیش آجائے، اس کی عمدہ مثال حضرت مسیح کا قصہ ہے۔ سورہ مریم اور بعض حصۂ آل عمران سے مقصد حضرت مسیح کی سوانح حیات نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل کی ضلالت، انکار و قتل انبیا، دعوتِ موسوی کے ظہور و تبشیر وظہور رسالت کبریٰ و دعوت عظمیٰ وغیرہ مقاصد پیش نظر ہیں۔ اس سلسلے میں ان غلطیوں کا ازالہ ضروری ٹھہرا، جو حضرت مسیح کے متعلق یہود و نصاریٰ میں پھیل گئی تھیں۔ یہود نے نبوت کا انکار کیا، حضرت مریم صدیقہ [علیہا الصلوۃ والسلام] پر زنا کا الزام دیا اور نصاریٰ نے ظہور مسیحی کی حقیقت گم کردی اور عبداللہ کو ابن اللہ ٹھہرایا۔ پس ضمناً ان جزئیات کو بھی بیان کردیا

جن سے ان گمراہیوں کا رد ہو جاتا تھا۔ مثلاً جزئیات پیدائش حضرت مسیح وغیرہ۔ واقعہ صلیب کی اصلیت گم ہو گئی تھی۔ پس ضروری تھا کہ تصحیح واقعہ کر دیا جائے لہٰذا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ نہ تو انھوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ (۴:۱۵۷)

اسی طرح حضرت سلیمان کے واقعات قصص یہود و روایات طالمود میں بے حد مسخ ہو گئے تھے۔ یہودیوں کے یہاں حضرت سلیمان کی وہی حیثیت ہو گئی تھی جیسی عوام مسلمانان ہند میں امیر خسرو نامی ایک فرضی ہیرو کی (۵)۔ صدہا مزخرفات و ما فوق الفطرت عجائب و غرائب ان کی طرف منسوب ہو گئے تھے اور گھر گھر پھیل گئے تھے۔ کتاب اللہ تو وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ تھی زیادہ تر دارومدار روایات احبار و مکتوبات طالمود پر تھا۔ جیسے آج کل قرآن سے زیادہ قصص الانبیاء مساجد کے مجامع میں مقبول ہے۔ قرآن حکیم نے ان لغویتوں کا انسداد کیا اور عہد سلیمان کے اصلی اور سچے واقعات بیان کر دیے۔ قصہ ہاروت اور کفر سلیمان جس کی تفسیر میں لوگ سرگرداں ہیں، اس قسم کے ماتحت لا کر حل کر لیجیے۔ میں نے کہا کہ جزئیات غیر ضروری بلکہ بعض مہمات قصص کے لیے بھی قرآن حکیم مخاطبین کے معلومات اور موضوع کی شہرت پر اعتماد کرتا ہے۔ یہ آپ کے پہلے سوال کا جواب ہے۔

آپ پوچھتے ہیں کہ اولین داخلۂ مصر کے وقت لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ ...... الخ نہیں کہا۔ دوسری مرتبہ کیوں کہا؟

پس چاہیے کہ اس موقعے کو تورات میں پڑھ لیجیے کتاب پیدائش میں ہے کہ جب اخوان یوسف پہلی بار مصر پہنچے تو ان پر جاسوسی کا شبہ کیا گیا۔ حتیٰ کہ خود یوسف نے ان سے کہا کہ تم جاسوسی کے لیے آئے ہو، تاکہ اس ملک کی بری حالت معلوم کرو، بھائیوں نے کہا نہیں! خداوند تیرے غلام غلّہ مول لینے آئے ہیں، جاسوس نہیں ہیں۔ اس شبہے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک ہی ملک سے ایک ہی سفر میں ایک ہی موقعے پر جو آدمی پہنچے

جو ایک ہی وضع وشکل کے تھے، مصریوں کو اس زمانے میں غیر قوموں [غیر ملکیوں] سے بڑی نفرت تھی حتی کہ وہ ہندوؤں کی طرح چھوت کرتے تھے۔ تورات میں ہے کہ جب یوسف نے بھائیوں کے لیے دستر خوان چنوایا تو ان کے برتن مصریوں سے الگ رکھے کیوں کہ مصری عبریوں (۶) کے ساتھ کھانا مکروہ سمجھتے تھے، ایسی حالت میں جب ایک جگہ صحرا نشین قوم یعنی کنعانیوں میں سے نو آدمیوں کا جتھا ایک ساتھ پہنچ گیا تو قدرتی طور پر شک وشبے کی نظر سے دیکھے گئے اور حضرت یوسف نے بھی بمصلحت اس کو قایم رکھا کیوں کہ بہر حال وہ مصر کی بادشاہت کے نہیں تو اس کے نائب السلطنت یعنی یوسف کے دشمن ضرور تھے۔

جب برادرانِ یوسف مصر سے واپس آئے تو یہ تمام واقعات حضرت یعقوب سے بیان کیے اور بن یمین کو لے کر دوبارہ روانہ ہوئے، اس وقت حضرت نے کہا لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ...... الخ نیا ملک ہے، اجنبی بستے ہیں، تم سے مصریوں کو وحشت ہے، پہلی دفعہ ٹولی بنا کر گئے اور مشتبہ سمجھے گئے، اب کے ایسا نہ کرنا "الگ الگ جانا اکیلے اکیلے آدمی کو جاتا دیکھ کر کسی کو خیال بھی نہ ہوگا۔

چوں کہ حضرت یوسف کا قصہ اہل کتاب میں مشہور تھا اور تورات میں مکتوب، اس لیے قرآن حکیم نے اولین ملاقات یوسف سے صرف اس ٹکڑے کو کہہ دیا جو دوسرے سفر کا موجب ہوا ہے اور جس کے بغیر سلسلہ چلتا نہ تھا، یعنی طلب بن یمین، برادر حقیقی یوسف۔ باقی گفتگو اور مصر کے واقعات چھوڑ دیے، جو مخاطبین کو معلوم تھے البتہ دوسری روانگی کے وقت ایک نبیؑ اللہ کی نصیحت نہایت قیمتی تھی اور اقوام مختلفہ کے اختلاط اور ایاب وذھاب کے سلسلے میں عمدہ اصول بتلاتی تھی۔ اگر ہمارا اجتماع غیروں کو کھٹکتا رہے تو مصلحتاً اجتماع کی ظاہری صورت کو ترک کر کے معنوی اجتماع وانضمام پر قناعت کرنی چاہیے اور متفرق ہو کر غیروں اور اجنبیوں میں کام کرنا چاہیے۔ یہ نہایت ضروری اصول تھا، پس اس کو بیان کر دیا۔

۳۔ پہلے اور دوسرے کا جواب ہو گیا۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ.

حضرت یعقوب نے بھی کہا اور بھائیوں نے بھی یہی بہانہ کر دیا۔ یہ کیا بات ہے؟ اس کے لیے خاندان یعقوب کی شہری حالت پر نظر ڈالنی چاہیے، تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عیسو اور یعقوب میں ناچاقی ہوئی تو حضرت اسحاق نے یعقوب کو برکت دی اور کہا کہ یہاں نہ رہ۔ ہجرت کر اور اپنے ماموں کے گھرانے میں اپنے لیے بیوی ڈھونڈ۔ یعقوب نکلے اور ''خدّ ان ارام'' میں آئے۔ وہاں لابن (لابان) کی دو لڑکیاں دیکھیں، لیاہ اور راخل، لیاہ کی آنکھ چندھی تھیں اور راخل خوبصورت تھی۔ یہ وہاں رہے اور بالآخر دونوں ان کے نکاح میں آئیں۔ لیاہ سے برادران یوسف اور راخل سے یوسف اور بن یمین پیدا ہوئے۔ جب کچھ عرصے کے بعد لابن کا گھرانا ان کو حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگا تو وہاں سے نکلے اور حکم خداوندی سے نکلے۔ پھر اپنے وطن کی طرف آئے مگر عیسو نے ان پر حملہ کیا اور بہت سے مراحل سفر کے بعد خدا نے فرمایا کہ اٹھ جا اور بیت ایل میں رہ اور خدا کے لیے وہاں مذبح بنا۔ یہ جگہ اس صحرا میں واقع تھی جو موطن اسحاق سے سکم نامی شہر کنعان کو جاتے ہوئے راہ میں پڑتا تھا، جب حضرت یعقوب نکلے ہیں تو اسی مقام پر خدا تعالیٰ نے وحی کی تھی۔ اسی لیے اس کا نام بیت ایل ہوا۔ حضرت یعقوب گئے اور یہاں آباد ہو گئے۔

اب ظاہر ہے کہ یہ کوئی شہری آبادی نہ تھی۔ صحرائی مقام تھا اور صرف خاندان یعقوب یہاں بس گیا تھا اس خاندان کا گزارا مویشی کے پالنے پر تھا اور اس زمانے میں دولت مویشی ہی کی صورت میں ہوتی تھی۔ حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دونوں کو مہر میں سات سات سال گلہ بانی کرنی پڑی تھی، جو خاندان اسرائیل کا قاعدہ تھا ایسی حالت میں قدرتی طور پر بھیڑیے کی طرف سے لوگوں کو خوف رہتا ہوگا جو بوجہ صحرائی مقام ہونے کے بکثرت ہوں گے اور بوجہ مویشی کی کثرت اور گلہ بانی

خوف کی سب سے بڑی چیز سمجھی جاتی ہوگی، اس طرح کے مقامات میں درندوں کی مضرت رسانیوں کے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار نکل گیا کہ کہیں بھیڑیا نقصان نہ پہنچائے، بھائیوں نے دیکھا کہ اس سے بہتر کوئی عذر نہیں، واپس آ کر یہی کہہ دیا۔ یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ گلہ بان ہمیشہ بھیڑیے سے ڈرتا ہے، شہری چور سے اور دہقان ٹڈیوں سے۔

کیا ایک صحرا نشیں گلہ بان قبیلہ اگر کسی کو مار کر اس کے خون سے بچنا چاہے گا تو قدرتی طور پر یہی عذر پیش کیا جائے گا کہ درندوں نے پکڑ لیا، یوسف کم سن تھے، ایک کم سن لڑکے کے لیے اس سے بہتر حیلہ کیا ہوسکتا تھا؟ آج بھی ان حالات کے ساتھ اس سے بہتر عذر نہیں ہوسکتا۔

۴۔ ''تاویل الاحادیث'' ایک بڑا ہی اہم لفظ ہے جو انبیاے کرام علیہم السلام کی نسبت کہا گیا ہے۔ ہرگز ہرگز اس سے محض تعبیر خواب مراد نہیں ہے، اگرچہ یہ بھی اس میں داخل ہے۔ عربی میں ''حدیث'' ویسے تو بات کو کہتے ہیں لیکن اس کا اطلاق واقعہ اور کسی اہم حکایت پر بھی ہوا ہے۔ شعراے جاہلیت کے ہاں حدیث ام عمرو یعنی واقعہ ام عمرو کو کہا ہے۔ قرآن میں بھی یہ اطلاق موجود ہے، هَلْ اَتَاكَ حَدِيثُ مُوسىٰ، (۹:۲۰) هَلْ اَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ اِبْرَاهِيم (۲۴:۵۱)، هَلْ اَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ (۱۷:۸۵)، حَدِيثُ الْغَاشِيَه (۱:۸۸)، ''یعنی واقعۂ موسیٰ، واقعۂ ضعیف واقعۂ جنود، ڈھانپ لینے والا واقعہ، لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے اللہ کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے ''فَبِاَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُونَ (۸۵:۷ و ۷۷:۵۰) وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيثًا (۸۷:۴) مَا كَانَ حدِيثاً يُّفْتَرىٰ'' الخ (۱۱۱:۱۲)، اَنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهٰذَا الْحَدِيثِ اَسَفًا (۶:۱۸) اَفَبِهٰذَا الْحَدِيثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُونَ'' (۸۱:۶۵)۔ صاف صاف سورۂ زمر میں قرآن کو حسن الحدیث: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا'' الخ (۲۳:۳۹) نیز سورۂ طور میں معارضہ کرتے ہوئے فرمایا فلیاتوا

بحدیث مثلہ (۳۴:۵۲) فرمایا۔ ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید وحی و کلام الٰہی اور مخاطبات و معارف نبوت کو بھی حدیث کہتا ہے، جیسے حدیث موسیٰ، حدیث الجنود وغیرہ اور الہامات الٰہیہ اور علوم و معارف نبوت کو حدیث قرار دیتا ہے۔ اب سورۂ یوسف میں تاویل الاحادیث کا سیاق و سباق دیکھیے۔ اوائل میں حضرت یوسفؑ اپنا خواب بیان کرتے ہیں، وہ خواب جس میں ان کے آئندہ مقاماتِ رفعت و اجتباء کی خبر دی گئی ہے، حضرت یعقوب سن کر کہتے ہیں یَا بُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْیَاكَ (۵:۱۲) وَ كَذَالِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَ یُعَلِّمُكَ مِن تَاوِیلِ الْاحادیثِ وَ یُتِمُ نِعْمَتَه‘ عَلَیْكَ وَ عَلٰی آلِ یَعْقُوبَ كَمَا اتَمَّهَا عَلٰی اَبَوَیْكَ مَن قَبل ... (۶:۱۲)

اللہ تعالیٰ تجھ کو بندگی اور رفعت دے گا اور ''تاویل الاحادیث'' بتلا دے گا اور اپنی نعمتوں کو پورا کرے گا۔ جیسا کہ ابراہیم و اسحاق پر کیا، یہاں اجتباء کا ذکر ہے، اتمامِ نعمت کی بشارت ہے، وہ نعمت جو خاندان ابراہیمی کا ورثہ ہے اور جس کا ظہور ابراہیم و اسحاق پر ہو چکا ہے۔ کیا وہ چیز محض تعبیر خواب ہو سکتی ہے؟ اور کیا یہی چیز ہے جو ابراہیم کی وراثت میں یوسف کو ملے گی اور خدا کا حکم پورا ہوگا جو توراۃ میں ہے کہ میں اس کی نسل سے علم و دانائی اور بادشاہت و حکمرانی سب ہی نعمتوں کو ظاہر کر دوں گا۔

سو معلوم ہوا کہ ''تاویل الاحادیث'' کا اردو ترجمہ ''باتوں کی حقیقت'' یا کلام کی حقیقت ہے اور اس سے مقصد یا تو وحی و کلام الٰہی ہے یا عام علوم نبوت یا وہ نورانیت ہے، جو روشن ہو کر تمام باتوں کی حقیقت کو کھول دیتی ہے اور انسانوں کو محجوب و مستور حقیقتوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے، یہ ''تاویل الاحادیث'' کا علم ابراہیم سے اسحاق، اسحاق سے یعقوب کو اور یعقوب سے یوسف کو ملا۔ ان کے بھائی اس سے محروم رہے۔ اس کا ان کو جلن تھا اور اسی لیے یوسف، حضرت یعقوب کو پیارے تھے، کما سیاتی تفصیلہ۔ ہاں! ''تعبیر رویا'' اسی علم و فہم و فراست نبوت کا نتیجہ ہے اور اس میں داخل!

۵۔ شهد شاهد من اهلها. بعض روایات کی بنا پر مفسّرین نے بچہ کو لکھ دیا، مگر حق یہ ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، قرآن میں صرف "مِنْ اَهْلِهَا" ہے اور اتنا کافی ہے گھر کے آدمیوں میں سے کوئی ہوگا۔

۶۔ آپ کا خیال صحیح ہے مگر "مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَان" میں تو سب داخل ہوگئے۔ اصنام وطواغیت بھی، رسوم وعواید بھی، نسلی روایات وعقاید مالوفہ بھی اور سلاطین جبابرہ بھی! غرضے کہ ہر وہ چیز جس کو اربابًا من دون اللہ کا درجہ عملاً یا اعتقاداً دیا جائے۔ یہ نام ہی نام ہوتے ہیں، جو بزرگی اور کبریائی کے لیے اسلاف نے گھڑ لیے تھے، لوگ ان سے ڈرتے ہیں، سہمتے ہیں، تھراتے ہیں۔ مگر ان میں ہے کچھ بھی نہیں۔ یہ بھی تو "ماتعبدون" میں داخل ہے؟ آج کل لوگ سہم جاتے ہیں کہ اگر کسی مسئلے کو یوں مان لیا جائے تو فقہ حنفی سے تخالف ہو جائے۔ امام ابوحنیفہ کا فلاں اصول ٹوٹ جائے۔ یہ بھی اَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُم و آباء کُم نہیں تو اور کیا ہے؟

۷۔ یہ سچ ہے حضرت یوسف انجان سے رہے، لیکن صورت واقعہ ایسی ہوگئی کہ بھائیوں نے خود ہی اپنی خاندانی حالت بیان کر دی، حضرت یوسف نے پہچان لیا تھا اور اپنے بھائی یا باپ کے حالات دریافت کرنے کے لیے بے چین ہوگئے تھے، انھوں نے کہا کہ تم جاسوس ہو، نہیں تو بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ بھائیوں نے کہا کہ ہم جاسوس نہیں ہیں اور اس لیے نہ کوئی جتھا بنا کر آئے ہیں، ہم کنعانی ہیں ہمارا باپ بوڑھا ہے اس کے ہم گیارہ لڑکے ہیں، ایک کھو گیا، ایک گھر میں ہے اور نو ہم غلّہ لینے آئے ہیں۔ اس پر حضرت یوسف نے موقع دیکھ کر کہا کہ اچھا تم اپنے بھائی کو بھی بلاؤ تا کہ تمھارے بیان کی تصدیق ہو۔ اگر اس کو نہ لائے تو تم جھوٹے ثابت ہوگے، چناں چہ توراۃ میں ہے کہ جب بھائیوں نے آ کر حضرت یعقوب سے ماجرا کہا اور بن یمین کو لے جانا چاہا تو وہ بہت ناراض ہوئے کہ یوسف کو کھو چکے ہو اب بن یمین کو بھی لے جانا چاہتے ہو، انھوں نے کہا "تم نے مجھ سے کیوں یہ بدی کی کہ اس مرد سے [یعنی یوسف سے]

کہا کہ ہمارا ایک بھائی اور بھی ہے۔ (۴۳:۶، ۷) وہ بولے چوں کہ اس مرد نے ہمیں تنگ کر کے ہمارا اور ہمارے کنبے کا حال پوچھا اور کہا کہ تمھارا باپ جیتا ہے؟ یا تمھارا اور بھی کوئی بھائی ہے؟ تو ہم نے باتوں کے سر رشتے کے مطابق اسے جواب دیا۔ [پیدایش ۴۳:۶، ۷]

رہا دوسرے داخلے کے وقت آوىٰ اِلَیْهِ اَخَاہ اس مرتبہ تو صفحہ الٹنے کے قریب تھا اور حضرت یوسف اپنے تئیں ظاہر کرنے پر آمادہ تھے۔ محبّت برادری نے بھی ان کو جوش دلایا۔ انھوں نے بن یمین کے ساتھ خاص سلوک کیا۔ تورات میں ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کو رونا آ گیا۔ وہ جلد بات ختم کر کے اندر چلے گئے۔

قَالَ اِنِّی اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (۱۲:۶۹)

اسے [پوشیدگی میں] اشارہ کر دیا کہ میں تیرا بھائی [یوسف] ہوں پس جو (بدسلوکی) یہ (لوگ تیرے ساتھ) کرتے آئے ہیں، اس پر غمگین نہ ہو (اور خوش ہو جا کہ زمانہ پلٹ گیا)۔

۸۔ یہ بہت تفصیل طلب سوال ہے، آپ پوچھتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم تھا یا نہیں؟ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ سے کیا مراد ہے؟ اگر علم تھا تو گریہ وزاری کیوں؟

سب سے پہلے ایک غلط فہمی سے آپ اپنے کو بچا لیں! عموماً لوگوں نے سورۂ یوسف کی تفسیر کرتے وقت حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کے باہمی تعلّق کو محض پدرانہ عشق و محبّت کے کمال و انتہا کی صورت میں دیکھا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن نے حضرت یعقوب کی محبّت اور فراق یوسفی گریہ وزاری وَابْیَضَّتْ عَیْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ (۱۲:۸۴) کی وجہ صرف یہ بتائی ہے کہ حضرت یوسف بڑے خوبصورت تھے، سب سے چھوٹے تھے، زیادہ محبوب بیوی راخل کے بطن

سے تھے اس لیے سب سے زیادہ باپ کو پیارے تھے۔

لیکن یہ ایک نہایت ہی افسوس ناک غلطی ہے اور افسوس کہ سب سے ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے لٹریچر میں محبّت پدری کی سب سے بڑی مثال ہی حضرت یعقوب کی محبّت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال یہودیوں سے مسلمانوں میں آیا ہے اور من جملۂ اسرائیلیات ہے۔ تورات میں ہے کہ یعقوب یوسف کو بہت چاہتا تھا اور اس کے لیے ایک بوقلموں قبا بنائی تھی۔ یہودیوں کی خارج از تورات روایات وقصص نے اس پر اور نمک مرچ لگایا ہوگا، رفتہ رفتہ مسلمانوں میں بھی شہرت ہوگئی۔ حال آں کہ قرآن میں کہیں اشارہ تک نہیں! بھائیوں کے جو باہمی اقوال نقل کیے ہیں، ان سے تو کچھ اور ہی ثابت ہوتا ہے۔

آپ یقین کریں کہ مقام نبوت ایک نہایت ارفع اور اعلیٰ مقام ہے اور جب ایک معمولی انسان اور صالح انسان نہیں ہوسکتا، جب تک کہ مرضیات الٰہیہ کی راہ میں جسمانی علاقوں کو خیر باد نہ کہہ دے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک نبی اللہ اور حامل وراثت ابراہیمی ہوکر اتنے گرفتار علایق ماسوی اللہ ہوجائیں کہ بیٹے کی یاد میں رورو کر آنکھیں سفید کرلیں؟ مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ. آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم [خلیل اللہ] علیہ الصلوۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کا جو نمونہ انھیں پہنچا تھا، وہ یہ تھا اِنِّی اَرٰی فِی الْمَنَامِ اِنِّی اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی؟ (۱۰۲:۳۷)

[میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں سو کہو تمھارا اس معاملے میں کیا خیال ہے؟] انبیائے کرام دنیا میں اس لیے نہیں آتے کہ بیٹوں کے ہجر میں رویا کریں، ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ حق واسلام اور سعادت عالم کے عشق میں رویا کریں، ان کا محبوب ہمیشہ سے ایک ہی ہے: خدا اور اس کی سچائی اور اس کی زمین کی سعادت۔ وہ

عزیز واقربا کا عشق لے کر نہیں آتے۔

اصل یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی گریہ وزاری یوسف کے عشق میں نہ تھی بلکہ اس چیز کے لیے تھی، جس کے لیے خدا نے یوسف کو چن لیا تھا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوۃ والسلام سے نبوت موعود کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ حضرت اسحاق کے بعد حضرت یعقوب کو ملا تھا۔ جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا، خدا نے اسرائیل کو بشارت دی تھی کہ میں تیری اولاد میں سے ایک کو اپنی نعمتوں کے لیے چن لوں گا، اور ابراہیمی وراثت کا وارث بناؤں گا اور زمین کی حکمرانی اس کو ملے گی۔ تورات میں ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام بہ حکم پدر، وطن سے نکلے تو راہ میں خدا دکھائی دیا۔ اور اس نے کہا کہ تیرا نام آیندہ اسرائیل ہوگا تو برومند ہو اور بہت ہو جا۔ تیری کمر سے بادشاہ نکلیں گے اور ابراہیم اور اسحاق [علیہما السلام] کی زمین تجھ کو دوں گا۔ [پیدائش ۳۵: ۹ تا ۱۱] قرآن حکیم نے بھی اس بشارت کی طرف اشارات کیے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں یہ بشارت گھر کر گئی تھی، وہ ہمیشہ اس کے ظہور کے منتظر رہتے تھے، انھوں نے اپنی اولاد سے بھی اس بشارت کا ذکر کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ تم میں سے کوئی ایک ہوگا جس کو خداوند اپنے وعدے کے ظہور کے لیے چن لے گا۔ اولادِ یعقوب اپنے باپ اور چچا کا قصہ بھی سن چکے تھے کہ کس طرح عیسو محروم رہ گیا اور ابراہیمی وراثت یعقوب کو مل گئی۔ اس لیے قدرتی طور پر ان میں سے ہر ایک دل کو اس کی لگن لگ گئی تھی اور ہر شخص چاہتا تھا کہ وہ موعود فرزند میں ہوں اور خاندان اسحاق و اسرائیل کی برکتیں میرے ہی واسطے سے آگے چلیں۔

یوسف علیہ السلام جب دس بارہ برس کے ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فراست نبوی کی آنکھیں ان پر ڈالیں اور بہت سی پاک علامتیں ان میں دیکھیں۔ ان کو خیال ہو گیا کہ عجب نہیں موعودہ فرزند یہی ہو، اسی اثنا میں ایسا ہوا کہ یوسف نے خواب دیکھا۔ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ. تورات سے معلوم ہوتا

ہے کہ خاندان اسرئیل میں خوابوں کا بڑا ہی اعتقاد تھا اور سورج چاند کے ملنے کو نبوت اور بادشاہت کا ملنا یقین کرتے تھے، اور حضرت یعقوب نے جب یہ خواب سنا تو ان کو پورا یقین ہو گیا کہ یہی وہ فرزند ہے جس کے ذریعے سے آسمانی بشارت پوری ہوگی کہ ''میں تیری کمر سے حکمران پیدا کروں گا اور نیز ابراہیمی وراثت دوں گا''۔ پس حضرت یعقوب علیہ السلام کی وہ شفقت اور کمال درجہ محبّت و عشق جو حضرت یوسف علیہ السلام سے نظر آتا ہے صرف اس بنا پر تھا کہ انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اندر ابراہیم و اسحاق [علیہما السلام] کو پالیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ دعوت ابراہیمی کا سلسلہ آگے کو اسی کے ذریعے چلے گا۔ چوں کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ اس نعمت کے حسد سے کس طرح عزیز بھائی مخالف ہو جاتے ہیں اور کس طرح عیسوان کا دشمن ہو گیا تھا، اس لیے انھوں نے یوسف کو روکا: لاتقصص رءیاك علیٰ اخوتك فیکیدوا لك کیداً.

''باپ نے کہا اے میرے بیٹے! اپنے اس خواب کا حال اپنے بھائیوں سے نہ کہہ دیجیو کہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبے کی تدبیریں کرنے لگیں۔ یاد رکھ! شیطان انسان صریح دشمن ہے۔ لیکن مشیتِ الٰہی دوسری تھی، بھائیوں نے خواب سن لیا اور وہ سمجھ گئے کہ ابراہیمی برکت جس کے لیے ہم منتظر تھے یوسف کو مل گئی۔ تورات میں ہے کہ بھائیوں نے خواب سنتے ہی کہا: کیا تو سچ مچ ہمارا بادشاہ ہوگا؟ یعنی وہ سب چوں کہ ظہور کے منتظر تھے اس لیے سنتے ہی اچھل پڑے اور معاً بول اٹھے کہ یہ تو بادشاہت کی خبر ہے اور وہی ہے جس کا ہم ہمیشہ سے چرچا کرتے آتے ہیں۔

جب بھائیوں نے یوسف کو الگ کر دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو بڑا ہی رنج ہوا کہ میرے ورثۂ نبوت کا حامل گم کر دیا گیا۔ مگر چوں کہ ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ خدا نے اپنے وعدے کے ظہور کے لیے یوسف علیہ السلام ہی کو چنا ہے، اس لیے ان کو یقین تھا کہ وہ ضرور اس کی حفاظت کرے گا اور بالآخر آسمانی حکم پورا ہو کر رہے گا۔ پس ان کی حالت، غیبت یوسف سے لے کر آخر عمر تک ایک ایسے شخص کی سی رہی جس کا

دامن دو جھاڑیوں میں پھنس گیا ہو، ایک طرف اس کا رنج وغم تھا کہ موعودہ فرزند نا معلوم مدت تک کے لیے جدا ہو گیا اور وراثت ابراہیمی کا کوئی حامل نہ رہا، دوسری طرف اس کی امید کہ جب خدا نے اس نعمت کے لیے اس کو چنا ہے تو ضرور ہے کہ اس کا حکم پورا ہو اور یوسف برگزیدۂ الٰہی بن کر دنیا میں نمودار ہو۔ حضرت یعقوب بار بار اس یقین کو ظاہر بھی کرتے تھے اور بے خبر بھائی کہتے تھے کہ یہ حماقت ہے اور جنون ہے "وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُونَ" وغیرہ تصریحات کو اسی سے سمجھ لیجیے!

اگر کہا جائے کہ جب وعدۂ خداوندی پر بھروسا تھا تو پھر گریہ وزاری کیوں تھی؟ تو اس کا جواب ظاہر ہے گریہ وزاری عدم طمانیت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ عشقِ طہور اور کمالِ شدتِ انتظارِ موعود میں وہ روتے تھے، کہ خدایا! کیوں نہیں وہ وقت جلد آتا اور کیوں دیر ہو رہی ہے اور ایسا کب ہوگا کہ میں (خود کو) وراثتِ ابراہیمی کے حامل برگزیدوں کے ساتھ پاؤں گا؟ بقائے نبوت ودعوت کا عشق خاصۂ اولیائے نبوت ہے۔

آنحضرت [روحی فداہ] صلی اللہ علیہ وسلم کا باوجود یقین یہ حال تھا کہ

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲۶:۳)

[اے پیغمبر] تیری حالت تو ایسی ہو رہی کہ جب لوگ یہ [واضح] بات بھی نہ مانیں تو عجب نہیں ان [کی ہدایت] کے پیچھے مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔ [حال آں کہ وہ ماننے والے نہیں؟]

آغاز وحی کے واردات بھی اسی عشق کا نتیجہ تھے۔ بخاری کی روایت ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا [سے] کیف کان بدء الوحی [وحی کا آغاز کیوں کر ہوا؟] کو ممکن ہے انقطاعِ وحی اور رسول اکرم کی بے قراری کو شارحین نے نہ سمجھا ہو اور مولانا شبلی مرحوم نے عاجز آ کر کہہ دیا کہ "موقوف و نا قابل اعتناء! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ عشق یہاں تک ہوا کہ قد خشیت علی نفسی.

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ حال ہوا کہ صحرائے سینا میں سرگردان پھرتے اور

حضرت یعقوب علیہ السلام پر یہ گزری کہ یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوسُفَ وَ ابیَضَّت عَینَاہُ مِنَ الحُزنِ فَھُو کَظِیم (۱۲:۸۴)۔ اور اس نے لوگوں کی طرف سے رخ پھیر لیا اور چوں کہ اس نئے زخم کی خلش نے پچھلا زخم تازہ کر دیا تھا اس لیے پکار اٹھا، آہ یوسف کا دردِ فراق اور شدت غم سے [روتے روتے] اس کی آنکھیں سپید پڑ گئیں اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔ و کل الی ذاك الجمال یشیر!

جب دوسرے سفر سے اخوانِ یوسف آئے ہیں، یہ وہ وقت تھا کہ ظہور یوسفی میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا اور مدتِ مقررۂ ہجر قریب الاختتام تھی، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام پر شدت اضطراب سے کمال درجہ حزن و رنج طاری تھا اور اپنی پوری قوتوں سے آپ خدا کے حضور حاضر ہوئے۔ چناں چہ قرآن پاک میں ہے:

وَتَوَلّٰی عَنھُم وَ قَالَ یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوسُفَ ... (۱۲:۸۴)

اور اس نے ان لوگوں کی طرف سے رخ پھیر لیا اور.... پکار اٹھا آہ یوسف کا درد فراق!

معلوم ہوتا ہے اس وقت آپ پر واردۂ انکشاف طاری ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا کہ وقت ظہور و ملاقات آ گیا ہے اور بن یمین اور یوسف ایک ساتھ ملیں گے لہٰذا فرمایا:

اِذھَبُوا فَتَحَسَّسُوا یُوسُفَ وَ اَخِیہِ وَلَا تَایئَسُوا مِن رَوحِ اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یَایئَسُ مِن رَوحِ اللّٰہِ اِلَّا القَومُ الکٰفِرُونَ ○ (۱۲:۸۷)

[پھر انھوں نے کہا] "اے میرے بیٹو! [ایک بار پھر مصر جاؤ] اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو منکر ہیں۔

قَالَ ھَل عَلِمتُم مَا فَعَلتُم بِیُوسُفَ وَاَخِیہِ اِذ اَنتُم جٰھِلُونَ

o قَالُوْا ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ؟ (۱۲:۸۹،۹۰)

[یہ حال سن کر] یوسف [کا دل بھر آیا اس] نے کہا تمھیں یاد ہے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب کہ تمھیں سوجھ بوجھ نہ تھی۔

سبحان اللہ قرآن عظیم نے قصۂ یوسف کے کیسے مشکل واقعے اور دفتر طلب حصّے کو ایجاز و اختصار بلیغ کے ساتھ حل فرما دیا ہے اور آپ ذوق نہیں لیتے۔

”هل علمتم ما فعلتم بيوسف و اخيه اذ انتم جاهلون اور ءَ اِنك لانت يوسف؟“ کے درمیان ایک دنیا محدود ہے جس کو قرآن نے اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ ”ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ؟“ سب کچھ بتلا دے گا۔ هَلْ عَلِمْتُمْ کا جواب بھائیوں نے نہایت حیرانی اور سراسیمگی سے دیا اور وہ حیرت سے پاگل ہو گئے کہ یہ کون شخص ہے؟ اس وقت حضرت یوسف آخری پردہ اٹھاتے ہیں اور ظاہر ہو جاتے ہیں کہ ”میں یوسف ہوں اور اس سرو سامان میں تم کو نظر آ رہا ہوں“ یہ سن کر بھائی حیران ہو جاتے ہیں۔ شدتِ تعجب سے ان کی عقل گم ہو جاتی ہے اور وہ سراسیمہ ہو کر چلا اٹھتے ہیں۔ یہ: ”ءَ انك لانت يوسف؟“ یہ بھائیوں کا وہ جواب نہیں ہے جو انھوں نے ”هل عَلِمْتُمْ“ کے جواب میں کہا تھا بلکہ بہت سی باتوں کے بعد جب یوسف نے صاف صاف اپنے تئیں پہنچوا دیا تو اس وقت بطور استفسار و پرسش کے نہیں بلکہ شدت تعجب و استغراب سے بول اٹھے: ءَ أَنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ؟ یوسف کے لفظ پر یہاں زور دیجیے تو اس کلمے کا اثر ظاہر ہو جائے گا، یوسف کا لفظ یہاں دراصل یوسف کی پوری سوانح عمری ہے، بھائیوں نے دراصل تعجب سے کہا ”کیا تو ہی یوسف ہے؟“ وہ یوسف یعنی وہی یوسف جس کو کنوئیں میں ڈال دیا، غلام بنا کر عربوں کے ہاتھ بیچا، مصر کا نائب السلطنت اور مختارِ کل ہو سکتا ہے! آپ کو جو شبہ ہوا ہے وہ مفسّروں کے عام بیان کی بنا پر ہوا ہے، لوگ سمجھتے ہیں ”انَّكَ لَاَنْتَ يُوْسَفُ“ هل عَلِمْتُمْ کا جواب یہ صحیح نہیں ہے، قرآن کی بلاغت ایجاز کے اصول و اقسام کو اپنے سامنے لائیے۔ یہ کہنا

بالکل ضروری تھا کہ یوسف نے اپنے تئیں ظاہر کر دیا کیوں کہ بھائیوں کے تعجب سے ماقبل کا سوال و جواب خود بخود روشنی پا رہا ہے۔ تورات میں ہے کہ یوسف نے اپنے گھر میں انھیں اتارا اور جب ملاقات ہوئی تو پچھلے واقعات کا تذکرہ چھیڑا، یہاں تک کہ بیتاب ہو گیا کہ اس کی آنکھیں جو اشک سے بھر آئیں سب کو بتا دیا اور ان پر ظاہر کر دیا کہ میں یوسف ہوں پر اس کے بھائی گھبرا گئے۔ مختصراً یہ کہ ''ءَ انَّكَ لَانْتَ یُوْسُفُ؟'' کلمۂ تعجب ہے کہ جواب ھل علمتم قواعد عربیہ کی بنا پر ''ءَ انَّكَ'' سے یہ ظاہر ہے، زمخشری کو اس کا خیال ہوا تھا۔

اب آخری وقت آیا اور جو ہلکا سا پردہ باقی تھا وہ بھی اٹھ گیا اور ادھر قافلہ مصر روانہ ہوا اور ادھر کنعان کا بیت الحزن بوے یوسفی سے بھر گیا۔ حضرت یعقوب چلا اٹھے کہ نسیم مصر سے یوسف کی بو آتی ہے!

اے گل بتو خورسندم تو بوے کسے داری؟

یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام پر آخری واردہ' انکشاف طاری ہوا، پہلی مرتبہ سراسر اس قدر ظاہر ہوا تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ یوسف اور بن یمین اکٹھے مل گئے، اس مرتبہ ان کا نور نبوت پکار اٹھا کہ قافلۂ مصر میں گم گشتہ کا سراغ ملنے والا ہے!

حضرت یعقوب پر یہ کیوں کر ظاہر ہوا؟ اس کا آسان جواب تو یہ ہے کہ وحی الٰہی سے! لیکن میں یہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں دیکھتا، علم النفس سے مدد لیجیے، علماے سائیکالوجی مجبور ہوئے ہیں کہ جذبات و امیال، معنویات نفس انسانی کے غیر مادی موثرات و علایق کا اعتراف کریں (۷)۔ مادیات میں جس چیز کو جذب کہتے ہیں، جذبات میں اسی کا نام عشق یا محبّت ہے، جس طرح قوتِ جاذبہ میں کشش ہے جو ہر مقابل کو کھینچ لیتی ہے، اسی طرح میلان اور رابطۂ محبّت بھی ایک اثر رکھتا ہے، جو غیر محسوس طور پر اپنی فعالیت کی نمود کرتا ہے۔ ہر شخص جو جذباتِ دقیقہ سے محروم نہیں، اپنی زندگی میں اس کے شواہد رکھتا ہے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی دور دراز مقام پر اپنے عزیز و

محبوب کو دکھ پہنچا ہے اور خود بخود یہاں اپنے اندر انقباض واضطراب رونما ہو گیا ہے۔ اگر جمع کیے جائیں تو ہزار ہا جزئیات ملیں گے کہ محبّت اور تعلّق کامل نے ایک دوسرے تک مخبری کی ہے، بارہا ایسا ہوتا ہے کہ دل خود بخود تڑپ اٹھتا ہے کہ آج کوئی خبر ملنے والی ہے اور فی الحقیقت خبر ملتی ہے کہ فلاں عزیز پر یہ گزری یا فلان محبوب آرہا ہے۔ البتہ اس کے لیے ضرور ہے کہ جذبات بغایت رقیق ہوں اور نفس خارجی اثرات سے گوشہ گیر ہو سکے۔ خود مجھ پر یہ واقعہ گزر چکا ہے کہ ایک شخص سے بغایت درجہ تعلّق خاطر تھا، جس دن اس کا خط آنے والا ہوتا تھا۔ صبح سے ایک نئی بات محسوس ہونے لگتی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ایک نئی ہوا میں سانس لے رہا ہوں، والد مرحوم کو شاہ محمد یعقوب برادر خرد شاہ محمد اسحاق سے بڑی ارادت تھی، شاہ صاحب مکۂ مکرمہ میں رہتے تھے اور والد مرحوم گرمیوں میں طائف چلے جاتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک بار صبح سے مجھ کو بغیر کسی وجہ کے اضطراب معلوم ہونے لگا، شام ہوئی تو شاہ صاحب کا خط ملا، میں سمجھ گیا کہ اسی وجہ سے تھا۔ اس کے بعد سے اپنے اضطراب قلب کو پیغامبر سمجھتا تھا اور جس دن ویسی حالت رونما ہوتی تھی نوکر کو بھیج دیتا تھا کہ ڈاک خانے سے خط لے آئے۔ چناں چہ خط موجود ملتا تھا ہر مرتبہ خط ملا اور کبھی اس میں غلطی نہیں ہوئی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ انبیاے کرام کے نفوس ذکیہ کی حالت دوسری ہوتی ہے اور بوجہ کمال تزکیہ فطری اور انشراح روحی ہر عام واردۂ قلبی ان پر زیادہ موثر اور واضح ہو جاتا ہے، ہم اس میں تعین اور تیقّن پیدا نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کا حال ایسا ہوتا ہے گویا ان واردات کے کلیات و جزئیات سب ان کے سامنے ہیں اور جس طرح ٹیلی گراف کا کلرک ہر اشارے کو سمجھ جاتا ہے کہ یہ ''الف'' یہ ''ب'' یہ ''لام'' ہے۔ اسی طرح وہ ان واردات کے مجہول و غیر مفہوم اشارات کو پالیتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے قریب قریب اس کے ایک تقریر لکھی ہے اور امام رازیؒ غیر نبی کے الہام و کشف کی توجیہہ کرتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو کمال درجہ تعلقِ خاطر یوسف علیہ السلام سے تھا، جب وقت آ گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے تیئں ظاہر کر دیا اور اپنی نسبت یقین دلانے کے لیے بطور نشان کے اپنا کرتا بھیج دیا، علم النفس کے اصول پر خاطر یعقوبی معاً متاثر ہوئی اور بوجہِ کمال تعلّق جو انفعالی حالت پیدا ہو گئی تھی اس نے فوراً اپنا اثر دکھلایا۔ ادھر قافلہ بشارت کرتا لے کر روانہ ہوا اور ادھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہنا شروع کر دیا: اِنِّي لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ. (۱۲:۹۴)

"لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ" کے مخاطب خاندان کے لوگ ہوں گے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے پڑپوتے ہو چکے تھے اور سبھی انھیں ان کے اس انتظار و غم پر ملامت کرتے اور کہتے (ہوں گے) کہ یہ جنون ہے:

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کو آپ نے "لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ" سے ملا دیا ہے۔

یعنی جب اِنِّي لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ کہنے پر حضرت یعقوب علیہ السلام کو "فِي ضَلَالِكَ الْقَدِيْمِ" کا الزام دیا گیا اور اس کے بعد "البشیر" نے بشارت دی تو اس الزام کی طرف اشارہ کر کے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ. الخ؟ حال آں کہ صورت واقعہ یوں نہیں ہے الزام دینے والے تو وہ لوگ تھے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس تھے اور جن کے سامنے آپ نے اِنِّي لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ فرمایا تھا۔ پس قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلَالِكَ الْقَدِيْمِ (۱۲:۹۵) میں قَالُوْ دیگر اعزا و اقارب سے متعلق ہے اس کے بعد بشارت پہنچی اور غالباً سب سے پہلے یہودا یا اروبن نے آ کر پیراہن پیش کیا۔ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اخوان یوسف علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ......الآیہ. یعنی کہ میں ہمیشہ کہا نہیں کرتا تھا کہ وعدۂ الٰہی ضرور پورا ہو کر رہے گا اور ایک نہ ایک دن یوسف ضرور ظاہر ہوگا۔ تب سب نے اعتراف کا سر جھکایا اور بولے:

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِيۡنَ ۝

(۱۲:۹۷)۔

بولے اے ہمارے باپ، ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے [اللہ کے حضور دعا کریں فی الحقیقت ہم سے سراسر قصور ہوتے رہے]

اس کیفیت میں قَالُوۡا ... "اِنَّكَ لَفِيۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِيۡمِ" میں دوسرے لوگ ہیں، دونوں کو ایک کرنے سے مغالطہ ہوا۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) یہ مکتوب الیہ کے قلم سے اس خط پر ایک نوٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے خاص خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میرے نام حضرت مولانا مرحوم ومغفور کے تمام خطوط، میرے محترم دوست اور بھائی مولانا غلام رسول مہر کی مساعی جمیلہ سے "تبرکات آزاد" میں شایع ہو گئے، جزی اللہ احسن الجزاء عنی وعن سائر المومنین صرف یہی ایک خط رہ گیا تھا جو تبرکات میں شامل نہیں ہو سکا تھا"۔

مولانا محی الدین احمد قصوری

[۲] ۱۹۱۳ء میں مولانا عبیداللہ سندھی نے منتہی طلبہ کو قرآن پڑھانے کے لیے ایک درس گاہ "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے نام سے دہلی میں قایم کی تھی اس میں مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی [۸/جنوری ۱۹۶۵ء] بھی شریک تھے۔ ان کے پاس مولانا کے درس قرآن کے نوٹس تھے۔ یہی نوٹس مکتوب الیہ کی نظر سے گزرے تھے۔

(۳) بلجیم میں نامور کے قلعے اپنی مضبوطی کے لیے مشہور تھے اور انھیں ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا۔

(۴) "داستان امیر" سے مراد "داستان امیر حمزہ" ہے۔ "سرا" کے معنی گانے والے یا بیان کرنے والے کے ہیں۔ "داستان امیر سرا" یعنی داستان امیر حمزہ بیان کرنے والا۔

(۵) مکتوب میں امیر حمزہ کی جگہ امیر خسرو درج تھا، جو یقیناً مکتوب نگار کا سہو قلم تھا یا ٹائپسٹ کی غلطی تھی، جو خاکسار نے درست کر دی۔

میرے سامنے اس خط کا مسودہ مکتوب نگار [مولانا ابوالکلام آزاد] کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں۔ بلکہ (اس) کی ٹائپ کاپی ہے جو غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے اغلاط ان کے محل استعمال اور مضمون کی مناسبت سے درست کر دیے۔ یہاں ایک ہندستانی تاریخی ادبی شخصیت "امیر خسرو" کا نام درج تھا۔ اگرچہ امیر خسرو کی شخصیت کے بارے میں بہت

سے افسانے مشہور ہو گئے ہیں لیکن وہ ایک تاریخی شخصیت اور زمین پر چلنے پھرنے والا وجود اور لاکھوں اہل ہند کی پسندیدہ اور دل چسپ شاعر اور صوفیانہ ذوق کی شخصیت تھے۔ وہ نہ داستان کے فرضی ہیرو تھے اور نہ ان کی کوئی داستان تھی جس کے صدہا مزخرفات اور مافوق الفطرت عجایب وغرایب ان کی ذات سے منسوب تھے اور گھر گھر پھیل گئے تھے اور اب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان صفات کی حامل شخصیت امیر حمزہ کی تھی اور انھیں کی داستان کی یہ خصوصیات تھیں۔

داستان امیر حمزہ اور اس کی خصوصیات کا حوالہ اسی خط میں ایک صفحے پہلے بھی تاریخی حقایق سے اور من گھڑت قصوں ہی کے سلسلے میں آ چکا ہے۔

(۶) ''عبریوں'' عربی کی جمع ہے۔ عبری بمعنی کنعانی۔ عبری قوم اور زبان دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

(۷) اس مقام پر خط میں ذیل کا حاشیہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''شیخ سعدی شیرازیؒ اپنے خاص انداز میں اس کیفیت کی یوں تشریح فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ سے اس موقع پر پوچھنے والے پوچھتے ہیں اور ان کا یہ سوال

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خرد مند

بالکل قدرتی تھا۔

ز مصرش بوے پیراہن رمیدی — چراچاہ کنعانش تو نہ دیدی

یعنی قمیص سے یوسف کی قمیض کی خوشبو تو تمھیں آ گئی، پھر کنعان کے کوئیں سے جو بالکل پاس ہی تھا، اسے کیوں نہ دیکھ لیا۔

اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

بگفت احوال ما برق جہاں است — دمے ...... دمے دیگر نہاں است

گہے طارع اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پاے خود نہ بینم

فرمایا، ہمارا حال کوندنے والی بجلی کی مانند ہوتا ہے کہ ایک دم میں وہ آشکارا ہو جاتی ہوں اور دوسری گھڑی چھپ جاتی ہوں۔ کبھی تو ہم بلند ترین مقام پر براجمان ہوتے ہیں کہ ہم اپنے اردگرد دور دور کی چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں اور کبھی ہم کو اپنے پاؤں کے نیچے کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ یعنی جب خدا کی طرف سے علم بخشا جاتا ہے تو باخبر ہوتے ہیں، ورنہ کچھ علم نہیں رکھتے!

[۴] ﴿۱۹۵﴾

اس مکتوب گرامی پر تاریخ درج نہیں لیکن یہ یقینی طور پر رانچی میں نظر بندی کے آخری دور کا خط ہے۔ اغلب ہے ۱۹۱۹ء کا ہو۔

حبیبی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی جس تحریر میں قرآن حکیم کی نسبت سوالات تھے اس کا مفصّل جواب بھیجا گیا تھا، جس کے بعد بالکل خاموشی رہی۔ مولوی سلطان صاحب [۱] نے دریافت حال کے لیے خط لکھا مگر جواب نہیں آیا۔ تعجب ہے کہ آپ اس بارے میں میرے بیان پر مطمئن نہیں [۲]۔

آپ نے میرے تغافل کی شکایت کی ہے۔ تغافل کا تو اقرار نہیں کر سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ جب کبھی میں نے آپ کے اور اپنے معاملے پر غور کیا ہے، یقین کیجیے کہ ہمیشہ خود میرے قلب نے مجھے ملامت کی ہے۔ آپ کی محبتوں کا میری جانب سے عشرِ عشیر بھی حق ادا نہ ہوا۔ میں خود اس کا معترف ہوں اور متمنی ہوں کہ کاش بقیہ زندگی میں کچھ تلافی کر سکوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ محبّت کی کوتاہیاں حد تلافی و مکافات سے مافوق ہیں۔ ہر کوتاہی کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن محبّت کی کوتاہی کی تلافی ممکن نہیں۔ مجھ سے علاقہ رکھنے والوں میں صرف ایک شخص ہے جس نے غالباً آپ سے بھی زیادہ مصائب برداشت کیے [۳]۔ باقی اور سبھوں سے زیادہ آپ کے لیے اپنے اندر اندوہ و غم پاتا ہوں اور دائمی اضطراب رکھتا ہوں۔

الی اللہ اشکو، ان فی النفس حاجۃ
تمر بہا الایّام وھی کماھیا

خط کی پشت پر تحریر جواب کو بھی آپ نے من جملہ شواہد تغافل کے قرار دیا حالانکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس وقت سوءِ اتفاق سے کاغذ موجود نہ تھا [۴]۔ آیندہ اس سے احتراز کروں گا۔

نصابِ تعلیم کے متعلق چند امور ہیں:

ایک نقشۂ نصاب بھیجتا ہوں۔ دو سال ہوئے ڈائریکٹر بنگال نے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی از سرِ نو تحریک کی اور مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کو ایک مسودہ تیار کرنے کے لیے کہا۔ چناں چہ ایک سب کمیٹی بنائی گئی اور میرے پاس بھی کاغذات پہنچے۔ نظر بندی کی وجہ سے کمیٹی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے تحریر و مراسلت پر اکتفا کیا اور ایک جدید نقشہ نصاب مرتب کر کے بھیج دیا۔ یہ اسی نصاب کے درجۂ ثانیہ کی نقل ہے۔ اس کے ساتھ تشریحات کے نوٹس تھے جو دو سو صفحے تک پہنچ گئے، لیکن ان کی نقل میرے پاس نہیں۔ ان سے کتبِ مجوزہ کے وجوہِ ترجیح اور وجوہِ انتخاب و تقسیمِ علوم و ربطِ کتب وغیرہ مہمات واضح ہوتے [۵]۔

۲۔ اس نصابِ تعلیم کی کل مدت سولہ سال ہے، جس میں مکتب کلاس کے تین سال بھی شامل ہیں۔ ان کو خارج کر دیا جائے تو تیرہ سال باقی رہ جاتے ہیں جو بی اے کی مدتِ تعلیم و تکمیل کے مقابلے میں کسی طرح گراں نہیں۔ تعلیم دو ٹکڑوں میں منقسم ہے: جونیر کلاس اور سینیر [کلاس]۔ جونیر کی مدت آٹھ سال ہے جس میں مکتب کی ابتدائی تعلیم بھی داخل ہے۔ عام طور پر یونیورسٹیوں نے مکتب کی تعلیم کے لیے تین سال رکھے ہیں ہم نے صرف دو سال رکھے اور مدرسۂ رانچی [۶] کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ پوری طرح کافی ہیں۔ یونیورسٹی کے جدید قواعد کی رو سے سولہ سال کی عمر سے پہلے میٹریکولیشن کا امتحان دیا نہیں جا سکتا۔ اگر بچے نے پانچ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی تو اس درجے کی تعلیم سے تیرہ سال کی عمر میں فارغ ہوسکتا ہے۔ دو سال درمیان میں ناکافی وغیرہ کے رکھ لیے جائیں اور پانچ کی جگہ آغازِ تعلیم کو چھ میں مان لیجیے۔ جب بھی سولہ سال کی عمر میں اس سے فارغ ہو جائے گا۔

۳۔ جونیر کلاس کے آٹھ سال میں پانچویں سال سے انگریزی زبان دانی شروع

ہو جاتی ہے اور حساب، جغرافیۂ عام، جغرافیۂ ہند، تاریخِ ہند، تاریخِ اسلام، مبادیاتِ سائنس اس کے برابر اور بعض حالتوں میں اس سے زیادہ ہے، جس قدر سرکاری مڈل انگلش کورس میں ہوتا ہے۔ گویا انگریزی، حساب، تاریخ وغیرہ کی جس قدر استعداد مڈل پاس کو ہوتی ہے اس سے زیادہ اس جونیر کلاس کے تعلیم یافتہ کو ہوگی۔ مزید برآں عربی صرف ونحو بالکل ختم، مبادیاتِ ادب شروع، کامل ترجمۃ القرآن، بقدر ضرورت تجوید وقراءۃ، عقاید کا ایک متن حفظ، تاریخ اسلام مجمل، سیرۃ نبویؐ فارسی کامل، منطق کی پہلی کتاب اردو شرح تہذیب سے زیادہ تک کی۔ فقہ میں ایک مختصر [رسالہ] اسرار الدین میں منتخب احیاء وما یناسب ذلک۔

ایک بنیادی پہلو:

۴۔ موجودہ حالت میں کوئی سلسلۂ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک اس میں سرکاری یونیورسٹیوں کے پیوند کی بھی گنجایش نہ رکھی جائے۔ ایک بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ جونیر کلاس کے بعد اگر کوئی چاہے تو بلا ایک سال بھی ضائع کیے ہائی اسکول کی پانچویں کلاس میں مڈل پاس کی طرح داخل ہوسکتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو قصداً پہلے مڈل انگلش کی تعلیم دلا کر ہائی اسکول میں داخل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اردو اور حساب دانی زیادہ پختہ اور امتحانات میں معین ہوتی ہے۔ ہم نے بھی اتنی ہی مدت رکھی ہے۔ پس اس کے بعد بھی یہ ممکن ہے اور مزید برآں یہ کہ عربیت و اسلامیت اور فارسیت اس کی تمام عمر کو سنوار دے گی۔ اگر جونیر کلاس کے بعد مجوزہ نصاب کے سینیر درجے کی تعلیم حاصل نہیں کی گئی اور صرف انگریزی ہی کو اختیار کرلیا گیا، جب بھی اس سے ایک عربی دان اور دین سے باخبر گریجویٹ پیدا ہوسکتا ہے۔

۵۔ سینیر کلاس یعنی جماعت ثانیہ صرف علوم کی جماعت ہے۔ مبادیات اور علوم آلیہ سب جماعت اولیٰ میں ختم کردیے گئے ہیں۔ اس کے چھ سال ہیں اور چار ابتدائی

سالوں میں انگریزی کا سلسلہ جاری رہے گا، بقیہ دو سالوں میں انگریزی نہیں۔ انگریزی کے متعلق یہ اصل ملحوظ رہے کہ ایک انٹرنس پاس کی زبان دانی تک کی استعداد لازمی طور پر حاصل ہو جائے جس کو مزید انگریزی کا شوق ہو وہ جماعت ثانیہ کے چھ سال ختم کر کے درجۂ تکمیل [ایم اے] میں انگریزی علم وادب کا مضمون لے سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کر لے سکتا ہے۔

نئی کتابوں کی ضرورت:

۶۔ کوئی جدید نصاب تعلیم صرف موجودہ کتب کے رد و بدل و اقتباس و انتخاب سے مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک بعض کتابیں از سرِ نو نہ لکھی جائیں۔ علی الخصوص ابتدائی تعلیم میں سلسلۂ دینیات، ترجمۃ القرآن، مبادیِ طبیعات، منتخباتِ ادبِ فارسی، سیرت نبویؐ، منطق کی تصنیف ناگزیر ہے۔ منطق کی پہلی کتاب قطعاً اردو میں یا فارسی میں ہونی چاہیے اور بہ اسلوب جدید نہ کہ بہ طرزِ متون وشروحِ قدیمہ، اس لیے متعدد چیزیں زیرِ تالیف ہیں۔ نیز منطق استقرائی۔

۷۔ معہذا چوں کہ مقصود و مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور اس کے بعد عامۂ مدارس تھے اور مزاجِ وقت اصلاحِ کامل کا متحمل نہیں اور رعایت مصالح ناگزیر، اس لیے بعض چیزوں میں تنزلات گوارا کر لیے گئے اور بعض چیزوں کو بحالہ چھوڑ دینا پڑا۔ مثلاً متون فقہ متداول اور عقاید واصول میں مصنفات تفتازانی۔ درسیاتِ اسلامیہ کے تنزل کا ایک بڑا سبب علامہ تفتازانی کے نصاب کا رواج وقبول ہے مگر یکایک انقلاب کامل کی کامیابی مشکل ہے۔ یہ ساری باتیں نوٹس سے معلوم ہوتیں، افسوس کہ وہ ڈائریکٹر بنگال کے پاس ہیں۔

مجتہدانہ نظر کا فقدان:

۸۔ ایک بڑی دقت جس کی وجہ سے بعض بہترین کتب قدما کو چھوڑ دینا پڑا۔ یہ

پیش آئی کہ ہمارے علماء صدیوں سے اس کے عادی چلے آتے ہیں کہ درسیات کو ان کے شروح وحواشی وتعلیقات وغیرہ کی مدد سے پڑھیں پڑھائیں۔ مجتہدانہ نظر و درس مفقود۔ اب اگر یکا یک تمام کتابیں ایسی رکھ دی جائیں جن کے شروح وحل غرائب و لغات وغیرہ موجود نہیں اور ان کا حل وفہم صرف معلّم کے مجتہدانہ نظر و مطالعہ کا محتاج، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کو پڑھانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ سب سے زیادہ دقّت ادب اور فقہ میں ہوئی۔ ناچار حتی الوسع ایسی ہی کتابیں رکھیں گئیں جن کے شروح کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ بلاغت ومعانی وبیان میں سینٹ جوزف کالج بیروت کی کتابیں اسی لیے اختیار کیں کہ ان کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں اور چھپی ہوئی ملتی ہیں، ورنہ بعض اور بہتر کتابیں قدما کی نکل آئی ہیں۔ انشاوکتابت میں ابن مقفّع وغیرہ کو اسی سہولت کی بنا پر اختیار کیا، ورنہ جاحظ، ابن درید وغیرہ ائمہ عربیت کے مقالات موجود ہیں اور وہ مستحق ترجیح تھے۔ بااین ہمہ ادب کا نصاب اس درجے مکمّل واصلح ہوگیا ہے کہ اس کے محاسن کا اندازہ تمام زیرِ درس کتب کے مطالعے اور ذوق سلیم وفکر مستقیم کی معاونت ہی سے ہوسکتا ہے۔ مختصر ومطول اور حریری ومتنبّی کی پرستش کرنے والے اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔

۹۔ لیکن آپ کو سردست جو صورت درپیش ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ آپ کو ایک کامل درس گاہ نہیں قایم کرنی ہے اور نہ اس کی ضرورت! مبادیات وآلات سے قطع نظر کر کے اعلیٰ علوم کی چند ضروری کلاسیں جاری کرنی ہیں اور بس! سرکاری یونیورسٹیوں کے قرار داد نظام وتقسیم اوقات وغیرہ غیر ضروری پابندیوں کی رعایت بھی ضروری نہیں جس کی وجہ سے مجوزہ نصاب میں بڑی دقتیں پیش آئی تھیں۔ پس یہ نقشۂ نصاب اس لیے نہیں بھیجتا کہ بجنسہٖ اس کو اختیار کیا جائے [۷]۔ مقصود یہ ہے کہ ضروری علوم و مضامین اور کتب منتخبۂ درسیہ کے متعلق کسی قدر مدد اس سے مل جائے گی اور کتابوں کے تقرر میں اس کا پیش نظر رہنا باعث سہولت ہوگا۔

دینیات اور عربیت:

۱۰۔ آپ کے لیے دو نصابِ تعلیم مطلوب ہیں، گریجویٹس کی تعلیم دینیات کے لیے اور متوسطین عربیت کی مزید تعلیم کے لیے۔ دونوں کے حالات و مقتضیات مختلف اور اس کی رعایت ضروری۔ آپ کے پیش نظر ''تکمیل'' نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ اس کے لیے زیادہ زمانہ مطلوب اور بالفعل ہمتیں عموماً مقصر۔ مجوزہ نصاب مقصد تکمیل و رسوخ علوم اسلامیہ کو پیش نظر رکھ کر تجویز کیا گیا ہے، یعنی علماے کاملین و راسخین پیدا کیے جائیں۔ مگر آپ کا مقصد بالفعل بجاے تکمیل محض تعلیم ہونا چاہیے، یعنی موجودہ حالت جہل بالدین کے مقابلے میں جس قدر بھی زیادہ اور بہتر تعلیم قرآن و سنت دی جا سکے، دے دی جائے، گو درجہ کمال تک نہ ہو مگر موجودہ طبقے کے گریجویٹ اور مولوی سے بہتر داصلح مسلمان گریجویٹ اور محقق پیدا کیے جائیں۔ یاد رکھیے کہ یہ بات سب سے زیادہ مقدم اور اولین بحث و فکر کی ہے۔ ہر سفر کی کامیابی کے لیے تقرر بدایت و نہایت لابد منہ و لازم و الزم ہے۔ جب تک سب سے پہلے اپنی منزل مقصود و متعین نہ کیجیے گا۔ نصاب و نظام تعلیم کی تجویز و بحث بے کار ہوگی۔ بہت سی عمدہ تجویزیں بلکہ عملی اقدام اس نکتے کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ضایع گئے۔ آپ سب سے پہلے اس کو صاف کر لیجیے کہ کیسی تعلیم مقصود ہے؟ یعنی موجودہ مراتب معلومہ تعلیم کے مقابلے میں کونسا مزید مرتبہ و درجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور مصالح و اسباب کے لحاظ سے کہاں تک بلندی نہ اسبقیت ممکن ہے؟

کاملین و متوسطین:

آیا مقصود علماے کاملین کا پیدا کرنا ہے یا اصحاب علم متوسطین کا؟ کامل و پختہ متعلم پیدا کرنا چاہتے ہیں یا کامل و راسخ معلّم؟ قرآن حکیم نے اصحابِ درایت و علم کی یہی دو قسمیں کی ہیں۔ متعلّم و معلّم اور یہی قدرتی تقسیم ہے۔ حفاظ علم ان دو جماعتوں سے باہر

نہیں اور ان کے آداب و وظایف مختلف۔ تکوین امت صالحہ کے لیے یہ دونوں گروہ صحت وکمال کے ساتھ پیدا ہونے چاہئیں۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ دونوں کارخانے درہم برہم ہو گئے، نہ کامل وصالح متعلّم ہیں، نہ کامل وصالح معلّم۔

صنفِ متعلّمین سے مقصود محض طلبۂ علم نہیں بلکہ اہل علم کا ایسا گروہ ہے جو باعتبار معلومات ایک اچھے سے اچھا درجہ علم وفکر کا رکھتا ہو اور ناقصین وغافلین اور اپنے سے تمام نچلے درجوں اور عامۂ امت کے لیے بہ نسبت اضافی معلّم ہونے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ تاہم اس کا اصل منصب ''علم کے جاننے والے'' کا ہو، بتلانے والے اور ''سکھلانے والے'' اور راہ کھولنے والے کا نہ ہو۔

معلّمین سے مقصود وہ سب سے اونچی اور آخری جماعت شہدا ومقوّمینِ حق و اصحابِ عزیمت علم وسابقون بالخیرات فی العلم کی ہے جو صرف عمدہ وصحیح وکافی طور پر جان لینے اور سمجھ لینے ہی پر قانع نہ ہو گئی بلکہ چند قدم آگے بڑھے اور وہ منصب ومقام نفوذ ورسوخ وسریان امر وسلطان کار کا حاصل کیا، جس کے بعد وہ بتلانے والی سکھلانے والی، طیار کرنے والی اور بنا دینے والی جماعت بن گئی۔ و ذلك من عمل النبوة!

قرآن حکیم نے انسانوں کو تین گروہوں میں منقسم کیا ہے۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ، وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ، وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ اور بحکم ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ! یہی تین گروہ ورثائے کتاب اللہ ہوئے[۸]۔ یہ تقسیم عام ہے نہ کہ محدود وخاص۔ ہر وادی اور ہر میدان میں۔ پس علم کے میدان میں بھی ''ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ'' ہیں اور درمیانی درجے والے ''مقتصد'' اور آخری درجے والے ''سابقون بالخیرات''۔ آپ پہلے طے کر لیجیے کہ کن لوگوں کو پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ ایسے لوگوں کو جو میدانِ علم میں درجۂ اقتصاد رکھتے ہیں یا ایسے لوگوں کو جو درجہ اسبقیت بالخیرات پر فائز ہوں؟

مصلحین کی ناکامی کے اسباب:

آج تک مصلحین نظامِ تعلیم نے جس قدر بھی کوششیں کیں، ناکام رہیں اس کے اسباب متعدد ہیں، لیکن ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مراتب و مدارج علمیہ و تعلیمیہ کے متعلق یہ اصول ان کے پیش نظر نہ تھے اور کوئی صحیح و اساسی تقسیم اپنے سامنے نہیں رکھتے تھے، حال آں کہ تعلیم امت بغیر اس کے ممکن نہیں۔ نہ تمام طالبین علم درجۂ اسبقیت حاصل کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں اور نہ کرانے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ یہ کافی ہوسکتا ہے کہ مجرد درجۂ اقتصاد پر قناعت کر لی جائے۔ پھر کتاب و سنت اور منہاج صحابہؓ کو پیش نظر رکھ کر وہ اصول و اساسات کار معلوم کرنے چاہییں، جن کے بعد ہم معلوم کر لیں کہ اصحابِ اقتصاد کو کیا اور کتنا ہونا چاہیے؟ اور اصحابِ سبقت بالخیرات میں کن کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟ اس کے متعلق بھی کوئی اسلامی و قرآنی روشنی لوگوں کے سامنے نہ تھی۔ محض قیاس ورائے کی ظلمت میں سرگردانی اور حیرانیاں تھیں۔ کسی نے مفاسدِ نصاب تعلیم کی ایک فرع کو محسوس کیا، کسی نے دوسری کو، کسی نے تیسری کو۔ پھر صرف اسی فرع کو بطور اصل کے کام میں لائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ **ظلمات بعضها فوق بعض** سے دوچار ہوئے اور چوں کہ اصلِ مفاسد ہاتھ نہ آئی، اس سے اصلِ اصلاح کی راہ بھی نہ کھل سکی۔

یہ ساری بحثیں نوٹس میں لکھ چکا ہوں مشرح، اور اب چاہتا ہوں کہ صرف مسئلۂ تعلیم اسلامیہ کی تاریخ و تنزل وطرقِ اصلاح و نصاب ہائے تعلیم جماعاتِ مختلفہ پر ایک مستقل کتاب لکھوں۔ شاید آج کل میں شروع کر دی جائے۔ یہ چیز سب سے پہلے لکھنی تھی، افسوس کہ اب لکھتا ہوں۔

اسبقیت و اقتصاد:

بہ ہر حال میری رائے نظر بر حالات معلومہ یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر درجۂ اقتصاد

فی العلم ہو، نہ کہ اسبقیت فی العلم۔ آپ متعلمین کاملین پیدا کیجیے، اسی کی ضرورت ہے نہ کہ معلمین کاملین۔ اس کو دوسرے وقتوں کے لیے اٹھا رکھیے۔ معلمین جبھی تیار ہوں گے، جب متعلمین کاملین بہ کثرت پیدا ہو جائیں۔ معہذا آپ کے پیشِ نظر اسباب و حالات سے پوری طرح واقف نہیں۔ اگر معلمین کاملین کے لیے گنجایش ہو تو مانع ہونے کی کوئی وجہ نہیں، وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ [۹] اور وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى [۱۰] کا معاملہ ہے۔ وللناس فيما يعشقون مذاهب!

اصحاب اقتصاد گریجویٹس اور عربی خواں دونوں میں سے بآسانی و بہ زمانۂ اقل پیدا کیے جا سکتے ہیں لیکن دونوں کا نصاب الگ الگ ہوگا، ایک نہیں ہو سکتا۔

ضروری سوالات:

آپ یوں کیجیے کہ حسب ذیل سوالات کا پہلے مفصّل جواب دیجیے اس کے بعد میں اس بارے میں مفصّل لکھوں گا اور مکمّل نقشہ ہائے نصاب و مباحث متعلق نظام تعلیم لکھ کر بھیج دوں گا:

۱۔ آپ نے لکھا ہے کہ وظایف دیے جائیں گے۔ اصولاً میں اس کا مخالف ہوں۔ صرف قیام واکل وشرب کا انتظام ہونا چاہیے۔ وظایف لے کر جو پڑھیں گے، ان سے کچھ امید نہیں۔ بایں ہمہ اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ آپ بتلائیے کہ سردست کتنے وظایف کا انتظام کریں گے؟

۲۔ آپ کا وعدۂ عطیّہ وظایف کتنے عرصے تک کے لیے ہوگا؟ دو سال یا تین یا چار؟

۳۔ انگریزی خوانوں کے لیے یہ شرط ہوگی کہ گریجویٹ ہوں؟

۴۔ عربی خوانوں میں کون اور زیادہ تر کہاں کے تعلیم یافتہ ہوں گے؟ مدارس شمال وغیرہ کے یا اورینٹل کالج لاہور کے؟

۵۔ عربی خوانوں کے لیے انگریزی کا بھی انتظام کر سکیں گے؟

۶۔ سرِ دست تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ کتنے اور کون کون آدمی مہیّا ہیں؟ آپ نے چند کا نام لکھا، مگر وہ کافی نہیں، بالتفصیل لکھیے اور یہ نہ لکھیے کہ مل جائیں گے۔ ابھی کس قدر اور کون کون موجود ہیں؟

۷۔ علمِ اسرار و مصالح و فقہ شریعت، فقہ جامع، تاریخِ اسلام و علوم و ملل والنحل، اصولِ فقہ جامع، اگر رکھے جائیں تو ان کی تعلیم کے لیے اشخاص ذہن میں ہیں یا نہیں؟

معاملہ مناظرہ:

۸۔ آپ نے غالباً مضامین تعلیم میں مناظرے کو بھی رکھا ہے۔ یہ مسئلہ بہت تشریح طلب ہے۔ یا تو اس سے غفلت تھی یا اب بے اعتدالی کا یہ حال ہے کہ لوگوں نے مناظرہ کو بھی مسلمانوں کے لیے ایک علمی و دینی فتنہ بنا دیا ہے اور سخت جہل و بے اصولی و بے قاعدگی طاری ہے۔ مناظرے سے اگر مقصود جدل ہو تو وہ تو خود اشد شدید بدعت وضلالت اور من جملہ مہلکات و موبقات کے ہے۔ ماضل قوم بعد هدی کانوا علیه الا اوتوا الجدل اور فرمایا: مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ [۱۱] اس سے مقصود محض مسلمانوں کا باہمی جدل و تعمق فی الدین ہی نہیں بلکہ ہر وہ جدل جو دین کے بارے میں ہو۔ شاہد اس پر قرآن ہے کہ: مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا. ظاہر ہے کہ یہ قوم مسلمان نہ تھی، مقصود غیر مسلمان ہی ہیں اور اگر مقصود وہ چیز ہے جو من جملہ طرق ثلاثہ دعوت و تبلیغ کے ہے اور جس کی نسبت فرمایا: بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ [۱۲] یعنی جدل احسن، تو بلاشبہ یہ نہ صرف مستحسن بلکہ من جملہ مامورات و مطلوبات کے ہے اور قرآن ناطق ہے کہ ہمیشہ تین گروہ انسانوں کے، مبلّغین و داعیان ہدایت کو ملیں گے۔ ایک گروہ کے لیے حکمت کا طریق اختیار کرنا چاہیے، ایک کے لیے موعظۂ حسنہ کا اور ایک کے لیے جدل بہ طریقہ احسن کا اور داعی صادق وہ ہے جس کے پاس ہر جماعت کی غذا موجود ہو۔

مخاطبین حکمت کے لیے غذائے حکمت، مخاطبین موعظت کے لیے موعظت اور مستحقین جدل کے لیے جدل، لیکن بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَن. اگر حکمت کے مستحقوں کے لیے صرف موعظت پر قناعت کرلی جائے گی یا مستحقین جدل کو حکمت وموعظت کی غذا دی جائے گی تو وہ یا تو ہضم نہ ہوگی یا نقصان پہنچائے گی اور معہذا داعی کو ہادی ہونا چاہیے نہ کہ مناظر ومخاصم! اور نمونہ اس کا حجۃ ابراہیمی اور مکالمۂ خلیل و مدعی الوہیت سے واضح۔[۱۳] پس اگر فنِ مناظرہ سے مقصود یہ ہو تو بلاشبہ یہ ضروری ہے، لیکن اول تو قرآن وسنت کی صالح وکامل تعلیم خود اس راہ کو کھول دیتی ہے۔ صرف فروعات و محدثات وقت وزمان کا معاملہ باقی رہ جاتا ہے اور اگر اس کو ایک مستقل مضمون تعلیم بنانا بھی ہے تو اس کا طریقہ دوسرا ہونا چاہیے اور یہ کام جس طریق پر ہو رہا ہے میں اس کو قرآن وسنت کے خلاف سمجھتا ہوں اور اس کا زیادہ حصّہ طریق بدعت پر مشتمل پاتا ہوں۔ لفظ بدعت وسیع ہے۔ مخالفین اسلام سے مناظرہ کرنے میں ہم کو کامیابی نہیں مل سکتی، جب تک اس کے اصول وآداب وطرق واساسات محض قرآن وسنت سے ماخوذ نہ ہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر کام اور ہر وادی میں اصل کار یعنی منہاج نبوۃ سے بُعد ہوگیا ہے۔ بہ ہر حال اس بارے میں اپنا مطمحِ نظر صاف صاف لکھیے۔

۹۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ علوم کی تعلیم کے لیے اصلی اور صحیح طریقہ املا کا تھا اور اب سارا دارومدار کتب پر ہے۔ اس کے لیے کچھ لوگ پیش نظر ہیں؟ اگر ہیں تو کون کون؟

اپنے والد بزرگوار[۱۴] اور مسٹر محمد علی[۱۵] کو میرا اسلام شوق پہنچا دیجیے۔

رولٹ بل اور گاندھی جی:

مسٹر گاندھی کی تحریک رولٹ بل کے متعلق صحیح ہے[۱۶] اور اس میں حصّہ لینا چاہیے، مگر تقسیم عمل کے بغیر چارہ نہیں۔ پس خود آپ کو اور آپ کے عزیزوں کو اب اپنا

تمام وقت اسی کام میں یعنی تعلیم میں بلا التفات یمین و یسار خرچ کرنا چاہیے اور اسی کا ہو رہنا چاہیے۔ ایک وقت و زندگی میں تمام خیرات پر احاطہ نہیں ہو سکتا۔ بعض بعض کے لیے اور ہر جماعت اپنے اپنے دایرۂ عمل کے لیے۔ آپ صرف اپنے کام میں لگے رہیے اور جو سفر شروع کیا ہے، پہلے اس کا سامان کر لیجیے۔ اب آپ کا مطمحِ نظر احیاے تعلیم ہونا چاہیے۔ البتہ یہ دوسری جماعتوں کا فرض ہے کہ اپنا فرض ادا کریں۔ مسٹر گاندھی کی نسبت تو نہیں مگر دستخط کرنے والوں کی طرف سے ابداً مطمئن نہیں ہوں کہ عمل کو قول کے مطابق کر دکھائیں گے۔ آخر مسٹر شرما نے استعفیٰ واپس لے لیا اور یہی حال اوروں کا بھی ہوگا۔ مسٹر مدن موہن مالویہ بھی دستخط کرنے والوں میں ہیں، لیکن اب تک کونسل میں نظر آ رہے ہیں۔ کم از کم اگر بیس ممبر بھی مستعفی ہو جاتے مقادمت مجہول نہ کرتے تو چوبیس گھنٹے کے اندر انڈیا آفس ہل جاتا اور قطعاً مداخلت کرتا۔ بہر حال دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ والعاقبة للمتقين.

خدارا اب میرے خطوں کو ضایع نہ کیجیے گا۔ [۱۷]

حواشی:

[۱] یعنی مولوی سلطان محمد مرحوم جو مشہور قومی کارکن تھے اور نوٹ بنانے کے سلسلے میں انھیں سزا بھی ہوئی تھی حال آں کہ وہ خود نوٹ نہیں بناتے تھے۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ مولوی محی الدین احمد نے لکھا تھا مولوی سلطان محمد صاحب نے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا۔ مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ غالباً مکتوب الیہ کے نزدیک قابلِ اطمینان نہ تھا۔ دوبارہ پوچھا گیا تو مولانا نے فرمایا جو کچھ لکھ چکا ہوں وہی درست ہے اور اس پر غیر مطمئن ہونا موجبِ حیرت ہے۔

[۳] معلوم نہ ہو سکا یہ کون صاحب تھے۔

[۴] معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محی الدین احمد نے کوئی استفسار کیا تھا۔ اس وقت مولاناؒ کے پاس کاغذ نہ تھا لہٰذا مولوی صاحب موصوف کے خط کی پشت ہی پر جواب لکھ دیا۔ مولوی صاحب نے اسے شولہِ تغافل میں شامل کر لیا۔

[۵] خود مولاناؒ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ دو سو صفحے کے یہ نوٹس ڈایریکٹر تعلیمات بنگال کے پاس بھیج دیے گئے تھے، کاش کوئی صاحب اس دفتر کے پرانے ریکارڈوں سے یہ بیش بہا تحریر نکال لیں۔ یہ ۱۹۱۸ء کی تحریر ہونی چاہیے۔

[۶] مولانا کلکتہ سے جلاوطن ہو کر ۱۹۱۶ء میں رانچی پہنچے تھے تو وہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے رانچی میں ایک درس گاہ قایم کر دی تھی، یہاں اسی کا ذکر ہے۔

[۷] یہ نقشہ مولوی محی الدین صاحب کے پاس نہ رہا۔ مختلف اوقات میں تلاشیوں کے خوف کے باعث کاغذات ادھر ادھر کرنے پڑے، اس افراتفری میں بہت سی قیمتی چیزیں گم ہو گئیں۔ انھیں میں یہ نقشہ نصاب بھی گیا اور بعض نہایت قیمتی خط بھی تلف ہو گئے۔

[۸] ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ. (۳۲:۳۵)

[پھر ہم نے وارث کیے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے۔ پھر کوئی ان میں سے برا کرتا ہے اپنی جان کا اور کوئی ان میں سے ہے بیچ کی چال پر اور کوئی ان میں سے آگے بڑھ گیا ہے، لے کر خوبیاں اللہ کے حکم سے۔ یہی ہے بڑی بندگی۔

[۹] سورۂ بقرہ۔ یہ تحویل قبلہ کے سلسلے کی ایک آیت ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر امت کے لیے قبلہ مقرر رہا۔ مقصود حقیقی نیکیوں میں سبقت و پیش قدمی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح تعلیم کے سلسلے میں بھی جو کچھ ممکن ہو، اس میں دریغ نہ کیا جائے۔

[۱۰] سورۂ حدید کی آیت کا ٹکڑا ہے۔ آیت کا مضمون یہ ہے کہ ''جن بندگانِ حق نے فتح مکّہ سے پیشتر خدا کی راہ میں مال خرچ کیا، نیز جہاد میں شریک رہے، ان کا درجہ بعد کے مجاہدوں اور مال خرچ کرنے والوں سے بڑا ہے۔ ویسے اللہ کی راہ میں جہاد اور انفاق مال بہ ہر حال اچھے ہیں''۔ ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہے کہ ''فتح مکّہ سے پہلے یا پیچھے خدا کی راہ میں جن لوگوں نے جو انفاق و جہاد کی خدمت انجام دی'' ''ان سب کے ساتھ وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا''۔

[۱۱] سورۂ زخرف [یہ مثال جو ڈالتے ہیں تجھ پر سو جھگڑنے کو بلکہ یہ لوگ ہیں جھگڑالو، اس سے پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر آتا تو مشرکین عرب خوب شور مچاتے اور کہتے ہمارے معبود بہتر ہیں یا مسیح، جن کی پرستش عیسائی کرتے تھے۔ اس کے بعد مندرجہ بالا ٹکڑا آیا۔

[۱۲] اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. سورۂ نحل: [اے پیغمبر! اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ، اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقے پر پند و نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو وہ بھی ایسے طریقے پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ ہو۔ احسن طریق کا مطلب یہ ہے کہ مقصود طلب حق ہو اپنی بات کی پیچ نہ ہو۔ مخالف کے اندر یقین پیدا کرنا ہو، اسے باتوں سے ہرانا نہ ہو۔ اگر وہ چپ ہو گیا اور دل کا کانٹا نہ نکلا تو بحث سے کیا فایدہ ہوا؟۔

[۱۳] اشارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بادشاہ وقت کے اس مکالمے کی طرف ہے، جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۸ میں آیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا: خدا وہ ہے جو مخلوقات کو جلاتا اور مارتا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں بھی جلانے اور مارنے کی قدرت رکھتا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا: اچھا خدا تو پورب سے سورج نکالتا ہے تو پچھم سے نکال دے۔ اس پر بادشاہ ہکا بکا رہ گیا۔ مطلب یہ کہ دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی ہے نہ کہ جدل و خصومت کی۔ داعی حق مخاطب کو دلیلوں کے

الجھاؤ میں نہیں پھنساتا بلکہ سچائی کو اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی داعی حق اور مناظر و مخاصم کی ذہنیتوں میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔

[۱۴] مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم و مغفور۔

[۱۵] مولوی محمد علی مرحوم جو محی الدین احمد صاحب کے بھائی تھے۔

[۱۶] حکومت نے رولٹ بل بہ ظاہر انقلابی تحریکوں کو دبانے کے لیے بنایا تھا، مگر مقصود یہ تھا کہ قومی تحریکات کو دبایا جائے۔ اس پر گاندھی جی نے مخالفت کی تحریک جاری کی تھی۔ مرکزی قانون سازی مجلس کے ممبروں نے بھی مخالفت میں حصہ لینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ان میں عمل و استقامت کی ہمت نظر نہ آتی تھی۔ پھر یہ تحریک پھیلی تو پاک و ہند کی پہلی تحریک بنی جسے صحیح معنی میں عوامی کہا جا سکتا ہے۔ وہیں سے انگریزی حکومت کے خلاف منظم عوامی سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا۔

[۱۷] مولانا نے اپنے خطوں کو محفوظ رکھوانے کا کبھی خیال نہیں فرمایا۔ میں نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ کانگریس سے آپ کی وابستگی کی علت آج تک سمجھ میں نہ آئی تو فرمایا کہ معلوم نہیں آپ میرے خطوں کو محفوظ رکھتے ہو یا نہیں۔ اسے ضرور محفوظ رکھنا، اس لیے کہ علت بہت جلد آشکارا ہو جائے گی۔ یہاں مولوی محی الدین احمد صاحب کو تاکید کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ایک مرتبہ مولوی صاحب موصوف نے سورۂ ملک کے متعلق استفسارات کیے تھے۔ ان کے جواب میں تیس صفحے لکھ دیے جو سورۂ ملک کی تفسیر پر مشتمل تھے۔ یکایک تلاشی کی نوبت آئی تو وہ خط اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا اور ضایع ہو گیا۔ اس واقعے کا ذکر دیباچے میں آ چکا ہے۔ مولاناؒ نے اسے واپس منگوایا تو اطلاع دی گئی کہ محفوظ نہیں۔ چونکہ یہ خط بھی اہم مطالب پر مشتمل تھا اس لیے فرمایا کہ ایسے خطوط ضایع نہ ہونے چاہییں۔ (اس خط کے تمام حواشی مولانا مہر مرحوم کے قلم سے ہیں)۔

[۳] ﴿۱۹۶﴾

باسمہٖ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

وفقنا اللہ وایاکم کما یحبہ ویرضاہ فی القول والعمل والاعتقاد

ا۔ مصلحتِ وقت کے متعلق آپ کا خیال صحیح ہے، مگر آپ کا یہ جملہ صحیح نہیں کہ اسلام میں مصلحتِ وقت کوئی چیز نہیں، حال آں کہ سنت اللہ مصلحت و رعایتِ وقت کی مقتضی ہے۔ اسلام کیوں کر اصلاً اس سے تخلف کر سکتا ہے؟ میں آپ کو ایک اصول بتلائے

دیتا ہوں کہ ہر بات کی بنیاد کسی اصل و اساس پر ہونی چاہیے۔ عام غلطی یہ ہے کہ اصول سامنے نہیں، صرف متفرق جزئیات پیشِ نظر ہیں۔ جس رنگ و حال کا کوئی جزئیہ نظر آ گیا، اسی کو اصل سمجھ کر حکم لگا دیا۔ دنیا کے ہر فکر، ہر عمل اور ہر سعی کو دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمیشہ ایک چیز وہ ہوتی ہے، جس کو ''مقصد'' کہتے ہیں اور ایک چیز وہ، جو اس مقصد کو عمل میں لائے اور اس کے وسایل و ذرایع سے عبارت ہے۔ مثلاً مقصد یہ ہے کہ ایک ملک فتح کیا جائے۔ اب آپ فوج جمع کریں گے، روپیہ فراہم کریں گے، اس ملک کی حالت کو دیکھیں گے، پھر کوچ ہوگا، قدم قدم پر طرح طرح کے حالات سے سابقہ پڑے گا۔ نکلنے سے پہلے قصد کیا تھا کہ برسات سے پہلے دھاوا کر دیں گے مگر برسات کا موسم راہ ہی میں آ گیا، ندی نالے چڑھ گئے۔ اب رائے ہوئی کہ آیندہ سال وغیرہ وغیرہ تو یہ تمام چیزیں ''مقصد'' نہیں ہیں بلکہ وسایل و ذرایعِ حصولِ مقصد — مقصد نہیں بدل سکتا، نہ اس کو وقت بدل سکتا ہے اور نہ اور کوئی شے۔ البتہ ذرایع میں حسب حالت تبدیلی ضرور کرنی پڑتی ہے کہ سنت اللہ اس کی مقتضی ہے اور بغیر اس کے حصول فتح متعذر۔ آپ نے اگر اس ملک کی ایک راہ کو بند دیکھ کر دوسری راہ اختیار کی یا موسم مخالف دیکھ کر دریاؤں کے اترنے کا انتظار کیا تو اس تبدیلی کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مقصد میں تبدیلی ہوئی اور مقتضائے وقت اس کو بہا لے گیا، کیوں کہ مقصد تو برابر سامنے ہے اور غیر متغیر، البتہ وسایل میں ضروری تبدیلی ہو رہی ہے۔

احکامِ شریعت کی تقسیم:

کچھ ایسی ہی تقسیم شریعتِ الٰہیہ کے احکام میں بھی ہے۔ جس چیز کو یہاں مقصد کہا وہاں وہ اصل و اساس یا عقیدہ یا ارکان ثابتۂ ایمانیہ ہیں۔ ان میں کبھی کسی طرح کی نہ تو تبدیلی ہو سکتی ہے نہ التوا، نہ اخفاء، نہ تقیہ۔ امرت ان اقاتل الناس حتی .... [۱] الحدیث اور حَتی لَاتَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَ یَکُوْنَ الدِّیْنَ کُلُّهٗ لله.... الآیة [۲] مصلحتِ

وقت، مقتضاے وقت، ہجوم موانع، کثرتِ اعداء، وغیرہ وغیرہ یہاں صرف مہمل ہیں اور ابداً مسموع نہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی اس سرزمین میں ان وساوس کا قدم آیا تو شیطانی نفاق ہے، یجری مجری الدم اور کسی طرح روح اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا، لیکن جس طرح وہاں مقصد کے بعد وسایل و ذرایع حصول مقصد کا ایک دایرۃ ہے، اسی طرح یہاں بھی فروعات عمل و تبلیغ و مقدار تیزی و سستی و بلندی و پستی وغیرہ وغیرہ امور ہیں اور بلاشبہ مصلحتِ وقت کا قانون ان پر مؤثر ہے اور اس کی رعایت واجب ہے اور عین اسوۂ حسنہ انبیاے کرامؑ و سنن ثابتہ و عادت حق و سنت اللہ فی خلق اللہ پر مبنی۔ اس سے کسی طرح اعراض نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی مقصد کا اظہار ایک خاص اسلوب پر کرنا چاہیے کبھی آواز اتنی بلند ہونی چاہیے کہ در و دیوار گونج اٹھیں۔ کبھی اتنا ہی کافی ہے کہ پڑوسیوں نے سن لیا۔ کبھی بعض فروعات کو اصل مقصد کی راہ میں ملتوی کر دینا چاہیے۔ کبھی بمقتضاے وقت انھی پر زور دینا چاہیے۔ کبھی رفتار اس قدر تیز ہو کہ نہ ٹھوکروں کی پروا ہے، نہ ندی نالوں کی۔ کبھی اس قدر محتاط کہ ایک ایک پتھر کو دیکھ کر اور ایک ایک کانٹے سے بچ کر قدم اٹھایا جائے۔ کبھی ایسا کرنا چاہیے کہ دو جماعتیں ہیں ایک سے عارضی صلح کر لی تاکہ دوسری اشد جماعت کے مقابلے میں مدد لے کر اس کا انسداد حفظ مقصد کے لیے مقدم ہے اور کبھی ایسا ہونا چاہیے کہ سوائے جماعت حقہ کے کسی سے صلح نہیں اور ایک کے لیے سب سے دشمنی۔ ان امور کے لیے قرآن حکیم نے انبیاے کرام کے اعمال حقۂ اجتماعیہ کے نمونے پیش کیے ہیں اور خود ظہور اسلام و نزول قرآن کی ۲۳ سالہ زندگی پر ایک مکمّل دستور العمل ہے جس سے اس بارے میں بھی ہم کو کلیات و اصول ملتے ہیں۔ فرعون صرف اسی وقت گمراہ نہ تھا جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کو لے کر فاتحانہ مصر سے نکلے ہیں، بلکہ اوّل دن سے تھا، مگر حضرت موسیٰؑ نے اول روز ہی یہ مطالبہ نہیں کر دیا کہ اَنْ اَدُّوْا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ انی لکم رسول امین [۳] ایک وقت وہ تھا کہ قبطی کو مارا۔ پھر وہ وقت آیا کہ مدین میں تکمیلِ استعدادِ ظہور کا

انتظار کیا۔ پھر جب سینا کے دامن میں شعلۂ حق نے چمک کر تکمیلِ وقت و اعلانِ ظہور کی خوش خبری دی تو آخری وقت آیا اور جو کچھ سنت اللہ کے مطابق ہونا تھا ظہور میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل مکّہ میں کیا تھا؟ پھر ہجرت کے بعد کیا ہوا؟ پھر صلح حدیبیہ کیوں ہوئی؟ اور بالآخر فتح مکّہ کے دن کیا ہوا؟

بصیرتِ راسخہ کی ضرورت:

نزولِ احکام کی تدریج بلکہ خود نزولِ قرآن کی تدریج میں بھی منجملہ دیگر غوامض کے مصلحتِ صالحۂ وقت کو دخل ہے۔ پہلے نماز کی تعداد اور اوقات اور تھے، پھر بتدریج یہاں تک پہنچے۔ روزہ اور زکوٰۃ کا حکم پہلے ہی دن نہیں ہوا وغیر ذالک من الاشباہ والنظائر۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ مقام نازک ہے اور افراط وتفریط کے کانٹوں سے راہ پُر ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں کہ مصلحتِ حقیقی وشرعی کو سمجھے اور جزئیاتِ سوانح نبوت سے کلیات اخذ کرے۔ بڑی ہی محتاط نظر اور بصیرۃِ راسخہ کی ضرورت ہے۔ یہاں اکثر کج نظری اور ضلالتِ استدلال سے ٹھوکر لگتی ہے۔

رہا یہ امر کہ اس دایرے میں بھی مصلحت وقت کے حدود کیا ہیں؟ اور کہاں تک ہمارے عمل کو اس کے قانون سے متاثر ہونا چاہیے؟ تو اس کے لیے بھی قرآن وسنت کے نمونے پیش کر دیے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ مصلحتِ وقت کا قانون اپنی انتہائی حالتوں میں بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا کہ حفظ و اعلانِ مقصد کے ساتھ مقدار و طرزِ عمل کی سرعت و آہستگی یا تقدیم وتاخیر یا زیادہ سے زیادہ بعض حالتوں میں سکوت و التوابس۔ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں۔ اس سے قدم ایک انچ بھی بڑھا تو پھر حدودِ نفاق وکفر شروع ہو گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مصلحت کی بنا پر کسی حقیقت سے انکار کر دیا جائے یا مصلحتاً حق کی جگہ باطل کی دعوت دی جائے۔

یہ میں نے جتنی باتیں لکھی ہیں سب قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں، آپ کو خلاصہ لکھ دیا۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہیاں:

۲۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصَارٰی .... الآیۃ [۴] اس آیہ کریمہ کا جو مطلب آپ نے لکھا ہے اور شبہہ ظاہر کیا ہے، فی الحقیقت وہ مطلب نہیں ہے اور آپ کا شبہہ آپ کی صحت ذوق کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے آیت کا سیاق وسباق دیکھنا چاہیے، سورۂ بقرہ میں خدا تعالیٰ یہودیوں کی حالت بیان کر رہا ہے۔ ایک ایک کر کے ان کی گمراہیاں گنوائی ہیں اور شریعتِ حقہ سے انحراف کا الزام دیا ہے، یہاں تک کہ ترکِ شریعت و کتاب اللہ واستہلاک ضلالت و بطلان اپنے منتہا درجے میں کہ مغضوبیت وملعونیت ہے، پہنچ گئے اور جو قوم کتاب اللہ یعنی تورات کی برکتوں سے بلند ہوئی تھی، ترکِ تورات سے اسفل سافلین ہوگئی۔ چناں چہ فرمایا: وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. [۵] [یعتدون یعنی راہِ حق و شریعت اور صراط مستقیم سے بالکل نکل گئے] اس کے بعد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیْنَ ..... الآیۃ (۶۲:۲) یعنی جو حالت بیان کی گئی ہے یا یہودیوں کو مخاطب کر کے جو الزام دیے گئے، سو من حیث القوم اہل کتاب کا یہی حال ہوا اور اسی لیے وقت آ گیا کہ ہدایتِ حقہ آخری کا ظہور ہوتا ہم اقوام سابقہ میں جو نفوسِ طیّبہ راہِ حق پر قایم رہے اور شریعت الٰہی اور کتاب اللہ پر ٹھیک عمل کرتے رہے جس کا خلاصہ ایمان باللہ، بالیوم الآخر اور عمل صالح ہے] تو وہ ہر حال میں اس مغضوبیت سے محفوظ ہیں اور ان کا اجر کبھی ضایع نہ ہوگا۔ ان کے لیے کسی طرح کا بھی خوف اور کھٹکا نہیں۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا

هُمْ یَحْزَنُوْنَ. پس جن یہود و نصاریٰ و صابئہ کا اس آیت میں ذکر ہے، ان سے مراد وہ یہود و نصاریٰ نہیں ہیں، جو بعد بعثت آنحضرتؐ کے عہد میں تھے یا جو بعد ظہور اسلام کے دنیا میں رہیں گے، بلکہ صرف ان کا جو ظہور اسلام سے پیشتر تھے، مگر اپنی قوم کی ضلالتِ تحریف و ترکِ شریعت و کتاب اللہ سے محفوظ رہے اور سچّی یہودیت اور حقیقی عیسائیت پر کہ دراصل اسلام ہے [کیوں کہ دین ایک ہے اور ہمیشہ سے ہے] ان کا خاتمہ ہوا۔ دراصل ایسے یہودی اور نصرانی آنحضرتؐ کے ظہور تک موجود تھے۔

موحد عیسائی:

یعقوبیہ عیسائیوں کا ایک بہت بڑا موحد فرقہ تھا، جو مسیحؑ کو ابن اللہ نہیں مانتا تھا اور نہ کفارے کا قایل تھا۔ روم کی کونسل روحانی نے اس کے داعی کو سزا دی۔ وہ بھاگ کر سکندریہ آیا۔ دراصل آج کل کے یونی ٹیرین عیسائی [۶] انھی کے بقایا ہیں۔ مشہور بشپ یوحنا جو حضرت عمرو ابن العاصؓ کے ہاتھ پر بعد فتح مصر اسلام لایا اور سب سے پہلا حکیم اسلام قرار دیا گیا، اسی فرقے کا پادری تھا۔ یہ لوگ سچّے عیسائی یعنی مسلمان تھے، مسیحؑ کو نبی مانتے تھے، کفارے کے قایل نہ تھے، نجات کا دار و مدار اعمال صالحہ کو سمجھتے تھے۔ راتوں کو عبادتیں کرتے اور دن کو بیماروں کی خدمتیں! ان میں سے اکثر اربابِ بصیرت ایسے تھے کہ سچّے دل سے فارقلیط کے موعودہ ظہور کے منتظر تھے اور ان میں سے جن لوگوں نے اس پاک ظہور کو پایا، سچّے دل سے ایمان لائے۔ یہی لوگ تھے جن کی نسبت فرمایا: وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ [۷]۔ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ یعنی دعوۃِ اسلامی کو سن کر جھک جاتے ہیں اور انکار نہیں کرتے۔ چناں چہ اس کے بعد فرمایا: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ. [۸]۔ جب قرآن کو سنتے ہیں تو ان کی

آنکھوں سے جوے اشک بہنے لگتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی سچائی کو انھوں نے پا لیا ہے۔ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ [۹]۔ پس وہ پکار اٹھتے ہیں کہ خدایا ہم اس کلام پر ایمان لائے پس ہم کو شہداے حق میں سے شمار کر!

ورقہ بن نوفل ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ حضرت سلمانؓ فارسی نے طلب حق میں بڑا سفر کیا اور ایسے پادریوں سے ملے جو سرِ حقیقت سے واقف تھے۔ انھوں نے وصیّت کی کہ فارقلیط کا ظہور قریب ہے۔ ملنا تو ایمان لانا اور ہمارا اسلام کہنا۔ سلمانؓ نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متامل ہوے کہ ایسے لوگوں کی نسبت کیا کہیں؟ اس پر یہ آیت اتری: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی ..... الآیة. یعنی وہ سچّے نصاریٰ تھے، سچّے عیسائی تھے ان کے لیے کوئی خوف نہیں۔

اہلِ کتاب سے قرآنی مطالبہ:

ابن ابی حاتم نے بسند متّصل مجاہد سے یہ روایت بیان کی ہے اور متعدد طرق سے منقول ہے اور سعید بن جبیر نے بھی روایت کیا ہے۔ قرآن ہر جگہ اہل کتاب سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کتاب اللہ کو قایم کرو جس کو تم نے نَبَذَ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کر دیا ہے۔ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰةَ، سورۂ مائدہ میں کہا: وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ ..... الآیة، پس اصل دینِ اللہ ایک ہے۔ جو یہودی و عیسائی تورات و انجیل پر قایم رہے، کیوں نہ ان کے لیے مغفرت و بشائر ہوں؟ بات بالکل صاف ہے اور خواہ مخواہ دوسری طرف لے جانا غلطی ہے۔ یہی تفسیر خود آنحضرتؐ نے کی اور یہی تفسیر اجلۂ صحابہ و تابعین سے مروی۔ حضرت ابن عباس سے بطریق متعددہ مروی ہے کہ مقصود امم سابقہ قبل از ظہور اسلام ہیں۔ نیز ربط آیات کا بھی مقتضی یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ امم سابقہ کے ساتھ اٰمَنُوْا کیوں کہا؟ یعنی مومنین کا کیوں ذکر کیا؟

تو اس کا جواب خود ابن عباسؓ دے چکے ہیں۔ چونکہ دین الٰہی ایک اور نتائج ایک، اس لیے فرمایا کہ اصل کار ایمان باللہ و عمل صالح ہے۔ پس جو ایمان لائے اور جو سچے یہودی و نصرانی تھے سب اللہ کے نزدیک ایک درجے میں ہیں اور مغفرت کا دروازہ باز۔ باقی رہے ان اقوام کے وہ لوگ جنھوں نے آنحضرتؐ کا زمانہ پایا اور تبلیغ دعوت کی گئی اور انکار کر دیا یا اس کے بعد کرتے رہے تو ان کی نسبت یہی قرآن سورۂ حج میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ. (۲۲:۱۷)[۱۰]

تفسیر قرآن بالقرآن:

اگر سورۂ بقرہ کی آیت کا وہ مطلب ہے جو آپ نے لکھا ہے اور آپ کے لیے موجب شبہ ہوا ہے تو کہیے اس آیت کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے بھی بڑھ کر چیز یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر سب سے پہلے خود قرآن ہی سے کرنی چاہیے اور اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے کہ ایک ہی مطلب کے متعلق کہاں کہاں ارشادات موجود ہیں۔ جس طرح سورۂ بقرہ میں ان اقوام و مذاہب کی نسبت فرمایا، ٹھیک ٹھیک اسی طرح سورۂ مائدہ میں کہا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ٥ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ م بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ (۵:۶۸ تا ۷۰)۔[۱۱]

اب دیکھیے کہ یہاں سب سے پہلے اہل کتاب سے فرمایا کہ تم کچھ نہیں جو جب تک کتاب اللہ کو قائم نہ کرو یعنی تورات وانجیل کو، پھر آں حضرت کو مخاطب کر کے کہا کہ تم پر جو کلام حق نازل ہو رہا ہے تو، اس سے یہ انکار کرتے ہیں اور یہ انکار ان کے لیے موجب مزید کفر وطغیانی ہو رہا ہے۔ پس ان کے لیے غم نہ کرو، یہ کافر ہیں۔ قوم کافرین کی شقاوت پر افسوس لا حاصل ہے۔ اس کے بعد وہی سورۂ بقرہ والی آیت بادنیٰ تقدیم وتاخیر الفاظ آتی ہے کہ ان کافرین میں سے جو لوگ ایسے ہوئے کہ کتاب اللہ کو قائم کیا یعنی ایمان باللہ وعمل صالح اختیار کیا تو وہ اس طغیان وکفر سے پاک رہے۔ وہ مثال مومنین اسلام کے ہیں۔ ان کے لیے کوئی خوف نہیں۔ پھر کہا لَقَدْ اَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ. اس سے مزید وضاحت ہوگئی کہ یہاں یہودیوں سے وہی یہودی مراد ہیں جنھوں نے میثاق الٰہی کو نہیں توڑا اور تکذیب رسل سے بری رہے۔

سرسید مرحوم اور سید جمال الدین کا اس آیت کی بنا پر خیال تھا کہ ایمان بالرسل شرط نجات نہیں۔ نہیں معلوم کیوں، مگر میں نے مولانا عبیداللہ کو بھی اس طرف مائل پایا۔ البتہ وہ زور زیادہ مسئلہ تبلیغ کی بنا پر دیتے تھے اور بنیاد شاہ صاحب کی ایک عبارت پر رکھتے تھے۔ بہ ہر حال غالباً مولوی احمد علی صاحب نے بھی اسی بات کو کہا ہوگا، مگر وہ دوسرا قصّہ ہے، آیت کا مطلب یہی ہے جو لکھا یہ خط آپ مولوی صاحب کو بھی دکھلا دیں۔ ممکن ہے اس بارے میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ انشاء اللہ مولوی احمد علی بات صاف کر دیں گے (۱۲)۔

نزولِ قرآن:

۳۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ .... الآیۃ بعض مفسّرین کو یہ خیال ہوا کہ

قرآن حکیم تو تیئیس سال میں اترا ہے پھر اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ کیسے کہا؟ اس لیے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کسی نے کہا کہ لیلۃ القدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے آخری آسمان پر کہ اس کو سماے دنیا کہتے تھے اتر آیا۔ وہاں سے نجماً نجماً زمین پر نازل ہوا۔[۱۳]

حواشی:

[۱] پوری روایت یوں ہے: امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشھدوا ان لااله الا الله وان محمداً رسول الله ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذالك فعصموا منی دمائھم و اموالھم الابحق الاسلام و حسابھم علی الله [مجھے حکم دیا گیا کہ میں ان لوگوں سے جنگ جاری رکھوں، جب تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قایم کریں اور زکوۃ دیں۔ پس جب ایسا کریں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے مال بچالیے سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

[۲] وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (سورۂ انفال:۳۹)

ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ظلم و فساد باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لیے ہو جائے]۔ روایت سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ لڑنے پر مصر ہوں ان سے لڑائی جاری رکھی جائے۔ جب تک وہ مذکورہ شرطیں نہ مان لیں! سورۂ انفال کی آیت میں دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لیے ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ظلم و جور کے لیے اس میں مداخلت کی کوئی گنجایش نہ رہے۔ دین خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے۔

[۳] سورۂ دخان (۱۸:۴۴): حوالے کرو میرے، بندے خدا کے، میں تمھارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر۔

[۴] پوری آیت یوں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ ''جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہوں، لیکن جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ بھی اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی'' (۶۲:۲)۔

[۵] سورۂ بقرہ۔ ''بہ ہر حال بنی اسرائیل پر خواری و نامرادی کی مار پڑی اور خدا کے غضب کے وہ سزاوار ہوئے اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کے ناحق قتل میں بے باک تھے اور گمراہی و شقاوت کی یہ روح ان میں] اس لیے [پیدا ہوگئی] کہ [اطاعت کی جگہ] سرکشی سما گئی تھی اور تمام حدیں توڑ کر بے لگام ہو گئے تھے'' (۶۱:۲)۔

[۶] یعنی مسیحیوں میں قائلینِ توحید اور منکرینِ تثلیث کی جماعت۔

[۷] سورۂ مائدہ۔ ''اور ایمان والوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں، ہم نصاریٰ ہیں، اس لیے کہ ان میں پادری اور رہبان ہیں اور اس لیے کہ ان میں گھمنڈ اور خود پرستی نہیں''۔

[۸] سورۂ مائدہ ''اور جب یہ [عیسائی] وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں جوشِ گریہ سے بہنے لگتی ہیں، کیوں کہ انھوں نے کلام کی سچائی پہچان لی ہے''۔

[۹] سورۂ مائدہ۔ ''وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں ''خدایا ہم ایمان لائے'' پس ہمیں بھی انھی میں سے لکھ لے، جو تیری سچائی کی گواہی دینے والے ہیں''۔

[۱۰] جو لوگ ایمان لائے (یعنی مسلمان)، جو یہودی ہوئے، جو صابی ہیں، جو نصاری ہوئے ہیں جو مجوسی ہیں، جو مشرک ہیں، قیامت کے دن ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کر دے گا۔ (اور ان کے اعمال کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی) اللہ (سے کوئی بات چھپی نہیں، وہ) سب کچھ دیکھ رہا ہے۔] (۲۲:۱۷)

[۱۱] ''ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب تمھارے پاس ٹکنے کے لیے کچھ بھی نہیں، جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، اسے قایم نہ کرو اور [اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ] جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے [بجائے اس کے کہ ان کے لیے تنبیہ ونصیحت کا موجب ہو] اور زیادہ ان کی سرکشی اور انکار بڑھا دے گا، تو تم اس گروہ کی حالت پر افسوس نہ کرو، جو حق سے منکر ہو گیا۔ جو لوگ قرآن پر ایمان لائے ہیں، وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی ہیں اور صابی اور نصاریٰ ہیں، کوئی ہو، لیکن [اصل دین یہ ہے کہ] جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے [ایمان اور عمل کا عہد اطاعت بنی اسرائیل] سے لیا اور [اور ان پر قایم رکھنے کے لیے ایک کے بعد ایک] رسول بھیجے، مگر جب بھی کوئی رسول ان کے پاس ایسا حکم لے کر آیا جو ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف تھا تو انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کیا۔ (مہر)

[۱۲] مولوی احمد علی سے مراد مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد مولانا احمد علی لاہوری ہیں جو مولانا سندھی کے کابل جانے کے بعد نظارۃ المعارف القرآنیہ۔ دہلی کے مدرس اور ناظم ہوئے تھے (ا۔س۔ش)۔

[۱۳] حد درجہ افسوس ہے کہ اس مکتوب گرامی کے باقی اوراق مولوی محی الدین احمد کے پاس محفوظ نہ رہے۔ غالباً یہ اشاعت کے لیے دیا گیا تھا، شائع بھی نہ ہوا اور واپس آیا تو اس کا ایک حصہ غائب تھا۔ (مہر)

[۴] ﴿۱۹۷﴾

حضرت مولانا کے ایک مکتوب سامی پر مرسل الیہ مرحوم کے قلم سے ذیل کا نوٹ یادگار ہے۔ مرحوم فرماتے ہیں:

''گو امام الہند کے مندرجۂ تحت مکتوب گرامی کو پڑھنے سے قبل آپ ذیل

کی چند سطور ملاحظہ فرما لیجیے تا کہ ان کے ارشادات کا پس منظر سمجھنے میں آسانی رہے:

۱۹۱۹ء میں عزیزی مولوی محمد علی قصوری ایم۔اے [کینٹب] کی سعی و محنت سے سیٹھ مہر بخش مرحوم سوداگر چرم بمبئی نے حضرت والد بزرگوار مرحوم و مغفور کی خدمت اقدس میں اڑھائی لاکھ روپے کی رقم بدیں غرض پیش کی کہ جنوبی اور وسطی ہندستان کی اچھوت اقوام میں اشاعت اسلام کا کام شروع کر دیا جائے۔ بعد میں شیخ مرحوم نے بعض اہل بدعت کے بہکانے سے رقم واپس منگوالی۔ مگر یہ کام خدا کے فضل و کرم سے کئی برس تک صرف اپنی تجارت کے بل بوتے پر جاری رہا۔ اس کے نتائج کی تفصیل بڑی دل چسپ اور ایک پوری کتاب کی محتاج ہے، چناں چہ حضرت مولانا آزاد کی رہنمائی اور حضرت والد بزرگوار مرحوم و مغفور کی سرپرستی میں، میں نے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا۔ جو ایک مستقل تاریخ ہے۔ انھی دنوں اس سلسلے میں میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا جس میں ''جمعیتِ دعوت و تبلیغ اسلام'' کا کانسٹی ٹیوشن تیار کر کے ان کی خدمت میں بغرض اصلاح و منظوری بھیجا۔ اسی خط میں حضرت مولانا کی خدمت میں یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ جمعیت دعوت و تبلیغ اسلام کی صدارت قبول فرمائیں۔ اس میں بعض دوسرے مسائل بھی عرض کیے تھے جن میں بہت زیادہ اہم مسئلہ جمعیتِ اہل حدیث کی تنظیم کا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ باعثِ صد ہزار عبرت و بصیرت ہے۔

محی الدین احمد قصوری

یہ نوٹ ''تبرکات آزاد'' میں نہیں۔ مکاتیبِ ابوالکلام [مرتبہ محمد رفیق، ادبستان۔ لاہور، ت ن، ۲۰۰ص] میں ہے اور وہیں سے نقل کیا ہے۔ [ا۔س۔ش]

۴۲۔ رپن اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۱ر نومبر ۱۹۲۳ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آیندہ سے آپ کے مکاتیب کے جواب کے لیے جو مذہب تعجیل اختیار کر رہا ہوں، اس کا اندازہ اسی جواب سے کر لیجیے۔ اسی لمحے میں نے آپ کا خط ختم کیا ہے۔ اور باوجود سخت دردِ پا کے جواب لکھنا شروع کر دیا۔

دہلی میں آپ کے والد بزرگوار سے آخری باتیں ہو گئیں۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے آپ کو لکھا ہوگا، لیکن شاید اب تک موقع ہی نہیں ملا۔ ایک لمحے کے لیے یہ خیال نہ کیجیے کہ میری خاموشی محض تساہل و اعراض کا نتیجہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ مجھ میں ہر طرح کی کوتاہیاں اور درماندگیاں ہیں، لیکن ساتھ اتنا ارادہ اب بھی ہے کہ فیصلے کے بعد عمل سے نہیں رک سکتا۔ مشکل یہ ہے کہ میں فیصلہ نہ کر سکا۔ میرے اضطراب کے لیے قوی وجوہ تھے، اگرچہ ممکن ہے وہ دوسرے طبایع کے لیے اس درجے موثر نہ ہوں۔ بہ ہر حال بہ حالت موجودہ میں جو کچھ فیصلہ کر سکا ہوں اس سے آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ ضرور نہیں کہ یہ آخری ہو۔ ہماری تو کوئی بات آخری نہیں ہوتی اور یہ تو محض وقتی حالات اور ہنگامی دواعی کا نتیجہ ہے۔

۱۔ جو مسودہ دستور العمل کا تیار شدہ موجود ہے، وہ ٹھیک ہے۔ تو کلا علی اللہ شایع کر دیا جائے۔ میں نے اس میں صرف اس قدر تبدیلی کر دی ہے کہ اصل مقاصد خدمت قرآن، اشاعت علوم، نشر تراجم، وغیرہ ذالک قرار دے دیا ہے۔ مشن کا کام تبعاً اس میں آ جائے گا۔ اول دن سے جو بات سامنے رہی ہے، وہ تھی بھی یہی! مسودہ مولوی عبدالقادر صاحب کو دے دیا ہے۔

۲۔ بالفعل میں جمعیت [۱] کی صدارت سے مجبور ہوں۔ حاجی عبداللہ ہارون [کراچی] کو تین سال یا ایک سال کے لیے صدر منتخب کر لیجیے۔ یہ اس لیے کہ طبقۂ علماء و مشائخ میں کوئی شخص آپ کے لیے سودمند نہیں ہو سکتا۔

جمعیۃ دعوت و تبلیغ سے علاقہ:

۳۔ رہا میرا علاقہ، تو وہ پوری باقاعدگی اور التزام کے ساتھ حسب ذیل صورتوں میں

رہے گا۔

[الف] ہر طرح کا تحریری ولسانی مشورے۔

[ب] جمعیّت کی ضروری تحریرات کی تیاری۔

[ج] بالالتزام ہر تیسرے ماہ ایک مستقل کتاب جمعیّت کے لیے تیار کر دینا اور طباعت کے لیے حوالے کر دینا۔ یہ ایک مرتب سلسلہ ہوگا جو اسلام اور علومِ قرآن کی نسبت ایک خاص سیریز کی تدوین کرے گا، اس طرح کہ اس کا مطالعہ کرنے والا بترتیب الف سے یٰ تک معلومات حاصل کرتا جائے۔ سب سے پہلی کتاب اسلام کا انٹروڈکشن ہوگا۔ پھر اسلام اور ارتقاے انسانیت، پھر عقاید اسلام، پھر القرآن۔[۲]

انتظام یوں کیا جائے گا کہ جونہی ایک کتاب آپ کو ملے اس کے انگریزی اور ہندی [ناگری حروف] ترجمہ کا بھی انتظام ہوجائے۔ اس کا انتظام کرنا آپ کا کام ہے۔ میرا کام اب صرف دنیا میں یہ رہ گیا ہے کہ اس وقت تک کے اپنے تمام افکار جلد سے جلد مدون کردوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چھوٹے رسالے ماہوار حوالے کر دیے جائیں۔

۴۔ اس کے علاوہ میرا طرزِ عمل ودستور یہ رہے گا کہ جہاں تک میرا حلقۂ اثر ہے لوگوں کو اس کام کی طرف توجہ دلاتا رہوں۔

بالفعل اس پر قناعت کیجیے۔ آپ کے دل میں تنظیم ملّت کا جو عشق ہے اس سے بے خبر نہیں ہوں لیکن انصاف کیجیے جب میں اپنے پندرہ سال کے طلب وعشق کے بعد وقت کی عدم مساعدت واستعداد کا اعتراف کرتا ہوں تو آپ کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔☆

☆ مولانا کا اشارہ "تحریک نظم" جماعت کی طرف ہے۔ جس کو مولانا نے وقت کی عدم مساعدت کی وجہ سے ۱۹۲۱ء میں جمعیّت علماے ہند کے سپرد کر دیا تھا۔ مولانا کی اس تحریک کے آغاز کو اس وقت ۱۵ برس گزر چکے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا نے اس تحریک کا منصوبہ ۱۹۰۸ء میں بنایا تھا۔ (ا۔س۔ش)

تنظیم اہلِ حدیث:

آپ نے جماعت اہل حدیث کی تنظیم کا ذکر کیا ہے۔ کاش یہی ہو جائے لیکن حالات پر جب نظر ڈالتا ہوں تو یہ مختصر بھی اس مطول سے کم مشکل نہیں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ جماعت اہل حدیث بھی اپنے اصلی ذوق اور ذہنیت سے ہٹ گئی ہے۔ علی الخصوص موجودہ علماے اہل حدیث کی منٹلٹی اس درجے عمل وعزائم سے اَبعَد ہوگئی ہے کہ کسی طرح انھیں راہِ عمل پر لایا نہیں جاسکتا۔ ایک لا علاج مرض حد درجے پستی فکر و معیارِ نظر کا پیدا ہوگیا ہے۔ مبتدعین ومقلّدین کی نصرانیت کے مقابلے میں یہاں ظاہر پرستی وتقشّف کی یہودیت سرایت کرگئی ہے کس کس کو آپ راہ پر لائیں گے اور کتنا وقت آپ سنگ تراشی میں صرف کریں گے؟ صورت بننے کی نوبت ہی پیش نہ آئے گی۔

طبقہ علما سے مایوسی:

میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ موجودہ طبقہ علماء سے خواہ مقلّدین ہوں یا اہل حدیث، میں قطعاً مایوس ہوں اور اس کو قوانین اجتماع کے بالکل خلاف سمجھتا ہوں کہ ان کے جمود میں کسی طرح کا تقلب وتحول پیدا ہو۔ راہ عمل صرف ایک ہی ہے یعنی موجودہ پختہ دماغوں سے صرفِ نظر کرکے ایک نئی مخلوقات دماغ وفکر کی پیدا کرنا۔ اس کے لیے مادہ اولیٰ صحیح اسلامی منٹلٹی کی تولید ہے اور اس کے لیے سب سے پہلے ایک خاص نیا لٹریچر مطلوب ہے، اس کے بعد تعلیم وتربیت!

مولوی برکت اللہ کا کوئی مضمون مجھے نہیں ملا، حیرت ہے۔ ورنہ فوراً الجامعہ میں درج ہوتا[۳]۔ مولوی عبدالرحمٰن ندوہ میں ہیں[۴] میں ان سے گفتگو کرتا ہوں۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] اس سے مقصود جمعیّت دعوت وتبلیغ ہے اور دستور العمل بھی اسی جماعت کا تھا[مہر]

[۲] یہ سلسلہ لکھا گیا یا نہ لکھا گیا تا ہم معلوم ہے کہ نہ کبھی چھپا نہ اس کا کوئی سراغ اب تک مل سکا۔ [مہر]

[۳] اشارہ یقیناً مولوی برکت اللہ بھوپالی کی طرف ہے، جو بہت بڑے انقلابی تھے اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ ملک سے باہر ہی گزرا، باہر ہی وفات پائی [مہر] ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کو سیکرانٹو [امریکہ] میں انتقال ہوا۔ [ا۔س۔ش]

[۴] مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مدرسہ اسلامیہ کلکتہ سے وابستہ تھے اور پیغام۔ کلکتہ سے بھی تعلق تھا۔ مکتوب نگار کے اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ الجامعہ سے بھی قریبی تعلق تھا۔ اب دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنو میں تھے۔ الجامعہ، کلکتہ، پندرہ روزہ عربی کا مجلّہ تھا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں اپریل ۱۹۲۳ء سے مارچ ۱۹۲۴ء تک نکلتا رہا تھا۔ [ا۔س۔ش]

[۵] ﴿۱۹۸﴾

۴۲۔ رپن اسٹریٹ۔ کلکتہ

۲۲ رفروری ۱۹۲۵ء

اخ العزیز! السلام علیکم

خط پہنچا، جواب میں اس لیے تاخیر ہوئی کہ کلکتہ کے حالات کی مزید تحقیق کر کے لکھنا چاہتا تھا جیسا کہ خیال تھا قطعاً خلاف ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ عرصے سے تجارتی حالت منقلب ہو چکی ہے۔ کلکتہ میں مسلمانوں کی دو تاجر جماعتیں تھیں۔ کولوٹولہ کے دہلوی تاجر! اور میمن تاجران دونوں کی جو حالت ہو رہی ہے وہ حقیقت میں اچھی نہیں۔ یہاں چند سالوں سے میرا زیادہ تر اعتماد حاجی غنی احمد تاجر شکر پر تھا، جو چار پانچ سال پہلے جاوی شکر کے پادشاہ سمجھے جاتے تھے اور جب تک وہ بازار میں آتے نہ تھے بازار شروع نہیں ہوتا تھا۔ ان کا اب یہ حال ہے کہ صرف آٹھ سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کا ایک مکان باقی رہ گیا ہے۔ اسی پر گزاران ہے اور اس کا بھی ایک حصہ کئی ماہ سے خالی ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ میں نے باوجود ان حالات کے علم کے، ایک کوشش کی اور ان میں بعض لوگوں کو بلایا اور ہر طرح ٹٹولا معلوم ہوا کچھ نہیں [ہوسکتا؟][۱]

اس سال بجز اس کے چارہ نہیں کہ ریاستوں سے مدد لی جائے۔ ریاستوں میں

پہل بھوپال سے ہو۔ زمین اچھی طرح تیار ہے۔ صرف ایک آخری ضرب کی ضرورت ہے۔ اگر حکیم صاحب [۲] پورا زور لگائیں۔ آپ کے جانے کے بعد دہلی میں حکیم صاحب سے میری دوبار گفتگو ہوئی اور انھوں نے پوری طرح سعی وکوشش کا وعدہ کیا، مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی آلودگیاں اس قدر وسیع ہیں کہ کسی ایک کام کے لیے صرفِ قوت دشوار ہے۔ بھوپال کے حلقے میں ایک شخص کا خیال آیا ہے اور اسے آج رجسٹرڈ خط بھیج رہا ہوں۔ معلوم نہیں بیگم صاحب [۳] دہلی میں ہیں یا چلی گئیں؟ ۵/ مارچ تک میں بھی دہلی جاؤں گا۔ وہاں آپ کے والد سے بھی ملاقات ہوگی۔ مشورہ کر کے کوئی نہ کوئی ایسی سبیل نکالی جائے گی کہ بھوپال کا معاملہ کامیابی کے ساتھ طے ہو جائے۔

اوّل دن سے یہ کام آپ ہمت وعزم اور محض اعتماد علی اللہ پر کر رہے ہیں۔ اب ہمت نہ ہاریے۔ بلاشبہ مشکل سخت پیش آ گئی ہے لیکن صرف استقامت ہی سے دور ہو سکتی ہے۔

میں نے جس روپیہ کا انتظام کیا تھا وہ دو لیتھو مشینوں کے لیے دے چکا، ورنہ سات آٹھ ہزار روپیہ بھیج سکتا تھا۔ عجب نہیں اللہ تعالیٰ جلد ایسے حالات پیدا کر دے کہ ... ... آپ کا بار میں ہلکا کر سکوں۔ [۴]

ابوالکلام

حواشی:

[۱] اس مکتوب کے بعض الفاظ قریباً مٹ گئے، بڑی کاوش سے چند الفاظ کا اندازہ کیا جا سکا اور وہ درج کر دیے گئے۔ بعض کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا ان کی جگہ مجبوراً نقطے لگانے پڑے۔

[۲] حکیم صاحب سے اشارہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کی طرف ہے۔

[۳] نواب سلطان جہاں بیگم مرحوم ومغفور والیۂ بھوپال۔

[۴] مکتوب کے اصل مضمون کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے برادرم مولوی محی الدین احمد نے ''جمعیت دعوت وتبلیغ اسلام'' کے نام سے جو انجمن قائم کر رکھی تھی اس کا مرکز پونا تھا۔ اس انجمن نے دکن کے مختلف حصوں خصوصاً ملیبار میں بڑا

عظیم الشان کام انجام دیا تھا۔ پہلے اسے سیٹھ مہر بخش اور مولوی محمد علی صاحب [برادر محی الدین احمد] کی طرف سے مستقل امداد ملتی تھی اور ضروری مصارف کے لیے کسی دوسری طرف توجہ کی ضرورت نہ تھی۔ اچانک مذکورہ بالا دونوں امدادی رقمیں بند ہوگئیں اور جمعیت کا کاروبار جاری رکھنے کے لیے باہر سے زراعانت کی ضرورت پیش آ گئی۔ مولانا نے پہلے کلکتہ کے تاجروں میں کوشش کی پھر بھوپال کا خیال آیا۔

[۶] ﴿۱۹۹﴾

اب مولانا آزاد کا جو مکتوب سامی آپ کے مطالعے میں آ رہا ہے۔ اس کے پس منظر کے بارے میں خود مکتوب الیہ نے لکھا ہے:

’’مجھے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۱۲ء میں شرف نیاز حاصل ہوا۔ جب کہ الہلال کو جاری ہوئے شاید چند ہی مہینے ہوئے تھے، مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ اس وقت سے لے کر تقسیم ہندستان تک میں ہمیشہ ان کی مخصوص عنایات کا مورد رہا ہوں۔ جب میں ان سے دور بھی رہا ہوں تو انھوں نے مجھے ہمیشہ محبّت آمیز خطوں سے نوازا ہے۔ ان کی اس محبّت ہی کا نتیجہ تھا کہ میں بعض اوقات ان پر ایسے سوال بھی کر دیتا تھا جو جرأت و گستاخی کی حد تک پہنچ جاتے تھے لیکن حضرت مولانا ہمیشہ نہایت شفقت سے ان کا جواب مرحمت فرماتے۔

ایک اسی قسم کا سوال تھا جس کے جواب میں مولانا نے مندرجہ ذیل مکتوب گرامی تحریر فرمایا۔

سوال یہ تھا کہ ’’آپ مسلمانوں کی اکثریت سے الگ کیوں ہیں [حال آں کہ میں خود بھی اس جرم کا مرتکب ہوں] کیا آپ ’’من شُذَّ شُذَّ فی النار‘‘ یا ’’من فارق عن الجماعه‘‘ وغیرہ احادیث کو بھول گئے ہیں۔

سوال کی سختی ظاہر ہے۔ میرا یقین ہے کہ حضرت مولانا کے سوا کوئی بھی اور عالم ہوتا تو وہ میری وہ گت بناتا کہ باید و شاید۔ اس چالیس سالہ صحبت میں صرف یہی ایک موقع ایسا آیا جس میں حضرت مولانا نے بزرگانہ سرزنش فرمائی۔ لیکن سچّی بات یہ ہے کہ وہ سرزنش محبت سے بھی خوش آیند تر تھی۔

محی الدین قصوری

[مکاتیب ابوالکلام: ادبستان۔لاہور، صفحہ ۲۲۔۱۲۱]

اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا نے جو فکر انگیز، حقیقت افروز اور ایمان پرور گرامی نامہ تحریر فرمایا ذیل میں درج کیا جاتا ہے ''تبرکات آزاد'' کا مجموعہ مولانا محی الدین قصوری کی اس تمہیدی تحریر سے عاری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا جواب مطالعہ فرمائیں:

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کو میرے بعض عقاید و اعمال کی نسبت شکوک پیدا ہوئے، مگر آپ ان پر قانع نہیں ہوئے۔ مجھے ان سے مطلع کر دینا ضروری تصور کیا۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہونا چاہیے۔ آپ نے رسالہ خلافت کا حوالہ دیتے ہوئے حکم التزام جماعت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اصلاً بالکل صحیح ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کا مورد و محل متعیّن کر لیا جائے۔ آپ میرے عمل کو اس کے خلاف قرار دیتے ہیں لیکن اُس کی تشریح نہیں کرتے کہ کون سا عمل! بہ ہر حال قیاس کہتا ہے کہ ''التزام جماعت'' اور ''علیکم بالسواد الاعظم'' وغیرہا احادیث کے سمجھنے میں آپ کو وہی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جو بعض دوسرے گوشوں میں دوسرے لوگوں کو ہو چکی ہے۔ اب جب تک کسی قدر تفصیل سے کام نہ لیا جائے معاملہ صاف نہ ہوگا۔

عقاید و اعمال کا معیار:

آپ غالباً سمجھتے ہیں کہ اس حکم [۱] کا تعلّق مسلمانوں کے عام عقاید و اعمال اور افکار و آرا سے ہے، یعنی جب کبھی مسلمانوں کی کوئی بھیڑ کوئی رائے و عمل اختیار کر لے تو شرعاً ہر مسلمان پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرے، نہیں کرے گا تو ''مَن شَذَّ شُذَّ

فِی النَّار" کی وعید کا مستوجب ہوگا اور اس کی موت "مِیۃَ جَاھِلِیَّۃ" کی موت ہوگی! حال آں کہ "حاشاوکلا حکم التزام جماعت" اور "اتباع سوادِ اعظم" کا یہ مطلب ہو۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ مطلب تسلیم کرلیا جائے تو حق و باطل اور سیاہ وسفید کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اسلامی زندگی کے معنی صرف یہ رہ جائیں گے کہ جس جہل و ضلالت پر سو آدمی متفق ہو جائیں ننانوے کو ان کی پیروی ضرور کرنی چاہیے۔ گویا اسلام کے نزدیک عقاید واعمال کی صحت کا معیار حقیقت نہیں بلکہ مقدار کی محض اضافی و وقتی اکثریت ہے۔ کوئی راہ کتنی ہی جہل و ضلالت کی راہ ہو لیکن اگر دس نے قدم اٹھا دیا تو گیارھویں کے لیے بحکم التزام جماعت "وَّاتَّبِعوُ سَوَادَ الاعظَم" اس کی پیروی لازم ہوگئی۔ نہیں کرے گا تو من شذ شُذ فی النار!

وجوب تقلید کے لیے استدلال:

اس نافہمی میں وہ مدعیان علم مبتلا ہوئے تھے جو اس حدیث سے تقلید شخصی کے وجوب والتزام پر استدلال کرتے تھے اور اب بھی اگر میدانِ مناظرہ گرم ہو جائے تو ضرور کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ چوں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی پر جم گیا ہے اور حق کو انھیں مذاہب مدونۂ اربعہ میں تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے اب کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تقلید شخصی کے التزام سے براہِ راست کتاب وسنت پر تدبر کرکے عمل بالحدیث کرے، کیوں کہ اگر ایسا کرے گا تو سواد الاعظم سے تخلّف کرے گا اور التزام جماعت سے باہر ہو جائے گا۔ وَمَن شذ شُذ فِی النَّار!

۱۲۴۰ھ کا مباحثہ:

انیسویں صدی کے اوایل میں جب مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے اتباع دین خالص کی دعوت بلند کی تھی تو ان مقابلے میں بھی پرستاران بدع ومحدثات نے آپ کا یہی مزعومہ مطلب بنائے استدلال ٹھہرایا تھا اور اتبعوا سواد الاعظم کی بنا پر من شذ شذ

فی النار کا فتویٰ دیا تھا۔ چنانچہ جامع مسجد۔ دہلی کے مباحثہ ۱۲۴۰ھ میں سب سے بڑی دلیل یہی پیش کی گئی تھی کہ جن عقاید و اعمال کو آج بدعت و ضلالت ٹھہرایا جا رہا ہے، یہ تمام تر وہی اعمال و عقاید ہیں جن پر مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا اتفاق ہو گیا اور مسلمانوں کا کوئی شہر و قریہ نہیں جہاں یہ امور عمل میں نہ لائے جاتے ہوں۔ پس ان کے استحسان میں شک کرنا اور انھیں بدع و محدثات قرار دینا سبیل المومنین سے تخلف کرنا اور راہِ شذوذ اختیار کرنا اور فارق جماعت ہونا ہے!

آپ کا خط پڑھتے ہوئے ایک دلچسپ لطیفہ ذہن میں یہ آیا کہ جو سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں بجنسہ یہی سوال مولوی شاہ اسمٰعیلؒ اور مولوی عبدالحی داماد شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ سے کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک تحریر ''تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ'' کے نام سے دہلی میں شایع کی گئی تھی۔ اس میں مولوی صاحب موصوف سے سایل پوچھتا ہے کہ:

''ایں ہمہ اعمال و امور کہ کافۂ اہل اسلام مستحسن و مقبول دانستہ می کردند و می کنند، الآن در عقیدہ شما شرک و بدعت گردیدہ۔ آیا ایں طریق جدید فساد فی الدین و شق عصائے مسلمین و شذوذ از جماعت و اتباع سبیل غیر مومنین نیست؟ مگر کہ حکم التزام جماعت و حدیث مشہورہ ''اِتَّبِعُوا سَوَادَ الاَعظَم'' از خاطر شریف بکلی محو و متلاشی گشتہ [حافظے سے لکھ رہا ہوں، ممکن ہے الفاظ میں کچھ رد و بدل ہو گیا ہو!]

حکم التزام جماعت کا محل:

اس غلط فہمی کا منشا یہ ہے کہ حکم التزام جماعت کا محل و مورد ان لوگوں نے معلوم نہیں کیا اور کوتاہ نظری نے تحقیق و مطالعہ کی مہلت نہ دی۔ اگر ان لوگوں نے کم از کم صحائف سنت کے تراجم ابواب ہی پر غور کر لیا ہوتا یا اس ایک حدیث کے ساتھ اس کی دوسری ہم معنی احادیث ہی دیکھ لی ہوتیں تو کبھی اس نافہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ دراصل ان تمام

احکام کا تعلّق امامت کبریٰ کے معاملے سے ہے، یعنی خلافتِ اسلامیہ کے معاملے سے، نہ کہ عقاید و افکار و اعمال و آرا سے۔ عرب کے جنوب و شمال میں اگرچہ حکومتوں کے بعض سلسلے قایم ہو چکے تھے، لیکن وسطی عرب ہمیشہ خودرو اور مطلق العنان قبایل کا جولان گاہ رہا۔ ان کے بے قید طبایع پر اس سے زیادہ کوئی بات شاق نہ گزرتی تھی کہ کسی نظامِ حکومت سے وابستہ ہو کر رہیں یا کسی امیر کے آگے سرِ اطاعت جھکا دیں۔ اسلام کا ظہور ہوا تو اس کی روح جمہوریت کے ساتھ نظم و اطاعت کا بھی قوام چاہتی تھی۔ وہ اگر ایک طرف انفرادی آزادی کا محافظ تھا تو دوسری طرف نظم و امارت کا بھی مُقوّم تھا۔ پس ضروری ہوا کہ مسئلے کے اس پہلو پر زور دیا جاتا اور عرب کے بے قید طبایع میں یہ بات اتار دی جاتی کہ جب ایک امیر منتخب کر لیا گیا اور جماعت اس پر متفق ہوگئی تو پھر کسی مسلمان کو محض اپنی انفرادی رائے کی بنا پر تخلف نہیں کرنا چاہیے۔ بہ ہر حال اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر تخلف کرے گا تو جماعت میں تفرقہ ہوگا۔ فتنوں کی تولید ہوگی، نظامِ ملّت درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فارق جماعت کی نسبت فرمایا۔ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی یعنی جاہلیت میں جماعت کا قوام نہ تھا، ایک طرح کی فوضویّت [یعنی انارکی] کی حالت طاری تھی۔ اسلام آیا تو اس نے تمام قوم کو ایک رشتۂ امارت میں منسلک کر دیا۔ اب اگر اس اطاعت کا ربقہ گردن سے نکالا جاتا ہے تو یہ اسی جاہلیت کی طرف عود کرنا ہے۔

اطاعتِ امیر:

چنانچہ جن احادیث میں التزام جماعت کا حکم دیا گیا ہے ان کا منطوق اس بارے میں بالکل واضح اور غیر مشتبہ ہے۔ تمام احادیث بالاتفاق اطاعت امیر کا حکم دیتی ہیں اور اسی سے ''تخلف'' کو ''تفرق عن الجماعت'' اور ''دعوت بدعوی جاہلیت'' قرار دیتی ہیں، مَن خَرَجَ مِن اِطَاعَةِ وَ فَارقَ الجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مَيةَ الجَاهِلِيّة اور

روایت ابن عباسؓ: فَانّه لَیسَ اَحَدَ مِنَ النَّاسِ خرَجَ مِن السّلطَان شبر فَمَاتَ علیه الا مَیتة الجاهلیة نیز روایت مسند من خرج من الجماعته قدر شبر فقد خلع ربقة الاسلام من عَنقِهِ الّا اَن یُّراجعَ وَمَن دُعَا بِدَعوی جاهِلَیة... الخ

آپ نے رسالہ ''خلافت'' کا حوالہ دیا ہے۔ اگر رسالہ مذکورہ آپ کے پاس موجود ہے، تو براہِ عنایت اسے مکرر دیکھیے میں نے نہایت تفصیل کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی ہے۔ خصوصاً اس کی وہ فصل جس میں ''اقتداء'' اور ''اطاعت'' کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ تعجب ہے آپ نے اس میں جماعت والتزام جماعت کے الفاظ تو دیکھ لیے لیکن ان کا مطلب نظر انداز کر دیا۔

معاملہ داعیانِ حق:

اگر حکم التزام جماعت کا مطلب یہی قرار دیا جائے کہ تمام عقاید وافکار اور اعمال و کردار میں مسلمانوں کو چاہیے کہ سوادِ اعظم کی پیروی کریں ورنہ ''من شذ شذ فی النار'' کے مستوجب ہوں گے، تو ظاہر ہے حق و باطل سنت و بدعت اور اسلام و کفر کے تمام احکام وقواعد کا خاتمہ ہو جائے۔ کیا ایک لمحے کے لیے کوئی ذی عقل اس کا یہ مطلب قرار دے سکتا ہے؟

پھر کیا حکم ہوگا۔ ان سیکڑوں مبلّغین و دعاۃ حق کا جنھوں نے ان تیرہ سو برسوں کے اندر باوجود کثرتِ شیوعِ فتن و استیلاے بدع و محدثات و غلبۂ بطلان وفساد و غربت اصحاب حق وقلّت مخلصین وصادقین، سوادِ اعظم کی گمراہیوں کا ساتھ نہیں دیا اور راہِ حق وصواب پر قایم رہے؟ کیا یہ سب التزامِ جماعت سے باہر ہوگئے تھے اور ان سب کی موت جاہلیت کی موت ہوئی؟

پھر اگر ''التزام جماعت'' اور ''اتباع سوادِ اعظم'' کا یہی مطلب ہے تو ان تمام

اختلافات کا کیا حکم ہوگا، جس میں تنہا ایک فرد کی راے ایک طرف اور جماعت کی راے دوسری طرف تھی اور حق وصواب فرد کے ساتھ تھا، نہ کہ جماعت کے ساتھ؟ خود عہدِ صحابہؓ کے بے شمار واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں؟ جب مانعین زکوٰۃ کے قتال کا سوال اٹھا تو مجمع صحابہؓ کی راے ایک طرف تھی اور حضرت ابوبکرؓ کی ایک طرف۔ یعنی سوادِ اعظم قتال کا مخالف تھا۔ حضرت ابوبکرؓ مجبور تھے۔ پھر کیا یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اتبعوا السواد الاعظم کی مخالفت کی؟ حاشا وکلا! کیا حکم ہوگا ان افرادِ شواذ کا جنھوں نے مامون وواثق کے زمانے میں سواد اعظم کا ساتھ نہ دیا اور خلق قرآن کے مسئلے میں سب سے الگ رہے؟ آپ کو معلوم ہے سواد اعظم کے مقابلے میں امام احمدؒ ابن حنبل نے کیا جواب دیا تھا؟ اِیتُونِی شیئًا مِن کِتَابِ اللّٰہِ وسُنّتِ رَسُولِہٖ حَتّٰی اَقُول! یعنی اس میدان میں معیارِ ردوقبول سواد اعظم نہیں ہے بلکہ علم وبصیرت ہے۔

حدیث غربت:

پھر اگر التزام جماعت کے حکم کا یہی مطلب ہے تو ان حدیثوں کا مطلب کیا ٹھہرایا جائے گا، جن میں صاف صاف ایسے زمانوں کی خبر دی گئی ہے جب مسلمانوں کے سواد اعظم کی راہ گمراہی کی راہ ہوگی اور اصحابِ حق قلیل واقل ہوں گے؟ غربتِ ثانیہ والی حدیث تو کبھی نہ کبھی آپ کے کانوں میں پڑی ہوگی؟ بدء الاسلام غریباً و سیعود غریباً کما بداءَ فطوبی للغرباء اسی میں ہے قُلنَا وَمَا الغرَبَا؟ قَالَ قَوم صَالِحونَ قَلِیل فِی نَاسِ سوءَ کثیر. مَن یَعصِیهم کَثِیر مِمّن یُطِیعُهم".

یعنی صحابہؓ نے سوال کیا "غرباء سے مقصود کون لوگ ہیں جن کے لیے فطوبی للغرباء کی بشارت ہوئی؟ فرمایا صالح مسلمانوں کا ایک گروہ۔ بُرے لوگوں کی کثرت

میں تھوڑے سے آدمی۔

اب غور کیجیے وہ سواد اعظم والی بات کیا ہوئی؟ اس سے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر وقت آئے گا جب حق سواد اعظم کے ساتھ نہ ہوگا بلکہ قوم صالحون قلیل فی ناس سوء کثیر کے ساتھ ہوگا۔ اسی طرح مسلم کی مشہور حدیث: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِن اُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الحقِ لَا يَضُرّهُم مَن خَالِفَهُم الخ میں اصحاب حق وسداد کو طائفہ سے تعبیر فرمایا یعنی سواد اعظم کے مقابلے ایک چھوٹی سی ٹکڑی اور اسی طرح شیخین کی مشہور حدیث میں خبر دی کہ جب مسلمانوں کا کوئی امام نہ رہے اور لوگ طرح طرح کی ٹولیوں میں بٹ جائیں تو فاعتَزِل تِلْكَ الفِرَقَ كلها ولو اَنْ تعض اَصلَ شجرة اگر درخت کے پتے چبا کر جینا پڑے جب بھی ان ٹولیوں کا ساتھ نہ دو، ان سب سے الگ ہو جاؤ۔

اب کہیے سواد اعظم یہاں کہاں رہا؟

موجودہ حالت اور سوادِ اعظم:

آج اگر مسلمانوں کی مردم شماری کی جائے تو شاید سو میں دو آدمی بھی ایسے نہیں نکلیں گے، جو اپنے عقاید و اعمال میں دین خالص پر عمل پیرا ہوں۔ پس سواد اعظم کی راہ انحراف و بدعت کی ہوئی اور ''اتبعوا سواد الاعظم'' کا حکم موجود ہے اور مطلب اس کا آپ کے نزدیک یہ کہ جس طرف بھیڑ چلے وہی راہ چلو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مسلمان کے لیے دین خالص کا اتباع جائز نہیں۔ لیجیے قصّہ تمام ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

سیاسی صورت حالات:

پھر جہاں تک سیاسی صورت حال کا تعلّق ہے کیا اس مطلب کا تصور بھی کیا جا سکتا

ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ قوم پر سیاسی محرومی کی حالت تبھی طاری ہوتی ہے جب سواد اعظم عزم و عمل سے محروم ہو جاتا ہے اور محکومیت کی روٹی پر قناعت کر لیتا ہے۔ اب اگر کوئی مرد کار سعی و عزم کی دعوت دے گا تو یقیناً اس کی راہ سواد اعظم کی راہ نہ ہوگی۔ فرد واحد کی راہ ہوگی یا ایک قلیل ترین طائفے کی۔ پھر کیا اس کے خلاف شرعاً یہ فتویٰ صادر کرنا پڑے گا کہ سواد اعظم سے باہر ہو گیا اور التزام جماعت کے حکم کی پیروی نہ کی؟ من شذ شذ في النار!

ہندستان میں سیاسی انقلاب ہوا اور مسلمانوں کی اکثریت غلامی و محکومیت پر قانع ہو گئی صرف قانع ہی نہیں ہوئی بلکہ حکمرانوں کے تمام مقاصد سیاسیہ کے لیے مساعد و مشارک اور آلۂ تعمیل و وسیلۂ تنفیذ بنی۔ اب ہندستان کے مسلمانوں کے لیے سواد اعظم کی راہ تو تعبد و تزلف اجانب ہی کی راہ ہو گئی تھی۔ اور جو صدائے عزم و ہمت بھی بلند کی جاتی شواذ و قلیلین ہی کی ہوتی پھر اگر اتبعوا السواد الاعظم کا مطلب یہی ٹھہرا جو آپ سمجھے ہوئے ہیں تو پھر صدائے عزم و سعی جو یہاں بلند کی جاتی "میتة جاهلیه" اور من شذ شذ في النار والی صدا ہی ہوتی۔

فیصلہ جماعت کیوں کر ہو؟

میں یہ محض ایک نظری بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ واقعہ دہرا رہا ہوں۔ اچھا اگر انجمن بازی کی تشویش و مسابقت اور طوائف الملو کی اور اعجاب کل ذی رای برایه کی یہ ساری بوقلمونی بھی جماعت مصطلحۂ احادیث ٹھہری تو سواد الاعظم کا فیصلہ کیوں کر ہوگا؟ کیا یہ اصطلاح پنجاب پرچیاں پڑیں گی اور جو انجمن اس میں بازی لے جائے گی وہی جماعت قرار پائے گی اور اس کی سبیل سبیل المومنین ہوگی؟

عزیزِ من! سارا رونا تو اسی کا ہے کہ جماعت ہے کہاں؟

کاش کہ ہندستان میں مسلمان کوئی ایسا نظام قایم کرتے جو ناقص معنوں ہی میں

حقیقت جماعت کا رنگ پیدا کر سکتا! آپ کی یہ ستم ظریفی قابلِ داد ہے کہ جماعت و التزام جماعت کا آپ نے شکوہ بھی کیا تو اسی نا مراد سے جو بائیس برس سے اس حقیقت کے لیے شکوہ سنج رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ آپ میری ہی تحریرات کا حوالہ دیتے ہیں!

این سخن را چہ جواب است تو ہم مے دانی

۱۹۱۴ء میں جب میں نے ہندوستان کے بعض اکابر علماء و مشائخ کو عزم وسعی کی دعوت دی۔ بعض سے خود ملا اور بعض کے پاس مولوی عبید اللہ سندھی کو بھیجا تو اکثر نے بعینہٖ یہی بات کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ یعنی علماء و مشائخ کی اتنی بڑی تعداد ملک میں موجود ہے کسی نے بھی آج تک یہ دعوت نہیں دی، اب سوادِ اعظم کے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا جا رہا ہے؟ اِن ھٰذا اِلَّا اختِلاق [۲]

جماعت مصطلحہ حدیث:

پھر یہ بھی نہیں معلوم آپ نے جماعت مصطلحۂ حدیث کا مطلب کیا سمجھا ہے؟ غالباً آپ آج کل کی انجمن بازیوں اور کانفرنس آرائیوں کو جماعت سمجھتے ہیں۔ مثلاً انجمن حمایت اسلام، علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس، جمعیۃ العلماء، احرار کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم کانفرنس گویا اس طرح کی جب کبھی کوئی انجمن بن جائے اور اس کا سالانہ جلسہ بھی کسی نہ کسی طرح منعقد کر لیا جائے تو یہ جماعت مصطلحۂ احادیث باب ہو گئی اور اب تمام مسلمانوں پر فرض ہو گیا کہ آنکھ بند کر کے اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ نہیں کریں گے تو راہِ شذوذ اختیار کریں گے اور من شذ شذ فی النار کی تعزیر کے مستوجب۔ اگر آپ نے جماعت اور التزام جماعت کا مطلب یہی سمجھا ہے تو اس پر اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

وائے گر از پس امروز بود فردائے

ابوالکلام

حواشی:

[۱] یعنی التزام جماعت اور علیکم بالسواد الاعظم۔

[۲] سورۂ ص کی آیت کے آخری جملہ: ''یہ محض ایک گھڑی ہوئی بات ہے'' مولانا نے ترجمان القرآن میں سورۂ توبہ کی آیت ۴۹ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا ہندستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصد وقت پر توجہ دلاؤں، ممکن ہے چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں۔ چناں چہ میں نے اس کی کوشش کی لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تھی، جواب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے''۔ [ترجمان القرآن: جلد دوم [اشاعت اول]، بجنور، ص ۹۵] غالباً اسی واقعے کا ذکر مکتوب میں ہوا ہے۔

[۷] ﴿۲۰۰﴾

کلکتہ،

۲۹ر جولائی ۱۹۲۷ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

آپ کا خط پہنچا۔ آپ نے الہلال کے مضامین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اگرچہ اسے پڑھ کر نہایت مایوسی ہوئی، آپ کے ذہن و فکر کے لیے ایسی مایوس رائے میں نہیں رکھنی چاہتا تھا۔ تاہم اس کی یہ توجیہہ میں نے کر لی کہ جب آدمی کو کسی ایک ہی چیز سے ذوق و شغف ہو تو وہ دنیا کی ہر چیز میں وہی ڈھونڈتا ہے اور وہ نہیں ملتی تو کہہ دیتا ہے کہ کچھ نہیں۔ آپ کو لکھنے پڑھنے کی چیزوں میں سے صرف ایک خاص نوعیت کے مذہبی مباحث کا شوق ہے اور علم و ادب کی ساری دنیا آپ کے لیے بے معنی ہے۔

الہلال کے مکاتیب خصوصی:

لیکن اسی سلسلے میں آپ نے ایک بات ایسی لکھ دی ہے کہ جس میں کسی طرح کی توجیہہ کی گنجایش نہیں۔ یہ چیز اس درجے مستبعد تھی کہ پہلی مرتبہ میں پڑھ گیا مگر کوئی

مطلب اخذ نہ کر سکا۔ دوسری مرتبہ پھر پڑھا اور معلوم ہوا واقعی آپ کا مطلب وہی ہے، جسے میں اپنے نزدیک مستبعد سمجھ رہا ہوں۔ آپ لکھتے ''اسٹیٹس مین''، ''ٹائمز'' وغیرہ میں جو چھٹیاں شایع ہو چکی ہوں، ان کا دو دو اور چار چار ہفتے کے بعد زیرِ عنوان نامہ نگار خصوصی شایع ہونا کسی طرح بھی الہلال کے شایانِ شان نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ''اسٹیٹس مین'' اور ''ٹائمز'' میں جو چھٹیاں شایع ہوتی ہیں انھیں چار چار ہفتہ کے بعد ترجمہ کر کے ''الہلال'' کے ''نامہ نگار خصوصی'' کے نام سے شایع کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ایک چیز کذب و تزویر کے ساتھ دوسرے شخص کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے[۱]۔

اگر ''الہلال'' میں کذب و تزویر کا یہ شیوہ اختیار کیا گیا ہے تو یقیناً یہ انتہا درجے کی سفاہت اور کمینہ پن بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز ہے۔ لیکن چوں کہ میرے لیے یہ محال عقلی ہے کہ الہلال کی ایک سطر بھی اس طریقے سے استعمال کی گئی ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے طریق نقد و انکشاف سے بہ تفصیل واقفیت حاصل کر لوں۔ براہِ عنایت مطلع کیجیے کہ الہلال کا کون کون سا مضمون ''اسٹیٹس مین'' یا ''ٹائمز'' سے اس طرح لیا گیا ہے؟ یہ عذر نہ کیجیے گا کہ آپ نے پرچہ رکھا نہیں اور تاریخ حافظے میں محفوظ نہیں رہی۔ اگر اسٹیٹس مین اور ٹائمز آپ کے پاس موجود نہ ہوں یا ان کا نمبر یا تاریخ نہ بتلا سکیں تو کوئی مضایقہ نہیں بہ ہر حال وہ انھی ایام کے ہوں گے جو الہلال کی اشاعت کے ہیں۔ آپ صرف الہلال کے وہ مضامین بہ حوالہ نمبر لکھ دیں۔ اور اتنی تصریح کر دیں کہ تقریباً دو ہفتے یا چار ہفتے گزرے کہ یہ مضمون ''اسٹیٹس مین'' یا ''ٹائمز'' میں نکلا تھا آپ نے ''اسٹیٹس مین'' یا ''ٹائمز'' کے ساتھ احتیاطاً ''وغیرہ'' کا لفظ بھی لکھ دیا ہے۔ پس اگر دونوں اخباروں کا آپ حوالہ نہ دے سکیں تو کسی دوسرے اخبار کا سہی جو دنیا میں شایع ہوتا ہے مجھے امید ہے کہ آپ تاخیر نہ کریں گے اور فوراً مطلع کریں گے آپ نے ایک ایسا کمینہ پن میری طرف منسوب کیا ہے جس کا مجھے کبھی وہم و گمان

بھی نہیں ہوا تھا۔ اب آپ کا اخلاقی و شرعی فرض ہے کہ اس کا اثبات بہم پہنچائیں[۲]۔

حقیقتِ حال:

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ''الہلال'' میں کوئی چیز چھپ نہیں سکتی جب تک میں دیکھ نہ لوں۔ مصر اور ٹرکی وغیرہ سے جو خطوط آتے ہیں ان کا ترجمہ بھی جب تک میں دیکھ نہیں لیتا، درج نہیں ہوتا۔ اکثر ان میں غیر ضروری تمہیدیں ہوتی ہیں یا غیر دلچسپ اطناب اس لیے وہ حذف کرنا پڑتا ہے۔ پس اگر ان چھٹیوں میں اس طرح کا پاجیانہ معاملہ کیا جا رہا ہے تو وہ کوئی دوسرا نہیں کر رہا، خود میں کر رہا ہوں یا پھر سامی بے ڈائریکٹر جنرل انگورہ اور عارف حکمت ایڈیٹر سبیل الرشاد جیسے اشخاص کر رہے ہیں[۳] کہ وہ ''اسٹیٹس مین'' یا ''ٹائمنز'' اور ''وغیرہ'' سے پرانے مضامین لے کر بھیج دیتے ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ غالباً وہ ان اخبارات کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔

''ٹائمنز'' تو یہاں آتا نہیں لیکن ''اسٹیٹس مین'' میں روز پڑھتا ہوں میں نے آج تک ''اسٹیٹس مین'' میں کوئی چٹھی باہر کی نہیں دیکھی۔ صرف گاہ گاہ وہ پہلے صفحہ میں لندن کی کوئی مراسلت دے دیا کرتا ہے۔

بہ ہر حال اس معاملے میں یا تو آپ نے کذب و تزویر کی انتہا کر دی ہے یا میں نے اور دونوں کے لیے بہتر نہیں کہ ایسا کریں پس براہ عنایت ''اسٹیٹس مین'' یا ''ٹائمنز'' اور ''وغیرہ'' میں جتنے مضامین دیکھے ہوں ان سے مطلع کیجیے!

دوسرے مقالات و مضامین:

آپ نے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات ایسی لکھی ہے جس پر مجھے ہنس دینا پڑا۔ آپ لکھتے ہیں اعادۂ شباب جیسے مضامین اور مس اسٹین پوپ کا مرقع حیات [۴] اور اس کے بعد کچھ نہیں لکھتے۔ گویا یہ دونوں چیزیں اس درجہ لغو اور مہمل ہیں اور ان کی لغویت اس درجے معروف و مسلم ہے کہ اصولِ بلاغت کے مطابق صرف ان کا ذکر

کر دینا ہی کافی ہے، لیکن آپ کو یاد نہیں رہا کہ ہر شخص نے علم و ادب میں اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ اتنا بلند پایہ اشارہ پا لے۔ کم از کم میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

آخر اس سے مطلب کیا ہے؟ یعنی کیا یہ بھی ''اسٹیٹس مین'' یا ''ٹائمز'' اور ''وغیرہ'' سے لیا گیا ہے یا ان کے مطالب میں کوئی سخت غلطی ہوئی ہے یا علمی اور تاریخی مضامین شایع کرنا بہت ہی بُری بات ہے؟ اعادۂ شباب والا مضمون نہایت ضروری اور وقیع تھا اس عملیہ کا ذکر کثرت کے ساتھ انگریزی اخباروں میں ہو رہا تھا، لیکن اس وقت تک اردو میں کوئی مضمون ایسا شایع نہیں ہوا تھا جس سے اس کی طبی و علمی حیثیت واضح ہوتی۔ الہلال میں مذاکرۂ علمیّہ کا باب اسی غرض سے رکھا گیا ہے کہ وقت کے علمی مباحث و انکشافات اس میں شایع کیے جائیں۔ لیڈی اسٹین ہوپ والا مضمون بالکل ایک نئی تاریخی معلومات ہے جو آج تک عام نظروں سے پوشیدہ تھی۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں ایک شخص کا شام میں مقیم ہو جانا اور مشرقی زندگی اختیار کر لینا، غرابت کی دلچسپی کے ساتھ علم کا فایدہ بھی رکھتا ہے۔ یہ دراصل ایک کتاب سے ماخوذ ہے جس میں اس طرح کے بیالیس اشخاص کے حالات ہیں۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ ان میں سے نصف کے قریب الہلال میں شایع کر دیے جائیں۔

عزیز من آپ کے دینی اخلاص اور ذوق سے ہمیشہ میرے دل میں توقعات رہی ہیں، لیکن میرا خیال تھا کہ علمی و ادبی ذوق سے بھی ان لوگوں کو کورا نہیں ہونا چاہیے جنھوں نے میرے لکھنے پڑھنے کی زندگی سے فایدہ اٹھایا ہے۔ کم از کم ان معاملات میں رائے سلیم و صالح رکھنی چاہیے، لیکن آپ نے یہ خط لکھ کر مجھے بہت مایوس کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک آدمی ان کوچوں سے بالکل نا آشنا ہو۔ معلوم نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے اور کیوں اس طرح کی خیرہ مذاقی کی نمایش کر کے مجھے مایوس کر رہے ہیں۔ آپ کہیں گے مجھے صرف قرآن حکیم کے مباحث کا شوق ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ ہر مضمون اسی موضوع پر ہو اور جو اس پر نہ ہو وہ لغو ہو۔ جن گوشوں کا

ہم کو ذوق نہیں، یقیناً وہ ہمارے میدان نہیں ہیں، لیکن دماغ میں اتنی صلاحیت ضرور ہونی چاہیے کہ ان کی نسبت رائے قایم کرتے ہوئے جہل و ناواقفیت ظاہر نہ ہو۔ ایک درمیانی درجے کی رائے دی جا سکے۔

پنجاب ہائی کورٹ کا فیصلہ:

آخر میں آپ نے اس مضمون کا ذکر کیا ہے جو دلیپ سنگھ کے فیصلے [۵] کے متعلق ہے میں حیران ہوں ادھر آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نہیں سمجھتا تھا آپ کے عقل و فہم کا یہ حال ہوگا۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ بے تامل سطروں کی سطریں لکھ گئے ہیں۔ اور ان کے ہر لفظ میں ایک غلط مقدمہ پوشیدہ ہے کہاں تک میں صفحے سیاہ کروں؟ آپ لکھتے ہیں کیا آپ [۶] کی خدمت میں کوئی جواب دعویٰ یا اپیل کی گئی تھی کہ آپ نے یہ مضمون لکھا؟ [۷] اس میں بھی وہی بلیغانہ اجمال ہے کہ کچھ معلوم نہیں ہوتا مطلب کیا ہے؟ غالباً مطلب یہ ہے کہ قانون کی بنا پر کیوں لکھا۔ درمختار اور ہدایہ کے حوالے کیوں نہیں دیے؟ اگر یہی مطلب ہے تو بجز انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ دینے کے اور کیا لکھوں؟ اگر یہ معاملہ قانونی نہیں ہے تو کیا ہے؟ ہندستان میں غیر قوموں کے ساتھ مسلمان بستے ہیں۔ ایک غیر حکومت قایم ہے۔ اس کا قانون ہے، اس کے اصول ہیں اور اب اس سے خطاب و مطالبے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ صرف اس کے مسلّم قانون کی بنا ہی پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اسے اس سے کیا غرض کہ درمختار اور ہدایہ میں کیا ہے؟ اس سے بڑھ کر کوئی لغویت نہیں ہو سکتی کہ اس طرح کے تخاطب میں اپنے مذہبی احکام رٹے جائیں۔ اگر میں قانونی حیثیت سے اس پر بحث نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟

پھر مذہبی احکام بھی ایک لفظ ہے، جو لوگوں نے سیکھ لیا ہے۔ نہ ان کی خبر ہے، نہ ان کا محل معلوم ہے، نہ استنباط اور انطباق کا سلیقہ ہے۔ اس بارے میں شرعی حکم کوئی ایسا

نہیں جو سود مند وقت ہو۔ شرعی حکم کا یہ حال ہے کہ اگر اسلامی حکومت ہو اور ذمی، ذمہ کا غلط استعمال کر کے شب وشتم کریں تو نظر بہ مصالح شرع وامت قضا کے احکام مرتب ہوں گے اور قاضی کے لیے ضروری ہوگا کہ تعزیر کرے۔ تعزیر کے مختلف مراتب ہیں اور حبس سے لے کر قتل تک کیا جا سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کو قتل سے اختلاف ہے لیکن چوں کہ تعزیر سے نہیں اس لیے فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں، لیکن بہ حالت موجودہ یہ باتیں کیا سود مند ہو سکتی ہیں؟ نہ اسلامی حکومت ہے، نہ ذمی ہیں، نہ ذمہ ہے، اس قسم کے تمام امور میں جب کبھی شرع کا نام لیا جائے گا تو صرف ایک ہی چیز سامنے آئے گی۔ یعنی قیامِ حکومت! اگر لوگ اس سے غافل ہیں اور موجودہ حالت پر قانع تو یہ اقتناع شرعاً ناجائز ہے۔ لیکن اس حالتِ اقتناع میں اگر ایک غیر مسلم کوئی ایسی بات کہے یا لکھے، جس پر بہ حالت حکومت ہم تعزیر کر سکتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہم شرعاً کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف اس سے تنبہ واعتبار حاصل کر کے قیام امر کے لیے سعی کرنی چاہیے۔

بعض تقریریں:

آپ لکھتے ہیں ''سبُ النّبی'' ملک کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ جو خالص مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے نہایت ہی عزیز بھائی ہجو ودعاع کی تقلید میں وارفتہ ہو کر عقل وفہم سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔ میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھے میرے اسلام نے جو ذہنیت بخشی ہے، اس کا فیصلہ یہ نہیں ہے۔ مجھے قطعاً اس سے انکار ہے کہ چوں کہ تاریخ نوع بشر کے ۱۹۲۷ء یا اس سے پہلے کسی برس میں ہندستان کے ایک مجہول اور مجنونِ جہل کیڑے مکوڑے نے، یا دو نے، یا تین نے ایک یا چند رسالے لکھ کر تاریخ انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت کے خلاف بدزبانی کی ہے، اس لیے اس کے ناموس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی عزت وحرمت کا سوال پیدا ہو گیا،...... مسلمانوں کی موت وحیات کی گھڑی آ گئی اور اب رونا چاہیے اور ہائے وائے مچانا چاہیے اور چیخنا

چاہیے کہ مذہب کا سب سے بڑا معاملہ آ گیا اور قیامت ٹوٹ پڑی ہے، مجھے اس سے بھی قطعاً انکار ہے کہ چوں کہ راج پال نامی کسی مجہول نے احمد شاہ شایق کی خوشہ چینی کر کے چار ورق چھاپ دیے، اس لیے امہات المومنینؓ کی عزت کا سوال پیدا ہو گیا.............[۸]، یہ وہ باتیں ہیں جو آپ لوگوں نے [آپ اس لیے کہ پہلے میرا خیال نہ تھا کہ آپ بھی اس حمام میں پہنچ گئے ہیں] علانیہ سورج کی روشنی میں کہی ہیں اور یہ آپ لوگوں کے فدائیان رسولؐ کی سب سے بہترین تقریریں ہیں، جن کی رپورٹیں اخباروں میں چھاپی گئی ہیں اور ان پر فخر کیا گیا ہے، مجھے اس سے قطعاً انکار ہے۔ انکار ہی نہیں بلکہ میں اسے اللہ کے برگزیدہ رسولؐ اور اس کے اہل بیتؓ مطہر کی بڑی سے بڑی توہین سمجھتا ہوں، جو دنیا میں ہو سکتی ہے قطعاً راج پال نے عالم انسانیت کی اس سب سے بڑی ہستی کی اتنی توہین نہیں کی۔ جس قدر آپ لوگ کر رہے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتے۔ آپ کو معلوم نہیں پچھلے دنوں کسی چیز نے مجھے اتنی اذیت نہیں دی [۹] جس قدر آپ کے فدائیان رسول کی ان ناقابلِ برداشت لغویتوں نے۔ کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا. لطف یہ ہے کہ آپ ازراہ جوش ایمانی مجھے بھی دعوت دیتے ہیں کہ اس میں حصّہ لوں میرے عزیز! اس کو غنیمت سمجھو کہ..........[۱۰] گرفتار ہو گئے اور مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ اس بارے میں کچھ لکھوں ورنہ مضمون تیار تھا اور کمپوز ہو رہا تھا۔ اب وہ رہا ہو جائیں اور جو کچھ ہونا ہے ہو جائے تو اپنا جو فرض اسلامی سمجھتا ہوں۔ اس کے مطابق لوگوں کو بتلاؤں گا کہ انھوں [۱۱] نے کیسا غلط اور گمراہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

ناموس رسولؐ:

مجھے قطعاً اس سے انکار ہے کہ عوام کی یہ ذہنیت بنانے کی کوشش کی جائے کہ کوئی چوہا اچھلا اور انھوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا کہ اسلام کی کشتی ڈوب گئی۔ جہاں کسی

آریا نے کوئی بات کسی جلسے میں یا اخبار میں کہہ دی اور بس شور مچانا شروع کر دیا کہ اسلام ختم ہو گیا۔ آپ لوگوں کو نہ تو ان معاملات کی خبر ہے، نہ تقلید عوام موقع دیتی ہے کہ دینی روشنی میں حالات کو دیکھیں۔ آپ نہیں جانتے کہ اس طریقے سے مسلمانوں کی جماعتی ذہنیت کس طرح قتل کی جارہی ہے۔ قومی خودداری، شرف نفس، علوِ نظر اور سنجیدگی و متانت کی جگہ ان میں خفیف الحرکتی، چھچھوراپن اور دوں ہمتی کی تخم ریزی کی جارہی ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے رسول کی فداکاری!

حیرت کی بات ہے کہ ایک صاف بات جو صحیح طریقے سے کی جاسکتی ہے، اسے خواہ مخواہ غلط طریقے سے کیوں کیا جاتا ہے؟ جو لوگ اس طرح کا پاجی پن کرتے ہیں قطعاً قانون کو ان کا علاج کرنا چاہیے۔ اور ضرور اس کا مطالبہ کرنا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اپنے قومی شرف کو تاراج کرنے کے لیے ناموس رسولؐ ناموس رسولؐ کا شور مچایا جائے۔

کیا لغویت ہے اگر کسی ایسی کتاب کے لکھ دینے سے نعوذ باللہ رسولؐ کے ناموس اور امہات المومنینؓ کے ناموس کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو ان بر خود غلط لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں تو کب سے ناموس کا خاتمہ ہو گیا ہے کیونکہ کم از کم دس ہزار کتابیں تو اعدائے اسلام نے لکھی ہوں گی اور ہندستان میں بھی آج نہیں اب سے ستائیس برس پہلے خاتمہ ہو چکا ہے۔ جب احمد شاہ نے امہات المومنینؓ لکھ کر لودھیانہ مشن سے شایع کی تھی۔

صحیح رائے کی ضرورت:

بہ ہر حال کہاں تک لکھوں، اگر یہ بات کسی دوسرے شخص نے لکھی ہوتی تو میں صرفِ وقت ضروری نہ سمجھتا، لیکن آپ میرے عزیز ہیں۔ میں سمجھتا رہا ہوں کہ مجھ سے محبّت و اخلاص کا رشتہ پیدا کر کے آپ نے میری سمجھ اور میری نظر حاصل کر لی ہے آپ

کا اس طرح کی بات لکھنا اور اس اسپرٹ میں لکھنا گویا ایک بڑی مضبوط اور مسلم بات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں، میرے لیے نہایت تکلیف دہ ہوا۔ خدارا اخبار فروشوں کی تقلید اعمیٰ میں اس طرح وارفتہ نہ ہو جاؤ۔ ہر معاملے پر اپنی دماغی روشنی سامنے لا کر رائے قایم کرنی چاہیے۔ اگر آپ کا بھی یہی حال ہوا تو پھر آپ میں اور آج کل کے اخبار فروشوں کی رایوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

امید ہے مضامین اسٹیٹس مین اور ٹائمنر کی نسبت پوری توجہ کر کے اطلاع دیں گے آپ کا یہ خط آ جائے تو پھر میں آپ کے دوسرے سوالات کا جواب دوں۔ معلوم نہیں آپ کے والد مع الخیر واپس آئے یا نہیں۔[۱۲]

ابوالکلام

حواشی:

[۱] معلوم نہیں مولوی محی الدین احمد صاحب نے کس خیال سے یہ سب لکھ دیا مفصّل جواب خود مولانا نے دے دیا ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ دورِاول کے الہلال ہی سے نہیں ''البلاغ'' سے بھی دورِ ثانی کا الہلال خاصا مختلف تھا اس وجہ سے بادۂ کہن کے لذت شناسوں کو شکایت پیدا ہوئی۔ حال آں کہ دور ثانی کا الہلال بھی خالص علمی نقطۂ نگاہ سے بہ دستور بہترین جریدہ تھا۔

[۲] مجھے معلوم نہیں مولوی محی الدین احمد صاحب نے یہ کیوں لکھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کی طبیعت کو جس الہلال سے خاص مناسبت تھی وہ نہ ملا اور اس میں ویسے ہی بیرونی مکتوب شایع ہوتے دیکھے جو دوسرے جراید میں بھی چھپتے تھے تو عام تاثر کی بنا پر بے تکلف لکھ دیا کہ یہ اسٹیٹس مین یا ٹائمنر وغیرہ کا چربہ ہوتا ہے۔

[۳] گویا یہ اصحاب اور ان کے علاوہ دوسرے اشخاص ۱۹۲۷ء میں الہلال کے نامہ نگارانِ خصوصی تھے۔

[۴] یہ ''الہلال'' کے دو مضمونوں کی طرف اشارہ ہے۔

[۵] جسٹس دلیپ سنگھ جو ہائی کورٹ پنجاب کا جج تھا اور اشارہ راج پال کی کتاب کے فیصلے کی طرف ہے۔

[۶] آپ سے مراد مولانا ہیں۔

[۷] اس سے غالباً وہ مضمون مراد ہے جو یکم اور ۸ر جولائی ۱۹۲۷ء کے مشترکہ نمبر ''الہلال'' میں بہ عنوان ''پنجاب ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ'' شایع ہوا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ جسٹس دلیپ سنگھ نے اصل کتاب کو قابل اعتراض قرار دیا، مگر ساتھ ہی لکھا

کہ یہ کتاب دفعہ ۱۵۳ ۱ رالف کی زد میں نہیں آتی جو پراسیکیوٹر نے لگائی ہے۔ مولانا نے اپنے مضمون میں ثابت کیا تھا کہ یہ کتاب دفعہ ۱۵۳ ۱ رالف کی زد میں آتی تھی۔ پھر یہ تجویز پیش کی کہ اگر ایک عدالت عالیہ نے ایسا فیصلہ کر دیا ہے تو اب ایک صاف اور غیر مشتبہ قانون مذہبی دل آزاریوں کے انسداد کے لیے بن جانا چاہیے۔

[۸] جن فقروں کی جگہ اوپر اور یہاں نقطے لگائے گئے ہیں ان میں وقت کی عام تقریروں کے خاص الفاظ و تعبیرات درج تھے لیکن اب انھیں دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم انھیں حذف کر کے نقطے لگا دینے سے اصل مضمون مکتوب پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

[۹] یہاں بھی انھیں خاص تقریروں کی طرف اشارہ ہے جن کے بعض فقرے مولانا نے اوپر لکھے تھے۔ ان کی قطعی رائے تھی کہ دوسروں نے جو کچھ کیا، اس کی نازیبائی کتنی ہی مکروہ سمجھ لی جائے، مگر مسلمان مقرروں نے اس سلسلے میں جو تقریریں کیں اور ان میں جیسے الفاظ و تعبیرات سے کام لیا وہ زیادہ رنجدہ، اذیت افزا اور توہین آمیز تھے۔

[۱۰] یہاں دو مشہور مقرروں کے نام درج تھے، جو تقریروں ہی کی وجہ سے گرفتار ہو گئے تھے۔

[۱۱] یعنی لوگوں نے۔

[۱۲] یہ مولانا عبدالقادر مرحوم قصوری کے سفر حج کی طرف اشارہ ہے۔

[۸] ﴿۲۰۱﴾

۱۹۔اے، بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۴۔۱۰۔۱۹۳۵ء

عزیزی! السلام علیکم

معلوم ہوتا ہے، ہارون آباد میں آپ کی ڈاک کا انتظام ٹھیک نہیں یا کوئی اور بات پیش آ رہی ہے۔ عرصہ ہوا آپ کا خط آیا تھا جو میرے پہلے خط کا جواب تھا جس دن خط ملا اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھیج دیا اور پتا وہی لکھا تھا جو آپ کے سابق خط میں مرقوم تھا لیکن پھر آپ کا خط ملا، جس سے معلوم ہوا آپ میرے جواب سے بے خبر ہیں۔ میں نے مکرر سابق خط کا خلاصہ بھی لکھا اور نئی صورت کا بھی لیکن اب پھر آپ جواب کا تقاضہ کر رہے ہیں، یہ بات کیا ہے؟ یہ خط میں رجسٹرڈ بھیج رہا ہوں۔

میں ادھر ارادہ کر رہا تھا کہ جنوری سے الہلال ماہوار رسالے کی شکل میں شایع کرنا

شروع کردوں، کیوں کہ لوگوں کا تقاضا حدِ برداشت سے گزر چکا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ماہوار رسالہ وہ مقاصد پورے نہیں کرسکتا جو ہفتہ وار رسالے سے متوقع ہیں اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہفتہ وار ''الہلال'' اپنی اصلی شان میں دوبارہ شایع ہو تو اس سے زیادہ کوئی عملی اور متقین کام نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کی اشاعت جبھی کار آمد ہوسکتی ہے جب کہ صحیح معنوں میں ''الہلال'' ہو اور اس کے لیے دو باتوں کا انتظام ضروری ہے:

اولاً روپے کا

ثانیاً اس کا کہ کم از کم ایک سال تک میں براہ راست اسے وقت دوں اور میری نگرانی میں مرتب ہو۔ اس کے بعد جب ایڈیٹوریل اسٹاف کا سانچا ڈھل جائے تو براہ راست نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

روپے کا آپ انتظام کر نہیں سکیں گے اور نہ میں کلکتہ بیٹھے ہوئے لاہور کے پرچے کی نگرانی کرسکوں گا۔

پچھلی مرتبہ اسی لیے دہلی کا خیال ہوا تھا کہ میں وہاں تک جا سکتا ہوں اور ٹھہر سکتا تھا مگر اللہ کو منظور نہ تھا کہ معاملہ انجام پائے۔[۱]

الہلال کے لیے قطعی ہے کہ ذاتی پریس ہو۔ کم از کم ایک لیتھو اور ایک ٹائپ کی مشین اور کافی لوازم پھر پہلے سال کے لیے اتنا روپیہ ہاتھ میں رہنا چاہیے کہ بروقت کام نہ رکے۔ پھر انتظامی اور تحریری اسٹاف کا سوال ہے۔ اس کے مصارف مطلوب! البتہ یہ ظاہر ہے کہ مالی اعتبار سے اس کا نفع بخش ہونا قطعی ہے، لیکن انفاق سرمایہ کے بعد۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر ستائیس ہزار روپے پریس پر اور پہلے سال کے مصارف پر لگا دیا جائے تو دوسرے سال سے الہلال کم از کم چوبیس ہزار روپیہ سال کی خالص بچت کا کاروبار ہو جاسکتا ہے۔

آج کل کوئی کاروبار ایسا نہیں ہے، جو اس درجہ نفع بخش ہو سکے، لیکن مشکل یہ ہے

کہ شخصی طور پر سر دست اتنی رقم کا بھی انتظام مشکل ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ کسی نہ کسی طرح پرچہ نکال دینا تو یہ کچھ بھی سودمند نہ ہوگا، کیوں کہ مقصود ایک پرچہ نکال دینا نہیں ہے بلکہ سچ مچ کو الہلال نکالنا ہے۔

میں نے اسی لیے مشترک سرمایہ کی تجویز لکھی تھی۔

یقیناً یہ صورت حال بہت ہی افسوس ناک ہے کہ تمام ملک ایک ایسے پرچے کا خواہش مند ہو اور اس کی بنیاد استوار نہ کی جائے، لیکن بغیر سرمایے کے اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے اپنے اور میرے معاملے کی نسبت لکھا۔ وہ کوئی بحث طلب مسئلہ نہیں ہے۔ میں ایک منٹ میں آپ سے طے کرلوں گا سوال اصل کام کے اسباب کا ہے۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] مولوی محی الدین احمد صاحب نے لکھا تھا کہ اگر اجازت دیں تو ''الہلال'' لاہور سے جاری کر دیا جائے اس کے جواب میں یہ خط تحریر فرمایا گیا۔ اس کا کوئی حصہ مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ مولاناؒ نے ایک مرتبہ کلکتہ سے دہلی میں منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ دریا گنج میں مکان لے لیا گیا۔ کلکتہ سے پریس دہلی میں بھیجنے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ لیکن دیش بندھو چترنجن داس کو علم ہوا تو انھوں نے مولانا کو دہلی آنے نہ دیا اور مشینیں پھر کلکتہ ہی میں نصب کر دی گئیں۔ غالباً اس کے بعد بھی ایک مرتبہ دہلی سے ''الہلال'' جاری کرنے کی تجویز ہوئی تھی۔

[۹] ﴿۲۰۲﴾

۲۴-۹-۱۹۳۶ء

عزیزی!

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ترجمان القرآن جلد دوم کا کوئی نسخہ اب یہاں باقی نہیں رہا ہے۔ میں نے تھوڑے سے نسخے دوستوں کو دینے کے لیے رکھ لیے تھے،

وہ سب ختم ہو گئے۔ اب میں اس خط کے ساتھ ایک خط شیخ مبارک علی کے نام لکھے دیتا ہوں۔ انھیں بھیج کر منگوا لیجیے۔ قیمت وہ میرے حساب میں مجرا کر لیں گے[۱]۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] مولاناؒ نے ترجمان کی دوسری جلد چھپتے ہی اس کے دو نسخے بھیج دیے تھے۔ ایک مولوی محمد علی صاحب برادر مولوی محی الدین احمد کے لیے جو لاہور میں مقیم تھے اور دوسرا مولانا عبدالقادر کے لیے قصور میں۔ مولوی محی الدین احمد اس وقت بمبئی میں مقیم تھے۔ اور مولانا کے نزدیک قصور والا نسخہ مولانا عبدالقادر اور مولوی محی الدین احمد دونوں کے لیے تھا۔ بعد میں مولوی محی الدین احمد کا خط گیا تو یہ خط بھیج دیا کہ شیخ مبارک علی سے منگوا لیجیے جو ترجمان جلد دوم پوری کی پوری خرید چکے تھے۔

[۱۰] ﴿۲۰۳﴾

۱۹۔اے، بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۳۰۔۹۔۱۹۳۷ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ جس وقت سے یہ معاملہ میرے سامنے آیا ہے، میں برابر اس پر غور کر رہا ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ اگر سرحد میں کوئی موزوں تعلیمی جگہ نکل آئے تو یہ آپ کے لیے زیادہ موزوں ہوگی۔ وہاں کام کا بہت بڑا میدان ہے اور کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ اب آپ نے بمبئی کے لیے لکھا ہے تو میں بمبئی بھی لکھتا ہوں۔ انشاء اللہ میری جانب سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

میرا خیال اب بھی سرحد کے لیے ہے۔ وہاں کئی کام اصلاحی شروع کرنے ہیں اور بہ آسانی موزوں جگہ نکل سکتی ہے۔

پنجاب کانگرس کے جھگڑے بدستور چلے جا رہے ہیں، بلکہ روز افزوں ہیں، امید

نہیں کہ ستیہ پال پارٹی اور گوپی چند پارٹی کی کشاکش ختم ہوسکے۔اس کا علاج صرف یہی ہے کہ اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا پر عمل کیا جائے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔آپ کے والد اگر آمادہ ہوتے تو ایک نیا تجربہ کیا جاسکتا تھا لیکن وہ بھی تھک کر بیٹھ چکے ہیں۔

سکندر حیات نے بلا ضرورت ستیہ پال کے خلاف تقریر کردی اور اب ایک نیا جھگڑا ان دونوں میں شروع ہوگیا۔

اپنے والد[۱] کو میرا اسلام پہنچایئے اور عزیزی احمد علی[۲] کو بھی۔والسلام علیکم

ابوالکلام

حواشی:

[۱] مولانا عبدالقادر قصوری۔

[۲] مولوی محی الدین احمد کے بھائی۔

[۱۱] ﴿۲۰۴﴾

کلکتہ

۱۹۔۱۰۔۱۹۳۷ء

عزیزی! السلام علیکم

دونوں خط پہنچے۔دونوں کا جواب بہ ترتیب لکھتا ہوں:

ا۔پنجاب کانگرس کے باہمی اختلافات یقیناً ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے ہیں اور ضروری ہے کہ اصلاح حال کی کوئی فیصلہ کن کوشش کی جائے۔میں نے ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر گوپی چند[۱] دونوں کو لکھا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے موقع پر کلکتہ ضرور آئیں تاکہ بالمشافہ گفتگو ہوسکے۔میں اصلاح حال کی پوری کوشش کروں گا، نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے۔

۲۔ آپ نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نے مسلم ماس کنٹیکٹ کے لیے روپیہ لیا اور اسے اپنی پارٹی کی راہ میں خرچ کیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ رقم کہاں سے لی گئی؟ پراونشیل کانگرس کمیٹی سے یا کسی دوسری جماعت یا فرد سے؟ اس بارے میں اگر کوئی پختہ بات سامنے ہو تو اس سے فوراً مطلع کیجیے۔

۳۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پنجاب کے مسلمان اس لیے کانگرس سے بے دل ہو گئے کہ پنجاب اسمبلی پارٹی نے کیوں یونٹی کانفرنس [۲] کی دعوت قبول کرلی۔ کانگرس کا طریق کار اس بارے میں ہمیشہ یہی رہا ہے کہ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے، لیکن ہر ایسی کوشش میں شریک ہونا اور اس کے لیے ساعی ہونا۔ یہ طرز عمل تو کسی طرح بھی درست نہ ہوتا کہ کانگرس شرکت سے انکار کر دیتی۔

۴۔ صوبہ سرحد میں انشاء اللہ نہایت آسانی سے ایک معقول جگہ نکل آسکتی ہے۔ اس میں کوئی دشواری نہیں دیکھتا۔ ضرورت صرف تھوڑے سے انتظار کی ہے۔ آپ اس معاملے کو اب مجھ پر چھوڑ دیجیے اور دیکھیے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

۵۔ آپ نے مجھے کاموں میں مدد دینے کے لیے جو آمادگی ظاہر کی ہے، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ میں ان شاء اللہ رمضان المبارک کے بعد اس بارے میں آپ کو لکھوں گا۔

۶۔ آپ نے جو تعلیمی رسایل لکھے ہیں، وہ ضرور بھیجیے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ یہ نصاب میں داخل ہو جائیں۔

تعلیمی اصلاح کا پورا معاملہ انجام دینا ہے اور ان میں ایک اہم کام تعلیمی نصاب کی درستگی بھی ہے۔ اس بارے میں بعض بنیادی مہمات زیر ترتیب ہیں انھیں ہو جانے دیجیے پھر یہ کام سامنے آئے گا کہ تمام قدیم رسایل تعلیم کو جانچا جائے۔ اور حسب ضرورت نئی چیزیں لکھوائی جائیں۔ اس وقت میں خود آپ کو بتلاؤں گا کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔

اپنے والد بزرگوار کو سلام پہنچا دیجیے، نیز عزیزی احمد علی سلمہ کو۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] پنجاب کانگریس کی دو مخالف پارٹیوں کے لیڈر۔

[۲] اس سے مراد وہ یونٹی کانفرنس ہے جس کا انتظام سردار سکندر حیات مرحوم و مغفور نے ۱۹۳۷ء میں کیا تھا۔ سردار صاحب اس وقت پنجاب یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے، جسے اسمبلی میں غیر معمولی اکثریت حاصل تھی اور اسی نے صوبے میں وزارت بنا رکھی تھی سردار صاحب کی خواہش یہ تھی کہ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے تمام اختلافی مسائل بہ طرز حسن طے کرا دیں۔ اس کانفرنس میں دوسری پارٹیوں کے علاوہ پنجاب کی کانگریس پارٹی بھی شریک ہوئی تھی۔

[۱۲] ﴿۲۰۵﴾

کلکتہ

۲۹۔۱۱۔۱۹۳۷ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ آپ نے اپنے ایک ابتدائی خط میں ڈاکٹر گوپی چند کی نسبت جو بات لکھی تھی یعنی ''ماس کنٹیکٹ'' کے لیے کسی رقم کو کہیں سے لینا اور اسے غلط طریقے پر خرچ کرنا۔ میں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ اس بارے میں تحقیق کر کے ضروری تفصیلات لکھیے اور اگر آپ لکھتے تو میں یقیناً اس بارے میں تحقیقات کرتا۔ آپ خط نہ لکھ سکے اور اس لیے اس بارے میں میں نے بھی کچھ پوچھ گچھ نہ کی لیکن یونٹی کانفرنس میں کانگرس پارٹی کی شرکت و عدم شرکت کے سوال کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور اس بارے میں آپ کا کچھ لکھنا یا نہ لکھنا کوئی اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر گوپی کی شخصیت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ کانگرس کے مسلک کا مسئلہ ہے اگر گوپی چند کا طریق کار غلط ہے تو اسے اسمبلی پارٹی کی لیڈری سے ہٹا دینا چاہیے۔ لیکن اس کی جگہ جو شخص بھی پارٹی لیڈر ہو گا۔ اس کے لیے اصولی سوال بدستور یہی رہے گا کہ اگر امن و اتحاد کے

لیے کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو بہ حیثیت کانگریس پارٹی کے اس سے تعاون کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ کانگریس کا مسلک اس بارے میں قطعی اور صاف ہے۔ یہ ہر ایسے اقدام سے تعاون کرے گی خواہ اقدام کرنے والے کانگریسی ہوں یا نہ ہوں۔

آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ستیہ پال اور گوپی چند کے جھگڑوں میں میری ہمدردی ہمیشہ ستیہ پال کے ساتھ رہی۔ بوجوہ میں گوپی چند کی پارٹی کے طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس معاملے میں محض گوپی چند کی چڑ سے ڈاکٹر ستیہ پال نے جو طرز عمل اختیار کیا، وہ اول دن سے غلط تھا اور خود کانگریس کو نہایت سخت نقصان پہنچانے والا۔ کیا مصیبت کی بات ہے کہ یہ لوگ محض اپنی ذاتی مخاصمت کے لیے کانگریس کے سر مصیبت لانی چاہتے ہیں اور اسے ایسے دلدل میں پھنسانا چاہتے ہیں جس سے نکلنا پھر اس کا دشوار ہو جائے۔

غلط طریق عمل:

مجھے تعجب ہے کہ آپ کے والد بھی اس رو بہہ گئے۔ آپ کو تو چاہیے تھا کہ اس معاملے میں محض پارٹی کا سوال نہ دیکھتے اصل معاملے کو دیکھتے جو غلط صورت حال ان لوگوں نے پیدا کر دی تھی، اگر میں اسے نہ سنبھالتا اور ورکنگ کمیٹی فیصلہ کر دیتی کہ کانگریس پارٹی یونٹی کانفرنس سے الگ ہو جائے تو کیا نتیجہ نکلتا؟ یونٹی کانفرنس سے ہونا ہوانا تو شاید کچھ نہیں، لیکن تمام ملک میں کانگریس بدنام ہو جاتی کہ دیکھو کس درجے متعصب، حاسد اور خود غرض ہے کہ سکندر حیات صلح واتحاد کے لیے کوشش کر رہا ہے اور یہ ٹھکرا رہی ہے اور کیوں ٹھکرا رہی ہے؟ محض اس جلن میں کہ پنجاب میں کانگریس منسٹری نہ بن سکی اور اگر سکندر حیات کی کوشش سے اتحاد کی راہ نکل آئے تو غیر کانگریسی منسٹری کی پرسٹیج بڑھ جائے گی!

لطف یہ ہے کہ یہ عقل مند بلا تامل اپنے بیانات اور تجویزوں میں صاف صاف یہ

کہہ رہے ہیں کہ یونٹی کانفرنس سے اس لیے مقاطعہ کرنا چاہیے کہ سکندر حیات پارٹی معاملۂ اتحاد میں کامیاب ہو کر نمایاں نہ ہو جائے۔ گویا اگر کمیونل تفرقے کا کوئی حل نکلتا ہو اور اس سے اندیشہ ہو کہ غیر کانگریس پارٹی کو کریڈٹ مل جائے تو کانگریس کو چاہیے اس جلن میں آ کر اس کی مخالفت کرے اور جھگڑوں، خونریزیوں کو نشو ونما پانے دے!

میں نے ڈاکٹر ستیہ پال کو لکھا تھا کہ کلکتہ آ جائیں۔ وہ آتے تو ان سے زبانی بہ تفصیل باتیں کرتا، لیکن وہ نہیں آئے۔ اب خط و کتابت میں صفحوں کے صفحے کون سیاہ کرے؟ بہ ہر حال مہلت ملی تو انھیں لکھوں گا، کسی صوبے میں آج کانگریس کی اتنی مٹی پلید نہیں ہو رہی جتنی پنجاب میں۔

عزیزی! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ملازمتوں اور تقرروں کی نسبت میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ میں قطعاً اس معاملے سے کوئی تعلّق نہیں رکھتا، نہ میں نے آج تک کسی شخص کی سفارش کی ہے کیوں کہ اوّل تو اصولاً اس طرح کی مداخلت کا طریقہ غلط ہے کہ اوپر سے ایک آدمی سفارش بانٹتا رہے۔ ثانیاً یہ دروازہ کھلے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسے اول دن ہی بند کر دینا چاہیے۔

لیکن آپ کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس بارے میں سعی و اہتمام اپنا ضروری فرض سمجھتا ہوں ممکن ہے یہ بھی کمزوری ہو لیکن اس کمزوری سے اپنے کو معاف نہیں رکھ سکتا۔ میں نے اپنے بھانجے کی سفارش کرنے سے یک قلم انکار کر دیا اور اپنی بھانجی کے شوہر سے بھی صاف صاف معذرت کر دی، لیکن آپ کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں اور کروں گا۔

براہِ عنایت اسی طرح کے الفاظ نہ لکھیے جس سے بے اعتمادی مترشح ہو کسی قدر توقف کیجیے اور دیکھیے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، ضروری ہے کہ اسے عمل میں بھی لاؤں۔ میں برابر خط و کتابت کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ عید کے

بعد میں آپ کو نتیجے سے اطلاع دے سکوں گا۔ والسلام علیکم!

ابوالکلام

﴿۲۰۶﴾ [۱۴]

کلکتہ

۲۰۔۱۲۔۱۹۳۷ء

عزیزی!

حکومتِ سرحد نے ابھی تک پبلسٹی کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا اور ضروری ہے کہ جلد از جلد ہو۔ مجھے خیال ہوا تھا کہ سرِ دست آپ کے لیے یہ صورت نکالی جائے۔ چناں چہ اس بارے میں میں نے زبانی عبدالغفار خان سے کہہ دیا تھا اور ڈاکٹر خان سے خط و کتابت بھی جاری ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ عدم تجربے کی وجہ سے کاموں میں بہت ہی سست رفتار ہیں۔ معمولی سی بات کے لیے بھی بلا وجہ ہفتوں نکل جاتے ہیں۔ میں نے تمام ضروری مراتب انھیں لکھ دیے تھے، مگر ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں ملا ہے۔

آپ نے مجھے بمبئی کی نسبت لکھا تھا۔ اب خیال کرتا ہوں کہ وہیں صورت نکل سکے گی، اور شاید جلد نکل آئے، لیکن اس کے لیے بہتر صورت یہ ہوگی کہ آپ خود بمبئی میں موجود ہوں۔ میں نے کل ایک خط ٹائپ کرایا تھا کہ آپ کو بھیج دوں لیکن اس وقت معلوم ہوا کہ مجوزہ ورکنگ کمیٹی جسے الہ آباد میں کرنے کا قصد تھا۔ بمبئی میں ہوگی۔ ۲رجنوری ۱۹۳۸ء کو چوں کہ اس صورت میں مجھے بہ ہر حال بمبئی جانا پڑے گا۔ اس لیے خط نہیں بھیجتا اور چاہتا ہوں کہ آپ ۲رجنوری کو خود بمبئی پہنچ جائیں اور وہاں مجھ سے ملیں تاکہ اپنی موجودگی میں آپ کو مسٹر کھیر سے ملا دوں اور زبانی گفتگو کروں۔ خط سے یہ طریقہ زیادہ موثر ہوگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

[۱۴] ﴿۲۰۷﴾

کلکتہ

۲۷۔۱۲۔۱۹۳۷ء

عزیزی!

میں بمبئی میں ۲ رجنوری کو پہنچوں گا۔ اسی تاریخ سے ورکنگ کمیٹی ہے۔ کمیٹی غالباً تین چار دن تک چلے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ آپ بھی ۲ رہی کو ضرور پہنچیں۔ ۳ ر یا ۴ ر کو بھی مل سکتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ میں آپ کو خود ملا دوں۔ کمیٹی کے جلسے متواتر رہتے ہیں اور مشغولیت سخت نا قابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اس لیے غالباً ۲ ر۔۳ ر کو تو موقع بھی نہ لگے، اس کے بعد ہی نکلے۔ بہرحال آپ جب پہنچیں مجھ سے مل لیں۔ پھر میں حسب حال انتظام کرلوں گا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہاں ٹھہرایا جاؤں۔ غالباً رجب علی پٹیل، ورڈن روڈ کے یہاں ٹھہروں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں آ جائیں۔ جہاں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوگا اور مجھے کارڈ بھجوادیں میں باہر آ کر مل لوں گا اور صورت کار طے پا جائے گی۔

صوبہ سرحد کا معاملہ چھوڑا نہیں ہے۔ بمبئی میں عبدالغفار خاں یا ڈاکٹر خان ضرور آئیں گے وہ بھی پیش نظر ہے۔ البتہ خیال ہوا کہ بمبئی کی بات بھی پختہ کرلی جائے جو کام پہلے ہوگیا اسے اختیار کر لیجیے گا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

[۱۵] ﴿۲۰۸﴾

کلکتہ،

۱۳۔۳۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

خط پہنچا، زخم اور ورم اب تک چلا ہی جاتا ہے بلکہ کل سے درد میں بھی زیادتی ہے۔ پھر سہ بارہ آج ایکس رے لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اندر کوئی غیر معمولی خرابی کام کررہی ہے۔

بمبئی میں مسٹر کھیر سے میں نے پھر از سرِ نو باتیں کرلی تھیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ آپ ایک خط ان کے نام اس مضمون کا بھیج دیں کہ میں یاں انتظار کروں گا۔ جب آپ کی جانب سے حکم ملے گا آجاؤں گا۔ خط و کتابت میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی جزئیات کا اثر طبایع پر بہت کچھ پڑتا ہے۔ خط جب لکھیے تو سنجیدہ عبارت میں قرینہ کے کاغذ پر اور ٹائپ کراکے۔

مولوی محمد علی نے کاغذات بھیج دیے ہیں۔ میں ایک شخص کا منتظر ہوں جو کلکتہ سے باہر گیا ہوا ہے وہ آجائے تو نتیجہ سے انھیں مطلع کروں گا۔

پنجاب کانگریس کے جھگڑوں کے لیے میں نے ورکنگ کمیٹی کی خواہش مان لی تھی کہ وقت نکالوں لیکن اب دیکھتا ہوں کہ صحت اجازت نہیں دیتی، نہیں معلوم موجودہ شکایت کب تک رہے؟ ممکن ہے دوبارہ عمل جراحی کی نوبت آجائے۔ مجبوراً جواہرلال کو لکھ رہا ہوں کہ وہ پنجاب جائیں اگر وہ نہ جاسکے تو پھر اور کسی کو بھیجوں گا اور ورکنگ کمیٹی کی تجویز بدلواؤں گا۔

قیام کے بارے میں میں نے کوئی خاص ارادہ تو نہیں کیا تھا لیکن میاں افتخار الدین نے بہ اصرار کہا تھا کہ ان کے یہاں ٹھہروں۔ ڈاکٹر عالم صاحب کا بھی خط آگیا ہے۔ بہ ہرحال اگر آتا تو کوئی وجہ نہیں کہ میاں عبدالعزیز صاحب کی دعوت نظر

انداز کرتا۔ ان کے یہاں بار ہا ٹھہر چکا ہوں اور ان کی محبّت و اخلاص کا شکر گذار ہوں[۱]۔

مولوی عبداللہ صاحب کا خط اس بارے میں مل چکا ہے۔ شکر گذار ہوں۔ انھیں بھی میرا پیام پہنچا دیجیے۔ والسلام

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولاناؒ کی تشریف آوری کی خبر سن کر میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا نے مولوی محی الدین احمد یا ان کے عم محترم مولانا عبداللہ مرحوم یا دونوں سے کہا تھا کہ مولاناؒ ان کے ہاں ٹھہریں، جیسا کہ پیشتر بار ہا ٹھہر چکے تھے۔

﴿۲۰۹﴾

[۱۶]

کلکتہ

۲۶۔۳۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ خط و کتابت کے بارے میں مسٹر کھیر یہ کیوں کہنے لگے کہ کاغذ کیسا تھا اور خط کیا تھا۔ بھلا ان جزئیات پر کسی سے گفتگو ہی کب ہوتی ہے۔ میں نے محض احتیاطاً آپ کو ایک بات لکھ دی تھی۔

مجھے نقل بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ان سے خط و کتابت جاری رکھیں۔ اب یہ قطعی ہے کہ کوئی صورت نکلے گی۔

اخبار کی نسبت جس قدر گفتگو میاں افتخار الدین سے ہری پورہ میں ہو چکی ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ وہاں مزید گفتگو شروع کردیں اور مجھے آپ یا وہ بذریعہ خط صورت حال سے مطلع کریں۔

فتح وال کا حال اخبارات میں پڑھتے ہی میں نے ڈاکٹر گوپی چند کو لکھا تھا کہ

تفصیلات بھیجیں۔ نیز یہ کہ جب دو غیر کانگریسی قتل ہو گئے اور ان پر حملہ ان لوگوں نے کیا تھا جنھیں کانگریسی سمجھا جاتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس پر اظہار تاسف کریں اور ان لوگوں سے اظہار بریت جو اس کا باعث ہوئے[۱]۔

مجھے جواب کا انتظار ہے۔

اپنے والد بزرگوار کو میرا اسلام شوق پہنچا دیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] فتح وال ضلع امرتسر میں یہ واقعہ پیش آیا تھا جس میں عام روایت کے مطابق کانگریسیوں کے حملے سے دو غیر کانگریسی قتل ہو گئے۔

[۱۷] ﴿۲۱۰﴾

کلکتہ،

۲۵۔۴۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ ادھر ڈیڑھ سال کے بعد عرق النساء کا دورہ پھر پڑا تھا، مگر اب افاقہ ہے۔ بمبئی سے اگر کوئی جواب نہیں ملا ہے تو بہتر ہوگا کہ ایک یاددہانی کا خط اور لکھ دیجیے۔ اور جواب کا انتظار کیجیے۔ پھر بھی تاخیر ہو تو مجھے مطلع کیجیے۔ اس کے بعد لکھوں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔

سر سکندر حیات یہاں ملنے کے لیے آئے تھے۔ میں نے ان سے ضلع امرتسر کے حادثے کی تفصیلات پوچھیں۔ ان کا بیان معتدل اور معقول تھا اگرچہ ان کے بعض ساتھی جو لقمہ دیتے جاتے تھے فریقانہ جذبات سے خالی نہ تھے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اصل حادثے کے لیے کسی ذمے دار کانگریسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی،

البتہ جو کمزوری دکھائی گئی ہے، وہ صرف اس بات میں ہے کہ جس طرح صاف صاف اصل حادثے کی شناخت کا اعتراف کرنا تھا اور حملہ آوروں کی مذمت کرنی تھی نہیں کی گئی[۱]۔

مسٹر جے رام داس نے اپنے قیام لاہور کے تاثرات لکھے ہیں۔ مئی کے پہلے ہفتے میں وہ پھر جائیں گے اور کوشش کریں گے کہ کچھ کر کے آئیں لیکن سارا معاملہ آدمی کا ہے، جب تک کوئی ایسا آدمی آگے نہ کیا جائے گا جو ان گروہ بندیوں سے اوپر رہ کر از سرنو قدم اٹھا سکے۔ اصلاح حال مشکل ہے اور یہی چیز پنجاب میں "بسیار است و نیست" [۲] کا حکم رکھتی ہے۔

جے رام داس مئی میں لاہور جاتے ہوئے قصور ٹھہریں گے تا کہ آپ کے والد سے بہ اطمینان مشورہ کر سکیں۔

اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا[۳]: بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

والسلام علیکم

ابوالکلام

حواشی:

[۱] وہی فتح وال والا حادثہ، جس کا ذکر سابقہ مکتوب میں آ چکا ہے

[۲] عالمگیر کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے یعنی "نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار ست و نیست۔"

[۳] مولانا نے اس قلق انگیز واقعے پر ایک بیان بھی دیا تھا۔ یہ چند الفاظ ہیں لیکن دیکھیے ان میں درد دل کس طرح کھینچ آیا ہے۔

[۱۸] ﴿۲۱۱﴾

کلکتہ،

۲۶۔۴۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

میں انڈیا کانگرس کے صدر دفتر میں ایک یا دو آدمی ایسے رکھنا چاہتا ہوں جو صرف مسلمانوں کی شکایات کی تحقیقات وانسداد کے لیے مخصوص ہوں، یعنی کانگرس کے اندر جو شکایتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے لیے۔ ان کی حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کی ہوگی۔ کیا آپ سرِ دست یہ کام پسند کرو گے؟ لیکن ایک بات قابلِ غور ہے، یہاں یہ زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ماہوار الاؤنس مل سکتا ہے۔ اگر میں زور لگاؤں تو شاید کچھ جزئی اضافہ بھی ہو جائے۔ اس سے زیادہ مالی نوعیت متوقع نہیں، البتہ صدر دفتر سے انسلاک کی اہمیت اور فی نفسہٖ وقت کی ایک نہایت ضروری خدمت کی انجام دہی، اس جگہ کے حق میں ہیں۔ اس پر بھی غور کرلو! والسلام علیکم

ابوالکلام

[۱۹] ﴿۲۱۲﴾

کلکتہ،

۵۔۵۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ ایک خط کل لکھ چکا ہوں، الہ آباد کی نسبت جو آپ کا تاثر ہے، وہ صحیح نہیں۔ وہاں بھی آپ اتنا ہی میرا سہارا پائیں گے جتنا کلکتہ میں۔ علاوہ بریں جو صورت حال وہاں اس اعتبار سے پچھلے دنوں رہ چکی ہے اب باقی نہیں رہی۔ اسے یک قلم بدل چکا ہوں۔

بہ ہر حال اس ماہ کے اواخر تک یہ تقرر ملتوی رہے گا۔ اور بمبئی کے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ اس ماہ کے اواخر تک آپ اور انتظار کریں۔ اس طرح اواخر ماہ میں پورا موقع ہو گا کہ جو صورت ارجح ہو اختیار کی جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس وقت آپ کو سرحد کے لیے بھی لکھ سکوں۔ اس بارے میں پھر خط و کتابت کر رہا ہوں۔

ایک خط سے کل معلوم ہوا کہ میاں افتخار الدین یورپ گئے۔ جولائی یا اگست میں واپس آئیں گے۔ معلوم نہیں آپ ان سے ملے بھی تھے یا نہیں؟ ہری پورہ میں انھوں نے اخبار کے لیے پورا عزم ظاہر کیا تھا۔ والسلام علیکم۔

ہاں مولوی محمد علی صاحب کے معاملے کے لیے میں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں۔ ایک صاحب کا اس وقت انتظار تھا جو پٹیالہ گئے ہوئے تھے، انھوں نے کلکتہ پہنچ کر پوری کوشش کی اور کئی جگہیں ٹٹولیں، لیکن ان شرایط پر معاملت کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ہر شخص چھوٹتے ہی کہتا ہے کہ معاملہ قرض کا ہے، مگر ضمانت مفقود! باقی رہی کاروباری نوعیت تو جب کلکتہ اور بمبئی کی اچھی جائداد سے بھی بلا خطر گیارہ فی صدی انتفاع ہو رہا ہے تو مشکل ہے کہ کاروباری الجھاؤ کی ذمہ داریاں اس کے لیے برداشت کی جائیں۔

بہ حالتِ موجودہ اگر کوئی راہ نکل سکتی ہے تو وہ صرف شراکت کی ہے یعنی کوئی سرمایہ دار کام میں شریک کیا جائے۔ کیا مدراس میں کوئی ایسا آدمی نہیں نکل سکتا جو کاروبار کا واضح انتفاع دیکھ کر آمادۂ شراکت ہو جائے۔

ابوالکلام

[۴۰] ﴿۲۱۳﴾

کلکتہ،

۸۔۷۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

کل آپ کا خط پاتے ہی میں نے اس مضمون کا تار بھیج دیا تھا "مسٹر منشی کے مشورے کے مطابق کام کرو۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وہ واقعی کوئی دوسری انتظامی جگہ دلا سکتے ہیں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اسے اختیار کرلیا جائے۔

اب آپ کا دوسرا خط ملا،

مسٹر کھیر اور منشی کی جو باتیں آپ نے لکھی ہیں ان میں کوئی بات پریشانی کی مجھے نظر نہیں آتی۔ یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے کوشش کرکے آپ کے لیے جگہ نکالی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ کل کی کسی کو خبر نہیں۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ عارضی یا مستقل کسی شکل میں بھی مجوزہ ڈیڑھ سو والی صورت موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو آپ کو فوراً کام شروع کردینا چاہیے کیوں کہ پہلے جو بات پیش نظر ہے وہ یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سردست کام ہاتھ آجائے پھر آیندہ ترقی کی راہیں بہ تدریج نکالی جاسکتی ہیں۔

یہ یاد رکھیے کہ فوری طور پر کہیں بھی کوئی حسب مطلب جگہ نہیں نکلے گی۔ کام پر لگ کر راہ نکالنی پڑے گی۔

بہ ہر حال پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر مسٹر منشی کوئی دوسری جگہ نکالیں تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی ہے؟ اگر اس کی راہ نظر نہ آئے تو پھر ان باتوں پر ہرگز نہ جائیے۔ جو جگہ مسٹر کھیر نے قرار دی ہے عارضی ہو یا مستقل، اس پر قانع ہوکر کام پر لگ جائیے۔ جب تک آدمی باہر ہے کوئی صورت نہیں نکلتی جونہی اندر آگیا پھر ہر طرح کی راہیں نکل آتی ہیں۔ والسلام۔

ابوالکلام

[۲۱] ﴿۲۱۴﴾

کلکتہ،

۴۔۸۔۱۹۳۸ء

عزیزی!

خط پہنچا۔ اب تو آپ کو تجربے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ معاملے کی انجام دہی میں کس قدر دقتیں پیش آتی ہیں۔ بہ ہر حال اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر و برداشت سے کام لیا جائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی کام میں لگ جانا چاہیے۔ اور دروازے کے اندر آ جانا چاہیے پھر کچھ دنوں تک اپنے کاموں کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ یہ دو باتیں انجام پا گئیں تو تیسرا مرحلہ انشاء اللہ خود بخود سامنے آ جائے گا۔

کام پر لگ جایئے تو کچھ مدت تک ساری باتیں بھول کر صرف اپنے کام کا بہتر تاثر پیدا کیجیے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کیجیے گویا اپنے مفوضہ کام کی سرگرم مشغولیت کے سوا آپ اور کسی بات کے خواہش مند نہیں۔ جو بات مطلوب ہے وہ خود بخود دوسروں کی طرف سے آئے گی، آپ کو کہنا نہیں پڑے گا۔

مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ صرف یہ ہے کہ والد مرحوم کے نانا کا تعلّق قصور سے تھا۔ اس سے زیادہ تفصیلات معلوم نہیں۔ وہ ۱۸۰۱ء میں تکمیل تعلیم کے لیے دہلی آئے جب کہ مرہٹوں اور انگریزوں میں جنگ جاری تھی اور شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس و تدریس میں داخل ہو گئے۔ پھر انھوں نے دہلی ہی میں قیام کر لیا اور قلعے سے رکن المدرسین کا منصب ملا۔ اصل خاندان ہرات سے آیا تھا۔ اور لاہور کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر بعض افراد مامور ہوئے تھے۔[۱]

ترجمان القرآن کو سرِ دست نہیں چھاپنا چاہتا۔ پہلے تیسری جلد نکل جائے جس کا کام جاری ہے، پھر دوسرے ایڈیشن کا اہتمام کیا جائے گا[۲]۔ مولوی بلگرامی کا انگریزی ترجمہ اگر موجود ہے تو اسے شایع کر دینا ضروری ہے[۳]۔ دراصل اس کے

لیے ندوۃ العلماء محرک ہوا تھا مگر افسوس ہے کہ تکمیل نہیں ہو سکی۔ اگر بمبئی میں کوئی اہل خیر اس کے لیے آمادہ ہو جائیں تو ضرور اس کا اہتمام کیجیے۔

میرے خیال میں اس کے لیے کسی ایسے مقدمے کی ضرورت نہیں جو نفس قرآن پر لکھا جائے البتہ ترجمے کا مطالعہ کر کے ترجمے کے محاسن پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے۔

والسلام علیکم

مولوی محمد علی کے لیے بھی کوشش جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کامیابی کی شکل دکھائے۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] جس استفسار کا یہ جواب دیا گیا ہے، وہ قصور یا اس کے نواحی کے ساتھ خاندان مولاناؒ کے تعلق کے باب میں تھا، جیسا کہ یہاں مشہور ہوا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ ان کے والد کے نانا مولانا منور الدین قصور سے بہ غرض تعلیم دہلی آئے تھے، پھر دہلی ہی میں توطن اختیار کر لیا۔ مولانا منور الدین کا خاندان ہرات سے لاہور آیا تھا اور بعض افراد خاندان جن میں سے مولانا منور الدین کے والد مولانا سراج الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لاہور میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور رہے۔ لاہور سکھوں کے قبضے میں آ گیا تو وہ لوگ قصور میں یا اس کے نواحی میں آباد ہو گئے۔

[۲] اس سے بھی بالکل واضح ہے کہ دوسری جلد کے چھپ جانے کے بعد مولانا تیسری جلد کی ترتیب میں مشغول ہو گئے تھے اور اسی کو سب سے پہلے چھاپنا چاہتے تھے۔

[۳] یعنی عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا انگریزی ترجمہ۔

﴿۲۱۵﴾ [۴۲]

اگست ۱۹۳۸ء

عزیزی!

۱۔ لا الٰہ الّا اللہ الخ بہ ظاہر شہادتین کا اختصار ہے۔ احادیث سے جو کلمہ ثابت ہوتا ہے وہ شہادتین ہی ہے۔ غالباً اُسی عہد میں یہ جملہ بہ طور خلاصۂ شہادتین کے مستعمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ حدیث میں ''یومہم'' سے مراد دن کا تعین نہیں ہے، بلکہ نفس تعطیل کا یعنی تعطیل کے دن کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ جس سے وہ گمراہ ہو گئے اور سبت کی رعایت کھو دی۔[ا]

۳۔ مولوی محمد علی کے لیے کوشش جاری ہے۔ غالباً قطعی نتیجہ ستمبر میں معلوم ہو۔

۴۔ مسٹر حسن کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ اس طرح کے معاملات میں دخل دینا معقول نہ ہوگا۔ تاہم ایک اور خط لکھ دیا ہے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

حاشیہ:

[ا] یہ جواب مولوی محی الدین احمد کے خط کی پشت پر لکھ کر واپس بھیج دیا گیا۔ پہلا سوال جواب سے واضح ہے سوال صحیح بخاری کی ایک حدیث کے متعلق تھا جو کتاب الجمعہ میں آئی ہے یعنی حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔ ہاں! انھیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی پھر یہ ان کا دن تھا جو ان پر فرض کیا گیا تھا، تو انھوں نے اس میں اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت کی۔ پس وہ لوگ اس میں ہمارے بعد ہیں۔ یہود کل اور نصاریٰ کل کے بعد، مطلب یہ ہے کہ جمعہ ہمارا دن ہے، اس کے بعد یہود کا ہفتہ یعنی سبت اور اس کے بعد نصاریٰ کا سبت یعنی اتوار۔

[۲۳] ﴿۲۱۶﴾

کلکتہ،

۲۳-۱۰-۱۹۳۸ء

عزیزی!

خط لکھنے میں دیر ہو مگر اصل معاملے سے تغافل کبھی نہیں ہو سکتا۔

اگر پبلسٹی کا کام اس وقت تک نہیں شروع ہوا ہے تو آپ مسٹر پٹیل سے ملیے اور صورت حال بیان کیجیے۔ آپ کو صرف اس پہلو پر زور دینا چاہیے کہ پیشِ نظر اصلی کام یہی تھا، اور اسی کی ضرورت ہے۔ اس لیے اگر اس میں تاخیر نہ ہو تو بہتر ہے۔ والسلام

علیکم

مولوی محمد علی کے معاملے کے لیے بھی مسلسل سعی جاری ہے۔ مطمئن رہیے۔

ابوالکلام

[۲۴] ﴿۲۱۷﴾

کلکتہ

۲۶۔۵۔۱۹۳۹ء

عزیزی!

میں ادھر بہت ہی مجبور رہا اور اس وقت بھی مجبور ہوں۔ ایک خط سردار پٹیل کے نام بھیج رہا ہوں۔ یہ خط لے کر آپ جایئے اور اُن سے ملیے۔ اگر کارپوریشن میں کچھ ہوسکتا ہے تو صرف انھیں کی کوشش سے، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پیش نظر جگہ کے لیے آپ کامیاب ہوسکیں۔ نہیں معلوم وہاں کتنے امیدوار ہوں گے۔ اور مقامی صورت حال کی کیا کیا کشمکشیں ہوں گی۔ بہ ہر حال کوشش کرنی چاہیے اور کوشش کا صحیح محل ولبھ بھائی پٹیل ہیں۔

اگر انجمن ترقی اردو والی بات بن گئی ہوتی تو آپ کے لیے سب سے بہتر صورت تھی۔ افسوس ہے کہ اس کی امید نہیں۔ آپ نے حیدر آباد کے لیے لکھا تھا۔ بلاشبہہ وہاں صورتیں نکل سکتی ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ کا میدان بھی کافی وسعت رکھتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا خط سر اکبر حیدری کے لیے کہاں تک موثر ہوگا؟ تاہم تیار ہوں کہ خط لکھ کر آپ کو بھیج دوں۔ میں نے آج تک کوئی سفارش نہیں کی۔ ممکن ہے مؤثر ہو، لیکن اس کے لیے ضروری ہوگا کہ آپ خود حیدر آباد جائیں۔ بغیر گئے ہوئے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ اس کے لیے تیار ہوں تو خط بھیج دوں۔

محمد علی کے لیے بھی اس وقت تک کچھ نہ ہوسکا۔ میں نے ڈاکٹر محمود کو پھر لکھا تھا اور

جب وہ کلکتہ مجھے دیکھنے آئے تو جس درجے زور دے سکتا تھا، اس میں کمی نہیں کی۔ مشکل یہ ہے کہ وہ بھی بغیر کسی مناسب صورت حال کے کچھ نہیں کر سکتے۔ شوگر سنڈیکیٹ کا معاملہ اس وقت تک چلا جاتا ہے۔ اگر پرائس کے کنٹرول کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ایک معقول جگہ بہ آسانی نکل آئے گی۔ ڈاکٹر محمود اس کے لیے کوشاں ہیں ان کا خیال ہے کہ شکر کی گرانی کی موجودہ صورتِ حال نے اس کا موقع پیدا کر دیا ہے اور غالباً صورت نکل آئے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

[۲۵] ﴿۲۱۸﴾

کلکتہ

۲۔۳۔۱۹۴۰ء

عزیزی!

پچھلے ماہ کا خط لاہور سے واپسی پر ڈاک میں ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کا اور میرا رشتہ ایسا نہیں ہے۔ جو اس طرح کی کسی حالت سے کبھی متاثر ہو سکے۔ البتہ میں مجبور بہت ہوں۔ صحت ساتھ نہیں دیتی۔ ذمے داریاں چھوڑ نہیں سکتا، اس لیے بے بس ہو کر رہ جاتا ہوں۔ خط و کتابت پابندی کے ساتھ کر نہیں سکتا۔ کوئی ضروری بات ہوتی ہے تو لکھتا ہوں نہیں تو عذر خواہ رہتا ہوں۔

لاہور میں آپ کے والد بزرگوار اور مولوی محمد علی و محمود علی کی موجودگی کی مسرت میں اگر کوئی کمی تھی تو آپ کی عدم موجودگی کی۔ تاہم یہ ظاہری کمی تھی، ورنہ آپ بھی میرے ساتھ تھے۔ اللہ تعالیٰ جلد سے جلد ایسے حالات بہم پہنچائے کہ آپ کو اطمینان خاطر نصیب ہو۔

سندھ کے متعلق یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جہاں جہاں مسلمانوں پر سکھوں

اور ہندوؤں کے مظالم ہوتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں نے گاندھی جی سے یہ نہیں کہا ہے کہ نہ تو ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ نہ ظلم سہہ سکتے ہیں۔ نہ اور کوئی راہ اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ آپ باہر کے مسلمانوں کو لاکر ہماری مدد کیجیے۔ اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس درجے بے حس اور بے ہمت ہو کہ ایسا کہے تو گاندھی جی یقیناً اسے یہی کہیں گے کہ تمھارے لیے ہجرت کے سوا چارہ نہیں ہے! مگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کہتا۔ سندھ کے دیہاتی ہندوؤں کی جانب سے یہ بات کہی گئی اس لیے انھیں ہجرت کا مشورہ دیا گیا۔ ہجرت کا مشورہ دینے کے یہ معنی ہیں کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی حال ہے تو باہر کے ہندوؤں سے حملہ کرانے کی خواہش نہ رکھو۔ اس کی میں کبھی امید نہیں دلا سکتا۔ ہجرت کرکے دوسری جگہ چلے جاؤ۔ اس معاملے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ باقی رہا آپ کا ہندوؤں کے عام حالات سے تاثر تو اس سے کسے انکار ہے؟ وہ صورت حال تو ہر آنکھ کے سامنے ہے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

[۲۶] ﴿۲۱۹﴾

[مولانا کے نام مولوی محی الدین قصوری کے ایک خط پر یہ نوٹ تھا جو اجمل خان صاحب نے نقل کر دیا تھا۔ ۵/ دسمبر ۱۹۴۱ء]

یہ اور ان کا خاندان بیس برس سے نیشنل سروس میں ہر طرح کی قربانیاں کرتا رہا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں جب بہت کم مسلمان میرے سیاسی خیالات سے متفق تھے تو اس وقت جن خاص خاص آدمیوں نے میری پکار پر لبّیک کہا تھا ان میں یہ اور ان کا خاندان بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس درجے ان کا خیال ہے۔

ابوالکلام

[۲۷] ﴿۲۲۰﴾

[مکتوب الیہ کی جانب سے مزاج پرسی اور دعاے صحت کے جواب میں۔
۱۰/جولائی ۱۹۵۰ء]

جواب:

خط مل گیا ہے۔ آپ کی محبّت و اخلاص کے لیے مولانا شکرگزار ہیں۔[۱]

اجمل خاں

حاشیہ:

[۱] یہ دونوں آخری اندراجات [نمبر ۲۶ و ۲۷] ''مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط و جوابات آزاد'' سے ماخوذ ہیں۔

مولوی عبدالقادر قصوری:

[۱] ﴿۲۲۱﴾

مولانا عبدالقادر قصوری کے نام جو دو خط ہیں ۔ ان کی صحیح جگہ تاریخی ترتیب میں تو وہی ہے ۔ جو ان کے لیے مقرر کر دی ہے ۔ لیکن ان دونوں خطوں میں چوں کہ مولوی محی الدین احمد قصوری کی ملازمت کا مسئلہ زیر بحث ہے ۔ اس لیے مسئلے کے مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں اس مقام سے دور نہ کیا جائے خصوصاً اس صورت میں کہ اس کا مقام ۲۶۶ خطوط کے بعد سلسلے کی دوسری جلد میں قرار پایا ہوا۔

بہ ایں سبب ان خطوط کو اسی دایرے میں لے کر قریب کر لیا ہے ۔ (ا۔س۔ش)

کلکتہ

۱۹ر جون ۱۹۳۸ء

حبی فی اللہ

آپ کا خط مل گیا تھا، مگر منتظر تھا کہ ممبئی کا جواب آ جائے تو لکھوں ۔ اب جواب مل گیا ہے، جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں ۔

اب بہ یک وقت دونوں صورتیں کام میں لائی جا سکتی ہیں ۔ بمبی کی بھی اور دفتر کانگریس کی بھی ۔ آپ معاملے کے دونوں پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کر لیں ۔

ممبئی میں اگر چہ بالفعل ڈیڑھ سو ہی کا معاملہ ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک مرتبہ یہ کسی نہ کسی کام پر لگ گئے تو پھر مزید ترقی کی راہوں کا پیدا کر لینا مشکل نہ ہوگا ۔ اشکال جو کچھ ہوا کرتا ہے ۔ ابتدائی تقرر میں ہوا کرتا ہے ۔

دفتر کانگریس کا معاملہ ایک قومی خدمت ہے اور اس کے ذریعے سے علایق کا پیدا ہونا ہے ۔ دونوں میں سے جو صورت آپ کے نزدیک مرجع ہو اس کا عزیز موصوف کو مشورہ دیجیے ۔ اگر ممبئی والی صورت منظور ہو تو اسے فوراً اختیار کر لیا جائے ۔ اگر الہ آباد والی مرجح نظر آئے تو مجھے پہلے بذریعہ تار مطلع کر دیا جائے ۔ میں بذریعہ تار مطلع کر

دوں گا کہ کب انھیں الہ آباد پہنچنا چاہیے۔

باقی پنجاب کے حالات کی نسبت آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ فرصت طلب ہے۔ ان شاء اللہ عن قریب اس بارے میں مفصّل طور پر لکھنے کی کوشش کر دوں گا۔

مولوی محمد علی صاحب کا بھی خط ملا۔ حتی الواسع کوشش کر رہا ہوں۔ ان کے کاروبار کی خرابی سے حد درجہ قلق ہوا۔ کاش مری کوشش بار آور نکلیں۔ (۱)

والسلام علیکم ابوالکلام

[۲] ﴿۲۲۲﴾

کلکتہ

۲؍جنوری ۱۹۳۹ء

حبی فی اللہ!

خط پہنچا! آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تحریر سے پوری طرح کام نکلتا نہیں اور نکالنا بھی چاہوں تو صحت کی کمزوری، کاموں کا ہجوم اور طبیعت کی بے تعلقی ساتھ نہیں دیتی۔ مہینوں سے فرنٹیئر کے کاموں کا تقاضا ہے، مگر ابھی تک وقت نہیں نکال سکا۔ غالباً اس ماہ کے اواخر میں قصد کروں۔ ذہن میں یہ ارادہ محفوظ کر چکا ہوں کہ روانگی سے پہلے آپ کو تار کر دوں گا کہ ایک دو اسٹیشن ساتھ چلیے تا کہ بہ اطمینان باتیں ہو جائیں۔

مولوی محی الدین کا معاملہ پیش نظر ہے۔ اس وقت تک جو یہ کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔ مگر اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ دائرۂ کار میں داخل ہو جایئے (۱) اب سوچنا یہ ہے کہ معاملہ کیوں کر دل خواہ درست کیا جائے! میں ۸ کو ممبئی کے لیے نکلوں گا اور وہاں پٹیل اور کھیر سے فیصلہ کن گفتگو کر کے ایک اور فیصلہ کر دوں گا۔ اس بارے میں آپ بالکل مطمئن رہیں اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں!

پراچہ صاحب کا خط آیا ہے (۲) کہ آپ نے کانگریس میں آنا اور پنجاب کی صدارت کا بوجھ اٹھانا منظور کرلیا ہے۔ اس بات سے مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ شاید پنجاب کانگریس کی اصلاحِ حال کے لیے اب کوئی راہ نکل سکے؟

والسلام علیکم ابوالکلام

حواشی:

(۱) صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی محی الدین احمد قصوری نے گزشتہ تقریباً ۶ ماہ میں ممبئی یا الہ آباد کہیں بھی کام کا چارج نہیں لیا تھا اور جہاں تک خاک سار کو معلوم ہے، قصوری صاحب نے کانگریس سے ملازمت کا کبھی تعلق رکھا ہی نہیں، (ا۔س۔ش)

(۲) مشہور کارکن شیخ سراج الدین پراچہ (مہر)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

مکاتیب ابوالکلام آزاد کے اس مجموعے میں یوں تو ہر مکتوب الیہ کے نام اور تمام خطوط ہی کوئی نہ کوئی خصوصیّت اور امتیاز رکھتے ہیں، لیکن مولانا ملیح آبادی کے نام مولانا کے خطوط اپنی خصوصیات، مضامین کے تنوع، مطالب کی ندرت اور معنویت میں اپنی خاص شان رکھتے ہیں۔ اصناف تحریر کے لحاظ سے سب خطوط ہی نہیں ہیں۔ ان میں کچھ رقعے ہیں، جو نہایت قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں، ان میں مولانا ملیح آبادی کے سوالات کے جوابات اور فرمائش پر لکھی ہوئی مفصّل تحریریں ہیں، چند فتوے ہیں جن کی تحریر کے موجب مولانا ملیح آبادی ہوئے تھے۔ یہ تحریریں جن میں بعض مولانا ابوالکلام آزاد کی اپنی ذات کے بارے میں اور بعض وقت کے افکار و مسایل کے بارے میں ہیں اور تاریخ و سوانح کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

مولانا آزاد سے ملیح آبادی کا قریبی تعلّق ایک طویل وقفے کے ساتھ ۳۸ سال کے شب و روز پر محیط ہے۔ اس مدت میں کئی تحریکیں پیدا ہوئیں، مولانا ملیح آباد نے کئی اخبار نکالے، کئی اہم کام انجام دیے اور کئی نشیب و فراز سے گزرے۔ دونوں بزرگوں کی زندگی کا یہ اہم دور تھا، جو دونوں کے سوانح حیات میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ علمی مشاغل اور سیاسی خدمات کے لحاظ سے یہ دور بہت شاندار تھا جو اپنے پیچھے بے شمار علمی، دینی اور سیاسی نوادر چھوڑ گیا۔ ان کی ایک اچھی تعداد کو زیرِ نظر تالیف میں مختلف عنوانات کے تحت اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ موضوعات کے علم کے ساتھ ان کے زمانے کا تعین بھی ہو جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا ملیح آبادی کے تعلقات کی تاریخ ۱۹۲۰ء

سے شروع ہوتی ہے۔ اولاً وہ ''تحریکِ نظم جماعت'' کے سلسلے میں باہم متعارف ہوئے تھے اور مولانا کے مرید وخلیفہ کی حیثیت سے لکھنوان کا مرکز اور صوبہ متحدہ (یو پی) ان کا میدان عمل قرار پایا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے انھیں ''سندِ خلافت'' عطا فرمائی تھی جس کی بنا پر وہ تحریک سے اتفاق رکھنے والوں سے بیعت لینے کے مجاز ٹھہرے تھے۔ ان کے خزانۂ علمی کا پہلا جواہر پارہ یہی ''سندِ خلافت'' ہے۔ دوسرا اندراج مولانا کے قلم سے ''بیعت جہاد کا مسودہ'' ہے۔

''تحریک نظم جماعت'' کے بعد ''تحریک خلافت'' کے سلسلے میں ترک موالات کا پروگرام مرتب کیا گیا اور اس کے نتیجے میں سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ترک تعلیم کا زور بندھا تو مدرسۂ عالیہ۔ کلکتہ اور دوسرے اداروں سے نکلے ہوئے طلبہ کی تعلیم کے لیے مدرسۂ اسلامیہ (جامع مسجد کلکتہ عرف مسجد خدا) کا قیام عمل میں آیا تو مولانا ملیح آبادی کو کلکتہ بلا کر مدرسے کا مہتمم بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تحریک خلافت کے ترجمان ہفت روزہ ''پیغام'' کا اجرا عمل میں آیا تو اس کی ادارت کے لیے قرعۂ فال مولانا ملیح آبادی کے نام نکلا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کے آخر میں انھیں ایک تقریر کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ جیل میں مقدمہ چلا اور انھیں ایک سال کی سزا سنادی گئی۔ یہ قید ان کے لیے بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ چند ہی دن کے بعد مولانا آزاد کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور انھیں بھی پریسیڈنسی جیل علی پور (کلکتہ) ہی میں رکھا گیا۔ میں نے مولانا ملیح آبادی کی گرفتاری اور قید کو مبارک اس لیے کہا کہ انھیں جیل میں بھی مولانا کی صحبت کی سعادت میسّر آ گئی۔ یہ ان کی گرفتاری ہی کی برکت تھی کہ مولانا کا ایک یادگار مضمون ان کے متعلق وجود میں آیا اور وہ کتنی ہی یادگار تحریروں، فتاویٰ اور مولانا ''آزاد کی کہانی ان کی اپنی زبانی'' کے بیان وتالیف اور اشاعت کے موجب ہوئے، اور دیگر کئی تحریرات مثلاً مولانا کی زندگی میں بیس برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے جو مذہبی انقلاب آیا تھا۔ اس کی ایمان افروز داستان جو قارئین کرام ''تاریکی سے روشنی کی طرف۔ ایک حیرت انگیز انقلاب اور نزول ہدایت'' کے عنوان سے نوادر دینیہ اور علمیہ وادبیہ کے اس مجموعے میں مطالعہ فرمائیں گے نیز مولانا کے

سیاسی مسلک کی تفصیل، خود ان کے قلم سے ان کے بعض مذہبی اعتقادات، ان کی تصنیفات وتالیفات کی فہرست وغیرہ جو آزاد زندگی میں کبھی تالیف نہ کرسکتے تھے اور اگر جیل میں مولانا ملیح آبادی نہ ہوتے تو یہ تحریریں کبھی وجود میں نہ آسکتی تھیں۔ اور جیل میں مولانا ملیح آبادی کو مولانا آزاد کی جو صحبت وتربیت میسّر آئی، اس سعادت اور اس کی معنویت کا کون اندازہ کرسکتا ہے!

مولانا ملیح آبادی ۱۹۲۲ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی رہائی پا گئے اور ۱۹۲۳ء کے آغاز میں مولانا آزاد بھی رہا کردیے گئے۔ رہائی کے بعد بھی مولانا ملیح آبادی کو تقریباً ساڑھے پانچ سال مسلسل مولانا آزاد کی تربیت وصحبت میسّر رہی۔

۱۹۱۶ء میں شریف مکّہ (حسین) نے ترکی خلافت سے بغاوت کا جو قدم اٹھایا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سال کے اندر عرب وحجاز کا گوشہ گوشہ فساد سے بھر گیا، تحریک خلافت، ترکی خلافت (سلطنت) کو اس اقدام سے سخت نقصان پہنچا تھا۔ عرب میں کئی آزاد ریاستیں قایم ہوچکی تھیں، وہ بھی برطانیہ کے اشارے پر چلتی اور نام نہاد آزادی کے زعم میں مبتلا تھیں اور جن ممالک اور علاقوں کی یہ حالت نہیں تھی وہ انتشار کا شکار ہوئے یا برطانوی تسلط اور اس کے اثرات نے انھیں برباد کردیا تھا۔ شریف کی بادشاہت جنگ عظیم (اول) کے ختم ہوتے ہوتے اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی لیکن اسے اسلامی ممالک میں خصوصاً ہندستان میں مسلمانوں کے ایک مضبوط اور با اثر مخالف گروپ کا سامنا تھا۔ اسی زمانے میں امیر عبدالعزیز آل سعود کے مسلح ردعمل کا آغاز ہوچکا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کا انتشار اگرچہ حد کو پہنچ چکا تھا، تحریک خلافت کا جوش ختم ہوچکا تھا، پژمردگی کا دور دورہ تھا، رہنماؤں اور کارکنوں کے سامنے نہ کوئی پروگرام تھا، نہ عمل میں سرگرمی! شریف مکّہ کی بغات کے وقت ہی اس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ فرنگی محل کے بزرگ جو تحریک خلافت کے صفِ اول کے رہنما تھے وہ اسی خلافت سے شریف کی بغاوت کو جائز سمجھتے تھے اور اس کے لیے ان کا استدلال یہ تھا کہ شریفِ مکّہ ''سید'' ہے!

فیصلہ یہ ہوا کہ ان حالات کے مقابلے اور اصلاح کے لیے صحافت کے اسلحہ سے کام لیا جائے۔ اردو میں اس مقصد سے ہندستان کے کئی علاقوں سے خصوصاً پنجاب سے کئی رسالے نکل رہے تھے، عربی میں بھی ایک رسالہ نکالا جائے جو ہندستان کے اہل حق کی آواز عرب وحجاز تک پہنچا سکے اور عرب کی انقلابی جماعت سے مجاہدین ہند کا رابطہ قایم کرے۔ مولانا ملیح آبادی کی ادارت میں ''الجامعہ'' کے اجرا کا یہی مقصد تھا عربی کا یہ پندرہ روزہ رسالہ اپریل ۱۹۲۳ء سے مارچ ۱۹۲۴ء تک الگ اور مشترک بیس شماروں اور تیرہ اشاعتوں میں جاری رہا تھا۔ مولانا ملیح آبادی نے اسے اپنے مقصد میں کامیاب رسالہ قرار دیا ہے الجامعہ کے نگراں یا سرپرست مولانا آزاد تھے۔

الجامعہ کے بعد ''پیام'' کے نام سے مولانا ملیح آبادی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار رسالہ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء میں کچھ عرصہ نکلتا رہا۔ اس رسالے کے زمانۂ اجرا اور بعض دیگر باتوں میں اختلاف ہے۔ خاک سار نے اپنی تالیف ''مولانا آزاد کی صحافت'' میں اس پر مفصّل بحث کی ہے۔

۱۹۲۷ء میں الہلال کا دوسری بار اجرا عمل میں آیا۔ اس کی ادارت کے تمام کام مولانا آزاد کی نگرانی میں مولانا ملیح آبادی انجام دیتے تھے۔ مولانا آزاد کی صحافت کے سلسلے میں یہ آخری رسالہ تھا جو جون تا دسمبر ۱۹۲۷ء جاری رہا۔

اس کے بعد مولانا ملیح آبادی کی آزاد صحافت کا دور شروع ہوا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی رسالے اور اخبار نکالے اور بہت کامیاب اور نام ور ہوئے۔ اور اردو صحافت کی تاریخ میں صف اول کے صحافیوں میں جگہ پائی۔ ان کا سب سے مشہور اخبار ''ہند جدید'' تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب مولانا انھیں دہلی لے گئے تو انھوں نے اپنا اخبار اپنے خلفِ رشید ''احمد سعید ملیح آبادی'' کے سپرد کر دیا تھا۔ سعید صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اسے جاری رکھا اور ترقی کے عروج پر پہنچا کر اپنے جانشین صادق ہونے کا ثبوت دیا۔ اب یہ اخبار ''آزاد ہند'' کے نام سے ہندستان کا مشہور اور تاریخ صحافت کا سب سے قیمتی ہیرا ہے۔

لکھنو سے کلکتہ جانے کے بعد مولانا ملیح آبادی کا قیام مولانا کے ساتھ رہا

تھا۔ الہلال (۱۹۲۷ء) کی بندش کے بعد انھوں نے اپنی رہایش کا الگ انتظام کرلیا اور جیسے ابھی تک ہمارے دونوں بزرگوں کے مابین بہت قریبی تعلقات رہے تھے۔ اب ان میں بہ ظاہر دوری اور علاحدگی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن یہ علاحدگی صرف سکونتی اور جسمانی تھی۔ سیاسی، سماجی، علمی، دینی، تعلیمی یا فکرو عقیدے کی نہ تھی۔ دونوں کے دل اب بھی ایک ساتھ دھڑکتے تھے، دونوں کے مابین محبّت وعقیدت کا رشتہ اب بھی قایم تھا اور شفقت واحترام کا وہی تعلّق تھا جو ایک بزرگ کو اپنے سعادت مند خرد سے اور خرد کو اپنے قابلِ فخر بزرگ سے ہوتا ہے۔ سیاست میں دونوں کا ایک مسلک اور موقف تھا۔ تحریک آزادی میں دونوں شانہ بہ شانہ تھے، نہرو رپورٹ کے زمانے میں تو دونوں کے ایک دوسرے پر اعتماد کے عجیب ثبوت علم میں آئے جس کی شہادت نہرو رپورٹ کے سلسلے میں مولانا کے خطوط'' اور ذکر آزاد'' میں مولانا ملیح آبادی کے قلم سے ملتی ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں مولانا آزاد نے ملیح آبادی مرحوم کو دہلی بلالیا تھا۔ آئی سی سی آر کے پروگرام میں سہ ماہی مجلّہ ثقافتہ الہند (عربی) کی ادارت کی ذمے داری ان کے سپرد کردی تھی۔ اس کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبے کے سپروائزر بھی تھے۔ ثقافتہ الہند کی ادارت سے ان کا تعلّق آخر تک رہا ہے۔

مولانا آزاد کی وفات کے بعد انھیں زندگی سے کوئی دل چسپی نہ رہی تھی۔ کینسر نے انھیں پہلے ہی نڈھال کردیا تھا۔ مولانا کے انتہائی توجہ دلانے پر اُنھوں نے علاج پر توجہ ضرور کی اور ٹھیک ہوگئے۔ لیکن مولانا کے انتقال کے بعد اب انھیں علاج کے لیے مجبور کردینے والا کوئی نہ تھا۔ اگرچہ انھوں نے بچوں کے اصرار کے آگے دم نہیں مارا، لیکن اب وہ جینا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے زندگی سے ہاتھ اٹھالیے تھے اور جلد سے جلد مولانا سے جاملنے کے آرزومند تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی پوشیدہ قوت مدافعت سے کوئی کام نہ لیا۔ تا آں کہ وقت موعود آپہنچا اور ۲۴؍جون ۱۹۵۹ء کو ان کی روح ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کرگئی۔ ان کے جسم خاکی نے اپنے وطن ملیح آباد میں دفن ہونے کے لیے جگہ پائی۔

آزاد ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے جو کارنامے انجام دیے اور دنیا میں خصوصاً اسلامی ممالک میں ہندستان کی ساکھ قایم کرنے میں جو بے نظیر اور قابل ستایش خدمات انجام دیں، ان کے مختلف پہلوؤں پر مولانا کے خطبات سے روشنی پڑتی ہے لیکن اس موضوع پر جامع کتاب اور تحقیقی مواد اس کوتاہ علم کی نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آئی سی سی آر کے قیام کا منصوبہ، اس کی تشکیل اور اس کی کارگذاری مولانا آزاد کے کارناموں میں شمار ہوگی۔ اس کے مقاصد کی تعیین مولانا کی بصیرت اور نہایت دور اندیشی پر مبنی تھی اور اس کے نتایج و ثمرات اس کا بڑا ثبوت ہیں۔ آئی سی سی آر کا ترجمان علمی وثقافتی وتہذیبی ''ثقافتہ الہند'' (عربی) جس کے اجرا کے بعد تقریباً دس برس مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اس کے ایڈیٹر رہے تھے۔ مولانا ملیح آبادی نے اس کی بنیادوں کو مضبوط، معیار کو نہایت بلند اور اسلامی ممالک میں اسے ہندستان کا نہایت کامیاب تہذیبی اور ثقافتی ترجمان بنادیا تھا۔

ثقافتہ الہند کے پہلے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی چند نہایت اہم اور تاریخی تحریرات، خصوصاً جن کا تعلق مغلیہ دور کے فنون لطیفہ کے بعد تاریخی مرقعوں سے تھا، ثقافتہ الہند میں ترجمہ ہوکر شایع ہوئی تھیں۔ مرقعوں کی یہ تعارفی تحریریں مولانا ملیح آبادی کی فرمایش پر لکھی گئی تھیں۔ ان کا عربی ترجمہ تو مرقعوں کے ساتھ چھپ گیا۔ اصل اردو تحریرات مولانا ملیح آبادی کے پاس محفوظ رہ گئی تھیں۔ جو انھوں نے ''ذکر آزاد'' میں چھاپ دیں۔ چوں کہ ان تحریرات کے محرک وموجب مولانا ملیح آبادی تھے اور چوں کہ انھیں کی گزارشات کے جواب میں لکھی گئی تھیں، اس لیے ان کے تحفظ واشاعت کی سب سے موزوں جگہ انھیں کے نام مولانا آزاد کے خطوط کے ضمن میں نظر آئی۔ ان تحریرات کے مطالعے سے فنونِ لطیفہ سے مولانا کے ذوق اور تاریخ میں ان کی گہری نظر کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دہلی پہنچ کر ثقافتہ الہند کی زمام ادارت انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی

تھی۔ اسے انھوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ ایڈٹ کیا اور جس شان سے اسے دس سال تک جاری رکھا اس نے عربی کی علمی مجلاتی صحافت میں اپنے ایڈیٹر کا نام بھی روشن کیا اور ان کی علمی ادبی اور فنی قابلیت کا ڈنکا بھی بجا۔ لیکن یہ معلوم ہو کر سخت تعجب ہوا کہ شہرت سے بے نیاز اور اپنے کاموں میں گم اور متوالی شخصیت نے مجلے پر ایڈیٹر کی حیثیت سے کبھی اپنا نام نہیں چھاپا۔ اب کوئی شخص گہری تحقیق اور نہایت تفحص کے بغیر عربی زبان وادب کے ایک کامیاب ہندی صحافی اور ادیب کا نام اور اس کے کارناموں کا پتا نہیں چلا سکتا۔ یہ ایک شخصیت اور تاریخ کا بڑا نقصان ہے کہ براعظم ہند و پاکستان کی عربی ادب وصحافت کی تاریخ کے صفحات ایک نامور کے واقعی مقام کے تذکرے سے سادہ رہ جائیں!

ثقافۃ الہند آئی سی سی آر کے زیر اہتمام اب بھی شائع ہوتا ہے۔

(ا۔س۔ش)

مکاتیب، رقعات اور دیگر تحریرات

(۱) ﴿۲۲۳﴾

تحریکِ نظم جماعت: سندِ خلافت

حضرت مولانا آزاد کے نزدیک قیامِ نظم جماعت اور انتخابِ امام کا مسئلہ مسلمانوں کی جماعتی اور دینی زندگی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بغیر ہندستان کے مسلمانوں کی زندگی ان کے نزدیک ''حیاتِ غیر شرعی و جاہلی'' تھی۔ اس دعوت کو اُنھوں نے ''الہلال'' میں پیش کیا، اپنی تقریروں اور خطبات میں اس مسئلے کی اہمیّت پر روشنی ڈالی اور کتنے ہی مکاتیب میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے۔ جمعیّت علماے ہند کے اجلاس لاہور (نومبر ۱۹۲۱ء) کے خطبۂ صدارت کا اصل موضوع یہی مسئلہ تھا۔

حضرت مولاناؒ نے پہلے منصبِ امامت کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کو منتخب کیا تھا اور ان کو اس منصب کے قبول کر لینے پر آمادہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے گئے جہاں دسمبر ۱۹۱۶ء میں انھیں گرفتار کر کے مالٹا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ اس طرح کام کا نقشہ یک سر پلٹ گیا۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا آزادؒ بھی رانچی میں نظر بند کر دیے گئے۔ لیکن اُنھوں نے اپنی ذاتی ذمے داری پر تنظیم جماعت کے کام کو جاری رکھا۔ نظر بندی کے زمانے ہی میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو صوبۂ بہار میں کام کا ذمے دار بنایا اور رہائی کے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی کو یوپی میں کام کرنے کی ذمے داری تفویض ہوئی۔ اُنھوں نے مولاناؒ کے مشورے سے لکھنؤ کو اپنا مرکز بنایا اور کام شروع کر دیا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں مولاناؒ نے یہ اہم کام جمعیّت علماے ہند کے سپرد کر دیا اور خود اس ذمے داری سے بری الذمہ ہو گئے۔

ذیل کی تحریر مولاناؒ نے ملیح آبادی مرحوم کو بطور ''سندِ خلافت'' لکھ کر دی تھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشاد سلوکِ سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون ومجاز ہیں۔ جو طالبِ صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے گویا اُنھوں نے خود فقیر سے بیعت کی! والعاقبة للمتقين.

فقیر

ابوالکلام کان اللہ لہ

۴؍شعبان ۱۳۳۸ھ

۲۳؍اپریل ۱۹۲۰ء، جمعہ

(۲) ﴿۲۲۴﴾

مسودہ بیعت جہاد:

مولانا ملیح آبادی نے اس کا عنوان ''بیعت جہاد'' قایم کیا ہے اس کا مسودہ مولانا آزادؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ درج کیا جاتا ہے۔

اٰمَنتُ بِاللهِ وَبِمَا جَآءَ مِن عِندِاللهِ، وَاٰمَنتُ بِرَسُولِ اللهِ وَبِمَا جَآءَ مِن رَسُولِ اللهِ وَاَقُولُ اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُكِي وَمَحيَایَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ العٰلَمِينَ لَاشَرِيكَ لَه وَبِذٰلِكَ اُمِرتُ وَاَنَا اَوَّلُ المُسلِمِينَ.

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خُلفا ونائبین اس بات پر کہ:

ا۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد اور عمل پر قایم رہوں گا، اگر استطاعت پائی۔

۲۔ پانچ وقت کی نماز قایم رکھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، زکوۃ اور حج ادا کروں گا، اگر استطاعت پائی۔

۳۔ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا، برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیّت کروں گا۔

۴۔ میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔ اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے، مال سے، اپنے اہل وعیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول ﷺ کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب وسنت کے مطابق دیا جائے گا سمع وطاعت کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

(۳) ﴿۲۲۵﴾

۱۱ر مئی ۱۹۲۰ء

حبّی فی اللہ! السلام علیکم، وفقنا اللہ وایاکم کما یحبہ ویرضاہ

خط پہنچا باوجود عزمِ صمیم فیض آباد نہ پہنچ سکا۔ عین وقت پر موانع پیش آئے۔ قلب کی شکایت کی وجہ سے اس موسم میں سفر نہایت دشوار ہوگیا ہے۔ تاہم ضرورتیں ناگزیر اور ان شاء اللہ ۱۳ر یا ۱۴ر مئی کو پنجاب میل سے روانگی ضروری بہ صورت ثانی ۱۵ر کو پہنچوں گا[۱]۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] اس زمانے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھنؤ میں مقیم تھے۔

(۴) ﴿۲۲۶﴾

کلکتہ

۱۳؍جولائی ۱۹۲۰ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

آپ کے تمام خطوط یک جا ملے۔ گزشتہ ماہ کے اواخر میں بمبئی گیا تھا تاکہ معاملات ایک قطعی اور مختتم صورت اختیار کرلیں۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا، ایک ہفتے سے زاید عرصہ اس میں ضایع ہوگیا، چوں کہ ارادہ زیادہ قیام کا نہ تھا، اس لیے ڈاک کلکتہ سے نہ منگوائی، کل یہاں پہنچا اور آج ڈاک میں آپ کے خطوط ملے۔ بحمد اللہ معاملۂ تنظیم جماعت من کل الوجوہ اتمام کو پہنچا۔ جزئیات وتفصیلات بھی طے پاگئیں۔ اب بجز توسیعِ دایرۂ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں ہے، اور وہ توفیق الٰہی پر موقوف ہے۔

حسرت صاحب سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ رائے وفکر کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کا اصلی جوہر استقامتِ عمل ہے۔ پس ان اُمور میں ان کی رائے پر اعتماد بے سود ہوگا[۱]۔

آپ نے لکھنو کے جو حالات لکھے ہیں، ان کو پڑھ کر سخت قلق ہوا۔ افسوس بہتر سے بہتر نیکی کو بھی یہ لوگ بلا آمیزش بدی کے نہیں انجام دے سکتے۔ ان لوگوں میں ایک شخص بھی نہیں جو اس مسئلے کی اہمیّت وحقیقت اور منصبِ امامت کے فرایض ومہمات، اور پھر موجودہ حالات کی بنا پر مشکلات وصعوباتِ راہ کا نکتہ شناس ہو۔ مع ہذا اگر یہ لوگ اصول کو تسلیم کرلیں اور کسی نہ کسی شخص کو متفقہ طور پر منتخب کرلیں، تو ہر حال موجودہ طوائف الملوکی سے یہ بہتر ہوگا۔

بہ ہر حال ہمارا دایرۂ عمل مکمّل ہو چکا ہے۔ پنجاب، سندھ، بنگال بالکل متفق ومتّحد ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہوگیا ہے۔ ان لوگوں کے فیصلے کا انتظار بے سود

تھا اور بے سود ہے۔

مفصّل خط کل یا پرسوں لکھوں گا، روپے کے لیے بمبئی لکھ دیا ہے۔ وہاں سے بذریعہ تار وصول ہو جائے گا۔ بمبئی سے مقصود خلافت کمیٹی نہیں، یہ دوسرا انتظام ہے[۲]۔ اور چوں کہ پوری طرح تنظیم ہو گئی ہے، اس لیے ان شاء اللہ آیندہ مالی مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔ پوری طرح مطمئن و فارغ البال رہیں۔

اب میں اس کے قطعاً خلاف ہوں کہ آپ ''عالمِ اسلامی'' وغیرہ اخبارات کی اشاعت کی فکر کریں[۳]۔ اخبار اگر اعلیٰ پیمانے پر نکلے تو مفید ہوگا اور وہ بہ حالتِ موجودہ ممکن ہے اور نہ بہ صورت تہیہ اسباب مفید! ضرورت صرف اس کی ہے کہ ایک دو ماہ صرف ایک ہی کام میں مشغول رہیں، یعنی دعوت و تبلیغ۔ اس کے بعد ان شاء اللہ ایک دوسری زندگی کو اپنے لیے آمادہ پائیں گے۔ آپ کے لیے جو امور پیشِ نظر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا وقت جلد لائے۔ یاد رکھیے کہ کام ایک ہی مرتبہ کرنا چاہیے۔ اور اعلیٰ پیمانے پر کرنا چاہیے، بے سروسامانی میں متعدد چھوٹے چھوٹے کاموں کو شروع کرنا، اپنے مستقبل کو نقصان پہنچانا ہے۔ مولوی عثمان صاحب[۴] آج کل کن اشغال میں ہیں؟

ابوالکلام

حواشی:

[۱] نظم جماعت کے سلسلے میں مکتوب الیہ کی مولانا حسرت موہانی سے بات چیت ہوئی تھی اور مکتوب نگار کی ملاقات بھی ان سے بمبئی میں ہوئی۔ مولانا آزاد کی رائے مرحوم کے بارے میں کیا خوب ہے۔ بلاشبہ ان کا اصل جوہر سیرت استقامتِ عمل تھا۔

[۲] مکتوب الیہ اور مولانا غلام رسول مہر کی روایت کے مطابق مولانا محمد علی ایم اے کنٹب [ابن مولانا عبدالقادر قصوری] کے ذریعے سے نظم جماعت کے کاموں کے لیے ایک لاکھ روپے ملے تھے۔ خلافت کمیٹی کے سوا دوسرے انتظام سے مقصود یہی انتظام تھا۔ مولانا آزاد نے یہ رقم اپنے ہاتھ میں نہیں لی تھی، بلکہ جس کام کے لیے اور جس شخص کو رقم دینی ہوتی اسے دلوا دیتے تھے۔

[۳] مکتوب الیہ مولانا ملیح آبادی لکھنو سے ایک اخبار ''عالم اسلامی'' نکالنا چاہتے تھے، لیکن مولانا آزاد اس منصوبے سے مطمئن تھے نہ متفق۔ اس لیے ان کی ہمت افزائی نہیں کی۔ مولانا آزاد کے نزدیک اس وقت تحریکِ نظمِ جماعت کی تکمیل اور دعوت و تبلیغ امامت وقت کا سب سے اہم مسئلہ تھا اسی کی طرف متوجہ کیا۔

[۴] مولوی عثمان مولانا ملیح آبادی کے دوستوں میں تھے مدرسہ دارالدعوۃ والارشاد [مصر] میں ان کے رفیق درس تھے۔ لکھنو اور کلکتے میں ملیح آبادی کا قرب رہا تھا اور اخبار ''ہند'' کی ناشر پبلک لمیٹڈ کمپنی کے ڈائریکٹر بھی ہو گئے۔ پورا نام سید محمد عثمان تھا مخصوص پور مونگیر کے رہنے والے تھے لیکن نام کے ساتھ مصری لکھتے تھے اور اس نسبت سے مشہور تھے۔

(۵) ﴿۲۲۷﴾

برادرِ عزیز! السلام علیکم

کل مفصّل خط آپ کو لکھوں گا۔ سر دست ایک کام کر دیجیے حکیم صاحب[۱] کو لکھنو کے خربوزے مطلوب ہیں، کسی واقف کار سے مدد لیجیے اور ایک من عمدہ سفیدہ لے کر اور اچھی طرح ٹوکرے میں رکھ کر بذریعۂ ریلوے پارسل بھیج دیجیے۔ بلٹی پوسٹ ماسٹر کاٹھ گودام کے نام بھیجی جائے اور ساتھ لکھ دیا جائے کہ ٹوکرا وصول کر کے حکیم صاحب کے یہاں بھیج دیا جائے۔ ٹوکرے میں خربوزوں کو عمدہ طور پر رکھنا چاہیے۔ وہاں لوگ اس سے واقف ہیں۔ لیکن آپ خاص طور پر تاکید کر دیجیے گا۔ لکھنو میں بعض تاجر باہر بھیجنے کا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اسے کہہ دیا جائے۔ قیمت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، لیکن پھل عمدہ ہوں۔ روپیہ آپ دے دیں۔ آپ کو ضرورت ہو گی تو میں یہاں سے بھیج دوں گا۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] حکیم صاحب سے مراد مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں دہلوی ہیں۔

(۶) ﴿۲۲۸﴾

برادرِ عزیز!

آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ بہ راہِ عنایت لکھنو میں کسی کارداں شخص سے کہہ دیں کہ ایک رضائی تیار کرا کے کلکتہ بھیج دے۔ رضائی لکھنو سے باہر اچھی تیار نہیں ہوسکتی، اور جگہ کے دھنیے ہلکی روئی بچھا ہی نہیں سکتے۔ فرد صوفیانہ مگر عمدہ قسم کی ہو، استر صندلی رنگ کا، سرخ نہ ہو۔ کنارے کی مغزی اودی ریشمی، ایک عزیز کی فرمایش ہے اور تحفۃً دینا مقصود ہے۔ بیس پچیس روپے کی لاگت آئے تو مضایقہ نہیں بلکہ دو چار اور سہی۔ لیکن عمدہ اور خوشنما ہو۔ روئی اتنی دی جائے جتنی کہ عموماً رضائی میں دی جاتی ہے۔ تاخیر نہ ہو۔

(۷) ﴿۲۲۹﴾

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے حضرت مولانا آزادؒ کی امامت کے بارے میں مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی رائے معلوم کی۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ میں خود بارِ امامت کا اہل نہیں، مولانا محمود حسنؒ [شیخ الہند] بھی اس کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں ان کی امامت بسر و چشم قبول کرنے پر آمادہ ہوں، لیکن تحریک اپنی جانب سے کرنا نہیں چاہتا[۱]۔ مولانا آزادؒ نے جواباً تحریر فرمایا:

''مولوی عبدالباری کا خط دیکھا:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

سردست اس قصے کو تہ کیجیے اور کام کیے جایئے۔ پنجاب، سندھ، بنگال میں تنظیم قریب مکمل ہے''۔

[۲۰ر ستمبر ۱۹۲۰ء]

حاشیہ:

[۱] حضرت فرنگی محلی کا یہ تاریخی خط آیندہ صفحات میں بہ طور ضمیمہ میں درج کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ:

امامت کے امیدوار

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا ایک مضمون ''امامت کے امیدوار'' اور اس کے ساتھ مولانا عبدالباری فرنگی محلی [لکھنو] کا ایک تبصرہ اس ضمیمے میں درج کیا جاتا ہے، تحریک نظم جماعت یا مسئلہ امامت کے باب میں دونوں قیمتی تاریخی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں یہ مسئلہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط بنام مولانا ملیح آبادی میں آیا ہے۔ حضرت فرنگی محلی نے چوں کہ تحریک سے کامل اتفاق اور مولانا ابوالکلام آزادی کی اہلیت کے اس درجے اعتراف کے باوجود کہ وہ اس منصب کے لیے مولانا کے سوا کسی اور کا نام لینے کو قوم سے غداری کے مترادف سمجھتے تھے۔ پھر بھی اس تحریک کو اپنی طرف سے جاری کرنا دیانت کے خلاف سمجھتے تھے کہ اگر وہ ملّت کے بہترین مفاد میں مولانا آزاد کو امام یا تحریک کا قاید تسلیم کرلیں گے تو دوسروں کے اعمال کا بار اُن کی گردن پر آئے گا اور وہ کسی اور کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ غور فرمائیے کتنا پیچیدہ خیال اور بودا عذر تھا مولانا کا افسوس کہ مولانا رحمتہ اللہ نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ وہ ایک اسلامی ملی تحریک کی صحت وضرورت سے اتفاق اور اس کے داعی کے علم وصلاحیت اخلاص و دیانت اور استحقاق کے اعتراف کے باوجود اس سے تعاون بالمعروف سے نہ صرف خود قاصر ومحروم رہ گئے بلکہ معروف میں سبقت اور اقدام نہ کرکے اجرا اور دوسروں کے تعاون میں ایک رکاوٹ بن رہے ہیں!

مولانا ملیح آبادی نے اس مسئلے میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دہلوی سے بھی ملاقات کی تھی اور ان کی رائے دریافت کی تھی۔ مولانا ملیح آبادی نے ان

دونوں بزرگوں سے اپنی ملاقاتوں کی روداد تحریر کی ہے۔ دونوں بزرگوں کے اندازِ فکر اور رویوں میں کتنا فرق ہے! اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت جاننے کے لیے مولانا ملیح آبادی کا بیان کافی ہے۔ مولانا نے اپنی تالیف ''ذکر آزاد'' میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ امامت کے امیدوار کے عنوان سے حضرت محدث دیوبندی اور حضرت فرنگی محلی سے اس مسئلے میں اپنی ملاقاتوں کی روداد بیان کی ہے اور مولانا فرنگی محلی کا ایک تاریخی خط درج کیا ہے۔ ہم یہاں مولانا ملیح آبادی کی مذکورہ تحریر اور مولانا فرنگی محلی کا یہ خط درج کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

شیخ الہند مولانا محمود حسن:

''اسی زمانے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم و مغفور مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنو تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ خبر ملی کہ فرنگی محل والے اس کوشش میں ہیں کہ مولانا عبدالباری صاحب کی امامت پر انھیں راضی کر لیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خود شیخ الہند کے بعض رفیق شیخ کے لیے یہ منصب چاہتے ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی۔ شیخ الہند کے لیے میں اَن جان نہ تھا۔ منیٰ اور مکے میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور بڑی شفقت سے پیش آئے تھے۔ لیکن اب جو مسئلہ درپیش تھا نازک بھی تھا اور اہم بھی۔ جو شیخ کی ذات سے بھی تعلق رکھتا تھا اور بڑے سلیقے کا طالب تھا۔ میں نے شیخ الہند سے تنہائی میں ملاقات کی۔ رسمی باتوں کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کی امامت کا تذکرہ چھیڑا۔ شیخ نے فرمایا: امامت کی ضرورت مسلم ہے۔ عرض کیا حضرت سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ہوش مند، مدبر اور ڈپلومیٹ ہو۔ مسلمانوں کا امام ایسا شخص ہونا چاہیے جس کی استقامت کو نہ کوئی تشویش متزلزل کر سکے نہ کوئی ترہیب! مثال کے طور پر میں نے پاپائے روم کا تذکرہ کیا جو ڈپلومیسی میں فرد اور سیاسیات کا شاطر ہے، شیخ

الہند نے اتفاق ظاہر کیا تو عرض کیا: آپ کی رائے میں اس وقت امامت کا اہل کون ہے؟ یہ بھی اشارۃً کہہ دیا کہ بعض لوگ اس منصب کے لیے خود آپ کا نام لے رہے ہیں اور آپ بحمد اللہ اہل بھی ہیں شیخ بڑی معصومیت سے مسکرائے اور فرمایا میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کا امام بنوں! عرض کیا کچھ لوگ مولانا عبدالباری صاحب کا نام لے رہے ہیں! موصوف کا تقویٰ واستقامت مسلم ہے، مگر مزاج کی کیفیت سے آپ بھی واقف ہیں؟ شیخ نے سادگی سے جواب دیا: مولانا عبدالباری کے بہترین آدمی ہونے میں شبہ نہیں، مگر منصب کی ذمے داریاں کچھ اور ہی ہیں۔ عرض کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے؟

''شیخ نے متانت سے فرمایا، میرا انتخاب بھی یہی ہے۔ اس وقت مولانا آزاد کے سوا کوئی شخص، امام الہند، نہیں ہوسکتا۔ اُن میں وہ سب اوصاف جمع ہیں جو اس زمانے میں ہندستان کے امام میں ہونا ضروری ہیں!

میں اپنے مشن میں کامیاب ہوچکا تھا۔ شیخ سے عرض کیا، اس گفتگو کو پبلک میں لا سکتا ہوں؟ انھوں نے اجازت دے دی سب سے پہلے میں نے مولانا آزاد کو تار پر خلاصہ بھیجا۔ پھر زبانی شہرت دینا شروع کیا۔ بعض اخباروں میں بھی مبہم لفظوں میں تذکرہ آ گیا۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی:

''اب مولانا عبدالباری صاحب سے نپٹنا تھا۔ مولانا سے میرے گہرے تعلقات تھے، اور اندیشہ تھا کہ میری اس مہم کا حال معلوم ہوگا تو مجھے نہ جانے کتنا بُرا سمجھیں گے۔ مگر جب بات چیت ہوئی تو خندہ پیشانی سے کہنے لگے:

> مولانا آزاد کے سوا کسی اور کا نام امامت کے لیے لینا قوم سے غداری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے شیخ الہند سے معاملہ صاف کرلیا، اور میں پہلا آدمی ہوں جو مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ ہمیں ہندستان آزاد کرانا

ہے۔ اور اسلامی دنیا کو انگریز کے چنگل سے نکالنا ہے۔ میں ایک نکٹے بُچّے حبشی غلام کو بھی سردار مان لوں گا، اگر انگریز پر جہاد کرے اور انگریز سے لڑے!

مگر میں اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ جانتا تھا مولانا آزاد سے بڑی چشمک ہے، گو ظاہری محبّت و خلوص کی کمی نہیں۔ میں نے درخواست کی کہ اپنا جواب تحریر کی صورت میں لے آئیں۔ اتفاق سے پُرانے کاغذوں میں اس تحریر کی نقل مل گئی ہے۔ یہاں درج کرتا ہوں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

حَامِدًا وَّمُصَلِّیاً وَّمُسَلِّماً.

مکرمی دام مجدہٗ! السلام علیکم۔

مسئلہ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوائے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے وہ بارہا اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں، باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز کو بسروچشم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خود مجھ سے بارہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی، مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا، نہ آیندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔

مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے بھی مجھے استنکاف نہیں ہے۔ بسروچشم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ بشرطے کہ تفریقِ جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں۔ اگر کسی نا اہل کو تمام یا اکثر اہل اسلام قبول کرلیں گے، تو مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار اور فرمان بردار پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا۔ نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں اس سے زاید مجھے اس تحریک سے تعرّض نہیں ہے۔ والسلام بندہ فقیر محمد عبدالباری مدرسۂ اسلامیہ۔ کلکتہ

(۸) ﴿۲۳۰﴾

مدرسۂ اسلامیہ تحریک ترک موالات کے زمانے میں [تقریباً وسط ۱۹۲۰ء میں] قایم ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا باقاعدہ افتتاح ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی سے کرایا گیا۔ اس موقع پر گاندھی جی نے ایک تقریر بھی کی تھی اور معائنے کے رجسٹر میں اردو میں یہ جملہ تحریر کیا:

''میں مدرسے کی ترقی کے لیے دُآ [دعا] کرتا ہوں''۔

مولانا آزادؒ مدرسے کے سرپرست، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مہتمم اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس تھے۔ عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مدرسے کے استاد تھے۔ [رحمۃ اللہ علیہم اجمعین]

اخراجات اور مدرسین کی تنخواہوں وغیرہ کا دار و مدار اس وقف پر تھا جو جامع مسجد کے مدرسے کے لیے مخصوص تھا اگرچہ فنڈ میں روپے کی کمی نہ تھی لیکن متولیوں کو نہ تو تعلیم سے دل چسپی تھی، نہ انھیں قومی زندگی میں اس قسم کے مدارس کی اہمیت کا احساس تھا۔ انھوں نے نہ تو مدرسے کے اجرا و قیام کو خوش دلی سے گوارا کیا تھا، نہ اس کے مالی معاملات میں اپنی ذمے داری کو! اس لیے جن مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ان کا اندازہ مولانا آزادؒ کے رُقعات سے ہوتا ہے۔ مالی اعتبار سے ایک دن بھی اطمینان کی صورت پیدا نہ ہو سکی، بلکہ ابھی مدرسے کا باقاعدہ افتتاح بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ گیا، جیسا کہ ۳۰ر ربیع الاول ۱۳۳۹ء مطابق ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء کے رقعے سے عیاں ہے۔ ذیل میں متعدد خطوط و اقعاتِ مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ ہی کے سلسلے میں آرہے ہیں۔

(۹) ﴿۲۳۱﴾

مکتوب الیہ ابھی لکھنو ہی میں تھے اور نظم جماعت کے کام میں مصروف تھے کہ مولانا آزادؒ کا خط پہنچا۔

۲۱ر ستمبر ۱۹۲۰ء

حبّی فی اللہ! السلام علیکم۔

ادھر عرصے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ مولوی عثمان صاحب بھی رانچی کے لیے نہیں آئے[1]۔ بالفعل مدارس کا معاملہ ایک نئی فوری شکل اختیار کر رہا ہے۔ ترکِ موالات کے سلسلے میں سرکاری مدارس سے علاحدگی علی الخصوص عربی سرکاری مدارس سے، نہایت ضروری ہے۔ بنگال میں اس کا مواد بالکل مہیّا ہے۔ لیکن ضرورت نئی تعلیم گاہوں کے انتظام کی ہے۔

بالفعل ارادہ ہے کہ مدرسۂ جامع مسجد۔ کلکتہ جلد سے جلد کھول دیا جائے۔ روپے کا انتظام ہو چکا ہے، دوسو [۲۰۰] طلبہ تیار ہیں۔ صرف ضرورت اساتذہ اور معلمین کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس بارے میں سعی کیجیے اور تمام کاموں پر اس کو مقدم رکھیے۔

بالفعل دو جگہوں کے لیے مدرسین کا پورا اسٹاف مطلوب ہے۔ کلکتہ کے لیے اور رانچی کے لیے۔ آٹھ مدرسین یہاں ہوں گے اور اتنے ہی رانچی میں۔

عربی ادب کی ابتدائی کتابوں سے لے کر درجۂ تکمیل کے علوم تک کے لیے مدرسین مطلوب ہیں۔ ابتدائی درجوں کے لیے چنداں فکر نہیں ہے۔ لیکن کم از کم دو بہتر مدرس کلکتہ کے لیے اور دو رانچی کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سے دو شخص پرنسپل ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں۔

وقت وضرورت اور کام کا مقتضا تو یہ تھا کہ علماے ہندستان کی پوری تاریخ میں کم از کم ایک نمونہ تو ایثار نفسی کا دکھاتے اور اس کام کو ایک عظیم وجلیل خدمت دینی سمجھ کر بلا معاوضہ وقت دینے کے لیے تیار ہو جاتے۔ لیکن اس امید کو تو وہم وگمان میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ کاش اتنا ہی ہو جائے کہ مناسب تنخواہیں لیں، مگر دوسری جگہوں پر اس کو ترجیح دیں۔ بالفعل طے پایا ہے کہ تیس ۳۰ سے ۱۰۰ روپے تک تنخواہیں دی جائیں۔

بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ علماء کی جستجو کی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ آپ لکھیے کہ لکھنو میں کتنے آدمی مل سکتے ہیں؟ اور مقامات میں کون کون؟ علماء میں جن

لوگوں کو وقت کی خدمات کا ذوق ہو، ان کے لیے بہترین موقع ہے۔ قیام وغیرہ کے تمام انتظامات بہ احسن وجوہ کر دیے جائیں گے۔ تقرر عارضی نہ ہوگا اور ان شاء اللہ ہر طرح قابلِ اطمینان! میں کسی ایسے معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالتا جو عارضی ہو۔ ضرورت ہو تو آپ لکھنو سے باہر بھی چلے جائیں اور زبانی گفتگو کر کے انتظام کریں۔ روپے کی ضرورت ہو تو تار دے کر مجھ سے منگوا لیں۔

دارالعلوم ندوہ سے کچھ لوگ مل سکیں تو کوشش کیجیے! ضرورت ہوئی تو عارضی طور پر آپ کو بھی آ جانا پڑے گا۔ بالفعل خیال یہ ہے کہ یہاں کے تمام طلبہ میں جو آمادگی پیدا ہو گئی ہے اس کو فوراً کام میں لایا جائے۔ بنگال میں نہایت کثرت سے عربی مدارس ہیں اور سب سرکاری ہیں۔ بنگال کے علاوہ اور کہیں عربی تعلیم گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کم از کم دو ہزار طلبہ مشغول تعلیم ہیں۔ اتنی بڑی جماعت نے اگر عملاً اقدام کیا تو تمام ملک پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا۔ علاوہ بریں وہ مدت کی تمنائیں بر آئیں گی جو اصلاحِ تعلیم کے بارے میں آج تک ناکام رہیں[۲]۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] مولانا آزاد نے رانچی میں دورانِ نظر بندی جو مدرسہ اسلامیہ قایم کیا تھا اس میں ایک مدرس کی ضرورت تھی اور مولوی سید محمد عثمان مصری مونگیری نے وہاں خدمات انجام دینے کا وعدہ کیا تھا۔

[۲] برٹش عہدِ حکومت میں مولانا آزاد قومی مدارس کے قیام کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ترک موالات میں اس کی تحریک پیدا ہوگئی تھی، اس سے فایدہ اٹھانا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ قومی قسم کے آزاد نظام سے مولانا کے پیش نظر تین اہم مقاصد تھے:

الف۔ ہندستان میں برطانوی حکومت کو شکست دینا

ب۔ حکومت کے اثر سے پاک آزاد قومی تعلیم و تربیت کا مستقل انتظام کر دینا۔

ج۔ تعلیم کے نظام اور نصاب میں قومی نقطۂ نظر سے ایسی اصلاحات کرنا جس سے ایسے اہل علم پیدا ہوں جو وقت کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور آیندہ آزاد ہندستان میں اپنا صحیح مقام پیدا کر سکیں۔

اصلاح نصاب و مقاصدِ تعلیم کے باب میں مولانا آزاد کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ زندگی بھر اس کے لیے کوشاں رہے

لیکن اہل مدارس کے جمود و ذوقِ تقلید نے مولانا کی کوششوں کو کامیابی سے ہم کنار نہ ہونے دیا۔
مولانا کے تعلیمی افکار کے مطالعے کے لیے ''اسپیچز آف مولانا آزاد'' مطبوعہ پبلی کیشن ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی سے رجوع کیجیے۔

(۱۰) ﴿۲۳۲﴾

۳۰ رستمبر ۱۹۲۰ء

حبّی فی اللہ! السلام علیکم۔

خط پہنچا۔ مولوی سید علی صاحب کو ضرور آمادہ کیجیے[۱]۔ جو رقم وہاں مل رہی ہے، اس سے اس قدر زیادہ کا انتظام ہو جائے گا کہ کلکتہ و لکھنو کے مخارج کا فرق پورا ہو جائے۔

مولوی ناظر حسن چھتاری کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ مولوی انور شاہ صاحب[۲] دیو بند سے آنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ اگر معقول مشاہرہ ہو۔ پس بہتر ہے کہ آپ فوراً دیو بند چلے جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے بھی زور ڈلوائیں[۳] اور مدرسۂ جامع مسجد۔ کلکتہ کی صدارت کے لیے انھیں آمادہ کریں۔ اگر یہ آ جائیں اور کلکتہ میں رہیں۔ مولوی سید علی رانچی کے صدر مدرس کر دیے جائیں۔ اگرچہ مولوی سید علی کے مذاق علمی کا حال معلوم نہیں۔ ادب سے تو انھیں ذوق ہے۔

خط میں قیام کی نسبت جو لکھا تھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر تمام مدرسین آ گئے تو ان کے قیام وغیرہ کے لیے مکان کا انتظام ہم خود کریں گے۔ ایک دو شخصوں کے لیے دقت ہوتی ہے جماعت ہو تو آسانی ہے۔ بہ ہر حال قیام کی نسبت آپ وعدہ کر لیں، جو تنخواہیں مل رہی ہیں، ان سے زیادہ رقوم منظور کر لیجیے۔ دیو بند آپ فوراً جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے طالبِ اعانت ہوں۔ ان سے مشورہ لیجیے اور خطوط۔ متعدد آدمی دیو بندی حلقے کے آ جائیں گے۔ مقصود تعجیل ہے، زیادہ تاخیر میں اتلاف کار کا خوف ہے۔ ممکن ہے طلبہ کی مستعدی ضعیف پڑ جائے۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] مولوی سید علی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک استاد تھے مولانا ملیح آبادی سے ان کے تعلقات تھے۔

[۲] مولانا انور شاہ کشمیری [۱۸۷۵ء-۱۹۳۳ء] شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نامور تلامذہ میں تھے، دارالعلوم کے مدرس ہوئے۔ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ دارالعلوم ڈابھیل میں بھی شیخ الحدیث رہے۔ جامع العلوم تھے، فقہ میں خاص مہارت تھی اور فلسفیانہ ذوق رکھتے تھے۔

[۳] مولانا محمود حسن [۱۸۵۲ء-۱۹۲۰ء] دیوبند کے عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے۔ حضرت قاسم نانوتوی کی سیاسی تربیت کا نمونہ اور ولی اللّٰہی علوم وافکار کا گنجینہ تھے۔ شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے منصبِ جلیلہ پر فایز رہے۔ انگریزوں سے سخت متنفر اور استعمار دشمن تھے۔ ۱۹۱۵ء میں حجاز تشریف لے گئے، ۱۹۱۶ء میں انھیں حرم مکّہ میں گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں لے جا کر نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں رہائی عمل میں آئی، تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں رہنمائی کی۔ شریعت وطریقت کی جامع شخصیت تھے۔ سیاست میں خاص بصیرت کے مالک اور ملک کے محبوب رہنما تھے۔ ملک کی تمام اقوام اور مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تحریک خلافت میں ''شیخ الہند'' کے معزز لقب نے ان کے وجودِ گرامی کی نسبت سے شرف پایا۔

(۱۱)

﴿۲۳۳﴾

مکتوب الیہ اس زمانے میں لکھنو سے کلکتہ آ گئے تھے۔ مولانا آزادؒ کے ساتھ قیام اور ان کے کاموں میں شریک ومعاون تھے۔

الہ آباد،

۲۹/نومبر ۱۹۲۰ء

اخ العزیز! السلام علیکم

امید ہے کہ آپ باطمینان مشغول کار ہوں گے۔ دہلی میں مولانا محمود حسن صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ مولوی شبیر احمد [۱] اور مولوی حسین احمد دونوں کو اجازت دے چکے ہیں۔ مولوی شبیر احمد بالکل تیار ہو گئے تھے۔ لیکن بعد کو اُنھوں نے محسوس کیا کہ یہاں سے علاحدگی ان کے بعض خاص مقاصد کے لیے مُضر ہے۔ مولانا کے ساتھ ایک پوری جماعت اصحابِ اغراض کی لگی ہوئی ہے۔ غرض ایک ہے اور غرض مند

متعدد، اس لیے رقیبانہ کشمکش ہو رہی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہی تنہا رہے اور دوسرا الگ ہو جائے اور اس طرح ذاتی اغراض و مفادِ بلا زحمت حاصل ہوں۔ اس کشمکش میں ایک فریق مولوی شبیر احمد بھی ہیں۔ پہلے انھوں نے خیال کیا تھا کہ مدرسے کی ریاست ان کے قبضے میں آتی ہے، اس لیے بلا تامل آمادہ ہو گئے۔ اب سوچتے ہیں کہ یہ علاحدگی مولانا حسین احمد کے حلقے کے منافع و مفاد سے انھیں کہیں الگ نہ کر دے اور دوسرے اس پر قابض نہ ہو جائیں۔ اس لیے متردد ہو رہے ہیں[۲]۔ حالت دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی حسین احمد صاحب لے لیے جائیں۔ مولوی شبیر سے زیادہ متین و سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں اور درس و تدریس میں بھی کم نہ ہوں گے۔ وہ بخوشی تیار ہو گئے ہیں۔ صرف ایک ہفتے کی مہلت چاہی ہے۔ مولوی عبداللہ مصری کو کہہ آیا تھا کے انتظار کریں اور پھر اپنے ساتھ کلکتہ لے جائیں۔ غالباً اب وہ روانہ ہو گئے ہوں گے یا روانگی کے لیے آمادہ ہوں گے۔ آپ طلبہ میں اعلان کر دیں کہ جمعیّت العلماء کے جلسے اور مولوی محمود حسن صاحب کی علالت کی وجہ سے تاخیر ہو گئی، اب مولوی حسین احمد آ رہے ہیں جو پندرہ (۱۵) سال تک مدینۂ منورہ میں درس حدیث دیتے رہے ہیں اور تمام حلقۂ دیوبند میں مولانا کے بعد ہر طرح بہتر و افضل ہیں۔ (۳)

جیسا کہ پہلے سے خیال تھا، جمعیّت العلماء سے بجز اس کے کوئی فایدہ نہ ہوا کہ ترک موالات پر ایک فتویٰ تیار ہو گیا۔ اور یہ بہ ہر حال ایک مفید اور ضروری کام ہوا۔

امید ہے کہ آپ مطمئن اور خوش حال ہوں گے۔ اگر مولوی حسین احمد صاحب اب تک نہ آئے ہوں تو ایک تار مولانا محمود حسن صاحب بہ ذریعۂ ڈاکٹر انصاری دریا گنج، دہلی کے نام بھیج دیجیے کہ مولوی حسین احمد صاحب جلد آئیں۔ میں ان شاء اللہ ہفتے عشرے میں کلکتہ پہنچتا ہوں۔ خط کا جواب آپ بانکی پور کے پتے سے بہ ذریعہ مسٹر مظہر الحق صاحب روانہ کریں۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] مولانا شبیر احمد [۱۸۸۸-۱۹۴۹ء] دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن کے بیٹے اور دارالعلوم دیو بند کے مفتی عزیز الرحمٰن کے چھوٹے بھائی تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی کے شاگردوں میں نامور ہوئے۔ مدرسۂ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس رہے، پھر دیو بند میں مدرس ہوئے۔ قرآن حکیم اور حدیث کے علوم میں گہری نظر تھی۔ تحریک خلافت اور ترک موالات میں حصہ لیا جمعیت علمائے ہند میں شریک تھے۔ بعدہ مسلم لیگ کی قایم کردہ جمعیت علمائے اسلام کے صدر ہوئے۔ مسلم لیگی اور دیو بندی مکتبِ فکر کی ایک مخصوص جماعت انھیں شیخ الہند کا جانشین اور شیخ الاسلام لکھتی ہے۔

[۲] شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی [۱۸۷۹ء-۱۹۵۷ء] جانشین شیخ الہند کے تعارفی نوٹ پر مولانا آزاد کے مکتوب الیہ کی حیثیت سے آئیں گے۔

[۳] حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے اخلاص وایثار اور ذوق خدمتِ دینی کو اس عہد کا کوئی شخص پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔ سیاست میں وہ حضرت شیخ الہند کے سچے جانشیں تھے۔

(۱۲) ﴿۲۳۴﴾

مولانا ملیح آبادی نے مدرسے کی ضروریات اور طلبہ کی اعانت کے لیے روپے کی ضرورت کا اظہار کیا تھا۔

۳۰ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ، ۱۲ دسمبر ۱۹۲۰ء

کل صبح مجھے اندازاً بتادیجیے کہ بالفعل ان طلبہ کی اعانت کے لیے کس قدر (رقم) چاہیے، تاکہ اس کا انتظام کردیا جائے، پھر ان شاء اللہ جنوری میں تمام انتظام ہوجائیں گے۔ آج متولی [۱] سے بھی اس بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ وظائف کی نسبت وعدہ لے لیا ہے۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] سیٹھ احمد زکریا متولی جامع مسجد و مدرسہ وقف کمیٹی کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۳) ﴿۲۳۵﴾

مولانا ملیح آبادی مدرسے کی ضروریات کے لیے روپے لینے جامع مسجد کے متولی سیٹھ احمد زکریا کے مکان پر گئے۔ لیکن اس نے نہ صرف ملنے سے انکار کر دیا بلکہ مولانا آزادؒ کے خط کا جواب دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ملازم سے مدرسے کے حساب کا رجسٹر منگوانا چاہا تب بھی اس نے تُرش روئی سے جواب دیا اور انکار کر دیا۔ مولانا ملیح آبادی خفیف ہو کر چلے آئے اور مولاناؒ کو کیفیت لکھ بھیجی۔

مولاناؒ نے جواب دیا:

۱۳؍ جنوری ۱۹۲۱ء

افسوس ہے کہ اس نالایق کے یہاں جا کر آپ کو یہ ناگوار واقعہ پیش آیا۔ خیر آیندہ آپ کو جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ آج صبح میں نے متولیوں سے احتیاطاً کہہ دیا تھا کہ اوقافِ مدرسہ کی وصولی کا تعلّق آیندہ عبداللطیف یا احمد سے ہم نہیں رکھ سکتے۔ وہ بطورِ خود انتظام کریں۔ حاجی محمد زکریا نے اس غرض سے کل چار بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ یہ تمام مشکلات دُور ہو جائیں گی۔

ابوالکلام

(۱۴) ﴿۲۳٦﴾

کل میں اسی غرض سے ملنا چاہتا تھا، مگر آپ موجود نہ تھے۔ مہینہ اگر ختم ہو گیا ہے تو تنخواہ کی حسب معمول فہرست لکھنی چاہیے اور تنخواہیں حسبِ معمول بانٹ دینی چاہییں۔ پرسوں متولیوں سے گفتگو ہو گئی عارضی طور پر وہ ابھی روپیہ دیتے رہیں گے اور مستقل انتظام اپنی کمیٹی کی منظوری کے بعد کریں گے۔ پس اگر تنخواہ کا بل بن جائے تو وہاں بھیج دیا جائے۔ باقی رہی آپ کی رقم تو اس کو بھی ماہ گذشتہ کے قرض کی رقم میں دکھا دیجیے۔[۱]

طالب علم کو آپ ماہِ آیندہ کی رقم وظائف دے سکتے ہیں، جو بل میں مجموعی درج

ہوگی[۲]۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] غالباً مولانا ملیح آبادی کی بھی تنخواہ مقرر ہوگئی تھی اور اس کی ادائیگی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔
[۲] مدرسے کا ایک طالب علم کچھ رقم کا کسی شخص کا مقروض تھا۔ اس نے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ رقم مدرسے سے بہ طور قرض مانگی تھی۔

(۱۵) ﴿۲۳۷﴾

کتابوں کی تجلید، میز، کرسی اور دیگر ضروریاتِ مدرسہ کے لیے روپے طلب کرنے پر مولانا کا جواب۔

لیکن بالفعل روپیہ بالکل نہیں ہے۔ آج سہ پہر خود اسی غرض سے جانے والا ہوں۔

ابوالکلام

(۱٦) ﴿۲۳۸﴾

ترکِ موالات کے زمانے میں انگریزی کپڑے اور ہر قسم کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ہر شخص جس کے اندر ذرا سی قومی غیرت وحمیّت بھی تھی، اس نے دیسی کھڈی کا بنا ہوا کپڑا پہننا شروع کر دیا گیا۔ گھر گھر چرخے چلائے جاتے تھے اور قومی اسکولوں میں بھی ان کا چلانا سکھایا جاتا تھا۔ گویا کہ چرخا قومی نشان بن گیا تھا۔ مدرسۂ اسلامیہ کے طلبہ نے بھی چرخوں کے لیے اصرار کیا۔ نیز درخواست کی کہ سالانہ امتحان ۱۵ر رجب کی بجائے یکم شعبان سے لیا جائے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کا ایک رقعہ:

[۲۷ر جمادی الثانی مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۲۱ء سے قبل]

"مجھے صبح چار بجے سے سخت پیچش ہوگئی ہے اور طبیعت معطل ہے۔ اگر مولوی منیر الزماں [۱] کے یہاں چرخے عمدہ ہیں، تو آج ہی پانچ چرخے وہاں سے منگوا لیے جائیں۔ قیمت ان کو دے دی جائے گی یا یوں کیجیے کہ جس قدر ان کے پاس ہوں، خلافت کمیٹی خرید لے اور کمیٹی سے حسبِ ضرورت مدرسے کے لیے لے لیے جائیں۔

فضل دین [۲] سے کہہ دیجیے: امتحان کی مدت بڑھا دی جاسکتی ہے، مجھے کوئی عذر نہیں۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] مولانا منیر الزماں اسلام آباد [چاٹگام] کے رہنے والے تھے۔ قومی کاموں میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا۔ جمعیت علمائے ہند سے تعلق تھا۔ مولانا آزاد کے عقیدت مند اور ان کے تحریک نظم جماعت کے بنگال میں ایک اہم رکن اور اس سلسلے میں مولانا سے بیعت تھے۔ عمر میں مولانا آزاد سے بڑے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: "تحریک نظم جماعت مولانا ابوالکلام آزاد" مولفہ ابوسلمان شاہ جہان پوری۔

[۲] فضل دین احمد وہی صاحب ہیں جنھوں نے مولانا آزاد کا "تذکرہ" شایع کیا تھا۔ "الہلال" اور "پیغام" کے منیجر بھی وہی تھے۔

(۱۷) ﴿۲۳۹﴾

مولانا ملیح آبادی مدرسۂ اسلامیہ کے مہتمم تھے، لیکن مدرسے کے بعض طلبہ کی عمر اور ان کی داڑھی کے مقابلے میں بقیمت بہتر ہونے کے باوجود بصورت کہتر تھے۔ آپ نے بصورت بھی بہتر بننے کی خاطر مولانا آزادؒ کا جبہ لے کر استعمال کرنا شروع کیا، لیکن بات بنی نہیں۔ جبہ مولاناؒ کو اس تحریر کے ساتھ واپس کیا کہ جبہ واپس ہے آپ کو بھی ضرورت ہوگی جناب کا نیا جبہ سل جائے گا تو یہ میرے کام آئے گا!"

مولانا بھی یہ بات سمجھ گئے اور اس تحریر کے ساتھ جبہ واپس کیا:

اس محبّت کے لیے شکر گذار ہوں! سردست ایک گرم جبہ تو میرے پاس ہے، البتہ

اس وضع کا سلوانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس رہے جب کپڑا لیا جائے، تو نمونے کے لیے درزی کو دے دیں گے۔

ابوالکلام

(۱۸) ﴿۲۴۰﴾

مدرسۂ اسلامیہ کے سالانہ امتحان کے بعد جیسا کہ قاعدہ ہے اوایل شوال تک کے لیے تعطیلات کر دی جاتی ہیں، شعبان کے دوسرے ہفتے میں تعطیلات کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ مولانا ملیح آبادی بھی لکھنو آ گئے تھے اور ملیح آباد جانے والے تھے کہ مولانا آزادؔ کا خط پہنچا۔

۲۵/اپریل ۱۹۲۱ء [۱۷/شعبان ۱۳۳۹ء]

صدیقی العزیز! السلام علیکم

لکھنو میں شیعہ کانفرنس ہے۔ بعض مصالح کی بنا پر ارادہ کر رہا تھا کہ اس میں شریک ہوں، لیکن اب وہ خود بُلا رہے ہیں اور شرکت ضروری ہے۔ میں بدھ کو روانہ ہوں گا اور جمعرات کی سہ پہر کو میل ٹرین سے پہنچوں گا۔ اُمید ہے آپ سے ملاقات ہو۔ خط اس لیے لکھتا ہوں کہ آپ ملیح آباد نہ چلے جائیں۔ لکھنو میں موجود رہیں۔ اگر کانفرنس والے مُصر ہوئے تو میں وہیں ٹھہروں گا۔ ورنہ فرنگی محل یا علی میاں کے یہاں[۱]۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] علی میاں سے مراد نواب علی حسن خاں ابن نواب مولانا صدیق حسن خاں آف بھوپال ہیں۔

(۱۹) ﴿۲۴۱﴾

جامع مسجد کلکتہ کے متولیوں کے درمیان ایک اختلاف میں مولانا آزادؔ کو

فریقین نے حکم بنایا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا کا یہ رقعہ ہے:

[اوائل جولائی ۱۹۲۱ء]

مدرسے میں انگریزی وحساب جو شخص پڑھاتے ہیں، غالباً محمد یوسف نام ہے، ان سے آج کہہ دیجیے گا کہ متولیانِ مسجد فیصلۂ مقدمہ کے لیے متقاضی ہیں۔ اس لیے جمعرات کے دن نو ۹ بجے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ تمام مُدعیان مقدمہ کو بھی اطلاع دے دیں۔ اگر کسی وجہ سے مدعی تاخیر چاہتے ہیں، تو اب میں خود اور تاخیر نہیں کر سکتا، ان کو چاہیے کہ خود حاجی محمد زکریا سے مل کر کوئی عذر کریں اور چند دنوں کی تاخیر کے طلب گار ہوں۔ مثلاً وہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مدعی موجود نہیں یا اس دن نہیں آ سکتے دوسرا دن مقرر کیا جائے۔

ابوالکلام

(۲۰) ﴿۲۴۲﴾

۲۷ رجب آخری چہار شنبہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہندستان کے مسلم اداروں میں اس دن عام طور پر تعطیل ہوتی تھی۔ اب بھی بہ شمول پاکستان ایسا ہی ہوتا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ جاری تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کے نگراں اور مولانا عبدالرزق ملیح آبادی اس کے مہتمم تھے تو طلبہ کے مطالبے پر مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد سے دریافت کیا۔

مولانا نے جواب میں فرمایا

...اکتوبر ۱۹۲۱ء

آخری چہار شنبہ کا تخیل مشرکین جاہلیت کے خیالات کا بقایا ہے جس کی نسبت حدیث میں ہے کہ "لاھول ولا صفر" لیکن اگر تعطیل کی رسم ہے تو بلا اقرار تعطیل کر دیجیے!

ابوالکلام

(۲۱) ﴿۲۴۳﴾

مدرسے کی ضروریات کے لیے روپیہ طلب کرنے پر یہ جواب دیا:

۱۰؍نومبر ۱۹۲۱ء

السلام علیکم

اسّی [۸۰] روپے مرسل ہیں، آپ مختار ہیں، جس طرح مناسب سمجھیں، طلبہ کو اس سے مدد دیں اور اس رقم کو درج ذیل حساب کرلیں۔ یہ میں نے اپنے پاس سے دی ہے، فنڈ سے مطلوب ہوگی۔

ابوالکلام

(۲۲) ﴿۲۴۴﴾

حضرت مولاناؒ کا یہ رقعہ ۲۳؍ستمبر اور ۱۵؍نومبر ۱۹۲۱ء کی درمیانی مدت کا ہے۔ ''پیغام'' اس وقت جاری تھا ۱۵؍نومبر سے قبل مولاناؒ لاہور کے لیے روانہ ہوگئے تھے جہاں ان کی صدارت میں جمعیت علماے ہند کا تیسرا سالانہ جلسہ ہورہا تھا۔ کوئی بزرگ کسی صاحب کو لے کر مولانا سے ملازمت کی سفارش کی غرض سے آئے تھے مولانا کے لیے یہ وقت مناسب نہ تھا۔ اس لیے اس وقت ملاقات سے معذرت کا یہ انداز اختیار کیا۔ مولانا نے تحریر فرمایا:

سرِ دست کون سی ملازمت ہے، جس کا انتظام کیا جاسکتا ہے؟ ملاقات کے لیے جب انھوں نے کہا تھا، تو آپ کم سے کم میرے اوقات کا لحاظ رکھتے، مدرسے میں بالفعل کوئی گنجایش نہیں۔ اور کوئی مدرسہ، میرے ہاتھ میں نہیں۔ کاش اس وقت پیدل آنے کی زحمت ان کو نہ دی گئی ہوتی۔ اس وقت اس درجے پریشان خاطر ہوں کہ فضل دین صاحب [۱] سے حساب کے چند الفاظ سننے سے بھی اکتا گیا۔، اب ان کو گاڑی منگوا دیجیے اور کرایہ بدرالدین [۲] سے گاڑی والے کو دلا دیجیے، تاکہ واپسی میں زحمت نہ ہو۔ اور میری طرف سے معذرت کردیجیے۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] فضل الدین احمد پیغام [ہفت روزہ] کے منیجر

[۲] بدرالدین مولانا آزادؒ کے برادر نسبتی [سالے] تھے مولاناؒ کے ساتھ ہی رہتے تھے، خنازیر کو مرض میں مبتلا ہوئے، مولانا نے ہر چند علاج میں سعی فرمائی، لیکن ۱۹۲۸ء میں عین جوانی میں انتقال کیا۔

(۲۳) ﴿۲۴۵﴾

ذیل میں مولانا آزادؒ کے چند رقعات درج ہیں۔ ان پر تاریخ نہیں پڑی ہوئی ہے نہ ایسے واضح قراین موجود ہیں جن سے ماہ و تاریخ کا تعین کیا جا سکے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ رقعات بھی ۱۹۲۱ء ہی کے ہیں۔ نمبر [۲۳] سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قبل از ۱۵؍نومبر ۱۹۲۱ء کا ہے کہ اس زمانے میں بیعت کا سلسلہ زور وشور کے جاری تھا۔

میں ایک بجے سے نکا ہوا اب واپس آیا ہوں۔ ٹیا برج کے جلسے میں نہایت پریشانی پیش آئی۔ اس کے بعد بھی تمام وقت مغز پاشی میں صرف ہوا۔ اس لیے اور لوگوں سے بھی نہ مل سکا اور بیعت کے لیے کل شام بلایا ہے۔ اگر یہ بھی کل بعدِ مغرب آ جائیں، تو اطمینان کے ساتھ یہ معاملہ انجام پائے۔

ابوالکلام

(۲۴) ﴿۲۴۶﴾

السلام علیکم

مسافر ایرانی کے لیے خلافت کمیٹی والوں سے کہہ دیا ہے۔ وہاں سے ساٹھ روپے آج سہ پہر تک ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ آج شام کی گاڑی سے لاہور روانہ ہو جائیں اور آغا صفدر صاحب سیکریٹری خلافت کمیٹی سے ملیں۔ وہ آگے کے لیے ان کا انتظام کر دیں گے اور وہاں کسی طرح کی زحمت پیش نہ آئے گی۔ آغا صفدر سے ان کو اپنے حالات بیان کر دینے چاہییں۔ مزید اعتماد کے لیے خلافت کمیٹی بنگال کی

جانب سے ایک خط بھی روپے کے ساتھ ان کو مل جائے گا۔

ابوالکلام

[۲۵] ﴿۲۴۷﴾

ایک صاحب مولانا آزادؒ سے ملے اور بڑی لمبی چوڑی اسکیمیں سامنے رکھیں۔لیکن مولاناؒ نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔دوسرے روز انھوں نے اپنی چند مجبوریاں ظاہر کیں۔اس سلسلے میں ملیح آبادی کو رقعہ لکھا۔

•••••

نیچے وہ سرحدی شخص آیا ہے۔یہ پندرہ ۱۵؍روپے اسے دے دیں اور میری جانب سے کہہ دیں کہ آپ کے مصارف کے لیے دیے گئے ہیں۔قبول کیجیے اور روانہ ہو جایئے۔باقی اور کوئی انتظام بالفعل نہیں ہو سکتا، ان امور کا خیال ترک کر دیں۔

ابوالکلام

(۲۶) ﴿۲۴۸﴾

ایڈیٹر پیغام کی گرفتاری
المثال ہذا فلیعمل العاملون!

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، دونوں حضرات ۱۶؍نومبر ۱۹۲۱ء کو جمعیّت علمائے ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس لاہور میں شرکت کے لیے کلکتہ سے روانہ ہوئے تھے۔یہ اجلاس مولانا آزاد ہی کی صدارت میں منعقد ہو رہا تھا۔اجلاس سے فارغ ہو کر مولانا ملیح آبادی تو فوراً کلکتہ لوٹ گئے تھے۔لیکن مولانا آزاد کراچی اور ممبئی سے ہوتے ہوئے گئے تھے اور یکم دسمبر کو کلکتہ پہنچے تھے۔کراچی میں انھوں نے اسیرانِ خلافت سے ملاقات کی تھی اور تحریک خلافت کے کاموں کا جائزہ لیتے اور ترک موالات کی صورت حال کے مشاہدہ و ہدایات سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو مولانا ملیح آبادی کی

گرفتاری کی خبر نے ان کا استقبال کیا۔ مولانا آزاد نے اس واقعے پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی محبت اور گرفتاری پر ان کے رنج کا پتا چلتا ہے، بلکہ مولانا ملیح آبادی کی قابلیت پر مولانا کے اعتماد اور مستقبل میں ان سے قوم و وطن کی خدمات کی توقعات کا پتا بھی چلتا ہے۔ مولانا کی پوری تحریر تاثرات میں ڈوبی ہوئی اور اسلوبِ نگارش کا ایک شاہ کار بھی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''کل چار بجے جب میں بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسب معمول اسٹیشن پر مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات ہوگی تو ان کی جگہ ان کی گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا۔ وہ اسٹیشن پر ملتے تو میرے دل میں ان کی محبت بڑھتی، جو گزشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے، مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے۔ اِس طرح اُنھوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لیے بھی میرے دل سے تقاضہ کیا۔ اب میں اُن سے صرف محبت ہی نہیں کرتا، بلکہ اُن کی عزت بھی کرتا ہوں۔

اُن کی گرفتاری کے لیے کوئی وارنٹ نہیں جاری کیا گیا۔ اُن سے کہا گیا کہ پولیس کمشنر نے بُلایا ہے۔ جب وہاں گئے تو گرفتار کرلیا گیا اور دو گھنٹے کے بعد میرے مکان پر ٹیلی فون سے اطلاع دی گئی کہ اُن کے لیے کھانا بھیج دیا جائے۔ گرفتاری کی کوئی معین بنا ابھی ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے پچھلے دنوں کلکتہ میں کوئی تقریر کی تھی اور اُسی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ۶ر دسمبر کو مقدمہ پیش ہوگا۔

''مولوی عبدالرزاق صاحب کا وطن، ملیح آباد (لکھنؤ) ہے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی۔ اس کے بعد قاہرہ (مصر) چلے گئے اور مدرسہ دعوۃ وارشاد میں داخل ہوگئے، جسے شیخ سید رشید رضا صاحب ایڈیٹر ''المنار'' نے جاری کیا تھا۔ تقریباً تین سال تک (۱) وہاں علوم ادبیہ اور تفسیر قرآن وغیرہ کی تحصیل کرتے رہے اور خود وہاں کے مصری طلبہ پر اپنے ذوقِ علم اور طلبِ صادق سے بدرجہا فوقیت لے گئے۔ مصر سے قسطنطنیہ گئے اور وہاں بھی ایک مدت رہے۔ ۱۹۱۸ء میں ہندستان

واپس آئے اور اُس وقت سے اب تک برابر علمی و قومی خدمات میں مشغول رہے۔ نہ صرف وہ خود بلکہ اُن کا پورا خاندان اپنے جوشِ ایمانی اور حُبِ اسلامی کے اعتبار سے اخلاص و عمل کا ایک قابل عزت گھرانا ہے۔ اُن کے والد اور تینوں بھائی ہمیشہ راہِ حق و عمل میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ اُن کے بڑے بھائی، ملیح آباد میں اس لیے گرفتار کر لیے گئے تھے کہ اُنھوں نے مقاصدِ خلافت کی تبلیغ کے لیے ایک اعلان شایع کیا تھا، اور اصلی سبب یہ تھا کہ وہ کسان سبھا اور خلافت کمیٹی کے قیام کے لیے بے باکانہ کوششیں کرتے تھے۔ وہ عرصے تک قید خانے کی سخت مشقتیں برداشت کرتے رہے اور حال میں رہا ہوئے ہیں۔

''دو سال ہوئے جب یہ مجھ سے ملے اور میں نے اِن میں بہترین قابلیتِ علم و عمل نمایاں پائی۔ یہ ملک کے ان مخصوص اہلِ علم نوجوانوں میں سے ہیں، جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے بہترین امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے خدمتِ خلق و دعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتۂ رفاقت و اخوت جوڑا تھا، وہ روز بروز قوی ہوتا گیا، اور ایک سچّے رفیق اور بھائی کی طرح اِن کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی۔ پچھلے دنوں جب مدرسۂ جامع مسجد عربی کا افتتاح ہوا تو میں نے انھیں کلکتہ بلالیا اور انھی کی محنت و سعی سے مدرسہ قایم ہوا۔ یہ مشغولیت ان کے لیے کم نہ تھی، لیکن ان کا ولولۂ خدمت زیادہ وسیع میدان ڈھونڈتا تھا۔ بالآخر پیغام جاری ہوا اور اس کی ترتیب و اشاعت کا تمام بار انھوں نے اپنے سر لے لیا۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس بار کے وہ اہل تھے اور نہایت مستعدی و قابلیت سے تن تنہا اس کی ایڈیٹری کرتے رہے۔ قارئین پیغام میں کوئی شخص نہ ہوگا جو اُن کی تحریروں کو دلچسپی و شوق کے ساتھ نہ پڑھتا ہوگا۔

''اب وہ گرفتار ہو گئے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ خداے تعالیٰ نے ان کی حسنِ نیت اور حسنِ عمل کو قبول کرلیا۔ اس بارے میں انسانی قلب کی درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ میں اگر کہوں کہ میرے دل پر کوئی صدمہ نہیں، تو یقیناً میں اپنے قدرتی جذبات

کے لیے پردہ پوش ہوں گا۔ میں اپنے دل کو راز بنانا پسند نہیں کرتا۔ میرے دل کو ایسے موقعوں پر غم ہوا ہے۔ میں نے برادرِ عزیز محمد علی و شوکت علی کی گرفتاری کی جب خبر سنی اور جب کراچی میں اُن سے ملا، تو میں اپنے دل کو صدمے سے نہ بچا سکا، اور نہ میری آنکھیں آنسوؤں کو روک سکیں۔ یقیناً اس وقت بھی میرا دل غم کرنا چاہتا ہے، لیکن الحمدللہ کہ دل کے جذبے پر دماغ کا ایمانی یقین و اعتقاد غالب ہے اور گو کشمکش ہوتی ہے لیکن بالآخر غلبہ اعتقاد ہی کو ملتا ہے۔ جذبات نابود نہیں ہو سکتے، مگر مغلوب ہو جا سکتے ہیں۔ میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز و رفیق کو مبارک باد دیتا ہوں۔ وہ بے گناہ ہیں، اور اُن کی گرفتاری اُن کے لیے ایک پاک عبادت ہے۔ اُنھوں نے جس سچی اور بے تکلّف ہمت و بشاشت کے ساتھ اپنی گرفتاری کا استقبال کیا، اور جس اطمینان و استقامت کے ساتھ اس وقت قید خانے میں ہیں، خدا تعالیٰ وہ جوہر ہر مسلمان کو عطا کرے۔

''البتہ میں اپنے دل کی اس خلش کو دور نہیں کر سکتا کہ رفیقانِ راہ ایک ایک کر کے قید ہو رہے ہیں، اور میں اب تک چھوڑ دیا گیا ہوں۔ مسنی اللّٰہ اَن یاتینی بِھم جمیعا، اِنه ھُوَ الْعَلِیمُ الحَکِیم!

ابوالکلام

(پیغام، کلکتہ: ۲؍دسمبر ۱۹۲۱ء، صفحہ ۱۵)

علی پور جیل کی چند یادگار تحریرات

(۲۷) ﴿۲۴۹﴾

آپ بیتی مولانا ابوالکلام آزاد
تاریکی سے روشنی کی طرف
ایک حیرت انگیز انقلاب اور نزولِ ہدایت

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد گرامی (۱۸۳۰ء تا ۱۹۰۸ء) نے ولی اللّٰہی سلسلے کے اساتذہ سے تحصیل علمی کی تھی۔ لیکن ان کی زندگی اور سیرت سے ولی اللّٰہی جماعت کے ذوق و رجحان کا پتا نہیں چلتا۔ نہ ان میں ایک جماعت کی سلفیت کا حسن پایا جاتا ہے، نہ دوسری جماعت کی حنفیت کا رنگ نظر آتا ہے، نہ ان میں پختہ علمی ذوق ہے اور نہ انقلابی فکر! ولی اللّٰہی خانوادۂ علمی کی ایک جماعت دعوت وارشاد اور اصلاح کی نہایت شایق تھی۔ اس سلسلے کے بعض علما نے عیسائی مشنریز سے مقابلہ و مناظرے میں شہرت حاصل کی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے دین کی خدمت کا ایک بڑا میدان مناظرے کا پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا خیرالدین اس ذوق سے بھی نا آشنا تھے۔ تصنیف و تالیف میں ان کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس نے شایقین علم دین اس کی طرف توجہ کرتے یا کوئی جماعت ان کے علم و تبحر سے فیض یاب ہوتی۔ تاریخ علوم و فنون میں کہیں ان کا تذکرہ اور کسی اسکالر کی تحقیق میں ان کے کسی حوالے کا سراغ نہیں ملتا۔ درس و تدریس کا شغل انھوں نے اختیار نہیں کیا تھا۔ کسی طالب علم کی علمی خواہش میں کا ذکر نہیں ملتا! علما و مشائخ کے تذکرے ان کے تراجم سے خالی ہیں۔

تذکرہ میں ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں، غبار خاطر میں ''انڈیا ونس فریڈم'' میں ابوالکلام کی زبان یا قلم سے ان کا بہت تھوڑا ذکر آیا ہے۔ اور اس سے قبل کہ دل پر کوئی اثر ہو جلد ہی ذہن سے نکل جاتا ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی

سے مولانا آزاد کے تعلقات نہ ہوتے تو نزھة الخواطر میں بھی ان کا نام نہ آتا۔ علمی دنیا میں وہ شہرت اور مقبولیت دونوں سے محروم رہے۔ بدعت نوازی، رسوم پرستی، تقلیدِ محض اور چند صوفیانہ مشاغل کا ''التزام'' نام ان کے نزدیک اسلام تھا۔

ابوالکلام آزاد کے ذوقِ سلیم اور سلامتی طبع نے پیدایشی اور خاندانی ورثے میں ملنے والے مذہب کو تسلیم کرنے سے انکار دیا تھا۔ وہ ایک صاف دل، اعلیٰ ذہانت اور اخلاص قلب کے ساتھ حق کی جستجو میں نکلے تھے۔ راہ میں بہت سے نشیب وفراز آئے، لیکن ان کی ازلی سعادت نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بالآخر انھیں ان کا مقصود مل ہی گیا اور ایمان ویقین کی جو دولت انھوں نے کھودی تھی وہ انھیں واپس مل گئی۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اسی سچائی کی تلاش میں گزرا تھا۔

اس دور میں سب کچھ کھودینے اور پھر سب کچھ پالینے پر انھوں نے یقین و اطمینان کا سانس لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ داستان انھوں نے تذکرہ میں اشارہ وکنایہ میں سنائی تھی۔ اپنی بیانیہ کہانی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت میں، معروضی انداز میں مطالعہ کی خود ان کی تحریر میں پڑھ کر اور ترجمان القرآن کے دیباچے میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل واحسان اور انعام کا نظارہ دیکھ کر آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کے سکون کی دولت پائی۔ زیرِ نظر مختصر بیان میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۲۲ء میں علی پور پریسیڈنسی جیل۔ کلکتہ میں اپنے قلم سے لکھ کر مولانا ملیح آبادی کو دیا تھا۔ مولانا کا یہ بیان آزاد کی کہانی میں آنا چاہیے تھا کہ وہاں ان کے عہدِ جہالت وگم رہی کا اعتراف ہے۔ لیکن فاضل مولف مولانا ملیح آبادی نے انقلابِ حق اور اعترافِ حق وصداقت کی اس دستاویز کو اپنی دوسری تالیف ''ذکرِ آزاد'' میں جگہ دی۔

''تذکرہ'' میں مولانا آزاد نے اس حقیقت سے پردہ اٹھادیا تھا اور اپنی سعادت اور فیروزمندی کی ایک جھلک دکھلائی تھی۔ اس پر کافی روشنی ترجمان القرآن کی جلد اول (۱۹۳۰ء) میں دکھائی تھی اور اس کا آخری وقطعی باصرہ نواز

اور حسرت آگیں نظارہ ''ذکر آزاد'' (۱۹۶۰ء) کے صفحات میں موجب تسکینِ قلب ہوا تھا۔ آیئے! آج ایک اور تقریب کے حوالے سے اس مسرت انگیز اور لطف اندوز داستان حق و صداقت کو چھیڑتے ہیں۔ آغاز میں چند سطریں مولانا ملیح آبادی کے قلم سے ہیں۔ (ا۔س۔ش)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''ہم جیل میں تھے اور یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے مفصّل حالات مجھے لکھا دیں، لیکن ان میں جو مذہبی انقلاب ہو چکا تھا اس کو تفصیل جاننے کی فکر تھی، ایک دن عرض کیا:

''آپ نے پیر گھرانے میں آنکھ کولی، پھر آپ کے مذہبی خیالات میں یہ حیرت انگیز انقلاب کیوں کر ہو گیا؟''

کہنے لگے: لکھ کر جواب دوں گا!

چند روز بعد ذیل کی تحریر میرے ہاتھ میں دے دی جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

(۱۹۲۲ء)

آپ کا یہ سوال میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں پیدائشی طور پر مسلمان ہوں، لیکن آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ پیدائشی اور خاندانی ورثے میں مجھے جو مذہب ملا تھا، میں اس پر قانع نہیں رہا اور جوں ہی مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہوئی کہ کسی چیز کو اپنے سے الگ کر سکوں، میں نے اُسے الگ کر دیا اور پھر ایک خالی دل و دماغ لے کر طلب و جستجو میں نکلا۔ اس جستجو میں مجھے بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑا اور پے در پے کئی ذہنی انقلاب میرے دماغ پر طاری ہوئے۔ بالآخر میں نے اپنا مقصود حاصل کر لیا اور یہ وہی مقام ہے، جہاں میں اپنے آپ کو اب پاتا ہوں۔ بلاشبہ یہ اسلام ہے، لیکن وہ اسلام نہیں ہے، جو محض رسم و تقلید کا مجموعہ تھا اور مجھے پیدائشی ورثے میں ملا تھا۔ میں اب اس لیے مسلمان نہیں ہوں کہ مجھے خاندانی طور پر ایسا ہی ہونا چاہیے تھا،

بلکہ اس لیے ہوں کہ میں نے اپنی طلب و جستجو سے اُس کا سُراغ پایا ہے۔ مجھے یقین اور اطمینان کی تلاش تھی اور وہ مجھے یہیں ملا۔

انسانی دماغ، خاندان، تعلیم، سوسایٹی اور گردوپیش کے مؤثرات کی مخلوق ہوتا ہے۔ علی الخصوص مذہب کے بارے میں خاندانی تقلید کا اثر اس درجے قوی ہوتا ہے کہ اُس سے باہر نکلنے کا کبھی ہمیں وہم و گمان بھی نہیں گزرتا۔ کتنے ہی انسان ہیں جو اپنی شہ زوری میں بڑی بڑی آہنی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے، لیکن وہ اس رشتے کو چھو بھی نہیں سکتے، جو آبائی تقلید کا ان کی گردن میں پڑا ہوتا ہے۔ فی الحقیقت انسان کی تمام غفلت و گمراہی کی اصلی بنیاد یہی ہے، اور میں یقین کرتا ہوں کہ یہ خدا کا بڑا ہی فضل و احسان تھا کہ مجھے اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی حصّے ہی میں اس قید و بند سے نجات حاصل ہو گئی۔ میرے موجودہ مذہبی عقاید نہ تو مجھے خاندان سے ملے ہیں، نہ میرے استادوں نے ان کی تلقین کی اور نہ میری سوسایٹی ان کے لیے رہنما ہو سکتی تھی۔ یہ تمام چیزیں تو موافق ہونے کی جگہ میری راہ میں رکاوٹ کا حکم رکھتی تھیں، انھوں نے مجھے جو کچھ دیا وہ میں نے کھو دیا، اور مجھے جو کچھ مطلوب تھا وہ خود اپنی طلب و جستجو سے ڈھونڈ نکالا۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ مذہب کے بارے میں انسانی عقاید کی جتنی اصولی قسمیں ہیں، ان میں سے کوئی قسم ایسی نہیں جو کچھ عرصے تک مجھ پر حاوی نہ رہ چکی ہو۔

اس راہ میں جتنے قدم اٹھے ہیں سب کو تقریباً یکساں حالتیں پیش آئیں۔ پہلے تقلیدی اور رسمی مذہب کی بے فکری اور مدہوشی میں دل سرشار ہوتا ہے۔ پھر شک اور اضطراب کی خلش پیدا ہوتی ہے۔ اور شک آہستہ آہستہ انکار تک پہنچا دیتا ہے۔ مجھ پر بھی بتدریج یہ تمام حالتیں طاری ہوئیں۔ مجھ کو تقلیدی اور رسمی مذہب کی پرستش سے شک اور اضطراب نے نکالا۔ اور شک نے بالآخر انکار اور دہریت کی صورت اختیار کی۔ میں مدتوں مذہب اور عقل کی آمیزش و آویزش کی گھاٹیوں میں سرگرداں رہا۔

عرصے تک میٹیریلزم اور ریشنلزم کے جلوۂ سراب کو آبِ حیات سمجھتا رہا۔ اس راہ کی جتنی بیماریاں ہیں وہ بھی مجھے لگیں اور جتنے نسخے ہیں وہ بھی میں نے استعمال کیے۔ بالآخر جب قدمِ جستجو سے تھک گئے اور ہمت نے جواب دے دیا تو اچانک پردۂ ظلمت چاک ہوا اور نظر اٹھائی تو حقیقتِ گم گشتہ کا چہرہ بے نقاب سامنے موجود تھا!

اس منزل پر پہنچ کر یہ سب سے بڑی بنیادی سچائی مجھ پر کھل گئی کہ مذہب کی راہ، عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات سے طے کی جا سکتی ہے۔ اور مذہبی سچائی کا پالینا اس لیے کٹھن نہیں ہے کہ وہ مشکل ہے بلکہ اس لیے کہ وہ بہت ہی آسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ سامنے کی آسان اور عام چیزوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے!

ایک راہ گم کردہ مسافر جو برسوں تک کوہ وصحرا کی خاک چھان کر بالکل مایوس ہو گیا، اور عالم مایوسی میں کسی درخت کے نیچے گر کے بے ہوش ہو گیا ہو لیکن جب وہ بے ہوشی سے بیدار ہو، تو دیکھے کہ اپنے وطن میں خاص اپنے محبوب گھر کی چھت کے نیچے پڑا آرام کر رہا ہے! یہ دیکھ کر اس کا کیا حال ہوگا؟ یقین کرنا چاہیے میرا یہی حال ہوا۔

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو صدیوں سے مذہبی بزرگی اور پیشوائی رکھتا تھا اور ہزاروں لاکھوں آدمی اس کے سامنے اطاعت اور تعظیم کا سر جھکاتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف بزرگی اور تقدس کا جلوہ دیکھا اور ایک بُت کی طرح اپنے خاندان کو معظّم و محترم پایا۔ میں ابھی بچہ ہی تھا کہ ہزاروں آدمی آتے تھے، اور بہ وجہ پیرزادہ ہونے کے میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ اپنے بزرگوں کے سوا جس آدمی کو دیکھتا تھا، اپنے آگے جھکا ہوا اور ادب و تعظیم سے مرعوب پاتا تھا۔ بڑے بڑے قابل اور معمر آدمی آتے تھے اور میرے سامنے [جب کہ میری عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی] اس ادب و احترام سے بیٹھتے تھے گویا میں سچ مچ کوان کا بت ہوں، میرے منہ سے جو بات نکلتی خواہ وہ کتنی ہی فضول اور بے

معنی ہوتی، لیکن وہ بڑے ہی اعتقاد اور احترام کے ساتھ سر جھکائے ہوئے سنتے اور ہر بات پر آمنا اور صدقنا کرتے!

ظاہر ہے کہ ایسی فضا میں پرورش پانے کا قدرتی اثر میرے دماغ پر کیا پڑ سکتا تھا؟ سب سے پہلے تو یہ کہ میں اپنی خاندانی شان وشکوہ دیکھ کر اسی میں سرشار رہ جاتا اور تحصیل علم کے لیے میرے اندر کوئی طلب و کاوش پیدا ہی نہ ہوئی، جیسا کہ بڑے پیروں اور پیشواؤں کی اولاد اپنی موروثی عزت واحترام کی وجہ سے عموماً بے پروا ہو جاتی ہے، اور اکثر صورتوں میں جاہل واپاہج بن کر رہ گئی ہے۔ پھر اگر والد مرحوم کی کوشش، خاندانی روایات کا اثر اور ذاتی شوق وطلب کی وجہ سے ایسا نہ ہونے پاتا، جب بھی ظاہر ہے کہ ایسی موروثی اور گہری مذہبی فضا میں کسی نئی فکر اور جستجوؤں کی راہ کا کھلنا تقریباً محال تھا۔

اپنی موجودہ حالت سے بلند تر حالت کی طلب جبھی پیدا ہو سکتی ہے، جب کوئی نہایت ہی قوی خارجی محرک موجود ہو، لیکن یہاں نہ صرف یہ بات تھی کہ کوئی ایسا محرک موجود نہ تھا، بلکہ ایسے محرکات کے لیے اس کی آب وہوا موافق ہی نہ تھی۔ میرے خاندان کی تمام پرانی روایات نہایت سخت راسخ الاعتقادی کی چلی آتی تھیں۔ گھر میں شب وروز ان تمام باتوں کا چرچا اور اعتقاد رہتا تھا، جو ایسے اعتقاد کا لازمی نتیجہ ہیں۔ والد مرحوم بھی نہایت سخت راسخ الخیال شخص تھے۔ ''کیوں'' اور ''کس لیے'' کی ان کے اعتقاد میں گنجایش ہی نہ تھی۔ مسلمانوں میں جو مذہبی عقاید کے اسکول، آزاد خیال اور اعتقادی امور کو فکر واجتہاد کے ساتھ قبول کرنے والے ہیں، وہ ان کے بھی سخت مخالف تھے اور تمام عمر ان کے رد میں قلم وزبان سے کام لیتے رہے تھے۔ ان کی دو تہائی تصنیفات انھی کے رد میں ہیں۔ میرے تمام استاد جن سے میں نے ابتدا سے لے کر آخر تک تعلیم حاصل کی ایسے ہی خیالات کے تھے، اور اب میں سوچتا ہوں، تو ان میں سے بعض کی سختی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک خفیف سے اختلاف رائے پر بھی بالکل

کافر، یعنی اسلام سے خارج ہوجانے کا فتویٰ دے دیتے تھے۔ جو نصاب تعلیم میں مجھے پڑھایا گیا، اور مذہبی علوم کی جن کتابوں کی تعلیم دی گئی، وہ بھی سرتاسر اسی مسلک پر مشتمل تھیں۔

پس ایسی حالت میں کیوں کر امید کی جاسکتی ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی میرا دماغ اس دایرے سے باہر کا کوئی تخیّل کرسکتا، یا کسی مزید طلب اور جستجو کی خلش میرے اندر پیدا ہوسکتی؟ قدرتی طور پر میری بڑی سے بڑی ترقی بھی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی کہ میں اپنی خاندانی روایات کے مطابق ایک اچھا کامیاب پیر اور مولوی ہوتا، جس کے ہاتھ چومنے والوں کا حلقہ بہت دور تک پھیلا ہوا نظر آتا!

لیکن شاید یہ بات نہایت عجیب سمجھی جائے گی کہ نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیوں؟ تو میں اس وقت بھی اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ابھی میری تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ میرا دل اچانک اپنی موجودہ حالت اور اردگرد کے منظر سے اُچاٹ ہوگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کسی اچھی حالت میں مبتلا نہیں ہوں۔ یہ بے اطمینانی بڑھتی گئی حتی کہ مجھے ان ساری باتوں سے جو لوگوں کی نظروں میں انتہا درجۂ عزت و احترام کی باتیں تھیں، ایک طرح کی نفرت ہوگئی، اور میں اندر ہی اندر ان باتوں پر شرم اور ذلت محسوس کرنے لگا، اب جو لوگ میرا ہاتھ پاؤں چومتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ گویا ایک بہت ہی سخت برائی کا کام ہورہا ہے۔ چند دن پہلے یہی منظر میرے لیے نہایت ہی فخر و غرور کا باعث تھا!

چند دنوں کے بعد یہ جذبہ ایک دوسرے رُخ پر بہنے لگا۔ اپنی حالت کے احتساب نے اپنے عقاید و افکار کے احتساب پر توجہ دلائی اور اب جو میں نے اپنے مذہبی عقاید کا جایزہ لیا، تو اس میں بجز آبائی تقلید، دیرینہ رسم پرستی اور موروثی اعتقاد کے اور کچھ نہ تھا۔ میں ایسا کیوں یقین کرتا ہوں؟ اس کا جواب مجھے اس کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا کہ چوں

کہ ایسا ہی مجھے بنایا گیا ہے یا چوں کہ ایسا ہی میرے باپ دادا کا اعتقاد تھا، یہ جواب میرے دل میں شک اور اضطراب کا ایک طوفان برپا کر دیتا اور میں اپنے تمام پرشکوہ عقیدوں اور سارے طلسم نما خیالات کے ساتھ بے اختیار بہنے لگتا!

[۱] کیا فی الحقیقت خدا کا وجود ہے؟ اور کیا واقعی مذہب کے تمام بتلائے ہوئے عقاید حقیقت رکھتے ہیں؟

[۲] اگر ایسا ہی ہے تو پھر اتنی بڑی حقیقت اور سچّائی میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟ مذہب اگر ہدایت اور امن کے لیے ہے تو پھر وہی انسان کے تمام اختلافوں اور جھگڑوں بلکہ انتہا درجے خونریزیوں کا سبب کیوں بن گیا ہے؟ حقیقت ایک ہی ہوسکتی ہے۔ ایک سے جو زیادہ ہے وہ تو حقیقت نہیں ہے''۔

[۳] پھر اگر دنیا کے اتنے بے شمار مذہبوں میں سے کسی ایک مذہب کو مان بھی لیا جائے تو بھی مشکل کہاں ختم ہوتی ہے؟ ہر مذہب کے اندر بھی تو بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں، اور بہت سی جماعتوں میں اس کے ماننے والے بٹ گئے ہیں؟ ایک کیوں حق پر ہے اور دوسرا کیوں حق پر نہیں؟

یہ تین سوال تھے، جو ۱۴ برس کی عمر میں مجھ پر اس طرح چھا گئے تھے کہ خون اور گوشت کی جگہ میرے اندر صرف انھی کی گونج بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ گرہ کو جس قدر کھینچا جائے اتنی ہی اور زیادہ الجھ جاتی ہے۔ اسی طرح میں جس قدر حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اتنا ہی زیادہ الجھاؤ بڑھتا جاتا تھا۔

میں نے ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مختلف مذہبوں کی کتابیں دیکھ ڈالیں۔ میں اس وقت ممبئی میں تھا۔ وہاں مجھے متعدد عیسائی، یہودی، پارسی، بہائی، ناستک اور ہندو عالموں سے ملنے اور بحث ومباحثے کا موقع ملا لیکن ان کی باتیں میری الجھن کو اور زیادہ کرتی تھیں۔ ان کے جوابات اور مباحث سن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری پریشانی اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے۔ جس قدر میں سمجھے ہوئے تھا۔ بالآخر یہ

اندرونی تکلیف یہاں تک بڑھی کہ میں بیمار ہوگیا۔ غذا بند ہوگئی، نیند اچاٹ ہوگئی۔

اس اثنا میں میں نے ماڈرن فلاسفی اور سائنس کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کیا جس قدر مطالعہ مشرقی زبانوں کے تراجم سے کرسکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کی طرف سے میری بے اطمینانی اور زیادہ گہری ہوگئی۔

اب مجھ پر وہ دروازہ کھلا، جو اس راہ میں ہمیشہ کھلا کرتا ہے، یعنی مذہب اور عقل کی تطبیق واتحاد کا طریقہ۔ اس کے بھی متعدد اسکول ہیں۔ میں نے سب کا مطالعہ کیا اور اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ایک عارضی سکون مجھے ہوگیا۔

اسی زمانے میں میں نے سرسید احمد خاں مرحوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا جن کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے موجودہ زمانے میں مذہب اور ماڈرن سائنس کو ملانے کے لیے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ مجھ پر ان کی تصنیفات کا بہت اثر پڑا حتی کہ کچھ دنوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں بالکل ان کا مقلّد اور پیرو ہوگیا تھا۔

مگر یہ وقفہ بھی عارضی تھا بہت جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ منزل مذہب کی طرف لے جانے والی نہیں ہے۔ بلکہ مذہب سے انکار کی ایک نرم اور ملایم صورت ہے۔ آخری نتیجہ میرے دل ودماغ پر حاوی ہوگیا تھا یعنی گو میں زبان سے صاف صاف اقرار نہیں کرتا تھا، لیکن میرے اندر قطعی انکار والحاد کی آواز گونج رہی تھی۔

میں اب ایک پکا دہری ہوگیا تھا۔ مٹیریلزم اور ریشنلزم کے اعتقاد پر میرے اندر فخر وغرور تھا اور مذہب کے نام میں جہل وتوہم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، تاہم وہ چیز کہاں تھی جس کی ڈھونڈھ میں نکلا تھا؟ یعنی دل کا اطمینان؟ وہ تو اب اور زیادہ دور ہوگئی تھی۔ میرے اضطراب کی اندھیاری میں تسلّی کی ایک ہلکی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی!

۱۴ برس سے لے کر ۲۲ برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا۔ میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل وعلم کے ساتھ ساتھ چلانا چاہتا ہے۔ لیکن میرے

اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق!

یہی منزل میری آخری مایوسی کی منزل تھی اور اسی کے بعد اچانک امید کی روشنی میرے سامنے چمکی۔ میں جس طرح اس ہاتھ کو نہیں بتلا سکتا، جس نے مجھے اندھیاری میں ڈھکیلا تھا اسی طرح میں اس ہاتھ کے لیے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جس نے اچانک مجھے اُجالے میں پہنچا دیا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ روشنی نمودار ہوئی اور نو برس خاک چھاننے کے بعد میں نے اپنی منزل مقصود خود اپنے ہی پاس موجود پائی۔ تمام شکوک دور ہو گئے، تمام دھوکے مٹ گئے اور جس یقین و اطمینان کی تلاش تھی، وہ مجھ حاصل ہو گیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ مذہب اور عقل کے میدان بالکل الگ الگ ہیں، اور دونوں کا ایسا پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو باہم مخالف سمجھ کر توڑنے یا جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ مادہ اور محسوسات کی راہ ہم ادراک سے طے کر سکتے ہیں مگر مذہب جس عالم کا پیغام لاتا ہے، اس کے لیے ہمارے پاس صرف جذبہ ہے اور یہ بڑی بھول ہے کہ چاندی سونا تولنے کے کانٹے سے ہوا اور روشنی کا بھی وزن معلوم کرنا چاہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ جس مذہب کو دنیا ''اسلام'' کے نام سے پہچانتی ہے فی الحقیقت وہی مذہبی اختلافات کے سوال کا اصلی حل ہے۔ اسلام دنیا میں کوئی نیا مذہب قایم نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کا مشن خود اس کے بیان کے مطابق صرف یہ ہے کہ دنیا میں تمام مذہبوں کے ماننے والے اپنی اصلی اور بے میل سچّائی پر قایم ہو جائیں اور باہر سے ملائی ہوئی جھوٹی باتوں کو چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا کریں، تو جو اعتقاد ان کے پاس ہوگا اس کا نام قرآن کی بولی میں ''اسلام'' ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی سچّائی ایک ہے۔ ابتدا سے موجود ہے اور تمام انسانوں اور قوموں کے لیے یکساں طور پر آتی رہی ہے۔ دنیا کا کوئی ملک، کوئی گوشہ نہیں، جہاں خدا کے سچّے بندے نہ پیدا ہوئے ہوں اور انھوں نے سچّائی کی تعلیم نہ دی ہو، لیکن

ہمیشہ ایسا ہوا کہ لوگ کچھ دنوں تک اس پر قایم رہے، پھر اپنے خیال اور وہم سے طرح طرح کی نئی اور جھوٹی باتیں نکال کر اس طرح پھیلا دیں کہ وہ خدا کی سچّائی، انسانی ملاوٹ کے اندر گم ہوگئی۔

اب ضرورت تھی کہ سب کو جگانے کے لیے ایک عالمگیر صدا بلند کی جائے۔ یہ "اسلام" ہے۔ وہ عیسائی سے کہتا ہے کہ سچّا عیسائی بنے۔ یہودی سے کہتا ہے کہ سچّا یہودی بنے، پارسی سے کہتا ہے کہ سچّا پارسی بنے۔ اسی طرح ہندوؤں سے کہتا ہے کہ اپنی اصلی سچّائی کو دوبارہ قایم کرلیں، یہ سب اگر ایسا کرلیں، تو وہی ایک سچّائی ہوگی، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ سب کو دی گئی ہے۔ کوئی قوم نہیں کہہ سکتی کہ وہ صرف اسی کی میراث ہے، اسی کا نام "اسلام" ہے اور وہی "دین الفطرۃ" ہے یعنی خدا کا بنایا ہوا نیچر، اسی پر یہ تمام کارخانۂ ہستی چل رہا ہے۔ سورج کا بھی وہی دھرم ہے۔ زمین بھی اسی کو مانتے ہوئے ہر آن گھوم رہی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی ہی اور کتنی زمینیں اور دنیائیں ہیں اور ایک خدا کے ٹھہرائے ہوئے ایک ہی قانون پر عمل کر رہی ہے!

پس قرآن لوگوں کو ان کے مذہب سے چھڑانا نہیں چاہتا بلکہ ان کے اصلی مذہب پر ان کو دوبارہ قایم کر دینا چاہتا ہے۔ دنیا میں بے شمار مذہب ہیں، ہر مذہب کا پیرو سمجھتا ہے کہ سچّائی صرف اسی کے حصّے میں آئی ہے، اور باقی سب باطل پر ہیں، گویا قوم اور نسل کی طرح سچّائی کی بھی میراث ہے۔ اگر فیصلہ ہو تو کیوں کر ہو؟ اختلاف دور ہو تو کس طرح ہو؟ اس کی صرف تین ہی صورتیں ہیں۔

[۱] ایک یہ کہ سب حق پر ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کیوں کہ حق ایک سے زیادہ نہیں اور حق میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔

[۲] دوسری یہ کہ سب باطل پر ہیں۔ اس سے بھی فیصلہ نہیں ہوتا کیوں کہ پھر حق کہاں ہے؟ اور سب کا دعویٰ کیوں ہے؟

[۳] اب صرف ایک تیسری صورت رہ گئی، یعنی سب حق پر بھی ہیں اور سب ناحق پر

بھی۔ یعنی اصل ایک ہے اور سب کے پاس ہے۔ ملاوٹ باطل ہے، موجب اختلاف ہے اور سب اس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ملاوٹ چھوڑ دیں اور اصلیت کو پرکھ کے صاف کرلیں تو وہ ایک ہی ہوگی اور سب کی جھولی میں نکلے گی۔

''قرآن'' یہی کہتا ہے۔ اور اس کی بولی میں اسی مشترک اور عالم گیر اصلیت کا نام ''اسلام'' ہے۔

شک اور انکار کے بعد یقین اور اعتقاد کے حصول میں میرے نظر و فکر کا کیا عالم رہا اور میرے تمام لاینحل سوالوں کے کیا کیا جواب ملے؟ یہ بہت لمبی چوڑی داستان ہے اور میری موجودہ تصنیفات انھی کی شرح ہیں''۔ [انتہیٰ]

(۲۸) ﴿۲۷۰﴾

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات

۱۹۲۲ء

علی پور جیل ہی میں ایک روز مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد سے عرض کیا کہ اپنی ابتدائی علمی زندگی کی تالیفات کا بھی کچھ حال سنائیں؟ فرمایا کہ لکھ کر جواب دیں گے۔ دوسرے روز یہ تحریر انھوں نے مولانا ملیح آبادی کے سپرد کر دی۔

تصنیفات
علاوہ میگزینوں اور اخبارات کے آرٹیکل کے

(الف) ۱۳ برس سے ۱۸ برس کی عمر تک

۱۔ اعلان الحق: محمڈن لا[۱]

۲۔ احسن المسالک: صوفی ازم اور طریق ریاضت کے مختلف اسکولوں کی تشریح میں[۲]۔

۳۔ دیوان غزلیات: شاعری[۳]۔

۴۔ عمر خیام: بائیوگریفی اور ریویو[۴]۔

۵۔ خاقانی: (فارسی شاعری)، بائیوگریفی اور ریویو[۵]۔

۶۔ ضوء غیر مرئی: [رانجن ایکس ریز] سائنس[۶]۔

۷۔ العلوم الجدیدۃ والاسلام: اسلام اور ماڈرن سائنس[۷]۔

۸۔ المراۃ المسلمہ: اس میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کے مسئلے پر بحث کی ہے اور آخر میں ثابت کیا ہے کہ عورتوں کے بارے میں یورپ کی موجودہ آزادی اور مشرق کی قدیم سختی دونوں قانون فطرت کے خلاف ہیں اور صحیح راہ درمیان کی ہے۔[۸]

۹۔ الہیت [اسٹرانومی]: اس میں دکھلایا ہے کہ جدید اسٹرانومی کے تمام اصول مسلمان حکما دریافت کر چکے تھے، اور قدیم یونان، مصر اور ہندستان کے عقاید کے برخلاف انھوں نے جدید نظام شمسی کے اصول تسلیم کر لیے تھے[۹]۔

۱۰۔ المعتزلہ: [ناتمام] اسلام کے فرقۂ معتزلہ کی تاریخ[۱۰]۔

۱۱۔ کششِ مادہ اور کشش عشق: اس میں دکھلایا ہے کہ جس طرح عالم مادہ ہے، اسی طرح جذبات کا عالم ہے اور دونوں کے قوانین یکساں ہیں[۱۱]۔

۱۲۔ اسلامی توحید اور مذاہب عالم: اس میں دکھلایا ہے کہ اسلامی توحید کی جغرافیائی فتوحات سے اس کی روحانی فتوحات کا دایرہ بہت وسیع ہے اور گو ابتدا میں پیروانِ مذاہب نے اس سے تغافل کیا، لیکن بتدریج یورپ اور ایشیا کے مذاہب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چناں چہ مسیحیت میں ریفارمیشن اور لوتھر کی تحریک کا ظہور ہوا، جس نے قدیم لاطینی ترجمۂ قرآن کا مطالعہ کیا تھا اور ہندستان میں بابا نانک اور کبیر کی تحریک [بھی] اسلامی [توحید کے] نفوذ ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر یہی چیز راجہ رام موہن رائے اور دیانند سرسوتی کی [تحریک کی] شکل میں ظاہر ہوئی اور برہمو سماج اور آریہ سماج کی بنیاد پڑی۔ آخر میں مسلمانوں سے التجا کی ہے کہ وہ اس کا خیر مقدم کریں[۱۲]۔

۱۳۔ چہار مقالہ: شاعری کے بعض مباحث میں[۱۳]۔

۱۴۔ فرہنگ جدید: لغت کی تحقیق میں[۱۴]۔

[ب]: ۱۸ برس کی عمر کے بعد

۱۔ قانون نشو و ارتقاء اور قرآن: اس میں دکھلایا ہے کہ نشو و ارتقا [Evolution] کو [جو] ڈارون اور ویلس نے انیسویں صدی میں معلوم کیا ہے۔ اسے مڈل ایجز میں مسلمان حکما نے منتہائے تحقیق تک پہنچا دیا تھا۔ ڈارون، ویلس، اسپنسر اور جرمن فلاسفر

نیٹشے کے قدم مادیات کی آخری سرحد تک پہنچ کر رک گئے ہیں۔ لیکن مسلمان حکما کا دایرہ ارتقا اس سے کہیں وسیع تر ہے۔ پھر واضح کیا ہے کہ خود قرآن نے اس کو اصل نظامِ کاینات بتلایا ہے۔ اور قرآن کہتا ہے انسانی اعمال کی جزا وسزا اور قوموں کی حیات وممات اسی قانون پر مبنی ہے۔ مادیات کی طرح افکار واعمال میں بھی ایک معنوی تنازع للبقا[Struggle for exixtence]اور انتخاب طبیعی [Natural Selection] جاری ہے اور بقا اسی عمل وفکر کے لیے ہے جو اصلح ہو۔ پس سچائی کامیاب ہوگی اور باقی رہے گی فساد وبطلان چھانٹ دیا جائے گا اور اسی کا نام عذاب ہے۔ آخر میں نیٹشے کے سُپر مین آئیڈیا پر بحث کی ہے۔ اور پھر دکھلایا ہے کہ نیٹشے وہاں تک نہ پہنچ سکا، جہاں تک اسلام نے ''انسان کامل'' اور ''بہترین امت'' کے آئیڈیا کو پہنچایا ہے[۱۵]۔

۲۔ خصایص مسلم: مسلم زندگی کا کیرکٹر حسب تصریحات قرآن[۱۶]۔

۳۔ القول الثابت: اس میں مذہب اور عقل کی باہمی آویزش پر بحث کی ہے اور دکھلایا ہے کہ سائنس کی حد، محسوسات ہے اور مذہب کی ماورائے محسوسات، اس لیے دونوں کا دایرۂ نظر وعلم الگ الگ ہے اور دونوں میں اصلاً کوئی نزاع نہیں۔ البتہ نزاع اس وقت ہوتی ہے جب پیروانِ مذہب، مذہب کے نام سے جہل وتوہمات کا عَلَم اٹھا لیتے ہیں۔ ترتیب اس کی یوں ہے کہ پہلے ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی ''کانفلیکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس'، پر نظر ڈالی ہے اور دکھلایا ہے کہ ڈریپر نے جن چار مسایل کو مابہ النزاع قرار دیا ہے وہ اصل مذہب کے نہیں ہیں، بلکہ صرف مسیحیت کے اور وہ بھی اصلی مسیحیت کے نہیں بلکہ رومانی پوپ ازم کے ہیں۔ قرآن واسلام کی تعلیم ان سے بالکل صاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مقابلہ مسیحیت نے سائنس کا کیا، وہ اسلامی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔ اس کے بعد پھر مبادیات مذہب یعنی وجود صانع اور مسایل ذات وصفات اور مسئلہ انفصال وانجذاب روح پر بحث کی ہے اور آخر میں دکھلایا ہے کہ قرآن کی کوئی

تعلیم، عقل کے خلاف نہیں ہے، بلکہ وہ تمام تر عقل اور عقل سے کام لینے کی ایک دعوت ہے، جو کہتی ہے کہ قانون نیچر ہی کا دوسرا نام سچّا مذہب ہے۔ اس کی تعلیم کے دو حصّے ہیں [اعمال اور عقاید] اعمال انسانی زندگی سے تعلّق رکھتے ہیں، اس لیے تمام تر مطابق عقل ہیں۔ عقاید ماورائے مادیات سے تعلّق رکھتے ہیں، اس لیے وہ ماورائے عقل ہیں [۱۷]۔

۴۔ اتحاف الخلف: اس میں دکھلایا ہے کہ خدا کی ذات وصفات کا ادراک ہم بذریعۂ عقل نہیں کرسکتے۔ لیکن اس کا اعتراف ہماری فطرت میں موجود ہے اور جذبات کا صحیح اغراق ہمیں اس تک پہنچا سکتا ہے۔ پھر دکھلایا ہے کہ اس بارے میں مذہب جس عجز و بیچارگی کا اقرار کرتا ہے بعینہٖ یہی اقرار فلسفہ وعقل کی راہ میں بھی کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ تمام قدیم وجدید فلاسفہ کو بھی کدوکاوش کے بعد یہی اعلان کرنا پڑا کہ ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ صرف یہی ہے کہ کچھ معلوم نہیں! سائنس کا استقرا ابھی صرف ترکیب و تفرید مادہ تک علم کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی بجز لاادری کے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پس ماورائے محسوسات کے لیے علوم وحی اور علوم عقلیہ دونوں ایک ہی نقطے پر پہنچتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مذہب ایک جانے بوجھے شخص کی طرح پہلے ہی دن اس کا اعتراف کرلیتا ہے لیکن عقل جب تک حیران وسرگرداں نہیں ہوجاتی اقرار نہیں کرتی [۱۸]۔

۵۔ البرہان: اس کا موضوع یہ ہے کہ جن دلایل فطریہ سے قرآن نے کام لیا ہے، ان سب کو یکجا کرکے دکھلایا جائے کہ قرآن کا طریق استدلال کیا ہے؟ چناں چہ اس میں واضح کیا ہے کہ سائنس کے استقرائی علوم کو الگ کردینے کے بعد [کیوں کہ وہ نفیاً یا اثباتاً مذہب سے کوئی تعلّق نہیں رکھتے] انسانی معلومات آج تک جو کچھ معلوم کرسکی ہے، اس کی اونچی سے اونچی سرحد بھی صرف شک، ظن اور تخمین پر جاکر ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن مذہبِ حق وخالص جو کچھ بتلاتا ہے اس کی سب سے پہلی سرحد ہی یقین

سے شروع ہوتی ہے۔ پس نوع انسانی کے سامنے دو مدعی کھڑے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میرے پاس زیادہ سے زیادہ شک ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس کم سے کم یقین ہے۔ انسانوں کو کس کی طرف جھکنا چاہیے؟ شک کی دعوت کے آگے یا یقین کی دعوت کے آگے؟ یہی قرآن کا سب سے بڑا استدلال ہے[۱۹]۔

۶۔ الدین الخالص: اس میں واضح کیا ہے کہ اسلام کی نسبت سب سے بڑی غلط فہمی دنیا میں یہ پھیل گئی ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب ہے جو دوسرے مذہب والوں کو ان سے بالکل الگ کر کے اپنا حلقہ بگوش بنانا چاہتا ہے حال آں کہ ایسا سمجھنا قرآن کے ہر صفحے کو جھٹلانا ہے۔ قرآن کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ

☆ خدا کی طرح خدا کی سچّائی بھی دنیا کے لیے ایک ہی ہے۔ اس سچّائی کا علم انسان کو اس کی ابتدائی آفرینش سے دیا گیا تھا لیکن مختلف اسباب سے [جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے] اس نے اس سچّائی کو طرح طرح کی غلط فہمیوں اور غلط عقیدوں اور عملوں سے آلودہ کر دیا۔

☆ پس اس ابتدائی سچّائی کے قیام و ذکر کے لیے مختلف وقتوں میں مختلف سچّے انسان پیدا ہوتے رہے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتے رہے۔ دنیا کا کوئی حصّہ اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں حسبِ بیان قرآن خدا کے سچّے اور پاک انسان نہ پیدا ہوں۔ لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ ان کی تعلیم چند صدیوں تک صاف و خالص رہی۔ لیکن پھر خود غرض مذہبی پیشواؤں اور انسانی عقل کی گمراہیوں سے محرّف ہوگئی۔ ہر چیز کی طرح مذہب بھی قانونِ ارتقاء کے مطابق ترقی کرتا رہا ہے۔

☆ پس بالآخر جب نوع انسانی کے ذہنی ارتقا کی تکمیل کا دور آیا، تو ضرورت ہوئی کہ سب کو اس عالمگیر اور حقیقی صداقت کے قیام کی دعوت دی جائے۔ اسی اصلیت کا نام ''اسلام'' ہے۔

☆ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے یہاں کی ملاوٹ اور

آلودگیوں کو چھوڑ کے اصلی سچّائی کو دوبارہ قایم کر دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو پالیں گے کہ اصلیت وہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ پس قرآن کوئی نیا مذہب نہیں پیش کرتا بلکہ نوعِ انسانی کو اس کی مشترک اور عالمگیر راہِ حق کی طرف بلاتا ہے[۲۰]۔

۷۔ الحریۃ فی الاسلام: اسلام اور انسانی آزادی۔ اس میں دکھلایا ہے کہ اسلام نوعِ انسانی کو اس کی چھنی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا ہے۔ حریت و مساوات اس کے قومی نظام کی اصلی بنیاد ہے اور ان دونوں سچّائیوں پر اس نے اس قدر زور دیا ہے کہ ایک مسلمان ہو کر کبھی غلامی پر قانع نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ اسلام اور آزادی لازم و ملزوم ہیں۔ پھر بہ تفصیل واضح کیا ہے کہ یورپ نے انقلابِ فرانس کے بعد جس آزادی کا سراغ پایا، وہ تیرہ سو برس پہلے عرب میں قایم ہو چکی تھی۔ اسلام نے جو قومی نظام قایم کیا وہ ایک خالص جمہوری [ری پبلک] نظام ہے اور فرانس اور امریکا کی ناقص جمہوریت سے زیادہ مکمّل اور اصلی، وہ ''بادشاہ'' کے وجود اور کسی آورار اسٹو کریٹ طبقے کو تسلیم نہیں کرتا۔ خلیفہ صرف ایک پریسیڈنٹ ہے اور بلا ملک کی اجازت کے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ مختلف ابواب میں واضح کیا ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت کیا ہے[۲۱]۔

۸۔ احرار اسلام: یعنی تاریخ اسلام کے ان سرفروشوں کی بائیوگریفی: جنھوں نے سچّائی اور آزادی کی راہ میں ہر طرح کی دنیاوی تکلیفیں برداشت کیں۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث کے وہ تمام حصّے جمع کیے ہیں جن میں حق پرستی اور حق پرستی کی راہ میں جان تک قربان کر دینے کی تعلیم دی گئی ہے[۲۲]۔

۹۔ سیرت ابن تیمیہ: ایک بڑے مسلمان عالم کی لائف[۲۳]

۱۰۔ الدین القیم: اس کا موضوع نہایت ہی اہم ہے اور علم و مذہب دونوں کے مباحث میں ایک نئی راہ کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس میں دکھلایا ہے کہ خدا ایک ہے، تو ضرور ہے کہ اس کے تمام کاموں میں یگانگت اور توحید ہو۔ پس اس کا قانونِ حیات بھی ہر گوشے

اور خلقت میں ایک ہی ہے۔ البتہ ہم نے نادانی سے اس کے بہت سے نام رکھ دیے ہیں، پھر علم ہیئت، ریاضی، ہندسہ، موسیقی، طب، علم الحیات، سائیکولوجی وغیرہ علوم کے حقایق پر بحث کر کے دکھلایا ہے کہ سب کے اندر ایک ہی حقیقت کام کر رہی ہے اگرچہ ہر دایرے میں ایک نئے نام سے پکاری جاتی ہے۔ پھر آخر میں بتلایا ہے کہ وہی ایک حقیقت جب انسانی عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے تو مذہب اس کو کس نام سے موسوم کرتا ہے؟[۲۴]

۱۱۔ جامع الشواہد: اس میں دکھلایا ہے کہ غیر مسلموں کو مسجد میں داخل کرنا اور مسجد کی مجالس میں شریک کرنا جائز ہے[۲۵]

۱۲۔ تذکرہ: آٹو بایوگریفی[۲۶]

۱۳۔ تاریخ دعوتِ اسلام: اس میں دکھلایا ہے کہ قانونِ ارتقا کے بموجب خدا کے تصور اور اعتقاد میں بھی ارتقا ہوا ہے اور آخری اور بے داغ تصور وہ ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور جو تمام تر محبّت ہے[۲۷]۔

۱۴۔ خلافت و جزیرۃ العرب: مطالبۂ خلافت کی تشریح[۲۸]۔

۱۵۔ ترک موالات: نن کوآپریشن کیا ہے؟[۲۹]۔

۱۶۔ ہندستان اور افغانی حملہ: اگر افغانستان حملہ کر دے تو ہندستانی مسلمانوں کا از روے مذہب کیا فرض ہوگا؟[۳۰]

۱۷۔ ترجمان القرآن: ترجمہ قرآن[۳۱]۔

۱۸۔ تفسیر البیان فی مقاصد القرآن: یہ سب سے اہم اور جامع کتاب ہے اور میری تمام فکر و نظر کا آخری نتیجہ ہے[۳۲]۔

۱۹۔ مقدمۂ تفسیر:[۳۳]

غیر مکمل مسودات ترک کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار آرٹیکل ہیں جن میں اکثر چار چار پانچ پانچ نمبروں میں شایع ہوئے ہیں اور اگر کتاب کی صورت میں

جمع کیے جائیں تو دس بارہ جلدیں ہو جائیں گی۔

حواشی:

[۱] رویت ہلال کے مسئلے میں اپنے والد گرامی مولانا خیر الدینؒ کی رائے کے دفاع اور علمائے کلکتہ کے اعتراضات کے رد میں ایک رسالہ جو ۔۵رجنوری ۱۹۰۲ء کو عثمان پریس کلکتہ سے شایع ہوا تھا۔ نایاب ہے البتہ ارمغان آزاد مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کراچی، ۱۹۹۰ء، میں شامل ہے۔

[۲] صرف اسی تحریر میں احسن المسالک کا نام آیا ہے۔ کسی اور ذریعے سے اس رسالے کا پتا نہیں چل سکا۔

[۳] مولانا کے دیوان غزلیات یا کسی مجموعۂ کلام کا پتا نہیں چل سکا۔ ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ''کلیات آزاد'' ۔[ناشر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ پاکستان ۔ کراچی ۱۹۹۷ء] کے نام سے مولانا کے تمام اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ مرتب کر دیا ہے۔

[۴] عمر خیام پر مولانا آزاد کا کوئی رسالہ یا مضمون دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ ان کے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یسین آہ کا ایک سلسلۂ مضمون جو پہلے ہفتہ وار احسن الاخبار۔ کلکتہ کے جولائی تا ستمبر ۱۹۰۶ء کے شماروں میں قسط وار چھپتا رہا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں آصفی پریس لکھنو سے کتابی صورت میں شایع ہوا سید محمد یوسف جعفری رنجور کے قلم سے ''خدنگ نظر'' لکھنو بابت ماہ فروری ۱۹۰۴ء میں اس پر تبصرہ شایع ہوا تھا۔ مولانا آزاد کا ایک مضمون ۲۴ رجون و یکم جولائی ۱۹۱۴ء کے شمارۂ الہلال میں بہ طور ریویو پر ''رباعیات عمر خیام'' ضرور دستیاب ہے۔

ابوالنصر کا یہ رسالہ ''الخیام'' [مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان ۔ کراچی، [۱۹۹۷ء] نے چھاپ دیا ہے اس کے آخر میں بہ طور ضمیمہ مولانا آزاد کا ریویو بر ''رباعیات عمر الخیام'' بھی شامل ہے۔ ابوالنصر کے رسالے کی یہ اشاعت عکسی ہے۔

[۵] مولانا آزاد ایک تذکرہ شعرائے فارسی مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے میں خاقانی شروانی پر ایک مقالہ سوانح اور کلام پر ریویو میں لکھا تھا اور مخزن لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ مقالہ ارمغان آزاد [مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری] میں شامل ہے۔ تذکرۂ شعرا کا منصوبہ پورا نہیں ہوا۔

[۶] بہ طور تصنیف کتاب یا رسالے کی شکل میں مولانا کے اس مضمون کی اشاعت کا تو پتا نہیں چلتا۔ البتہ بہ طور مضمون مولانا کی یہ کاوش ''ضوءِ غیر مرئی ——— ایک جرمن پروفیسر کی حیرت انگیز ایجاد'' کے عنوان سے خدنگ نظر لکھنو کی دو اشاعتوں بابت ماہ مئی و جولائی ۱۹۰۳ء میں شایع ہوئی تھی۔

[۷] مولانا آزاد نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا اور مولوی حکیم محمد علی طبیب ایڈیٹر ''مرقع عالم'' [ہردوئی] کو اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ بعد میں مولانا نے اسے ایک کتاب بنا دینا چاہا۔ لیکن اب نہ مضمون کا پتا چلتا ہے، نہ رسالے یا کتاب کا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''ارمغانِ آزاد'' محولہ بالا

[۸] مصری عالم فرید وجدی کی تصنیف ''المراۃ المسلمہ'' پر مولانا آزاد کا تبصرہ جو الندوہ لکھنؤ کی تین اشاعتوں بابت، نومبر، دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری ۱۹۰۶ء میں چھپا تھا۔ بعدہٗ اس تبصرے کو مکمل کیا اور وہ ''وکیل بک ایجنسی امرتسر'' سے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں ''مسلمان عورت'' کے نام سے کتابی شکل میں چھپوایا اس کے بیسیوں ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں اور ہنوز اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن بعد میں مولانا آزاد نے اسے کسی کو چھاپنے کی اجازت نہیں دی۔ فرید وجدی نے اس کتاب میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، مولانا کو ان سے اتفاق نہیں رہا تھا، دیکھیے خط بنام محمد یونس خالدی۔ مشمولہ ''افادات آزاد'' [مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری) کراچی ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۴۹ اب اس کا تحقیقی، اضافی اور تصحیحی ایڈیشن پورب اکادمی اسلام آباد سے شایع ہو گیا ہے۔

[۹] یہ رسالے کینول فلاماریان کے انگریزی رسالہ ''سولرسسٹم'' سے بہ واسطۂ فارسی ترجمہ [از مولوی عبدالرحیم تبریزی] مولانا نے اردو میں منتقل کیا تھا اور الگ سے بھی مطالب و مباحث کا اضافہ کیا تھا۔ ''خدنگ نظر'' لکھنو بابت جون ۱۹۰۳ء میں اس کے بارے میں ''الہیئت'' [جدید علم ہیئت کی ایک مکمل کتاب] کے عنوان سے ایک اعلان شایع ہوا تھا۔ لیکن نہ اُس وقت تک یہ کتاب چھپی تھی، نہ بعد میں اس کی اشاعت کا پتا چلا تفصیل کے لیے دیکھیے: ''ارمغانِ آزاد'' محولہ بالا۔

[۱۰] المعتزلہ ''العلوم الجدیدۃ والاسلام'' کا ایک باب تھا، جس کے صفحات کی طوالت اور علمی افادیت کے پیش نظر مستقل تصنیف کی شکل دے دی گئی تھی۔ لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آسکی اور شاید تکمیل کی بھی! میرا خیال ہے کہ المعتزلہ ۱۹۱۶ء تک مکمّل یا نامکمل، کسی نہ کسی شکل میں مولانا کے پاس ضرور موجود تھی۔ جو ۱۹۱۶ء کی خانہ تلاشی میں کلکتہ کے مکان اور پریس کے ذخیرے سے پولیس لے گئی تھی اور پھر پولیس آفس کی آتش زنی میں ضائع ہوگئی ''تاریخ معتزلہ'' کے نام سے مولانا نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ''الہلال'' کا تیسرا دور ''الہلال'' کلکتہ ۲۴ رجون ۱۹۲۷ء [صفحہ ۲ تا ۴] تاریخ وعبر کے صفحہ پر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر تاریخ معتزلہ کا ایک صفحہ [البلاغ۔ کلکتہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۵ء] اور ''تاریخ معتزلہ کا ایک ورق'' البلاغ، ۱۴ و ۲۱ رجنوری کو جو مضمون نکلا تھا مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ وہ اسی تاریخ معتزلہ کے اجزا تھے جو پولیس کی خانہ تلاشیوں کے نتیجے میں ضایع ہوگئی تھی [باقیاتِ ترجمان القرآن جلد سوم، لاہور، [۱۹۶۱ء صفحہ ۳]۔

[۱۱] ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں المصباح کے سلسلۂ بیان میں مولانا نے فرمایا ہے کہ جب انھوں نے المصباح جاری کیا تھا تو ''اس میں ایک صفحہ علمی مضامین کے لیے بھی رکھا تھا۔ ایک صفحہ تاریخ وسوانح عمری کے لیے۔ امام غزالی ، نیوٹن اور مسئلہ کشش ثقل وغیرہ مضامین ان صفحات کے لیے لکھے تھے''۔ [صفحہ ۲۷۵]

میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک ہی مضمون ہیں۔ شاید کششِ مادہ اور ''کششِ عشق'' میں قانونِ کشش کی یکسانیت اور موازنے کی بحث کا کوئی اضافہ کر دیا ہوگا۔

المصباح، جس میں مسئلۂ کشش ثقل پر مضمون شایع ہوا تھا، جنوری ۱۹۰۱ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''ارمغانِ آزاد'' محولۂ بالا

[۱۲] اس کتاب یا مقالے کا علم بھی کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکا۔ یقین ہے کہ کلکتہ اور رانچی میں پولیس کے ہاتھوں مولانا کے ذخیرۂ علمی اور قلمی مسودات پر جو بیتی تھی، اس میں یہ کتاب بھی ضایع ہوگئی۔

[۱۳] زیرِ نظر تحریر کے سوا کسی اور تحریر و بیان یا کسی محقق کی تحقیق سے اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

[۱۴] اس کا ذکر مولانا نے ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں بھی کیا ہے۔ وجہِ تالیف کے بیان کے بعد مولانا نے فرمایا:

''خیال ہوا کہ ایسے تمام لغات اور محاورات اور صلات کو ایک فرہنگ میں جمع کیا جائے۔ چناں چہ ایک معقول حصہ ایسے الفاظ و محاورات کا جمع کر دیا [صفحہ ۲۲۶]

[۱۵] کسی اور ماخذ سے اس رسالے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہو سکا۔

[۱۶] الہلال کے ایک مضمون ''الہلال کا تیسرا دور'' مطبوعہ ۲۴ر جون ۱۹۲۷ء میں صفحہ ۴ پر اس رسالے کا نام آیا ہے۔ یہ رانچی کی نظر بندی کے زمانے سے پہلے کا رسالہ ہے اور نظر بندی کے زمانے میں کلکتہ کی خانہ تلاشی اور پولیس کے قبضے میں جا کر جو ذخیرہ علمی ضایع ہوا تھا، اس میں یہ رسالہ بھی ضایع ہو گیا تھا۔

[۱۷] اس رسالے کا پورا نام ''الکلام الطیب و القول الثابت'' ہے۔ تذکرہ میں اس کے موضوع و مباحث کا ذکر آیا ہے۔ دیکھیے: تذکرہ مرتبہ فضل الدین احمد، کلکتہ ۱۹۱۹ء، صفحہ ۲۲۰ نیز ساہتیہ اکادیمی دہلی ایڈیشن، صفحہ ۲۲۴۔

[۱۸] اس رسالے کا پورا نام ''اتحاف الخلف بطریقۃ السلف'' تذکرہ میں دو مقام پر اس کا ذکر ہے۔ دیکھیے: کلکتہ ایڈیشن [۱۹۱۹ء] صفحہ ۱۵۸ و ۲۲۰، دہلی ایڈیشن: صفحہ ۱۸۰ و ۲۲۴

[۱۹] اس تصنیف کے علم کا واحد ماخذ یہی تحریر ہے۔

[۲۰] کسی اور ماخذ سے مولانا کی اس تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

[۲۱] الحریت فی الاسلام کے عنوان سے الہلال دورِ اول اور البلاغ کے بارہ [۱۲] نمبروں میں یہ مضمون شایع ہوا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

[الف] احرار اسلام: الحریت فی الاسلام [۱] الہلال، ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء، ص ۵

[ب] احرار اسلام: الحریت فی الاسلام [۱] الہلال، ۲۵ر جون ۱۹۱۳ء، ص ۱۲

[ج] الحریت فی الاسلام: نظامِ حکومتِ اسلامیہ [۱] ۲ر جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۹

......[۲] الحریت فی الاسلام: نظامِ حکومتِ اسلامیہ [۲] ۹ر جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۳۱

......[۳] الحریت فی الاسلام: نظامِ حکومتِ اسلامیہ، (۳) ۱۶ر جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۵۳

......[۴] الحریت فی الاسلام: نظامِ حکومتِ اسلامیہ (۴) ۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۳۶

......[۵] الحریت فی الاسلام: نظامِ حکومتِ اسلامیہ (۵) یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۵۷

......[۶] الحریت فی الاسلام: نظامِ حکومتِ اسلامیہ (۶) ۸ر اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۸۱

[د] الحریت فی الاسلام: حریت اور حیات اسلامی، (د)

قرآن کی تصریحات [۱] الہلال، ۱۵ و ۲۲ر اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۳۱۲

......قرآن کی تصریحات [۲] الہلال، ۲۹ر اپریل، ص ۳۳۵

......احادیث وآثار [۱] الہلال، ۶ رمئی ۱۹۱۴ء، ص ۳۵۵

[۲] ۱۹۱۳ء ۲۰ رمئی ۱۹۱۴ء، ص ۳۷۷

[۵] مواعظ وخطب: الحریت فی الاسلام، البلاغ، ۱۷/۲۴ ردسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۲۲

علامہ سید سلیمان ندوی نے شبہہ کے لہجے میں دعویٰ کیا ہے کہ شاید یہ مضمون ان کا ہے۔ فرماتے ہیں:

''جہاں تک یاد آتا ہے ''حریت اسلام'' کے سلسلے کے ''نظام سیاسی'' کا مضمون میں نے لکھا تھا جو اس سے پہلے ''الندوہ'' میں ''اسلام اور اشتراکیت'' کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ اس کو دوبارہ الہلال کے رنگ میں لکھا۔ مولانا [آزاد] نے اس میں انقلابِ فرانس وغیرہ مسایل کا اضافہ فرمایا ہے''۔

(خطوطِ سلیمانی: خط بنام پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، کراچی، ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۲۲)

لیکن یہی خصوصیت تو مولانا ابوالکلام نے بھی اپنے مضمون کی بتائی ہے:

''تفصیل کے ساتھ مختلف ابواب میں واضح کیا ہے کہ اسلام کا نظام حکومت کیا ہے''۔

حضرت سید صاحب نے جب یہ بات فرمائی تھی تو ان کے سامنے نہ ''الندوہ'' میں مطبوعہ مضمون تھا، نہ الہلال کا سلسلۂ مضمون تھا، اور نہ ان کے حافظے میں تفصیلات تھیں۔ جذبات کی فراوانی میں حضرت کے بیان کی صحت متاثر ہوگئی۔ صورتِ احوال اس سے مختلف ہے۔ بحث ونظر کا یہ موقع نہیں لیکن ۲۰ رجولائی سے ۸ راکتوبر ۱۹۱۳ء تک مضمون چھپا ہے۔ وہ نظام حکومتِ اسلامیہ کے موضوع پر ہے اور اس میں انقلاب فرانس وغیرہ کا تذکرہ بھی ہے۔ اس لیے یہ مضمون ایڈیٹر کی اصلاح اور ترمیم واضافہ کے ساتھ حضرت سید صاحب ہی کا ہوسکتا ہے۔

''الحریت فی الاسلام'' کے نام سے الہلال کے مضامین کا مجموعہ قومی دارالاشاعت میرٹھ نے ۱۹۲۱ء میں چھاپ دیا تھا۔

[۲۲] ''احرار اسلام'' کے نام سے مولانا کی کسی تالیف کا سراغ تو نہیں ملا لیکن الہلال میں مضامین کا ایک سلسلے دور تک پھیلا ہوا ہے اور اسی عنوان سے ہے، ان مضامین کا ایک مجموعہ بھی چھاپ دیا ہے۔

[۲۳] مختلف مواقع پر خانہ تلاشیوں اور پولیس کے ہاتھوں جو مسودات برباد ہوئے تھے، ان میں سیرت ابن تیمیہ بھی ضایع ہوگئی۔ لیکن ''تذکرہ'' کے تقریباً دو تہائی صفحات شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی سیرت کے محاسن میں ہیں اور اگرچہ اردو میں حضرت شیخ الاسلام پر کافی ذخیرہ جمع ہوگیا ہے لیکن مواد اور اسلوب بیان کے اعتبار سے اس سے اچھی تحریر کوئی نہیں۔

[۲۴] مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی تحریرات ''الدین القیم'' ہی کی دعوت کے خصایص کا تذکرہ اور تشریح ہے، لیکن اس نام سے مولانا کی کوئی تصنیف علم میں نہیں آسکی۔

[۲۵] اس کا پورا نام اس طرح ہے: ''جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد'' اولاً یہ کتاب معارف، اعظم گڑھ میں دو قسطوں میں شایع ہوتی تھی، اور انھیں اوراق پر سرورق کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں شایع ہوئی تھی۔ اب یہ کتاب مولانا آزاد کے تصحیح شدہ نسخے کے مطابق خاکسار ابوسلمان شاہ جہان پوری نے تقدیم اور تدوین کے بعد ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان، کراچی [۱۹۹۶ء] سے شایع کردی ہے۔ اس تصنیف کی کئی اشاعتیں کئی پبلشرز نے پیش کی ہیں

لیکن اس تحریر کے پس منظر اور محرک طرف کسی نے حال آں کہ اس کی بڑی اہمیت تھی۔ خاک سار نے اس تالیف کے پس منظر کے واقعات اور اس کی اشاعت کی اہمیت پر ۴۵ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے۔

[۲۶] ''تذکرہ'' مولانا آزاد کی مشہور تصنیف۔ البلاغ پریس۔ کلکتہ سے ۱۹۱۹ء میں پہلی بار شایع ہوئی تھی۔ مولانا کی زندگی میں بیسیوں اشاعتیں وجود میں آئیں، اس کی آخری اشاعت میں ساہتیہ اکادیمی۔ نئی دہلی سے ظہور میں آئی۔ مالک رام نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں کئی بڑی غلطیاں ہیں لیکن ان کی تصحیح کرنے والا کوئی نہیں!

[۲۷] ''تاریخ دعوت اسلام'' کے نام سے مولانا کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

[۲۸] خلافت کانفرنس کلکتہ [۱۹۲۰ء] کا خطبۂ صدارت جو بعد میں نظر ثانی اور مضامین کے اضافے کے ساتھ ''مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب'' کے نام سے کتابی شکل میں شایع ہوا۔ اب آخری صورت میں یہ اپنے موضوع پر مسایل کی تحقیق، اصول وفروع کی تفصیل، مباحث کی جامعیت میں وقت کی اہم ترین تصنیف ہے۔

[۲۹] ترک موالات کے موضوع پر مولانا نے ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء کے خطبات ومضامین میں بہت لکھا ہے، مولانا کا فتوی بھی موجود ہے ''بائی کاٹ'' کے عنوان سے قومی دارالاشاعت میرٹھ سے مولانا کا ایک کتابچہ بھی شایع ہوا تھا لیکن ''ترک موالات'' کے نام سے کوئی رسالہ نظر سے نہیں گزرا۔

[۳۰] مولانا محمد علی نے ۱۹۲۱ء میں مدراس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر افغانستان نے ہندستان پر حملہ کیا اور ہم کو معلوم ہوگیا کہ اس کا ارادہ ہندستانیوں پر حکومت کرنے کا نہیں ہے بلکہ ہندستان کو آزاد کرانا مقصود ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی اعانت کریں''۔

اس بیان میں کوئی پیچیدہ بات نہ تھی۔ لیکن اخبار میں یہ بات اس طرح آئی کہ بعض برادران وطن اس سے سخت متوحش ہوئے۔ اور پنڈت مدن موہن مالویہ، سوامی شردھانند، لالہ لاجپت رائے وغیرہ کو سخت اعتراض ہوا۔ اس دوران میں افغان جاسوس کا شاخسانہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پنڈت مالویہ نے ایسوسی ایٹ پریس کے نمایندے کو ایک بیان بھی دے ڈالا اور خلافت کانفرنس الہ آباد میں تقریر میں بھی اس مسئلے کو چھیڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خاص حلقے میں مسلمانوں کی حب الوطنی کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ملک سے مسلمانوں کی وفاداری اور ان پر اعتماد کی بحث شروع ہوگئی۔ مجبوراً مولانا آزاد کو قلم اُٹھانا پڑا اور ہندستان پر حملہ اور مسلمانوں کے فرایض کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ اس کے اخبار میں چھپتے ہی غلط فہمیاں دور، ہنگامہ فرو اور حالات پر سکون ہوگئے۔ اس میں حملے کے امکان، اس کی مختلف صورتیں اور مسلمانوں کے فرایض پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ بہت معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔ مولوی مشتاق احمد ناظم قومی دار الاشاعت۔ میرٹھ نے ۱۹۲۱ء ہی میں چھاپ دیا تھا۔

[۳۱] ترجمان القرآن اوّلاً دو جلدوں میں شایع ہوا تھا۔ اب ۱۹۶۶ء میں ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی کی جانب سے سورۂ نور کے اضافے کے ساتھ چار جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ یہ صرف انیس پاروں کا ترجمہ، سورہ فاتحہ کی مفصل تفسیر اور دیگر سورتوں کے اہم مباحث پر نہایت محققانہ تفسیری مقالات پر مشتمل ہے۔

[۳۲] تفسیر البیان فی مقاصد القرآن کا اب کوئی وجود نہیں۔ اس سلسلے کی چیز سورۃ فاتحہ کی ''تفسیر ام القران'' ہے یا بعض

سورتوں کے اہم مقامات پر تفسیری مقالات ہیں جو سورتوں کے آخر میں شامل ہیں۔

[۳۳] مقدمہ تفسیر ۱۹۱۶ء میں البلاغ پریس میں چھپنا شروع ہو گیا تھا، لیکن پولیس کی خانہ تلاشی میں مطبوعہ صفحات بوریوں میں بھر کر پولیس آفس چلے گئے اور پھر ضایع ہو گئے۔ اس وقت تک کم از کم چھ باب شایع ہو چکے تھے۔ اس لیے کہ ۳۲ صفحات مطبوعہ جو ترجمان القرآن کی سابقہ تقطیع کے ملے اور جنھیں ترجمان القرآن جلد اول بہ عنوان ''مقدمہ فاتحہ الکتاب [صفحہ ۵۹ تا ۱۰۷] شامل کر لیا گیا ہے موجودہ ساہتیہ اکادمی دہلی کے ۴۹ صفحے میں آئے ہیں اور باب اب بھی مکمل نہیں ہوا۔ ان صفحات میں تحریر کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''مقدمے کے پانچویں باب میں قرآن حکیم کے طرز نزول اور ترتیب وانضباط کی بحث تم پڑھ چکے ہو اور......'' اس سے بے شک وشبہ ثابت ہو جاتا ہے؛

۱۔ یہ کہ مقدمے کے ابتدائی پانچ باب چھپ چکے تھے اور دستیاب شدہ مطبوعہ صفحات باب ۶ کے آغاز کے صفحات ہیں۔

۲۔ اور یہ کہ دستیاب شدہ باب ۶، اگر ۴۹ صفحے میں بھی مکمل نہیں ہوا تو اسی پر قیاس کر کے ابتدائی پانچ ابواب کی کم از کم ضخامت تین سو صفحات اور ترجمان القرآن کے پہلے سایز پر دو سو صفحات ضرور قرار دی جا سکتی ہے۔

۳۔ دستیاب شدہ باب ۶ کی ابتدائی سطروں کے مطالعے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پانچویں باب کی ایک اہم بحث قرآن حکیم کے طرز نزول اور ترتیب وانضباط کی بحث تھی مولانا فرماتے ہیں:

''تم پڑھ چکے ہو اور یہ حقیقت تم پر واضح ہو چکی ہے کہ قرآن حکیم کی ایک ترتیب وقتی تھی اور ایک دائمی! وقتی ترتیب وہ تھی جو اس کے جستہ جستہ حسب ضرورت نزول میں ملحوظ رہی اور دائمی وہ تھی جس کے مطابق وہ بہ شکل ''الکتاب' مرتب و مدون ہوتا رہا۔ یہی ''الکتاب' جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اور ٹھیک ویسا ہی مرتب و منظم ہے، جیسا کہ وحی الٰہی نے اس کو مرتب کیا تھا''۔

[ترجمان القرآن [جلد اول]: دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۶۴ء، ص ۵۹]

(۲۹) ﴿۲۵۱﴾

مولانا آزاد کا سیاسی مسلک

پریسیڈنسی علی پور جیل (۲۲۔۱۹۲۱ء) کی یادگار تحریرات میں مولانا کی ایک تحریر ''سیاسی مسلک'' کی وضاحت میں ہے۔ مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''سب جانتے ہیں کہ مولانا ہمیشہ پکے نیشنلسٹ اور مکمل آزادی و جمہوری نظام کے علم بردار رہے۔ ملک کی سیاست نے بہت سی کروٹیں بدلیں، بڑے بڑے لیڈر ادھر سے ادھر ہو گئے، مگر مولانا کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے، ہمیشہ اپنے مسلک پر ڈٹے رہے اور اس راہ میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ظلم وستم بردباری خاموشی اور ثابت قدمی سے جھیلے جو انبیاءِ ومرسلین کو منکرین کے ہاتھوں جھیلنا پڑتے تھے۔

لیکن یہ واقعہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں مولانا تشدد پسند انقلابیوں کے ساتھ تھے اور ہندستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بنگال کے انقلابیوں سے تعلقات استوار تھے۔ دوسری طرف سرحد کے قبایل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے بھی رشتہ مضبوط تھا اور خود ہندستان بھر میں بیعت جہاد زور شور سے جاری تھی۔

جب میں ان کی رفاقت میں [۱۹۲۰ء میں] آیا تو اس وقت تک مولانا مسلح بغاوت ہی کے قایل تھے۔ ایک دفعہ خود مجھے ایک جگہ بھیجا تھا اور میں دو درجن پستول لے آیا تھا، جو انھوں نے کسی اور کے ہاتھ کہیں بھیج دیے تھے۔ مگر اسی زمانے میں ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور سمجھ گئے کہ ہتھیاروں کے زور سے انگریزوں کو نہیں نکالا جا سکتا۔

جیل میں جب ہم تھے، تو میں نے مولانا سے درخواست کی کہ اپنے ''سیاسی مسلک'' کی تشریح لکھ دیں؟ مولانا نے فرمایا کہ سوال مرتب کرو، جواب لکھ دوں گا میں

نے سوال پیش کر دیے۔ افسوس سوالوں کا مسودہ محفوظ نہیں رہا، مگر جواب میں مولانا کی تحریر محفوظ ہے‘‘۔ [ذکر آزاد؛ کلکتہ، ۱۹۶۰ء، ص ۳۴۷۔۲۷۲]

مولانا ملیح آبادی نے جیل میں مولانا آزاد کے جو سوانح حیات مرتب کیے تھے، وہ ۱۹۵۸ء میں شایع ہو گئے [آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی]۔ لیکن اس میں مولانا کی تحریرات انھوں نے شایع نہیں کیں۔ البتہ ’’ذکر آزاد‘‘ [کلکتہ میں انھوں نے تحریرات کو بھی مرتب کر دیا۔ لیکن جیل میں انھوں نے جو مواد مہیّا کیا تھا، اس سے استفادہ کر کے مولانا شایق احمد عثمانی ایڈیٹر عصر جدید۔ کلکتہ نے ’’امام الاحرار حضرت مولانا ابوالکلام آزاد‘‘ کے نام سے ایک کتابچہ [۷۲ صفحات] شایع کیا تھا، اس میں مولانا آزاد کی یہ تحریر مع سوالات کے درج ہے بلکہ ایک سوال اور اس کا جواب ’’ذکر آزاد‘‘ سے زیادہ ہے۔ یہاں ’’امام الاحرار......‘‘ سے استفادہ کر کے اس تحریر کو سوالات کے اضافے کے ساتھ مکمّل شایع کیا جا رہا ہے۔ مولانا ملیح آبادی کے سوالات یہ ہیں:

۱۔ سوراج کے معنی برٹش ایمپایر کے ماتحت ہیں یا مکمّل؟

۲۔ کیا مہاتما جی کے ’’نوان وائی لینس، نوان کوآپریشن‘‘ سے ہندستان کو سوراج مل سکتا ہے؟

۳۔ نوان وائی لینس، نوان کوآپریشن کی شرط آپ کے نزدیک کیسی ہے؟

۴۔ موجودہ ہندو مسلم اتحاد کے متعلق آپ کی کیا راے ہے؟

۵۔ خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی سے اطمینان ہو سکتا ہے؟

۶۔ مخالفین آزادیِ ہند کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ اگر سوراج حاصل ہو جائے تو مسلمان ترکوں یا افغانوں کو نہ بلا لیں گے؟

۷۔ کیا چرخہ قومی زندگی میں مستقل جگہ لے سکے گا؟‘‘

حضرت مولانا آزاد نے ان سوالات کے یہ جواب عنایت فرمائے:

ا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ سوال قبل از وقت ہے۔ ابھی ہم نے سوراج کی ابتدائی منزلیں بھی سر نہیں کی ہیں۔ اس کی آخری منزل کے بارے میں بحث و گفتگو کرنا بالکل لاحاصل ہوگا۔

سوراج کے معنی ''اچھے راج'' کے ہیں۔ میرے اعتقاد میں اچھا راج وہی ہوسکتا، جس میں دو شرطیں پائی جائیں، قومی ہو اور جمہوری ہو۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ہندستان کی قدیم تاریخ میں جمہوری نظامِ حکومت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، لیکن اسلام کی تمام روایات، تمام تر جمہوریت پر مبنی ہیں۔ اس لیے بہ حیثیت مسلمان ہونے کے یہ قدرتی بات ہے کہ میں صرف جمہوری نظام ہی سے مطمئن ہوسکتا ہوں۔

۲۔ اس بارے میں میرا جو خیال آج سے کئی سال پہلے تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہندستان اس طریقے پر چل کر ضرور آزاد ہوسکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر بردولی فیصلے کی یادگار غلطی نہ ہوئی ہوتی[۱]، تو ہمارا یہ پہلا تجربہ بھی بہترین فوری نتائج حاصل کرسکتا تھا۔ اس تجربے نے مجھے اور زیادہ ''نوان وائی لینس نوان کوآپریشن'' کے طریقے کی عملی صداقت کا یقین دلا دیا ہے۔ موجودہ حرکت عملاً ختم ہوچکی۔ اور اب ملک کا کسی قدر رستا ناگزیر ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد ایک قوی حرکت انھی اصول پر شروع ہوئی اور ان مرکزی اور انتظامی غلطیوں سے اجتناب کیا گیا، جو اس مرتبہ ہوچکی ہیں تو مجھے کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔

۳۔ بلاشبہ نوان وائی لینس ان حالات میں ایک صحیح طریقہ ہے جو ہندستان اور ہندستان جیسے ملکوں کے ہیں۔ باقی رہا ''نوان وائی لینس'' کا اصول بہ حیثیت ایک اخلاقی اعتقاد کے تو میں اسے تسلیم کرتا ہوں، لیکن اسی صورت میں جو قرآن نے پیش کی ہے، اور اس تشریح کا یہ موقع نہیں۔ بعض حالتوں میں ''وائی لینس لا آف نیچر'' ی

تعمیل ہے۔

۴۔ ہندو مسلم اتحاد یقیناً آج اس سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ جتنے کی ۱۲۔۱۹۱۱ء میں، میں امید کرتا تھا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اب تک اس درجے تک نہیں پہنچا کہ ہم اس پر پوری طرح اعتماد کرسکیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیال میں اب تک یہ ایک پالیسی سے زیادہ نہیں ہے۔ محض وقت کے مشترک حالات نے دونوں کو اکٹھا کردیا ہے[۲] ہزاروں مسلمان ہیں جنھیں اب تک ہندوؤں کی مجاریٹی سے دہشت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سیلف گورنمنٹ کے معنی ہندو گورنمنٹ کے ہوں گے۔ اسی طرح ہندوؤں کے دلوں میں بھی شمال کا خطرہ اب تک باقی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابدالی والی سڑک بند نہیں ہوئی ہے۔ جنسی تعصّب کا اب تک سد باب نہیں ہوا، چھوت کی ناقابلِ عبور خلیج اب بھی ہمارے ملنے میں حائل ہے۔ اس لیے سوراج کی اس سب سے پہلی بنیاد کا کام کسی طرح بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ آیندہ سالہا سال تک ہمارے پروگرام میں سب سے پہلی چیز یہی رہنی چاہیے۔

البتہ میرا یقین ہے کہ کوئی حقیقی رکاوٹ اس کام میں حایل نہیں۔ دنیا کی تمام قوموں سے کہیں زیادہ ہندو مسلمانوں میں دایمی اور حقیقی اتحاد ہوسکتا ہے، بشرطے کہ باہم دگر غلط فہمیوں کا خاتمہ کردیا جائے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

مجھے نہایت رنج ہوتا ہے، جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندستانی انگلستان اور امریکہ کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن وہ اس مذہب اور جماعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا، جو صدیوں سے اس کے ہم سائے میں موجود ہے۔

مجھے کس قدر حیرت ہوئی۔ جب میں نے سر رابندرا ناتھ ٹیگور[۳] کا ایک آرٹیکل ''فلاسفی آف انڈین ہسٹری'' دیکھا جو ''ماڈرن ریویو'' میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی بجائے خود معبود بن گئے ہیں،

کرشن، مسیح اور چیتن کے ساتھ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کرشن اور مسیح کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں میں معبود کی طرح پرستش کیے جاتے ہیں! میں نے کہا کہ ہندستان کا عظیم الشان شاعر، امریکا کی سیاحت سے واپس آ رہا ہے لیکن اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی معلوم نہیں، جو خود اس کے گھر میں بستے ہیں! مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک دہقانی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اس کا پیغمبر انسان تھا اور خدا کا ویسا ہی بندہ جیسا وہ خود ہے۔ اسلام کا تو اصلی مشن ہی انسانی پرستش کو مٹا دینا ہے۔

اسی طرح جب میں بنکم چندر چٹر جی [۴] کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو باوجود اس تعریف کے جوان کے لٹریچر کی میرے دل میں ہے ہندستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری پر متعجب ہو ہو کے رہ جاتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا ایک امریکن۔ میں اس کے لیے ہندو بھائیوں کو ملامت نہیں کروں گا۔ بلاشبہ یہ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح واضح کر دیتے لیکن انھوں نے پوری طرح اس فرض کو انجام نہیں دیا۔

بہ ہر حال مجھے ہندو مسلم اتحاد کی عملی حقیقت کا پورا پورا یقین ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ خیال سے تو اس میں کوئی روک بھی نہیں ہو سکتی کیوں کہ اسلام فی نفسہٖ ایک عالم گیر اور سب میں پھیلی اور بٹی ہوئی صداقت کا واعظ ہے۔ اس کی بنیاد ہی انسانی برادری اور مساوات پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مسلمانوں سے ہمیشہ التجا کرتا ہوں کہ وہ اس راہ میں خود پیش قدمی کریں۔ دوسرے فریق کی پیش قدمی کا انتظار نہ کریں۔ میں گذشتہ دسمبر میں اس بات کا انتظام کر رہا تھا کہ ایک مرکزی انجمن صرف ہندو مسلم اتحاد کو ترقی دینے اور اس مقصد پر مفید لٹریچر تیار کرنے کے لیے قایم ہو جائے۔ میری گرفتاری سے کام رک گیا۔ لیکن انتظامات جاری ہیں۔

ایک اور نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف مجھے اشارہ کر دینا چاہیے۔ اگر ہم ہندستان میں ایک متّحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روز بروز ایک نئی تفریق پراونیشل ازم کی بڑھتی جاتی ہے۔ ''مائی انڈیا'' کی جگہ ''مائی بنگال'' کی صدائیں میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں۔ شاید کہا جا سکتا ہے کہ اور صوبوں کے مقابلے میں پراوینشل ازم کا جذبہ بنگال میں زیادہ ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ یہ چیز آگے چل کر ''انڈین نیشنل ازم'' کے لیے سخت مضر ثابت ہوگی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انڈین نیشن کی کوئی قومی زبان اب تک نہیں ہے۔

۵۔ مطالبات خلافت کی تشریح میں میری کتاب اردو اور انگریزی میں شایع ہو چکی ہے [۵]۔

مختصر مطالباتِ خلافت یہ ہیں کہ

الف: عراق و فلسطین اور شام کو انگریزی یا فرنچ منڈیری میں رکھنے کی کوشش ترک کردی جائے۔ انھیں بالکل چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ آزاد و خود مختار حکومت خلیفۃ المسلمین کے زیرِ سیادت قایم کرلیں۔

ب: تھریس اور سمرنا ترکوں کو واپس دے دیا جائے۔

ج: قسطنطنیہ درِ دانیال اور خلیفۃ المسلمین کی حکومت پر کسی طرح کی پابندی عاید نہ کی جائے۔

د: اسلام کے مقدس مقامات کا اہتمام خلیفہ کے زیر اقتدار رہنا چاہیے۔

۶۔ اس کا مفصّل جواب میں ایک رسالے میں دے چکا ہوں۔ جو گذشتہ سال چھپ چکا ہے [۶] لیکن اس موقعے پر میں صرف اسی قدر کہوں گا کہ ہندستان میں تئیس ۲۳ کروڑ ہندو ہیں اور سات کروڑ مسلمان ۲۳ کروڑ ہندوؤں کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ اگر ایک لاکھ ترک یا افغانی پٹھان حملہ کر دیں، تو وہ اپنی حفاظت آپ کرسکیں۔

اگر اتنی طاقت ہم میں نہیں ہے تو پھر واقعی سوراج کا خیال ہمیشہ کے لیے ترک کر دینا چاہیے۔

بعض اوقات مجھے بڑی ہی ہنسی آتی ہے۔ جب میں اس معاملے کو سوچتا ہوں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ڈر رہے ہیں اور دونوں کو اپنے اوپر اعتماد نہیں۔ مسلمان خیال کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی تعداد تین گنی زیادہ ہے۔ آزادی ملنے پر وہ مسلمانوں کو پامال کر دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہندستان انگریزوں ہی کا غلام رہے۔ ہندو سوچتے ہیں کہ انگریزوں کے جاتے ہی خیبر کی بلندیوں سے پٹھان اتر آئیں گے اور تمام ہندوؤں کو پامال کر دیں گے۔ اس لیے نجات اسی میں ہے کہ انگریز رہیں۔ دیکھیے! انگلستان کی یہ خوش قسمتی کب تک قایم رہتی ہے؟

۷۔ جہاں تک تعلّق ہمارے موجودہ مقاصد کا ہے، نہ ایسا ہونا ضروری ہے اور نہ ہوتا نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ایک علاحدہ اور مستقل سوشیل اور تمدنی مسئلہ ہے۔ اگر ہندستان ''سرمایہ'' اور ''مزدوری'' کی اس عظیم الشان اور لا علاج کشمکش سے بچنا چاہتا ہے۔ جو بڑے بڑے کارخانوں کی بدولت یورپ میں پیدا ہو چکی ہے، تو بلا شبہ ابھی سے کوشش کرنی چاہیے کہ محنت کو محدود کارخانوں میں روک دینے کی جگہ تمام قوم میں مشترک طور پر پھیلا دیا جائے اور اس کے لیے چرخے کا عام رواج یقیناً ایک عظیم الشان بنیاد ہوگی''۔

حواشی:

[۱] بردولی صوبہ گجرات کے ضلع سورت کا ایک قصبہ ہے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں وہاں سے گاندھی جی کی قیادت میں سول نافرمانی کی تحریک کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن دوران میں ۵ فروری کو چوری چورا میں تشدد کا ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے گاندھی جی کو یقین دلا دیا کہ ملک ابھی عدم تشدد پر مبنی کسی عوامی تحریک کے لیے تیار نہیں ہو سکا۔ چناں چہ انھوں نے سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دیا۔ مولانا آزاد ان کے اس فیصلے سے متفق نہ تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''تحریک خلافت'' از قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ ۲۲۷ تا ۲۴۴۔

[۲] ہندو مسلم اتحاد کوئی وقتی اور سیاسی ضرورت نہ تھی، نہ اب ہے۔ یہ ایک مستقل دایمی اور انسانی ضرورت ہے۔ اسے کسی وقتی یا گروہی ضرورت اور مصلحت کی بڑی سے بڑی قیمت پر بیچا نہیں جا سکتا۔ ہندو مسلم اتحاد ہندستان کی تمام غیر مسلم اقوام اور مسلمانوں کے مفادات کا جامع ہے۔ اس اتحاد کے بغیر امن قایم نہیں ہو سکتا اور امن کے بغیر مسلمان ہندستان میں نہ اطمینان سے زندگی گزار سکتے ہیں، نہ اپنے خاص معاشرتی تہذیبی اور شرعی فرایض انجام دے سکتے ہیں۔ مختلف القوی اتحاد کسی ایک ملک کی داخلی ضرورت ہی نہیں خارجی ضرورت بھی ہے۔ پڑوسی ملکوں سے اتحاد بھی لازمی ہے اس کے بغیر کوئی ملک اپنے پڑوسی ملک کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی ملکی تعمیر و ترقی کے کام انجام نہیں دے سکتا۔ ملکوں کے بعد مختلف براعظموں کے اتحاد کی منزل پیش آئے گی تب کہیں جا کر "کلکم اخوکم و کلکم بنو آدم و آدم من تراب" کا مقصد متحدہ انسانیت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہمیشہ امن رہی ہے۔ یہ ضرورت آج بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گی۔ اس کی بنیاد قوموں اور ملکوں کے باہمی اعتماد اور اتحاد کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ اس کے قیام کی سب سے بڑی ذمے داری مسلمانوں کی ہے۔ اس لیے کہ وہ اسلام پر یقین رکھتے ہیں، اسلام کے معنی ہی امن اور سلامتی کی راہ کے ہیں۔ کسی قوم کی تنگ نظری اور تعصب ان کی ذمے داری میں اضافہ تو کرتا ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کے جواب میں انھیں اپنی ذمے داری سے دستبرداری کی اجازت نہیں مل سکتی۔

کسی پڑوسی ملک سے کسی مسئلے پر اختلاف اور اس کے نتیجے میں کسی وقت جنگ ہو سکتی ہے لیکن ہمیشہ حالت جنگ میں نہیں رہا جا سکتا۔ تصفیہ و صلح اور اعتماد و امن کی بحالی ناگزیر ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم میں اتنی سمجھ اور صلاحیت ہے کہ جنگ کے وقوع سے پہلے اپنے اختلافات دور کر کے باہمی اعتماد اور امن کی فضا پیدا کر دیں؟

مولانا ابوالکلام آزاد ہندستان میں فرقہ وارانہ اتحاد کے سب سے بڑے آرزومند اور عالمی سطح پر متحدہ انسانیت کے قیام کے بہت بڑے داعی تھے۔ اگر مولانا کی تمام اسلامی عملی سیاسی قومی و ملکی خدمات سے قطع نظر کر لی جائے تو ان کی انسانی عظمت کے اعتراف کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد اور متحدہ انسانیت کے قیام کے لیے ان کی فکر اور سعی کافی ہے۔

[۳] رابندر ناتھ ٹیگور [۱۸۶۱ـ۱۹۴۱ء] ہندستان کا عظیم صوفی، فلسفی، شاعر، مصنف، قومی معمار اور محب وطن ہندستان کی عظیم درس گاہ شانتی نکیتن کا بانی، نوبل انعام یافتہ، "نائٹ ہڈ سر" کے خطاب سے معزز جو جلیاں والا باغ میں برٹش استعمار کی بربریت کے خلاف احتجاجاً واپس کر دیا تھا۔ بنگالی اور انگریزی میں متعدد تصنیفات نظم و نثر یادگار ہیں انگریزی میں متعدد تصانیف ٹیگور کے سوانح، شخصیت سیرت، افکار اور خدمات کے تذکرے میں موجود ہیں۔

[۴] بنکم چندر چٹرجی [۱۸۳۸ـ۱۸۹۴ء] بنگالی زبان کے مشہور شاعر اور ناول نگار، آنند مٹھ [ناول] کے خالق جس میں "بندے ماترم" کا مشہور ترانہ شامل ہے۔ کالج میں تعلیم حاصل کی کلکتہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے سرکاری خدمات انجام دیں۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ بنگالی اور انگریزی میں ان کی کئی تصانیف نظم و نثر یادگار ہیں۔

[۵] مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، خلافت کمیٹی بنگال کے خطبۂ صدارت کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا نے اسے نظر ثانی و

اضافۂ مضامین کے بعد ایک لاجواب کتاب بنا دیا تھا، جو کتابی صورت میں بار بار چھپتا رہا۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپا تھا۔ میرے پاس موجود ہے۔

[۶] مولانا کا اشارہ اس رسالے کی طرف ہے جو ''ہندستان پر حملہ اور مسلمانوں کے فرائض'' کے نام سے شائع ہوا۔ ہندستان پر افغانستان کے حملے کا شاخسانہ مولانا محمد علی کے ایک مبینہ بیان سے پیدا ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ رسالہ لکھ کر تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا تھا۔ مزید تفصیل سے دیکھیے: ملیح آبادی کے نام خط نمبر ۲۸، حاشیہ نمبر ۳۰

(۳۰) ﴿۲۵۲﴾

پندرہ روزہ الجامعہ۔ کلکتہ

''الجامعہ'' عربی کا ایک پندرہ روزہ تھا جو کلکتہ سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زیرِ نگرانی اپریل ۱۹۲۳ء سے مارچ ۱۹۲۴ء تک جاری رہا تھا۔ رسالہ کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کی تحریک آزادی کے تمام ضروری حالات مصر و عرب اور دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچائے جائیں اور اس طرح بین الملی روابط مستحکم کیے جائیں۔ یہ مقصد ''الجامعہ'' نے اعلیٰ پیمانے پر پورا کیا۔ اگر کہا جائے کہ اس سے پیشتر یا اس کے بعد ویسا عربی اخبار ہندستان و پاکستان سے کبھی جاری نہ ہوا تو یہ بالکل بجا ہوگا''۔ [مولانا غلام رسول مہر]

اس کے بند ہونے کی وجہ کے بارے میں مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں:

''ہندستان میں اس کے زیادہ خریدار مہیا نہ ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت و ترکِ موالات کا جوش باقی نہ رہنے کی وجہ سے پرچہ بند ہو گیا''۔

''الجامعہ'' کے ابتدائی دو نمبر مولانا آزادؒ کی غیر موجودگی میں شائع ہوئے تھے۔ اس سلسلے کے مولانا آزادؒ کے دو تاریخی خط پیش کیے جاتے ہیں''۔

[ا۔س۔ش]

ملتان

مارچ [۱۹۲۳ء]

اخ العزیز! السلام علیکم

لکھنؤ میں دستی خط ملا تھا، وہاں سے آگرہ آ گیا، آگرہ کا قصد تھا، نہ ضرورت، لیکن ایسی صورت پیش آ گئی کہ گئے بغیر چارہ نہ تھا۔ وہاں سے لاہور آیا اور لاہور میں [الجامعہ دیکھا۔ مجھے رسالے کی ترتیب اور مجموعی ہیئت کی طرف سے تشویش تھی لیکن بحمد اللہ کہ وہ بلا وجہ ثابت ہوئی۔ نہایت خوش اسلوبی سے آپ نے یہ کام سرانجام دے دیا۔ البتہ طباعت کی غلطیاں اور حروف کا التباس جا بجا ہے۔ خصوصاً ''ڈ'' اور ''د'' کا التباس اور مرکب الفاظ کے حروف کی تقدیم و تاخیر۔ آیندہ زیادہ غور کے ساتھ پروف دیکھیے گا تو غلطیاں کم رہیں گی۔ اب بڑی دقّت دوسرے نمبر کی ہے، میرا یہ سفر گو آخری سفر ہے، لیکن قصد اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا۔ خیال تھا کہ نو دس تک واپس پہنچ جاؤں، لیکن اب بہ مشکل ۱۵ر، ۱۶ر تک واپس ہو سکتا ہوں۔

نہیں معلوم ملتان سے کب رہائی ہو اور اس کے بعد لاہور میں پنجاب کا جھگڑا کب (تک) چکے؟ بڑی دقّت یہ پیش آ گئی ہے کہ مجھ سے پہلے پنڈت نہرو اور مسٹر داس[۱] پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک ترتیب عمل شروع کر چکے ہیں۔ میں اس ترتیب کو اب بدل نہیں سکتا، اور وہ نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ فیصلے سے بہت دور کرنے والی۔ بہ ہر حال ارادے سے زیادہ قیام کرنا پڑے گا۔

لکھنو، آگرہ اور لاہور میں بے انتہا کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح لکھنے کا موقع ملے، لیکن بالکل نہیں ملا، حتّٰی کہ آگرہ کے متعلق ایک مختصر بیان پریس میں دینے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ لوگ کسی ترتیب و تنظیم کے عادی نہیں ہیں۔ رات کو ایک بجے دو بجے سونے کو مہلت ملتی ہے اور پھر صبح سے جلسے اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ نیند کے اوقات کے مختل ہو جانے کی وجہ سے دماغ کام نہیں دیتا۔

بہ ہر حال کوشش کر رہا ہوں کہ چند ضروری چیزیں لکھ بھیج دوں۔ آپ بد دل اور پریشان نہ ہوں۔ اگر مضمون نہ بھیج سکا، تو مجبوراً دوسرے نمبر کی تاخیر گوارا کر لیجیے گا اس کے سوا چارہ نہیں کوئی مضایقہ نہیں اگر آیندہ نمبر پہلی مئی کو ڈبل نکلے۔ اس کے بعد پھر

ایسی صورت پیش نہ آئے گی۔ جوں ہی یہ سفر ختم ہوا ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہوں گا۔[۲]

[ابوالکلام]

حاشیہ:

[۱] پنڈت نہرو سے مراد پنڈت موتی لال نہرو ہیں، نہ کہ ان کے صاحبزادے پنڈت جواہر لال نہرو۔ مسٹر داس سے مراد شری دیش بندھو چترنجن داس [کلکتہ] ہیں۔ ۲۶؍جون ۱۹۲۵ء کو دارجلنگ میں ان کا انتقال ہوا۔ پنڈت نہرو کا تعارف ان کے نام مولانا کے خط کے ضمن میں آئے گا۔

[۲] ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنا۔ اردو محاورے کے خلاف ہے۔ یہ مولانا کے قلم سے نہیں نکل سکتا۔ یہ سہو قلم ہے یا کتابت کی غلطی۔ محاورہ ''پاؤں توڑ کر بیٹھنا ہے''

(۳۱) ﴿۲۵۳﴾

مولانا آزادؒ ابھی سفر ہی میں تھے کہ مولانا ملیح آبادی نے ''الجامعہ'' کا دوسرا نمبر بھی شایع کر دیا۔ اسے دیکھ کر مولاناؒ نے یہ خط لکھا۔

لاہور،

۱۹؍اپریل [۱۹۲۳ء]

اخ العزیز! السلام علیکم

اسی وقت آپ کا خط ملا اور اسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ نے دوسرا نمبر نکالنے کے لیے جو اہتمام کیا، اس نے آپ کی مستعدی کا نقش میرے دل پر ثبت کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ سید رشید رضا[۱] کا مضمون آپ رسالے میں شایع کر رہے ہیں اور بالکل محسوس نہیں کرتے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

لکھنو میں جب آپ کا خط آیا اور آپ نے سیّد کے مضمون کا حال لکھا تو میں سمجھا تھا کہ انھوں نے اتحادیوں کے خلاف شکایتیں کی ہوں گی اور نوٹ میں ان کا جواب دے دینا کافی ہوگا۔ اس لیے لکھا تھا کہ کمپوز کرا لیجیے۔ کلکتہ آ کر دیکھوں گا اور نوٹ سے

ساتھ شایع ہو جائے گا لیکن اب اصل مضمون دیکھتا ہوں تو دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے۔ نہ صرف ''متفرنجین ترک'' بلکہ اثنائے جنگ کی عثمانی گورنمنٹ پر سخت الزامات لگائے ہیں۔ ''الحاد و تشریع'' ترکی کا ملزم ٹھہرایا ہے۔ ''حاکمیۃ ملیۃ'' کو [جو اس وقت بھی انگورہ کی طاقتور پارٹی ہے] ''ہادم خلافت'' بیان کیا ہے۔ جمال پاشا[۲] کے ''فرضی مظالم'' کا اعادہ ہے۔ ''ثورۂ حجاز'' [۳] کے طبعی ہونے کا ادعا ہے۔ اور بہ حیثیت مجموعی اتنی نا تمام حق گوئی بھی نہیں ہے، جتنی ''حقائق جلیہ'' وغیرہ مقالات ''المنار'' میں تھی۔ تعجب ہے کہ الجامعہ کے دوسرے نمبر میں شایع کر رہے ہیں اور اس نوٹ کو کافی سمجھتے ہیں جو ابتدا میں درج کیا گیا ہے۔ نوٹ میں آپ ان واقعات اور طریقِ استدلال کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ ''ترک اور عرب دونوں نے ایسا کیا ہے اور ان کا مقصود تمام ترکوں کا عام الحاد نہیں ہے، بلکہ بعض کا۔ ہر شخص اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ الجامعہ ان کے تمام افکار سے متفق اور تمام بیان کردہ واقعات کا مصدق ہے۔ صرف عام و بعض کی توجیہ ضروری سمجھتا ہے۔ نیز ترکوں کی طرح عرب بھی اس کے نزدیک ''جنسیت'' [۴] کے ملزم ہیں۔

''علاوہ بریں آپ نے لکھا ہے کہ۔۔۔ (کرم خُردہ غالباً ترکوں میں) جدید مدنیۂ ملعونہ سے جنسیت پیدا ہوئی یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

''غور کیجیے! اگر اس مضمون کا ترجمہ ہندستان میں اخبارات شایع کر دیں، تو مسئلۂ خلافت کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا؟ جدید انقلاب خلافت کے بعد سے تمام یورپین اخبارات تو یہی کہہ رہے ہیں کہ ینگ ترک ملحد ہیں، اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اسی کی ایک شہادت آپ نے بھی دے دی۔ ایسی شہادت جس میں یہاں تک لکھا ہے کہ ''اباحوا المهتك وكذا الفجور للنساء المسلمات''. عام مسلمانوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ ہندستان کے علما تو پہلے سے نوجوان ترکوں کے خلاف مستعد ہو رہے ہیں۔

خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے اور یہ مضمون شایع نہ کیجیے۔ دوسرا نمبر شایع نہ ہو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ایک نیا فتنہ نہیں پیدا کرنا چاہیے۔ اور نہ اباطیل و اکاذیب کی اشاعت میں حصّہ لینا چاہیے۔ یہ کچھ فرض نہیں کہ ان کا یہی مضمون ضرور شایع ہو۔ اگر وہ پسند کریں گے، کوئی اور تحریر بھیج دیں گے۔ نہیں بھیجیں گے تو ان کی مرضی۔

بہ ہر حال اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ ابتدا کا ایک فارم بدل دیا جائے اور اس میں کوئی اور مضمون دے دیا جائے اگر اور کوئی مضمون نہ ہو تو پھر ایک نمبر ''حکم حمل سلاح علی المسلم'' کا دے دیجیے۔ اس مرتبہ میں کلکتہ پہنچ جاؤں اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہوں، پھر ان مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

گاندھی جی کی تصویر پر جو الفاظ مدح و توصیف کے لکھے ہیں، مثلاً ''القدوۃ فی حیاتہ، طاہر الذیل، نقی القلب''، یہ بھی سخت اعتراضات کا موجب ہوں گے، خدارا ان چیزوں میں احتیاط و حزم سے کام لیجیے[۵]، صرف ''قاعدِ حرکۂ ہندیہ سلمیہ'' اور نام کافی ہے۔ امید ہے کہ نئے فارم میں اس کا لحاظ رہے گا[۶]۔

میں جانتا ہوں کہ یہ تاخیر آپ پر بہت شاق گزرے گی۔ لیکن کیا کروں، اس معاملے میں مجبور ہوں، سید رشید رضا کا مضمون کسی حال میں بھی قابلِ اشاعت نہیں ہے یا تو لوح پر سے میرا نام الگ کر دیجیے یا یہ مضمون شایع نہ کیجیے۔

اگر فارم بدل کر رسالہ شایع نہ کر سکیں، تو میرا انتظار کریں، اس کے سوا چارہ نہیں کہ ڈبل نمبر نکالا جائے۔

فارسی مضمون کے لیے پریشان نہ ہوں اور ''اسرارِ خودی'' وغیرہ چھاپ کر رسالے کو مضحکہ انگیز نہ بنائیں۔ سب باتیں اپنے وقت پر ہو جائیں گی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ رسالے کی ضخامت دو جز پر رکھی جائے، کم کر دی جا سکتی ہے۔

میں اس سفر میں بری طرح پھنسا۔ بے کار وقت گیا۔ امید ہے کہ پرسوں یعنی سنیچر کو روانہ ہو سکوں۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] علامہ رشید مصری، کا تعارف ان کے نام مولانا کے خط کے تعلق سے آچکا ہے۔

[۲] جمال پاشا [سر] ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے ایک رکن

[۳] ''ثورۂ حجاز'' یعنی حجاز کی آزادی و خود مختاری۔ گویا کہ گورنر حجاز حسین کی خلافت ترکی سے بغاوت جائز تھی۔

[۴] ''جنسیت'' قوم پرستی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ لفظ آچکا ہے۔ اردو میں ان معنیٰ میں یہ لفظ غیر معروف ہے۔

[۵] مولانا آزاد نے گاندھی جی کی تصویر پر کلمۂ توصیف کے بارے میں جس حزم و احتیاط کی نصیحت فرمائی وہ ان کے کمال دوراندیشی پر دال ہے۔

[۶] گاندھی جی تصویر کا مکمل کیپشن یہ ہے: ''داعی الحریۃ، ماحق العبودیۃ، القدوۃ فی حیاتہ، الشہیر بمارۂ، طاہر الذیل نقی القلب، زعیم الہند، قائد الحریۃ الہندیۃ، المحبوس لست سفوات''

(۳۲) ﴿۲۵۴﴾

مولانا آزاد ڈرپن اسٹریٹ کے مکان سے اواخر ۱۹۲۵ء میں بالی گنج، سرکلر روڈ کی ایک کوٹھی میں اٹھ آئے تھے۔ کوٹھی کے احاطے میں پریس کی مشینوں کے لیے شیڈ ڈال دیا گیا تھا اور اخبار [پیام] کے عملے کے لیے کمرے تیار کر دیے گئے تھے، ان میں سے ایک کمرے میں جو مالی کی کوٹھری کے پاس تھا، مولانا ملیح آبادی کو اٹھ جانے کا حکم ہوا۔ مولانا ملیح آبادی نے اس کو ناپسند کیا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ایک رقعے میں مولاناؒ سے بھی کر دیا۔ مولاناؒ نے اس رقعے کا درج ذیل جواب دیا۔

[۱۹۲۵ء]

استغفر اللہ! یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک نیا قضیہ پیدا ہو جائے۔ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں بھی آج تک یہ مسئلہ نہیں آیا کہ وہاں چلے جائیں۔ خود بدرالدین نے آکر کہا کہ وہ کہتے ہیں وہ کمرہ تیار کر دیا جائے تو میں جاؤں گا۔ نیز دروازے پر چک کے لیے کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہاں مکان تو کب کا تیار ہو چکا ہے، چک منگوا دو، بہ ہر حال میرا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ آپ ''ناگواری'' کے ساتھ وہاں

قیام نہ کریں۔ مالی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ جگہ دروازے کے پاس ہی رہے گی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ کوئی بات بھی میری خاطر ناگواری سے کریں۔ اسی بدرالدین نے جھوٹ سچ آ کر مجھ سے کہا کہ نہیں آپ وہاں قیام کریں گے حال آں کہ میں نے مکان کی جستجو کے لیے کہہ دیا تھا جو خود آپ ہی کی تجویز تھی، جب تک مکان کا انتظام نہ ہو یہ تمام کمرے حاضر ہیں آپ یہاں قیام کیجیے۔ ہرگز ہرگز یہاں سے تبدیلی مقصود نہیں ہے۔(۱)

[ابوالکلام]

(۱) اس وقت جامعہ بند ہو گیا تھا۔ (ا۔س۔ش)

(۳۳) ﴿۲۵۵﴾

الہلال۔ جون تا دسمبر ۱۹۲۷ء

اجرا سے پہلے اور اجرا کے بعد

(۱)

''الجامعہ'' اور ''پیام'' بند ہو جانے کے بعد مولانا ملیح آبادی بے کار ہو گئے اور مولانا آزادؒ کی جانب سے جو رقم ہر ماہ ملتی تھی، وہ بھی بند ہو گئی۔ مولانا ملیح آبادی نے اپنی بے کاری کی شکایت کی۔ مولانا کا درجِ ذیل مکتوب اسی کا جواب ہے۔

۳۰؍جولائی ۱۹۲۵ء

عزیزی!

کئی باتیں بالکل صاف ہیں:

۱۔کام شروع ہونے میں اتنی دیر نہیں، جتنی آپ سمجھتے ہیں۔[۱]

۲۔میرا خیال یہی ہے کہ آپ ایک عزیز کی طرح میرے ساتھ ہیں، اور یہ بالکل

ٹھیک ہے کہ کام نہ ہونے کی صورت میں بھی مجھے آپ کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری جانب سے اس لیے اس میں سستی ہوئی کہ میں نے دیکھا آپ نے تھوڑا بہت باہر کا کام جاری رکھا ہے۔[۲]

۳۔ تیس روپے آپ کو کل بھیج دوں گا۔ اگست کے خاتمے میں بھی آپ تیس روپے اپنی لازمی ضروریات کے لیے لے لیں اور اگر ستمبر میں کام نہ شروع ہو تو اس میں بھی۔ یہ ضروری ہے کہ اکتوبر سے زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔ یہ بھی اس صورت میں کہ میں باہر جاؤں ورنہ ستمبر میں اجرا لازمی ہے۔

۴۔ کام شروع ہونے پر آپ کے لیے اس سے زیادہ رقم قطعاً ہونی چاہیے، جو پچھلے دنوں آپ لیتے رہے، لیکن کیا آپ اس کے یقین کے لیے وقت اور مجھ پر اعتماد کریں گے۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] مولانا الہلال نکالنے کا سرو سامان کر رہے تھے اور اگر چہ اس کا اجرا بہت جلد عمل میں لے آنا چاہتے تھے، لیکن جون ۱۹۲۷ء سے پہلے اس کا اجرا عمل میں نہ آ سکا۔

[۲] مولانا ملیح آبادی نے الہلال بک ایجنسی [لاہور] کے لیے ابن تیمیہ اور ابن قیم [رحمہما اللہ] کے بعض تفسیری و دینی رسایل کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، مولانا آزاد کا اشارہ اسی طرف ہے۔

(۳۴) ﴿۲۵۶﴾

مولانا کے پچھلے خط کے بعد مولانا ملیح آبادی نے پوچھا تھا کہ آیندہ ان کے کاموں اور ذمے داریوں کی نوعیت کیا ہوگی یعنی کیا کام کریں گے کتنا وقت دیں گے اور کس قدر تنخواہ ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن گفتگو ناتمام رہ گئی۔ پھر ملیح آبادی آئے تو مولاناؒ مصروف تھے اور جب مولاناؒ نے یاد فرمایا تو ملیح آبادی موجود نہیں تھے۔ اس پر مولاناؒ نے یہ خط لکھا۔ اگر چہ اس مکتوب پر تاریخ درج

نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ پچھلے مکتوب کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔

اخ العزیز!

کل آپ سے باتیں ناتمام رہ گئیں، دن کو دوبارہ دریافت کیا، لیکن معلوم ہوا کہ آپ باہر ہیں۔ دوپہر کو آپ آئے لیکن شوکت صاحب کا جھگڑا چل رہا تھا، باتیں نہ ہوسکیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے خیالات لکھ کر مجھے دے دیں۔ اور میں ان کا جواب لکھ کر آپ کو دے دوں۔ آپ نے کل دریافت کیا تھا کہ میرے کاموں کی صورت کیا ہوگی؟ غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ صاف صاف معلوم اور طے ہو جائے کہ اب آپ کے تعلق اور مشغولیت کی نوعیت کیا ہے؟ اگر یہی بات ہے تو جو کچھ آپ کے پیشِ نظر ہو، آپ خواہ زبانی خواہ بہ ذریعہ تحریر بتلا دیں تاکہ حالتِ منتظرہ باقی نہ رہے۔

ابوالکلام

(۳۵) ﴿۲۵۷﴾

۱۹۲۶ء کے ابتدائی مہینوں میں مولانا ملیح آبادی بیمار ہوئے اور دو ماہ تک صاحبِ فراش رہے، جب طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی تو ملیح آباد تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر پھر بیمار پڑ گئے، کلکتہ واپسی کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ اس کی اطلاع مولاناؒ کو دی۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایا کہ "الگ کام کرنا چاہتا ہوں، مگر مدت تک ساتھ رہا ہے لوگ مجھے آپ کا آدمی سمجھنے لگے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آئندہ لوگوں کو میری وجہ سے آپ پر اعتراض کرنے کا موقع ملے لہٰذا اجازت دیجیے کہ اعلان کر دوں۔ آپ میرے خیالات اور کاموں کے ذمہ دار نہیں ہیں"۔ مولاناؒ کا جواب درج ذیل ہے:

[وسط مئی ۱۹۲۶ء]

عزیزی! السلام علیکم

سفر سے واپس آیا تو ڈاک میں آپ کا کارڈ اور خط ملا۔ افسوس میں کس خیال میں

تھا اور آپ کس طرف جا رہے ہیں۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آپ کا یہ ارادہ ہے۔ اگر ہوتی تو میں یہیں آپ سے گفتگو کرتا اور آپ کا اضطراب دور ہو جاتا۔ آپ نے اس تمام عرصے میں اچھی طرح اس بات کا اندازہ کر لیا ہے کہ میں نے کبھی کسی ذاتی انتفاع کے خیال سے نہ تو آپ کو باصرار روکنا چاہا، نہ کسی دوسری مشغولیت کے اختیار کرنے میں حارج ہوا۔ البتہ ہمیشہ اپنے دل کی محبت اور چاہت کی وجہ سے اس کا خواہش مند ضرور رہا کہ حتی الامکان آپ جدا نہ ہوں۔ آپ نے بھی ہمیشہ ایسے ہی جذبات ظاہر کیے اور اس کا نتیجہ ہے کہ کئی سال کا زمانہ یک جائی میں گزر گیا۔ اب بھی میرے دل کا وہی حال ہے، وہی خواہش ہے اور وہی جذبہ اور میں نہیں جانتا کہ اس گفتگو کے بعد جو آخری مرتبہ آپ کی آیندہ زندگی اور کاموں کے متعلق ہوئی، نئی بات کون سی پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے آپ علاحدگی کا قصد کر رہے ہیں؟ تاہم اگر آپ نے ارادہ مصمم کر ہی لیا ہے۔ تو میرے لیے بجز اس کے کیا رہ جاتا ہے کہ ہر حال میں آپ کی بہتری اور فلاح کا خواہش مند رہوں اور دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کے لیے بہتر مشغولیت کا سامان کر دے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس کی نسبت کوئی ایسا اعلان ہو جائے کہ آیندہ آپ کے کام میری طرف منسوب نہ کیے جائیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خواہ کسی پیرائے میں یہ بات لکھی جائے بے اعتمادی کے اثر سے خالی نہ ہوگی، اور جب درحقیقت کوئی ایسی صورت درپیش نہیں تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ کوئی اعلان کیا جائے؟

البتہ میں اپنے دل کی محبت سے مجبور ہو کر اتنا ضرور لکھوں گا کہ آپ اگر علاحدہ نہ ہوں تو یہ بہتر ہے۔ میں نے پچھلی گفتگو کے دوران تمام امور واضح کر دیے تھے۔ پس اگر اپنی آیندہ مالی ضروریات کا خیال ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس گفتگو کے بعد آپ کو کیوں پریشانی ہوئی؟ اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ دو تین ماہ کے اندر کام شروع نہ ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ آپ کو ایک مقررہ رقم وصول کرنے کا حق ہو۔ افسوس ہے کہ آپ بیمار

ہوگئے۔ حجاز جانے کا موقع بھی باقی نہ رہا!! اب آپ کو دیکھنا تھا کہ کوئی انتظام ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ ہوتا تو آپ یہی کر لیتے جو اس وقت کرنا چاہتے ہیں۔

آپ جس وقت جا رہے تھے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ آپ ایک ماہ وطن میں رہیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلی جولائی سے آپ کی نئی مشغولیت شروع ہو جائے۔ میں نے قطعی اراد کر لیا تھا کہ خواہ پریس جاری ہو یا نہ ہوا خبار وغیرہ نکل سکے یا نہیں، پہلی جولائی سے کم از کم پچھتّر روپیہ کا آپ کے لیے ضرور انتظام ہو جائے۔ پھر اس سفر میں بعض اشخاص نے ایک خاص اسلوب کے اخبار کے فوری اجرا پر زور دیا تو میں نے یہ رائے قایم کی کہ اسے آپ کی ایڈیٹری میں دے دوں اور اپنی صرف نگرانی رکھوں۔ نیز کوئی ایسی صورت تجویز کر لی جائے کہ اخبار کی وجہ سے آپ کو مالی ترقی کا [illegible]ی موقع مل جائے۔ چناں چہ کلکتہ آ کر ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں کہ آپ کے خط نے دوسری صورت پیدا کر دی۔

عزیزم! بلاشبہ کاموں کے تعطل سے جو نتایج پیدا ہوئے، ان کی آپ کو شکایت ہے اور یقیناً وہ شکایت حق بجانب ہے، لیکن اگر یہ تعطل آپ کے لیے نقصان دہ ہوا، تو یقیناً میرے لیے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوا۔ آپ ایک لمحے کے لیے بھی ان نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو مجھے برداشت کرنا پڑے اور کر رہا ہوں۔ بلاشبہ مجھے حق نہیں کہ اپنے نقصانات کے لیے جو میری ہی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ آپ کو اظہار ہمدردی پر مجبور کروں، لیکن کیا آپ کے لیے موزوں ہے کہ آپ صرف اپنے ہی کو دیکھیں اور میرے لیے آپ کے اندر کوئی جذبہ نہ ہو؟ آپ کو یقیناً ایسا نہ ہونا چاہیے۔ جس کی محبّت و اخلاص پر مجھے اب تک اعتماد رہا ہے اور علم اللہ جسے اپنا ایک عزیز و حبیب یقین کرتا ہوں۔ مان لیجیے، کسی وجہ سے آپ علاحدہ بھی ہونا چاہتے تھے، تو کم از کم اس موقع پر تو آپ ایسا نہ کرتے، جب ضرورت تھی کہ آپ ایسا عزیز و مخلص میرا ہاتھ بٹائے۔

یقین کیجیے! مجھ پر آپ کی اس وقت کی علاحدگی اس لیے زیادہ شاق گزر رہی ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بے کاری سے بے دل ہو کر جا رہے ہیں اور مجھے آپ کے لیے ان باتوں کے انجام دینے کا موقع نہیں ملا ہے جو انجام دینا چاہتا تھا۔ میں آپ کو اپنے ایک عزیز کی طرح مخاطب کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر علاحدہ ہی ہونا چاہتے ہو تو کم از کم اس وقت علاحدہ نہ ہو۔ جہاں اتنا وقت نکل گیا، وہاں چند مہینوں کا بسر کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ میں کم از کم اس طرح کام میں آپ کو لگا دیکھوں جس طرح چاہتا ہوں کہ آپ کریں۔ اور آپ کی استعداد صحیح طور پر ملک و قوم کی خدمت کے لیے کام آئے۔ اگر کسی وجہ سے آیندہ آپ کو یہی منظور ہوا، تو آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ زیادہ نہیں تو اس سال کے آخر تک یہ ارادہ موقوف رکھو۔

مجھے امید ہے کہ اتنے عرصے تک محبّت و اعتماد نے آپ کو مجھ سے قریب رکھا، آپ میرے اس حق سے انکار نہیں کریں گے کہ آپ سے بہ زور کہوں کہ علاحدہ نہ ہوں اور اس ارادے سے باز آ جائیں۔ جتنے دن طبیعت چاہے وطن میں رہو۔ پہلی جولائی تک میرے پاس چلے آؤ۔ پریس شروع ہو یا نہ ہو، پچھتّر (۷۵) روپے جولائی سے آپ کے مصارف کے لیے مہیّا ہوتے رہیں گے۔ کام کی تعداد یا وقت وغیرہ کا آپ نے ذکر کیا تھا اس بارے میں کوئی مطالبہ نہیں، جس طرح جی میں آئے کرو۔ سرِ دست لکھنے پڑھنے کے متعدد کام موجود ہیں۔

لیکن اگر وہ اخبار نکل گیا، جس کا اب قطعی ارادہ ہے اور مجبوراً اس کی ذمے داری مجھے قبول کر لینی پڑی، تو پھر ان شاء اللہ دوسری ہی صورت پیش آ جائے گی۔ اور پچھتّر (۷۵) کی جگہ زیادہ سے زیادہ جو رقم ہو سکے گی آپ کے لیے ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ جوں ہی طبیعت چست و چاق ہو جائے، آپ آ جائیں، اس اثنا میں جتنی رقم مطلوب ہو لکھ دیجیے میں اس کا فوراً انتظام کر دوں گا۔

افسوس بدر الدین کی طبیعت درست نہیں ہوئی بخار روز آتا ہے اور خنازیر کا مادہ

موجود ہے۔ بعض لوگوں سے ادھر مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنو میڈیکل کالج یا سپٹل میں اس کا کوئی اکسپرٹ موجود ہے یا خصوصیّت کے ساتھ علاج کا انتظام ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو مناسب ہے کہ لکھنو بھیج دیا جائے۔ میں نے تحقیق کے لیے خط لکھوایا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حکیم اجمل خان صاحب کا یونانی علاج کرایا جائے۔ وہ دہر دون جارہے ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ وہاں بھجوادوں۔ اگر لکھنو کی بات پکی نہ نکلی تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہرہ دون چلا جائے۔ دونوں صورتوں میں ضرورت ہوگی کہ کوئی شخص ساتھ ہو، کیا آپ کی صحت ایسی ہے کہ آپ اس میں مدد دے سکیں؟

اپنے والد صاحب اور بھائیوں کو دعائے خیر پہنچا دیں۔

ہاں! آپ نے شرف الدین [۲] کی بھیجی ہوئی کتابوں کی نسبت لکھا، میں جب آپ کی موجودگی میں دہلی سے آیا، تو میں نے دو کتابیں اوپر میز پر شرف الدین کی بھیجی ہوئی پائی تھیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ یہ آپ کی منگوائی ہوئی ہیں یا کس طرح آئی ہیں۔ شرف الدین کتابیں بھیجتے رہتے ہیں میں نے خیال کیا انھوں نے بھیج دیا ہوگا۔ اب آپ کے کارڈ سے معلوم ہُوا کہ آپ نے منگوائی تھیں۔ بہ ہرحال آپ کو اندیشہ کیوں ہے؟ دونوں کتابیں رجسٹرڈ بھیج رہا ہوں وصول کرلیجیے۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] موتمر کا اجلاس ۲؍جون ۱۹۲۶ء کو ہونے والا تھا۔ مولانا آزاد کا خود بھی جانے کا ارادہ تھا اور ملیح آبادی کو بھی بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بیمار ہوکر ملیح آباد چلے گئے اور مولانا خود بھی نہ جاسکے۔

[۲] شرف الدین تاجرِ کتب، بمبئی

(۳۶) ﴿۲۵۸﴾

۳۰ رمئی ۱۹۲۶ء

عزیزی! السلام علیکم

عرصہ ہوا ایک مفصّل خط لکھ چکا ہوں۔ اب تک جواب کا انتظار ہے۔ خدا کرے مانع بخیر ہو۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ بہ ذاتِ خود پریس کی تکمیل و اجرا کی سعی کروں۔ چناں چہ اب خدا خدا کرکے کام شروع ہوگیا ہے۔ امید ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر مشین روم اور مشینیں مکمّل ہو جائیں گی۔ ایک ہفتہ اور موٹر وغیرہ میں لگ جائے گا۔ اس کے بعد پریس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ پہلی جولائی سے اخبارات نکالے جا سکتے ہیں۔ کاتبوں وغیرہ کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنا تھا۔ جہاں تک جلد ممکن ہو پچھلے خط کا جواب دیں اور بتلائیں کب تک وہاں قیام کا قصد ہے؟

افسوس ہے غریب بدرالدین کی صحت کا اب تک وہی حال ہے۔ لکھنو سے اب تک جواب نہیں آیا۔ کل پھر بعض احباب کو خط لکھا ہے۔ اگر معلوم ہوا کہ کنگ جارجز ہاسپٹل میں خنازیر کا اکسپرٹ ڈاکٹر ہے، تو ارادہ ہے لکھنو بھیج دوں۔

اپنے والد اور بھائیوں کو سلام اور دعائے خیر پہنچا دیں۔

ابوالکلام

(۳۷) ﴿۲۵۹﴾

مولانا ملیح آبادی نے رانچی جانے کا خیال ظاہر کیا تھا، جہاں مولانا آزادؒ کے سالے بدرالدین بیماری کی وجہ سے تبدیلی آب و ہوا کے لیے گئے ہوئے تھے، چوں کہ مولانا ملیح آبادی کو بدرالدین سے دلی لگاؤ تھا، اس لیے جانے کے لیے بے چین تھے، دوسری طرف ''الہلال'' کے اجرا کو تھوڑے دن ہوئے تھے، پہلا پرچہ ۱۰ رجون کو شایع ہوا تھا۔ کام کی ابتدا سعی و محنت کی طالب تھی، مولانا آزادؒ ابھی ان کا کہیں جانا پسند نہ کرتے تھے۔ یہی بات مولاناؒ کے پورے رقعے سے

ظاہر ہوتی ہے۔

(۲ر جولائی ۱۹۲۷ء)

میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ تاخیر کے بے شمار اسباب جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اب انھیں دور کرنا چاہیے یا قایم رکھنا چاہیے؟ اگر دور کرنا چاہیے تو یقیناً ضروری ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ وقت پر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ نظم قایم ہو جائے۔

پھر کیا کوشش عمل میں آ سکتی ہے، اگر عین اس زمانے میں جب کہ اخبار کا دوسرا تیسرا نمبر نکل رہا ہو اور کوشش کی جا رہی ہو کہ راہ پر آ جائے۔ کام کرنے والے سفر کی حالت میں ہوں؟

باقی رہا آپ کا مکان جانا یا رانچی جانا، تو اس میں دو باتیں سمجھ لینی چاہییں۔

کام کی ابتدا سعی و محنت چاہتی ہے۔ جب کام راہ پر آ جاتا ہے تو پھر اس کی حالت بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ میں نے جو لکھا تھا وہ اس تعجب کا نتیجہ تھا کہ ابھی تیسرا نمبر بھی نہیں نکلا ہے۔ اور ایک نمبر کو بھی وقت پر نکالنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے اور آپ کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کام کے انضباط کے بعد نقل و حرکت، تو نہ اس میں کام مانع ہو گا اور نہ میں کسی حال میں مانع ہو سکتا ہوں۔ آپ ابھی چند دن ہوئے رانچی تشریف لے گئے۔ میں نے ایک لفظ بھی اعتراض کا کہا؟ آخر وہاں جا بھی رہے ہیں تو بدرالدین کے خیال سے۔

البتہ جب کبھی ایک شخص کسی دوسری جگہ رہ کر مشغولیت اختیار کرے گا تو لازمی طور پر مکان سے دوری ہو گی اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے اندر ایاب و ذہاب نہ کر سکے گا۔ لوگوں نے اس بارے میں کوئی نہ کوئی طریق عمل اختیار کر لیا ہے اور وہ ناگزیر ہے۔

ابوالکلام

(۳۸) ﴿۲۶۰﴾

درج ذیل رقعے کا مضمون پچھلے رقعے میں گزر چکا ہے اور اس پر نوٹ لکھا جا چکا ہے۔ آخری دو پیراگرافوں کا تعلق مولانا ملیح آبادی کی اس شکایت سے ہے جو انھوں نے رہایش کے بارے میں کی تھی فرماتے ہیں:

''مولانا لکھ تو دیتے تھے کہ قیام کا دوسری جگہ بندوبست ہو جائے، مگر چاے پر ایسی باتیں کرتے تھے کہ میں پھر رک جاتا تھا۔ کبھی کہتے، انتظام کی صورت میں مصارف زیادہ ہوں گے اور بجٹ میں ابھی گنجایش نہیں۔ کبھی فرماتے علاحدگی کا تصور بھی بے وفائی ہے اور آپ کو بے وفا نہیں ہونا چاہیے۔

خود میرے دل کی بھی یہی حالت تھی کہ ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا:

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم ان سے و لے
مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

(۳ر جولائی ۱۹۲۷ء)

میں نے کل آپ کے خط کی پشت پر لکھ دیا تھا۔ غالباً یہیں رہ گیا پھر لکھتا ہوں۔ اس معاملے میں میرے لیے مشکل ہے کہ میں کچھ کر سکوں۔ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی کے نقصانات کے بعد اب کہیں پرچہ نکل سکا ہے اس کا یہ تیسرا نمبر ہے، جو نکلے گا۔ کام کی ترتیب کا یہ حال ہے کہ اب تک ایک نمبر بھی وقت پر نہیں نکل سکا جو نمبر اس وقت زیر ترتیب ہے، اسے جمعے کے دن نکلنا تھا، اب وہ دوسرے جمعے تک بہ مشکل نکل سکے گا۔ صرف یہ صورت اب سمجھ میں آتی ہے کہ اسے ڈبل کرنے کی ذلت گوارا کر لی جائے اور کوشش کی جائے کہ آیندہ نمبر وقت پر نکلے۔ اس صورت کی تعمیل صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ جوں ہی کاتب خالی ہو اسے فوراً دوسرے پرچے کے مضامین مل جائیں۔ ایک مرتبہ اگر کسی نہ کسی طرح سات دن کے اندر معاملہ آ جائے تو پھر آیندہ چکر قایم ہو جائے گا۔ آج اتوار ہے اور ڈاک آئے گی۔ اس سے مضامین اخذ کر کے فوراً تیار کر لیے جائیں۔ نیز اور جو چیزیں آیندہ نمبر کے لیے سوچی تھیں تیار

ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ آیندہ نمبر سے وقت کی ترتیب قایم ہو جاتی۔

اس کے علاوہ یہ پرچہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کم از کم دو فارموں کی کاپیاں اور پروف باقی ہیں۔ کاتب کا ہاتھ اگر کل شام کو خالی ہو جائے، تو پرسوں سے اس کو مضامین دینے چاہییں۔

پس ذمے دار کام کے آپ ہیں۔ کم از کم میں اب تک ایسا ہی خیال کرتا رہا ہوں۔ اگر آپ اس صورتِ حال پر مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس حالت میں آپ کو لکھنو یا ملیح آباد یا رانچی یا کہیں بھی ایک دن کے لیے یا دو کے لیے یا پانچ کے لیے چلا جانا چاہیے اور آپ اس نقل و حرکت کے ساتھ اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے تو مجھے اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں، آپ شوق سے جا سکتے ہیں۔ میری طرف سے کوئی روک نہیں۔

اور یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ ''یہاں مجھے تکلیف ہے۔ معمولی معمولی باتوں کی تکلیف ہے، بار بار کہتے کہتے رک جاتا ہوں''۔ تو یہ میرے لیے نہایت ہی عجیب بات ہے۔ اس وقت تک میرے علم میں نہیں آئی۔ میرے علم میں آپ کی جو تکلیفیں آئیں، میں انھیں دور کرنا اپنا فرض سمجھوں گا۔ بہ شرطے کہ میرے علم میں آئیں، لیکن اگر آپ مجھے نہ کہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

باقی رہی یہ بات کہ آپ کو آرام کس حالت میں ہے؟ تو جس حالت میں ہو، اس کے سر و سامان کا انتظام کیجیے۔ جنوری میں آپ نے کہا تھا کہ آپ یہاں نہیں رہیں گے۔ پھر جب میں نے کہا کہ اچھا اس کا انتظام کیا جائے تو خود آپ نے کہا کہ ضرورت نہیں۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کا انتظام کیا جائے۔ یقیناً زندگی کے لیے پہلی چیز، قیام کا قابل اطمینان انتظام ہے۔ آپ کسی وقت بہ تفصیل مجھ سے گفتگو کر لیں تا کہ جو صورت پسندیدہ ہو اختیار کی جائے۔

ابوالکلام

(۳۹) ﴿۲۶۱﴾

الہلال (۱۹۲۷ء) جاری ہو گیا تو مولانا آزادؒ نے آمد و خرچ کے حسابات کی جانب توجہ دی۔ اخراجات کا رجسٹر بنوایا گیا اور اس میں خانگی اخراجات کے لیے رقم سے لے کر عملۂ الہلال کی تنخواہوں اور مولانا آزادؒ کی بہنوں کو بھیجی جانے والی رقوم تک کا اندراج کیا گیا۔ اس میں مولانا ملیح آبادی کا نام بھی تھا۔ جب ان کے پاس تنخواہوں کی وصول یابی کے دستخط کے لیے رجسٹر گیا تو ان کے دل کو سخت دھکا لگا، دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا آزادؒ کو لکھا ''میں تو اس وہم میں مبتلا تھا کہ آپ کے عزیزوں کی طرح رہتا ہوں۔ اس لیے مالی معاملات کی کبھی پروا نہ ہوئی، لیکن آج رجسٹر نے بتایا کہ میں بھی ایک ''نوکر'' ہوں۔ اب مجھے طے کرنا ہے کہ نوکری کروں یا نہ کروں؟ اور کروں تو کتنی تنخواہ طلب کروں؟ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ''یہاں میری گزر نہیں ہو سکتی'' علاحدگی کے لیے ۱۵ دن کا نوٹس بھی دے دیا۔ مولاناؒ نے جواب میں مفصّل خط تحریر فرمایا لیکن جب شام کی چائے پر دونوں جمع ہوئے تو سارے گلے شکوے دور ہوئے۔

جب گلے سے مل گئے سارے گِلے جاتے رہے!

[۱۲ر جولائی ۱۹۲۷ء]

عزیزی!

اگر آپ کا مقصود یہ ہے کہ آپ رہنا نہیں چاہتے تو آپ کو وہی کرنا چاہیے، جس پر آپ کی طبیعت مطمئن ہو اور میں پسند نہیں کروں گا کہ آپ ایک دن بھی ناگواری خاطر کے ساتھ رہیں، لیکن یہ طریقہ تو کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے کہ ایک غلط اور بے اصل وجہ پیدا کی جائے۔ آپ کی یہ رائے کس درجے تمسخر انگیز ہے جب کہ:

(۱) کسی حسابی فرد میں کسی متعیّن دن ضروری رقوم کے اندراج کو ذلت و عزت سے کوئی تعلّق ہی نہیں۔ اگر ایک جگہ ایک بھنگی دس روپے لیتا ہوں اور میں ایک ہزار اپنی ضروریات کے لیے لیتا ہوں تو یقیناً ایک کاغذ پر دونوں کا اندراج ہو سکتا ہے۔ اور آپ

کی عقل کے سوا دنیا کی کوئی عقل اسے ''کمپوزیٹروں کی صف'' سے تعبیر نہیں کرے گی۔
گذشتہ ماہ سے منشی ابن الحسن [۱] وہ دونوں رقمیں اسی میں درج کر کے بھجواتے ہیں جو میں اپنی بہنوں کو بھیجتا ہوں۔ کیا اس سے وہ کمپوزیٹروں کی صف میں آ گئیں؟ مکان کے کرائے کی رقم کا اس میں اندراج ہوتا ہے۔ کیا اس سے مکان والا ''کمپوزیٹروں کی صف'' میں آ گیا؟

(۲) پھر اس پر طرہ یہ کہ آپ نے اپنے جوشِ جستجوے حیل میں پوری بات بھی نہیں سنی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے وقت پر یہ معاملات یاد نہیں رہتے۔ پچھلی مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ کو روپیہ ایک دو دن کی تاخیر سے ملا اور آپ نے کہا کہ اس کی وجہ سے آپ کو دقت پیش آئی۔ اس مرتبہ بھی دیکھیے! آج ۱۲ ہے اور اگر آپ آج مجھ سے نہ کہتے تو مجھے بالکل خیال نہ تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے سنیچر کے دن منشی ابن الحسن صاحب سے [جب کہ وہ پیشگی رقوم محرم کے خیال سے لوگوں کو دلا رہے تھے] احتیاطاً یہ کہا کہ پرسوں جب تنخواہوں کا شیٹ آپ بنائیں تو اس میں ایک خانہ میرے گھر کے مصارف کا بھی رکھ دیں اور اس میں ڈھائی سو روپے درج کر دیں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ اس سے دو فایدے ہوں گے۔ ایک تو رجسٹر مصارف میں خود بخود پورے مصارف کا اندراج ہو جائے گا۔ دوسرے اسی وقت یہ رقوم دے دی جائیں گی۔ ان میں سو روپیہ آپ کو دینا تھا، ڈیڑھ سو باہر بھیجنے تھے۔ میں نے یہ کارروائی اس خیال سے کی تھی۔ کہ بہتر ہوگی۔ چنانچہ یہی بات آپ سے کہی، جب آپ نے روپے کا ذکر کیا لیکن آپ نے اس کا یہ مطلب قرار دیا۔ یہ آپ کی طبیعت اور دل کی خوبی ہے اور میری بدقسمتی۔

بہرحال اب آپ اتنی تکلیف اور کیجیے کہ اس کے ساتھ جو کاغذ بھیجتا ہوں وہ منشی ابن الحسن صاحب کو بھیج کر ان سے کاغذ منگوا لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ اس ''صف'' میں آپ کا نام ہے یا نہیں؟۔

آپ نے میرے دلی جذبات کے ساتھ، جو آپ کے لیے رکھتا ہوں بہت ہی سخت ناانصافی کی ہے۔ بہ ہر حال اللہ تعالیٰ آپ کے لیے وہی کرے جس میں آپ کی بہتری ہو۔

میرا آپ کا تعلّق کاروباری نہ تھا جس کے لیے پندرہ دن یا ایک ماہ کے نوٹس کا سوال ہوا۔ دل کی محبّت کا تھا، اس کی تبدیلی کی صورت میں اپنے اوپر جبر کر کے کام کرنا کسی طرح بھی بہتر نہ ہوگا۔

میں آپ کے دل کی یہ حالت [جس کا اس وقت اچانک انکشاف ہوا] پوری طرح محسوس نہیں کر سکا تھا۔ لیکن یہ محسوس کر چکا تھا کہ آپ جم کر کسی ایک شغل میں نہیں رہ سکیں گے اور کام کے متعلق جو ارادے ظاہر کیے جا رہے ہیں، وہ سب چند دنوں کے اشتغال کے بعد رہ جائیں گے۔ بایں ہمہ آپ کی اس گفتگو سے جو آپ نے دسمبر میں کی تھی میں نے اثر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ اس میں پیغام کا حصّہ ہو چکا، الہلال کا باقی تھا۔ اب وہ بھی ہو چکا۔

خیر ان باتوں کا تذکرہ بے سود ہے۔ میں ہر حال میں آپ کی بہتری چاہوں گا اور جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] منشی ابن الحسن دفتر الہلال میں اکاؤنٹنٹ تھے۔

(۴۰) ﴿۲۶۲﴾

بدرالدین کو دیکھنے، رانچی جانے کے لیے مولانا ملیح آبادی نے پھر پرچہ لکھا۔ حال آں کہ چند دنوں میں حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگئی تھی؛ مولانا آزادؔ کا خیال تھا کہ پچھلے خط کے بعد انھوں نے [ملیح آبادی نے] رانچی جانے کا

ارادہ فسخ کر دیا ہوگا۔لیکن جب پھر پرچہ پہنچا اور سفر کی اجازت چاہی تو مولانا ؒ نے درج ذیل پرچہ لکھا، جس کے ایک ایک لفظ سے ناگواری ظاہر ہو رہی ہے۔

۔۔۔چوں کہ آپ کی طبیعت جانے پر مایل ہے، اس لیے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ طبیعت پر جبر کر کے رُکیں۔ بہتر ہے آپ آج رات چلے جائیں اور رانچی ہو آئیں۔کوئی بات میرے کہنے سے بہ جبر نہ کیجیے!

ابوالکلام

(۴۱) ﴿۲۶۳﴾

مولانا ملیح آبادی لکھنو کے زمانۂ قیام ۱۹۲۰ء میں ایک رسالہ ایڈٹ کر چکے تھے، پھر ۱۹۲۱ء میں پیغام کو ایڈٹ کیا اس کے بعد ۲۴۔۱۹۲۳ء میں الجامعہ [عربی] کو ایڈٹ کیا۔ یہ دونوں پرچے مولانا آزادؒ کی نگرانی میں تھے۔لیکن مولانا آزادؒ کے سامنے جو صحافتی معیار تھا، اس کے لیے مولانا ملیح آبادی اب بھی پوری طرح تیار نہ ہو سکے تھے، اس لیے ان کو نہ صرف پرچے کے نظم وترتیب کے بارے میں ہدایات دیتے رہتے تھے بلکہ کتابت، کمپوزنگ اور الفاظ کے املا وترجمے کے بارے میں بھی ہدایات دیتے رہتے تھے۔ جیسے کہ مولاناؒ کے اس رقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔

[۱۹؍اگست ۱۹۲۷ء یا اس سے ایک دو روز بعد]۔

عزیزی!

ترجمہ وکتابت میں چند اُمور کا لحاظ رکھنا چاہیے:

۱۔ بلا ضرورت انگریزی اسما و مصطلحات استعمال نہ کیجیے۔ مثلاً رپورٹ، کانفرنس، پارلیمنٹ، ایڈیٹر وغیرہ، ان کے لیے روداد، بیان، موتمر، مجلس، یا مجلس حکومت وغیرہ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ مسودہ لکھتے وقت رسم الخط کا خیال رکھیے تاکہ کاتب اور کمپوزیٹروں پر بھی زور چل سکے۔ پہلے ''الہلال'' کا رسم الخط مقرر تھا، اب نہیں ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں، مثلاً حتی الامکان ہر مرکب لفظ مستقلاً لکھنا چاہیے یعنی ''سمجھکر'' کی جگہ ''سمجھ کر''، ''پہنچکر'' کی جگہ ''پہنچ کر'' وغیرہ ذالک۔ ہائے مخلوط وغیر مخلوط میں فرق کیجیے۔ ''کھانا''، ''انھیں'' وغیرہ کو دو چشمی [یعنی ہائے مخلوط] سے مگر ''نہیں''، ''کہیں'' کو دو چشمی ''ھا'' سے نہ لکھا جائے۔

علامات قرأت کا بھی نظر ثانی میں خیال رکھیے۔ اب فل اسٹاپ کی جگہ ''۔'' کی علامت اختیار کرلی گئی ہے۔ پس وقف کامل کی جگہ نقطہ نہیں ہونا چاہیے۔ ڈیش ''-'' [چھوٹا] دینا چاہیے۔

اگر تین الفاظ مسلسل آجائیں تو دو میں کاما اور تیسرے میں عطف ہو جیسے ''ہندستان، مصر اور سوڈان''، تو اس صورت میں آخری عطف کے ساتھ بھی کاما ہونا چاہیے۔[!]

اس کے علاوہ اسلوبِ تحریر و انسجام الفاظ کا معاملہ ہے، جس کے لیے آپ کی تحریر میں کوئی ایک سطح قایم نہیں ہوئی ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں گے تو یہ بات دور ہو جائے گی۔ مثلاً ''ہوا'' اور ''ہوگیا''، ''کہا'' اور ''کہہ دیا'' کا فرق تو واضح ہے، لیکن بول چال اور کتابت میں کس جگہ کیا ہونا چاہیے۔ یہ ذوق پر موقوف ہے اور تھوڑی سی توجہ سے ایک قاعدے کی طرح قلم جاری ہوسکتا ہے۔

ہاں! مصری، یورپین الفاظ کی تعریب کرتے ہوئے عموماً ''واؤ'' کی آواز ''ف'' سے نکالتے ہیں، مثلاً ''ہارورڈ'' کی جگہ ''ہارفرڈ''، ''پنسلونیا'' کی جگہ ''پنسلفانیا'' اس لیے نقل اسما میں احتیاط کے ساتھ اصلیت معلوم کرنی چاہیے۔

آیندہ نمبر کی ترتیب حسبِ ذیل ہوگی:

۱۔ دوسرے صفحے سے ''مقالات☆'' شروع ہوگا۔ لیلی مجنون کا بقیہ حصّہ نمبر۲ کے عنوان سے درج ہوگا۔ یہ غالبًا پانچ کالم سے زیادہ نہ ہو۔ ممکن ہے اس پر پہلا فارم ختم ہو جائے۔

۲۔ ''آثارِ عتیقہ☆'' میں منارۂ اسکندریہ کمپوز شدہ ہے، اس میں صرف عرب مورخین کی تصریحات بڑھانی ہیں۔ لیکن اگر اس کے دونوں فوٹو بن کر آ گئے تو پھر اس نمبر میں اتنا ہی دینا کافی ہوگا۔

۳۔ اس کے بعد ایک نئی سرخی ''مشرق کی تاریخ جدید کی تاریخی شخصیتیں☆'' شروع کی جائے۔ اس میں جمال الدین کا تذکرہ ہوگا۔ لیکن اس مرتبہ بہت ہی مختصر تبصرہ کرنا ہے۔ کیوں کہ سات آٹھ مختلف قسم کے فوٹو تیار ہیں۔ اس کے دو مصور صفحے مرتب ہوں گے۔ مضمون میں لکھ دوں گا۔

۴۔ اس کے بعد ''باب التفسیر☆'' ہوگا۔

۵۔ اس کے بعد ''برید فرنگ'' جس کے مضامین کچھ دیے ہیں، کچھ بھیجتا ہوں۔

۶۔ اس کے بعد ''بصائر و حکم''، ''برید مشرق☆'' ضروری ہیں، اور اس کے علاوہ تاریخی و ادبی مضامین درج کیے جا سکتے ہیں، جو زبانی دریافت کر لیجیے گا۔

میں چاہتا ہوں کہ اب بہ تدریج آپ پرچہ خود مرتب کرنے لگیں، یعنی میرا تعلّق آپ سے ہو، آپ کا پرچے سے۔ ترتیب، تصحیح، تصاویر کا انتخاب اور ان کی نشست وغیرہ میں ٹھیک کر کے آپ کو بتلاتا رہوں۔

ابوالکلام

نوٹ: جن جملوں پر یہ ☆ نشان بنا ہے وہ الہلال کے خاص عنوانات یا کالم ہیں، جن کے تحت تحریرات اپنی نوعیت کے لحاظ سے درج ہوتی تھیں۔

حاشیہ:

(۱) اس جملے پر مولانا ملیح آبادی نے حاشیے میں لکھا ہے: "عطف سے پہلے کاما غیر ضروری ہے"۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ عطف کے ساتھ کاما کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ کاما عطف ہی کا تو قایم مقام ہے۔

(۴۲) ﴿۲۶۴﴾

یادداشت (۱)

.....اگست ۱۹۲۷ء

۱۔ علم الاجتماع کا جس قدر ترجمہ ہو جائے، کمپوزیٹروں کو دے دیا جائے اور صفحات بنادیے جائیں۔

۲۔ منشی عباس علی (۲) سے کہا جائے کہ اس پرچے کے اختتام کے بعد (جو کل پرسوں نکل رہا ہے) پہلے "جامع الشواہد" کی بقیہ کاپیاں از سر نو لکھیں اور تصحیح کے بعد چھپوائی جائیں۔

۳۔ اس کے بعد الہلال کے صفحات، اشتہارات دو دو تین تین مرتبہ کے لیے لکھ لیں۔

۴۔ پھر الہلال کے لیے "سیر فی الارض"، "تقاریر زغلول (بہ عنوان ادبیات) اور "عہد عباسیہ" لکھیں۔

۵۔ مشین ٹائپ پر دو تین ہفتے کے لیے ٹائٹل پیج کے دونوں رُخ بہ تبدیلی نمبر چھپوالیں۔

۶۔ آپ (مولوی عبدالرزاق صاحب) دو نمبروں کے لیے مواد تیار کریں، مذاکرۂ علمیہ، مکمّل ترجمہ علم الاجتماع، ترجمۂ تقریر مصطفیٰ فاضل، مصر، ٹرکی وغیرہ کی چٹھیاں، ادبیات میں افسانہ یا کوئی اور چیز، احادیث کا ایک مختصر مجموعہ، جس میں صرف اخلاق، حکمت و موعظت کی احادیث ہوں، مثلاً اتفاق اجتماعی، اطاعتِ امیر، مکارمِ اخلاق، عفو و درگزر، تسامح، تحمّل مصائب، مصابرہ، عزم، ثبات ایمان و عقاید، امر بالمعروف وغیرہ۔ یہ اس طرح لکھی جائیں کہ پہلے اصل احادیث مع تخریج، پھر ترجمہ، پھر پانچ

پانچ سطروں کی جگہ سادی۔[۳]

ابوالکلام

حواشی:

(۱) اس یادداشت کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکا لیکن چوں کہ سعد پاشا زغلول اور تاریخ عہد عباسیہ کا ایک صفحہ ۲ر ستمبر کے پرچہ میں شایع ہوا تھا، اس لیے میرا خیال ہے کہ ۱۹ر اگست کے بعد یہ یادداشت لکھی گئی ہوگی۔

(۲) منشی عباسی علی، الہلال کے کاتب تھے۔

(۳) ''سادی جگہ'' حدیث کے مطالب کی تشریح کے لیے جو مولانا خود لکھتے تھے۔

(۴۳) ﴿۲۶۵﴾

نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء)

۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو الہلال [دورِ ثانی] کا آخری نمبر شایع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا ملیح آبادی بھی مولانا ؒ سے جدا ہو گئے، اور اپنے ایک عرب دوست سید محمد عمری کی کوٹھی پر رہنے لگے۔ اس زمانے میں ان کا مشغلہ مصر کے اخبارات المقطم، الاہرام اور البلاغ کی نامہ نگاری تھا، نہرو رپورٹ شایع ہوئی تو بعض مسلم اکابر نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن مولانا آزاد کا خیال تھا کہ اس کو ایک قلم منسوخ کر دینا مناسب نہیں بعض ترمیمات واصلاحات کے بعد اسے قبول کر لینا چاہیے۔ اسی سلسلے میں حضرت مولانا ؒ نے ملیح آبادی کو بلایا اور نہرو رپورٹ کے متعلق گفتگو فرمائی اور جب انھیں بھی ہم خیال پایا تو رپورٹ کی حمایت میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کرنے کی ہدایت فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ یہ تحریک چوں کہ کانگریس کے موقتہ مقاصد کے لیے ہوگی، اس لیے کانگریس کی طرف سے اس کی اجرت بھی دی جائے گی۔ مولانا ملیح آبادی نے اس معاملت کو پسند نہیں کیا تو مولانا ؒ نے ان کو بتایا کہ ہر سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں اور انجمنوں میں ایک مخصوص فنڈ ہوتا ہے جس سے جماعت اور اس کے مقاصد کی نشر واشاعت ہوتی ہے۔ اس کے لیے جماعت ایک شعبہ قایم کرتی ہے، اس کا

اسٹاف مقرر کیا جاتا ہے اور اس پر اخراجات ہوتے ہیں۔ کسی جماعت یا انجمن کے شعبۂ نشر و اشاعت سے منسلک ہونا اور تنخواہ پانا نہ اخلاقی طور پر معیوب ہے، نہ قانونی طور پر جرم ہے۔ پس اگر کوئی شخص اس وابستگی اور تعلّق کے بغیر کسی جماعت کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے کام کرتا ہے، اس میں اپنا وقت صرف کرتا ہے، محنت کرتا ہے تو اس کا کوئی معاوضہ بہ صورت رقم لینا کیوں کر ناپسندیدہ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کانگریس کے ان مقاصد سے متفق ہیں تو آپ کو اس کا معاوضہ قبول کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ بالآخر مولانا ملیح آبادی قایل ہوگئے اور ایک سلسلۂ مضامین شروع کر دیا۔ مولانا نے اسی سلسلے کے کسی مضمون کے اندازِ بیان کی جانب اشارہ کیا ہے اور آیندہ محتاط اندازِ بیان اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کے بعد والے مکتوب میں بھی شخصاً کسی کی برائی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مولاناؒ کے یہ دونوں مکتوب تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے نہرو رپورٹ کے بارے میں مولاناؒ کی صحیح رائے معلوم ہوتی ہے اور سیاسی معاملات میں اختلاف کے حدود بھی متعین ہوجاتے ہیں۔ اس مکتوب کی ابتدائی سطروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ نہرو رپورٹ کی حمایت میں مولاناؒ نے خود بھی بعض مضامین لکھے تھے اور مولانا ملیح آبادی کے نام سے شایع کرائے تھے۔ خیال رہے کہ نہرو سے مراد پنڈت موتی لال نہرو ہیں۔ تاکہ ان کے ان کے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو! (ا۔س۔ش)

دہلی

۱۸/اکتوبر ۱۹۲۸ء

عزیزی!

ایک مضمون اس غرض سے بھیج چکا ہوں کہ آپ اپنے دستخط سے اخبارات میں بھیج دیں۔ امید ہے کہ آپ بھیج چکے ہوں گے۔ آج میں نے آپ کا مضمون زمیندار میں دیکھا، مضمون بہت اچھا ہے اور ان مسائل پر بحث کرنے کا یہ عنوان و اسلوب بالکل صحیح اور مؤثر ہے۔ اسی عنوان و اسلوب سے جاری رکھیے۔

البتہ ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے نہرو رپورٹ کی حمایت کرتے ہوئے کوئی بات ایسی نہیں لکھنی چاہیے کہ لوگوں کو مبالغے کا گمان ہو، رپورٹ اور کانفرنس نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے جو اصول و مبادیات قرار دیے ہیں، صحیح ہیں۔ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی، بلاشبہ اکثریت چاہے تو اس سے بھی زیادہ امتیازات دے سکتی ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ کوئی جماعت امتیازات بخشنے کو تیار نہیں ہوسکتی اور ہندستان جیسے ملک میں معیار یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک جماعت نے دوسری جماعت کو کوئی خاص امتیاز دیا یا نہیں، بلکہ یہی ہوسکتا ہے کہ کسی جماعت کی آزادانہ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں رکھی گئی ہیں یا نہیں؟

بس یہ جو آپ نے ایک دو جگہ لکھا ہے کہ ''نہرو رپورٹ'' میں مسلمانوں کو جس قدر دیا گیا ہے، اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے'' یا ''کیا مخالفانہ شور و شغب اس لیے ہے کہ ہندوؤں کو دبا کر کچھ اور لے لیا جائے۔ اس میں نہرو رپورٹ کے اس پہلو کا جس درجہ اعتراف پایا جاتا ہے اسے کسی قدر معتدل کر دینا چاہیے اور ہمیشہ یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ کافی اور تسلّی بخش ہے نہ یہ کہ بہت زیادہ ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح کر دیجیے کہ نہرو رپورٹ میں ابھی جزئی ترمیم و تغیّر کی پوری گنجایش باقی ہے اور مسایل پر مزید غور و فکر کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے، چناں چہ خود ابوالکلام نے اپنے مضامین میں متعدد امور سے اختلاف کیا ہے، اور اعلان کیا ہے کہ کمیٹی کو مزید غور و فکر سے انکار نہیں [۱]۔ نیز پروونشل مسلم لیگ نے بھی اپنی تجویز میں چار باتوں کو مزید غور و فکر کا محتاج ظاہر کیا ہے۔ پس اگر کسی شخص یا جماعت کو اختلاف ہے تو یہ اختلاف کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ لیکن یہ نہیں کرنا چاہیے کہ جزئی اختلاف ہے۔ تو یہ اختلاف کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ لیکن یہ نہیں کرنا چاہیے کہ جزئی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے قتلِ عام کا شور مچا دیا جائے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان مسایل کی نسبت صحیح راے قایم نہیں کر سکیں گے اور غلطیوں کا شکار

ہو جائیں گے۔

آپ نے اس دن ایک باورچی کا ذکر کیا تھا کہ وہ آپ کے یہاں آیا تھا مگر آپ چاہتے ہیں کہیں رکھوا دیں۔ اگر وہ چپاتی اور معمولی سالن پکا لیتا ہو، تو کیوں نہ اسے یہاں بھیج دیجیے۔ جو تنخواہ اس سے طے کر لیجیے گا وہ دے دی جائے گی۔

ابوالکلام

حاشیہ:

[۱] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہرو رپورٹ کے بارے میں مولانا آزاد نے اپنے نام سے بھی کوئی مضامین لکھے تھے اور کوئی مضمون مولانا ملیح آبادی کو لکھ کر دیے تھے کہ وہ انھیں اپنے نام سے چھپوا لیں۔

(۴۴) ﴿۲۶۶﴾

دہلی

۴ر نومبر ۱۹۲۸ء

عزیزی!

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مطلوبہ رقم آپ کو نہیں بھیجی گئی ہے۔ جن لوگوں کو بھیجنا تھا وہ سفر میں ہیں اور یہاں سے واپس جا کر بھیجیں گے۔ چوں کہ آپ نے کہا تھا کہ ۱۰ر نومبر کو لکھنو جانے کا قصد ہے، اس لیے میں نے خیال کیا آپ کو روپے کی ضرورت ہوگی۔ میں آپ کو پچھتّر روپے کا چک اپنے پاس سے بھیج دیتا ہوں۔ وہاں کی رقم خود وصول کر لوں گا۔ یہ چک امپریل بنک کے نام ہے۔ آپ کسی ضرورت سے کلکتہ جائیں تو اسے بھنوا لیں یا معین کو دے دیں وہ روپیہ لا دے گا[۱]۔

یہاں بعض اشخاص نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ نے کسی مضمون میں شوکت علی صاحب کو بہت برا بھلا لکھا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی کوئی تحریر اس قسم کی نہ نکلی ہوگی۔ بہ ہر حال اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ شخصاً کسی شخص کی برائی نہ کی جائے۔ اور جو کچھ لکھا جائے اعتدال سے باہر نہ ہو[۲]۔

سلسلہ بلا انقطاع جاری رکھیے۔[۳]

میں نے آپ کے آیندہ کاموں کی نسبت ایک اور تجویز سوچی ہے۔ غالباً نومبر کے آخر تک آپ لکھنو سے واپس آ جائیں گے۔ اس وقت زبانی کہوں گا۔ اگر آپ ۱۱ر نومبر تک لکھنو پہنچ جائیں تو ۱۲ر کو لکھنو میں بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے کی وجہ سے وہاں جانا پڑے گا۔ غالباً میں ۱۲ر کو پہنچوں اور ۱۳ر تک ٹھہروں۔ اگر آپ ایک دن کے لیے ملیح آباد سے لکھنو آ جائیں تو بہت بہتر ہو۔

ابوالکلام

حواشی:

[۱] معین الدین مرحوم، مولانا آزاد کا بھانجا[سالی کا لڑکا]، مولانا ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ بڑا ہونہار اور صالح نوجوان تھا۔

[۲] مولانا شوکت علی نہرو رپورٹ کے مخالف تھے۔ مولانا ملیح آبادی نے اپنے مضمون میں مولانا شوکت علی کے بارے میں کوئی بات لکھ دی تھی۔ مولانا آزاد کا یہ مشورہ بہت صائب تھا کہ کسی شخص کی عیب چینی نہ کی جائے اور کوئی بات اعتدال سے باہر نہ ہو۔

[۳] نہرو رپورٹ کی تائید میں یہ سلسلۂ مضمون جاری رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ وفنون لطیفہ اور مولانا ابوالکلام آزاد

(۴۵) ﴿۲۶۷﴾

صحیفۂ کائنات کے دو گمشدہ ورق

فلسفے سے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی علمی و ادبی زندگی کے آغاز ہی میں دل چسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اور زندگی بھر فلسفے کے مطالعے کا انھیں شوق و شغل رہا۔ انھوں نے فلسفے کا مطالعہ ایک فن کے مطالعے کے طور کیا تھا، تاریخ کی روشنی میں فلسفے کے بہ تدریج ارتقا کا مطالعہ کیا تھا اور فلسفے کے مختلف مکاتبِ فکر کی خصوصیات نیز مشرق و مغرب کے ذوق اور اندازِ فکر کے فرق کی بنیاد پر ان کے خصائص و امتیازات کی جستجو کی تھی اور ہر طریق مطالعہ کی راہ سے حقیقتِ فلسفہ تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ غرضے کہ فلسفے کے فن، تاریخ، خصوصیات وغیرہ باہر پہلو پر ان کی گہری نظر پیدا ہوگئی تھی۔ غبارِ خاطر کے کئی خطوں، میں الہلال کے کئی مقالات میں اور آزادی کے بعد حکومت کی سرپرستی میں فلسفے کی تاریخ لکھوانے اور پھر اس پر مقدمہ لکھنے سے فلسفے سے اپنی گہری دلچسپی اور نہایت بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ فلسفے سے ان کی دل چسپی اور ذوق و علم کا اثر ان کے اسلوب نگارش میں بھی صاف جھلکتا ہے، لیکن ابھی تک کسی صاحب علم و قلم نے ان تمام جہات سے شاید مطالعہ نہیں کیا اور اسی وجہ سے کوئی جامع مضمون مولانا کی شخصیت کے اس پہلو پر نہیں آیا۔ مولانا کی علمی و فکری زندگی کا یہ ایک اہم پہلو ہے جس پر کسی صاحبِ ذوق کو توجہ کرنی چاہیے۔

معلوم ہے کہ مولانا آزاد نے تاریخ فلسفہ پر مقدمہ لکھا تھا۔ جو یادگار ہے۔ مولانا نے یہ تعارف اردو میں لکھا تھا اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کتاب میں شامل ہوا تھا۔

مولانا آزاد نے ۱۹۴۷ء میں ایجوکیشن منسٹری کا چارج لیا تو ایک کانفرنس بلائی تھی، جس میں انھوں نے چند اہم باتوں کا اعلان کیا تھا من جملہ ان کے ایک نئی تاریخ فلسفہ لکھی جانے کی ضرورت بھی بیان کی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر

رادھا کرشن کی صدارت میں ایک بورڈ قایم کیا گیا جس نے ''اے نیو ہسٹری آف فلاسفی۔ایسٹرن اینڈ ویسٹرن'' دو جلدوں میں مرتب کی اس کا ''تعارف'' مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا تھا یہ تاریخ ''میسّرز جارج ایلن اینڈ انوین لمیٹڈ (لندن)'' نے ۱۹۵۲ء میں شایع کی۔اس کا انٹروڈکشن مولانا آزاد نے لکھا تھا۔ااور انگریزی ترجمہ ہندستان ٹائمز''۔دلی میں خود دلچسپی لے کر چھپوایا تھااور اردو متن مولانا ملیح آبادی کو دیا تھا کہ وہ اسے عربی میں ترجمہ کر کے ثقافۃ الہند۔دلی میں شایع کر دیں۔انھوں نے ایسا ہی کیا۔مولانا کی تحریر کا اردو متن ملیح آبادی کے پاس رہ گیا تھا جسے انھوں نے ''ذکرِ آزاد''،کلکتہ (۱۹۶۰ء) میں چھاپ دیا تھا۔

محمد وارث کامل (سب ایڈیٹر چٹان۔لاہور) نے ''فلسفہ۔اصول ومبادی کی روشنی''میں مرتب کی تو انگریزی انٹروڈکشن کا اردو میں ترجمہ کر کے اس میں شامل کیا تھا لیکن اس میں تحریر کے حدود کا پتا نہیں چلتا کہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہوگئی۔اب جو تحریر پیش کی جارہی ہے وہ اپنے موضوع کی اہمیّت اور اسلوب کے حسن کے لحاظ سے شاہ کار ہے۔پہلے آپ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے ابتدائی نوٹ اور پھر مولانا کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔واضح رہنا چاہیے کہ یہ ہسٹری آف فلاسفی کا مکمل انٹروڈکشن نہیں ہے۔

مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''مولانا کی شخصیت جامع کمالات تھی دوسری حیثیتوں کے علاوہ وہ فلسفی بھی تھے،اور فلسفے میں انہماک رکھتے تھے۔۱۹۴۷ء میں انھوں نے حکومت ہند کی جانب سے ایک بورڈ مصنفوں کا بٹھایا تھا تاکہ انگریزی میں ایک نئی تاریخ ایسی لکھی جائے جس میں مغربی فلسفے کے ساتھ مشرقی فلسفے کو بھی اس کی واجبی جگہ دی جائے۔جب کتاب تیار ہوگئی تو مولانا نے اس پر مقدمہ لکھا اور اس مقدمے کا عربی ترجمہ میں نے ثقافۃ الہند میں چھاپا۔اردو میں لکھا ہوا مولانا کا یہ مقدمہ میرے پاس موجود ہے۔اس میں فلسفے کی جو تعریف کی ہے قابل دید ہے۔''صحیفہ کاینات کے دو گم شدہ ورق اور ان کی جستجو'' کے عنوان سے مولانا

تحریر فرماتے ہیں! (ا۔س۔ش)

''ایک فارسی شاعر نے کائنات کو ایک ایسی پرانی کتاب سے تشبیہ دی ہے جس کا پہلا اور آخری ورق کھو گیا ہے، اب نہ تو یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ یہ کتاب شروع کس طرح ہوئی تھی، نہ یہ کہ ختم کس طرح ہو گی؟

ماز آغاز و انجامِ جہاں بے خبریم
اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست!

انسان نے جب سے ہوش وخرد کی آنکھیں کھولی ہیں، وہ اس جستجو میں ہے کہ ان کھوئے ہوئے اوراق کا سراغ لگائے۔ فلسفہ اسی جستجو اور جستجو کے نتائج کا نام ہے۔ ایک فلسفی، فلسفے کی تعریف کرتا ہوا جو حقیقت کئی صفحوں میں بیان کرتا، وہ اس شاعر نے ایک مصرعے کے اندر سمیٹ دی ہے۔

''ان کھوئے ہوئے اوراق کی جستجو سے مقصود در حقیقت زندگی اور کائنات کی حقیقت کی جستجو ہے۔ انسانی دماغ نے جوں ہی سوچنا شروع کیا، یہ دو سوال خود بخود اس کے اندر اٹھنے لگے: اس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اسے اپنے چاروں طرف جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ نہیں معلوم کتنے عرصے تک اس کا دماغ اس جستجو میں ہر طرف بھٹکتا رہا۔ بالآخر ایک وقت آیا جب اس کے قدم نے جستجو کی راہیں معین کر لیں اور ایک نظم و ترتیب کے ساتھ غور و فکر کی کڑیاں جوڑتا ہوا قدم اٹھانے لگا۔ یہ منظّم نظر و فکر [Systematic Speculation] کی ابتدا تھی۔ جس دن وہ اس منزل پر پہنچا، وہی دن فلسفے کی پیدائش کا پہلا دن تھا اور اسی دن سے فلسفے کی تاریخ کی داستان شروع ہو جاتی ہے''۔

(ذکرِ آزاد، کلکتہ، ۱۹۶۰ء، ص ۵۴۔۴۵۳)

﴿۲۶۸﴾ (۴۶)

مُجلّہ ثقافتہ الہند۔ نئی دہلی

''ذکرِ آزاد'' میں مولانا ملیح آبادی نے مجلّہ ثقافتہ الہند کے اجرا کی تاریخ، پس منظر اور مقصد بیان کیا ہے۔ اس کے بارے میں مولانا کا ایک فرمودہ بھی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔

ثقافتہ الہند ''انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز'' کا سہ ماہی علمی و تہذیبی ترجمان تھا۔ یہ کونسل مولانا آزاد نے اپنی خاص ذاتی دلچسپی سے قایم کی تھی۔ وہی اس کے صدر تھے۔ وہی اس ادارے میں مولانا ملیح آبادی کو لائے تھے، انھی نے ثقافتہ الہند جاری کروایا تھا اور جب تک وہ زندہ رہے، اس پر نظر رکھتے تھے۔ گویا وہ اس کے نگران تھے ۱۴؍ فروری ۱۹۵۸ء کو کونسل کا اجلاس مولانا کی صدارت میں ہوا، جس میں کونسل کی کارگذاری پر تبصرہ کیا اور اپنے اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا۔ ثقافتہ الہند کی کارگذاری کی تعریف کی۔ یہ تعریف دراصل مولانا ملیح آبادی کی یا دوسرے الفاظ میں اپنے انتخاب کی تعریف تھی۔ مولانا ملیح آبادی ثقافتہ الہند کے اجرا کے اول روز ہی سے ایڈیٹر تھے۔ مجلّے کے اجرا کا تمام سروسامان انھی نے کیا تھا۔ (ا۔س۔ش)

مولانا آزاد نے فرمایا:

''کونسل نے اپنا سہ ماہی رسالہ ثقافتہ الہند جاری کیا اور رسالے کے مضامین نے مسلم دنیا پر برقی لہروں کا سا اثر پیدا کیا۔ مسلم دنیا ہندستان کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگی۔ مصر، عراق، سیریا اور ایران کے پرچوں اور رسالوں نے اس رسالے کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی اور اس کے مضامین نقل یا ترجمہ کر لیے۔ ان ملکوں کے نامور اہلِ قلم اور مصنفوں نے رسالے کو اور اس کی خدمات کو سراہا۔ رسالے کے بعض مضامین تو اس قدر مقبول ہوئے کہ عراق کی ایک سوسایٹی نے انھیں کتابی صورت میں شایع کر دیا۔ ایران میں بھی یہ مضامین فارسی میں ترجمہ ہوئے اور کتاب کی شکل میں چھاپے گئے۔

انگلینڈ، فرانس اور اٹلی کے مشہور مستشرقوں نے رسالے کے بعض مضامین کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا"۔

فنون لطیفہ اور مولانا آزاد

(۴۷) ﴿۴۶۹﴾

" ذکر آزاد" میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے آرٹ کے بعض نمونوں پر مولانا آزاد کی تعارفی تحریرات کو نقل کیا ہے۔ یہ تصاویر آئی سی سی آر [انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز] کے عربی مجلّے ثقافۃ الہند میں شایع ہوئی تھیں۔ مولانا ملیح آبادی نے ان تحریرات کو پیش کرتے ہوئے مولانا ملیح آبادی فنون لطیفہ سے مولانا کی دل چسپی پر ایک تعارفی نوٹ بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا کو علم وادب کے ساتھ فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی اور فن مصوری سے تو خاص لگاؤ تھا۔ آرٹ کے اعلیٰ نمونے پرکھنے اور مصوری کی باریکیاں سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ بعض قدیم تصویروں کی اُن حل گتھیاں مولانا نے جس آسانی اور وضاحت کے ساتھ سلجھادیں، اس پر حیرت ہوتی ہے۔

ثقافۃ الہند میں قدیم آرٹ کی بعض نادر تصویریں بھی شایع کی گئیں۔ ان پر مولانا کے نوٹ پڑھنے کے لایق ہیں۔ یہ نوٹ خود مولانا نے اردو میں لکھ کر مجھے دیے اور ان کا ترجمہ ثقافۃ الہند میں شایع ہوا۔ اب مولانا کے قلم سے لکھے ہوئے اردو نوٹ ملاحظہ کیجیے اور مولانا کے ذوق وبصیرت کی داد دیجیے":

(اـس ـش)

(۴۸) ﴿۴۷۰﴾

(۱)

بابر کی مسکراہٹ

یہ تصویر ایک گروپ کے مرقعے سے لی گئی ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

تصویر مرزا عبدالصمد شیریں رقم کے کمال فن کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ عبدالصمد کو ہندستان کے عہدِ مغلیہ کی مصوری کے ابتدائی معلموں میں تصور کرنا چاہیے۔ اسے سلطان ہمایوں ایران سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔

مرقع کپڑے پر بنایا گیا ہے اور اس میں تیمور سے لے کر اکبر تک تمام سلاطین تیموریہ کو ایک مجلس میں مجتمع کر دیا گیا ہے۔ بابر ہمایوں سے کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جس کی وجہ سے ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمایاں ہوگئی ہے۔ اس مسکراہٹ کو جس فطری طریقے سے مصور نے دکھایا ہے، وہ اس کے کمال فن پر دلالت کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے تمام ماہرین مصوری نے اس تصویر کی خوبی پر اتفاق کیا ہے۔

[ثقافۃ الہند: جون ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۱۷]

(۴۹) ﴿۲۷۱﴾

(۲)

شہنشاہ جہانگیر

مغل عہد کے فن مصوری کا یہ ایک نہایت شاندار نمونہ ہے، اس میں جہانگیر کو حالت سفر میں دکھایا گیا ہے۔ سامنے اس کے والد شہنشاہ اکبر کا مقبرہ ہے اور وہ گھوڑے پر سوار اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہے۔ اس کے جلو میں اعیان و امرا ہیں اور عقب میں ایک فوجی دستہ، اس کے سامنے ایک نوجوان سر ننگے عجز و انکسار کی حالت میں کھڑا ہے، اور نوجوان کے پیچھے ایک شخص ایسی ہیئت میں نمایاں ہے گویا وہ نوجوان کو بہ حیثیت مجرم اور قیدی کے پیش کر رہا ہو۔ مرقعے میں جن جن آدمیوں کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، سب حقیقی ہیں یعنی جو آدمی اس موقعے پر جس وضع ولباس میں موجود تھے انھیں اسی طرح مصور نے نمایاں کیا ہے۔

اکبر کا مقبرہ آگرہ سے پچیس میل کے فاصلے پر قریہ سکندرہ میں واقع ہے۔ پس یہ تصویر کسی ایسے موقعے کی ہے جب جہانگیر آگرہ سے نکل کر اکبر کے مقبرے پر پہنچا تھا۔

لیکن یہ موقع کون سا تھا؟ جہانگیر نے اپنی تزک یعنی یومیات میں دو موقعوں کا ذکر کیا ہے، جب وہ اپنے والد کی قبر کی زیارت کے لیے گیا تھا لیکن ان دونوں موقعوں میں کوئی واقعہ ایسا نہیں بیان کیا ہے جب کوئی مجرم اس کے آگے پیش کیا گیا ہو۔ پہلی مرتبہ وہ جوش محبت میں پیدل گیا تھا اس لیے اسے گھوڑے پر سوار ہونے کا اتفاق ہی نہیں ہوا دوسری مرتبہ بلا شبہ سوار گیا تھا، لیکن مقبرے کی عمارت کے معاینے کے لیے گیا تھا۔ وہاں اور کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

یہ تصویر گزشتہ اسی (۸۰) برس کے اندر مختلف مصور کتابوں اور البموں میں شایع ہو چکی ہے، لیکن ابھی تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ مصور کس موقع کو نمایاں کر رہا ہے اور تصویر کا مطلب کیا ہے؟ تصویر کی اصلی کاپی برٹش میوزیم میں ہے۔

حال میں [مولانا] ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک مضمون میں اس تصویر کا معمہ حل کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس تصویر کا مطلب حل کرنے میں دقّت اس لیے پیش آئی کہ فرض کر لیا گیا جہانگیر جب اکبر کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا ہے، اس وقت کا منظر اس میں دکھایا گیا ہے۔ اور چوں کہ وہ زیارت کے لیے صرف دو مرتبہ گیا ہے اور دونوں موقعوں پر کسی مجرم کی گرفتاری کا واقعہ پیش نہیں آیا ہے اس لیے تصویر معمہ بن کر رہ گئی ہے اور اس کا مطلب حل نہیں ہوا۔ دراصل اس تصور کا تعلّق اس موقع سے ہے جب جہانگیر کی تخت نشینی کے پہلے سال اس کا لڑکا خسرو بقصدِ بغاوت قلعۂ آگرہ سے نکل کر پنجاب کی طرف بھاگا ہے اور جہانگیر اس کے تعاقب میں نکلا ہے۔

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

''۸/ذوالحجہ یک شنبہ کی رات خسرو قلعہ سے نکلا اور تین سو پچاس سواروں کے ساتھ جنھیں اس نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ کسی جانب روانہ ہو گیا۔ پہلے میں نے شیخ فرید بخشی بیگی کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا پھر صبح کے وقت متوکلاً علی اللہ بغیر کسی خاص سر و سامان کے خود بھی روانہ ہو گیا۔ جب میں سکندرہ پہنچا تو میں نے چاہا کہ والدِ بزرگوار کی روحانیت سے استمداد چاہوں! چناں چہ ان کے روضۂ منورہ پر حاضر ہوا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ مرزا حسن پسر میرزا شاہ رخ کو پکڑے ہوئے قریہ سکندرہ سے لائے اور عرض کیا کہ یہ بھی خسرو کی ہمراہی کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس کے پیچھے روانہ ہونے والا تھا جب یہ بات ہمیں معلوم ہوئی تو ہم نے اسے روک لیا۔ میں نے مرزا حسن سے پرسش کی تو وہ انکار کی جرأت نہ کر سکا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ باندھ کر اسے ایک ہاتھی پر سوار کیا جائے''۔

''جہانگیر کی اس تصریح نے اس تصویر کا پورا مطلب حل کر دیا۔ مصور نے اس موقعے کی تصویر کھینچی ہے جب جہانگیر اکبر کے مقبرے کے سامنے پہنچا ہے اور کچھ لوگ مرزا حسن کو پکڑے ہوئے لائے ہیں۔ جہانگیر نے گھوڑے کی لگام روک لی اور صورت حال دریافت کی مرزا حسن سر جھکائے کھڑا ہے اور اس کو گرفتار کرنے والا اس کے پیچھے ہے مرزا حسن کی حالت بتلا رہی ہے کہ اسے بے خبری کی حالت میں اچانک گرفتار کیا گیا ہے۔ سر برہنہ ہے گویا اس کی بھی اسے مہلت نہ ملی کہ سر پر پگڑی رکھ لیتا''۔

جہانگیر نے لکھا ہے کہ ''میں نے حکم دیا کہ اسے دست بستہ ہاتھی پر سوار کیا جائے۔

چناں چہ ایک ہاتھی لایا گیا ہے اور وہ سامنے کھڑا ہے۔

تصویر کی جزئیات کو جس درجہ نظر انتقاد سے دیکھا جائے اس کی خوبیاں پوری طرح آشکارا ہیں۔ باکمال مصور نے موقعے اور محل کی ہر بات ملحوظ رکھی ہے۔ اور اسے پوری

صحت و دیانت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ تصویر پر مصور کا نام نہیں ہے لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ یہ جہانگیر کے خاص مصور میرزا ابوالحسن کے قلم سے نکلی ہے، جسے جہانگیر نے نادرۃ الزماں کا خطاب دیا ہے۔

جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ ''جب بارہ سال کے واقعات قلم بند ہو گئے تو میں نے حکم دیا کہ انھیں ایک جلد کی صورت دے دی جائے اور مصوروں سے کہا گیا کہ اس کے اہم واقعات کی تصویریں تیار کر کے اس میں جا بجا لگا دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر بھی دراصل تزک جہانگیری کے کسی شاہی نسخے کا جزء تھی جو اصل سے الگ ہو کر منتشر ہو گئی۔

[ثقافۃ الہند: جون ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۱ ب]

(۵۰) ﴿۲۷۲﴾

(۳)

شاہجہاں کا دربار

آج ہم ہندستان کے قدیم فن مصوری کا ایک اور شان دار نمونہ شایع کرتے ہیں۔ اس میں مصور نے شاہجہاں کے اس دربار کی تصویر کھینچی ہے، جو ایرانی سفارت کے پیش ہونے کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔

''شاہجہاں تخت پر متمکن ہے۔ اس کے سامنے اس کے دولڑکے دارا شکوہ اور مراد کھڑے ہیں اور ان کے پیچھے ان کا اتالیق کھڑا ہے۔ نیچے دونوں طرف ارکان دولت کی بالمقابل صفیں کھڑی ہیں۔ بائیں جانب ایرانی سفیر کھڑا ہے اور ہاتھ سر تک اٹھائے سلام کر رہا ہے۔ بائیں جانب کی صف کے پیچھے ایرانی سفارت کے دوسرے ارکان طرح طرح کے تحفے ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں۔ سامنے درباری کھڑے ہیں۔ باہر وہ گھوڑے نمایاں ہیں جو ایرانی سفارت عراق کے تحائف میں لائی تھی۔

جو بات قابل غور ہے وہ تصویر کی جزئیات و دقایق ہیں۔ جنھیں مصور نے پوری نگرانی کے ساتھ نمایاں ہے۔ حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے اشخاص کی وضع قطع اور لباس کی کوئی جزئی سے جزئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو پوری صحت اور واقعیت کے ساتھ مصور کے قلم نے نمایاں نہ کر دی ہو۔ اشخاص کے سروں پر عمامے ایک وضع اور ایک قسم کے کپڑے کے نہیں ہیں۔ لیکن ہر عمامے کی خاص نوعیت اور کپڑے کی ساخت پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ نمایاں ہے اس کا پورا اندازہ سرسری نگاہ سے نہیں ہو سکتا۔ خرد بینی گلاس سے دیکھا جائے تو مصوّر کے قلم کا حیرت انگیز کمال نمایاں ہو۔ جن عماموں پر موتیوں کی لڑی بندھی ہوئی ہے اس کے ایک ایک موتی کو نمایاں کیا ہے۔

''تختِ شاہی کے نیچے سنگِ مرمر کی جو کرسی ہے اس کی سطح پر چند تصویریں سنگ ساز نے کھودی تھیں اوپر ایک ترازو کی تصویر تھی جو میزان عدل کے قیام کا اظہار کرتی تھی۔ ترازو کے نیچے دو بزرگ انسان آمنے سامنے کھڑے ہیں، ایک کے ہاتھ میں تلوار ہے دوسرے کے ہاتھ میں ایک کُرّہ۔ ان کے نیچے دریا ہے اور دریا کے کنارے ایک شیر اور گائے مل جل کر پانی پی رہے ہیں۔ یہ تصویر حکومت کے کمالِ عدل اور امن کی مرموز علامت ہے۔ یعنی شیر کو جرأت نہ رہی کہ گائے پر حملہ کرے اور گائے کو شیر سے ڈر نہ رہا کہ اس کے سایے سے بھاگے۔

مصور نے کس خوبی سے ان تصاویر کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ چوں کہ یہ سنگِ مرمر کی سطح پر کندہ تھیں، اس لیے انھیں نسبتہً مدھم رنگ سے کھینچا گیا ہے، تا کہ صاف نظر آ جائے کہ کندہ تصویر کی تصویر ہے۔

[ثقافۃ الہند: جون ۱۹۵۲ء صفحہ ۶۳]

مولانا ابوالکلام آزاد کے چند فتوے

(۵۱) ﴿۲۶۷﴾

مولانا ملیح آبادی کی تالیف لطیف ''ذکرِ آزاد'' جس کے اوراق زریں سے ادب کے یہ شہہ پارے اور علوم و معارف کے یہ قیمتی موتی چنے ہیں۔ اس کا دامن مذہبی مسایل کی تحقیقاتِ نادرہ اور افکارِ مجتہدانہ کے جواہر ریزوں سے بھی خالی نہ تھا۔ ذیل کے چند فتوے، مباحث علمیہ و دینیہ کی اسی آخری قسم سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ فتوے علوم دینی میں مولانا کے رسوخ و تبحرِ علمی اور حقیقت پسندی کی مثال ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

حدیث وقرآن کی تشریعی حیثیت

مولانا عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی نے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ۲۲۔۱۹۲۱ء میں پریسیڈنسی جیل علی پور [کلکتہ] میں محبوس تھے، ایک دن عرض کیا:

''حدیث کی تدوین تیسری صدی کے اوایل میں شروع ہوئی۔ دو سو سال تک زبانی روایات ہوتی رہیں۔ روایت بھی لفظاً نہیں معناً، راوی اپنے فہم کے مطابق اپنے لفظوں میں روایت کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ آدمی کا فہم ضروری نہیں کہ صحیح ہی ہو، پھر معلوم ہے کہ حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حدیث لکھنے کی ممانعت فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ تو اپنے عہد خلافت میں راویوں کی دروں سے خبر لیتے تھے۔ جب حالات یہ ہیں تو حدیث شریعت اور قانون کا سر چشمہ کیوں کر مانی جا سکتی ہے''؟

ابوالکلام آزاد نے فرمایا:

''مولوی صاحب آپ نے ٹھیک کہا حدیث صحیح عبادت میں تو حجّت ہے اخلاق و معاشرت کے سلسلے کی احادیث ایسی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر ان کا مقابلہ نہیں

کرسکتا۔ مگر حدیث انسانی سوسایٹی کے لیے قانون کا سوتا نہیں ہوسکتی۔ عالم گیر ہدایت کا ضامن قرآن ہے اور قرآن معدودے چند قوانین کا حامل ہے۔ یہ اس لیے کہ کوئی قانون بھی اختلافِ ازمنہ و حالات کی وجہ سے ساری دنیا پر نہ نافذ ہوسکتا ہے نہ مفید ہوسکتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ خود منصوص قوانینِ قرآنیہ کے التوا کا اختیار امام المسلمین کو بخش دیا گیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے

☆ منصوص قانون طلاق میں ترمیم کردی

☆ عام الرّمادہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کیا۔ کیوں کہ لوگ قحط زدہ تھے اور

☆ مؤلفۃ القلوب کو مسلمانوں کا مال دینے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اب اسلام طاقت ور ہوچکا ہے اور غیر مسلموں کی تالیف قلب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

حضرت عمرؓ کے یہ فیصلے صحابہ نے قبول کرلیے۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ دراصل شریعت کی اساس جُلبِ مصالح اور رفع مفاسد پر ہے''۔

(۵۲) ﴿۲۶۸﴾

فوٹو اور اسٹیچو

ایک روز مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد سے دریافت کیا ''تذکرہ'' کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تصویر اتروانا درست نہیں سمجھتے؟ مولانا نے فرمایا: فوٹو اور اسٹیچو کے معاملے پر میں نے کچھ لکھا تھا۔ اس کا مسودہ غالباً میرے اٹاچی کیس میں پڑا ہے۔ آپ کو دے دوں گا۔ دوسرے دن وہ تحریر میرے حوالے کردی جو دراصل فتویٰ ہے۔ نیچے نقل کرتا ہوں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حبی فی اللہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ پہنچا۔ تاخیر کے لیے خواستگار معافی! آپ نے جواز و عدم جواز فوٹو کی نسبت دریافت فرمایا ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ سردست چند اشارات پر اکتفا فرمایئے اور ان شاء اللہ آپ کے لیے اشارات ہی مطلوب!

یہ کہنا ضروری نہیں کہ ہر اَمر و نہی شرعی کسی نہ کسی علّت پر مبنی اور بنیادِ کار جُلبِ مصالح و دفعِ مفاسد۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بذاتہٖ مُضر و مُفسد، اور کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ گو بذاتہٖ نہیں مگر مفاسد کے لیے مقدمات و وسایل کا کام دیتی ہیں۔ شارع کا فرض ہے کہ وہ جس طرح مفاسد کو روکے اسی طرح مقدمات و وسایل کو بھی روکے کہ کسی نہ کسی وقت مفاسد تک مُنجر ہوں گے۔ فقہا نے اسی لیے ''محرّمات لِغَیرہٖ'' کی اصطلاح قایم کی ہے، اور آپ کو اس کی تفصیل معلوم ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ انسان کی تباہی و ہلاکت کا اصلی مرض مفاسد کا عشق نہیں ہے بلکہ وسایل و مقدمات کا فریب ہے۔ دنیا میں ہمیشہ مفاسد کے قیام و دوام کا ذریعہ، وسایل و مقدمات ہی ہوئے ہیں۔ مفاسد صریحہ سے نفرت، خود طبیعتِ انسانی میں موجود ہے، اسی لیے کوئی قوم کسی فسادِ صریح و حقیقی کو باسم و شکل فساد یکایک قبول نہیں کر سکتی۔ یہ وسایل و مقدمات ہی ہیں جو بوجہِ عدم مضرت بالفعل شایع ہو جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مفاسد قطعیّہ و اصلیہ تک منجر ہوتے ہیں۔ شرک و بت پرستی، قتل اولاد، انسانی قربانی، غلامی، جنگ و قتال بغیر حق وغیرہا تمام مفاسد و خبایث کے شیوع کی تاریخ پر غور کیجیے ان سب کی ابتدا مقدمات و وسایل ہی سے ہوئی ہے۔

اسلام سے پہلے جن شرایع کا ظہور رہا۔ ان سب نے اپنی تمام توجہ محض مفاسد کے دفع و منع میں محدود رکھی، وسایل و مقدمات مفاسد سے چنداں تعرض نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا عہد ابتدائی عہد تھا اور سلسلۂ ارتقا مذہب کی وہ ابتدائی کڑیاں تھیں،

جو بتدریج حسب استعداد امم ظاہر ہوتی رہیں۔ اس وقت اقوام کی استعداد یہاں تک نہیں پہنچی تھی کہ منع ووسایل کے نازک و دقیق احکام کی متحمل ہوسکیں، ان کی کوتاہی نظر و حداثتِ فکر کا تو یہ حال تھا کہ صریح بت پرستی سے بچنے کا صاف وواضح حکم بھی بارِ خاطر ہوتا تھا۔ مصر سے نکلتے ہی بنواسرائیل نے فرمایش کردی تھی "اِجْعَل لَنا اِلٰهاً كَمَا لَهُمْ اٰلِهَه، قَالَ اِنَّكُم قَومٌ تجهلون" (۱) لیکن جب وہ وقت آ گیا کہ "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" (۲) اور اسلام کا ظہور ہوا تو ضروری ہوا کہ آیندہ کے لیے مفاسد کا قطعی سدّ باب کردیا جائے اور ان تمام سوراخوں کو بند کردیا جائے جہاں جہاں سے شر و فساد کو ابھرنے کے لیے راہیں ملتی رہی ہیں، تمام شرایع کا اُس اساس اور اصلاح عالم کی اصل بنیاد، عقیدۂ توحیدِ خالص اور منعِ شرک و ماسوی اللہ پرستی ہے۔ آغاز ظہورِ ہدایت سے اسی کی تبلیغ ہوتی رہی اور تمام انبیا اور رسل اسی کے قیام و اعلان کے لیے آئے، لیکن اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ صرف اسی قدر تھا کہ شرک صریح سے روکا گیا تھا وسایل و ذرایع شرک کے سدّ باب کا کچھ انتظام نہیں ہوا تھا اور اسی وجہ سے تمام پیروانِ رسل، توحید سے آشنا ہوکر پھر دوبارہ شرک و اصنام پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے۔ پس اسلام نے تکمیل شریعت کے کام کو یوں پورا کیا کہ پہلوں کی طرح صرف بت پرستی اور شرکِ صریح ہی سے نہیں روکا، بلکہ ان تمام عقاید و اعمال کو جرم و معصیت قرار دیا جو کسی نہ کسی رنگ میں وسایل و مقدماتِ شرک ہوسکتے ہیں اور گو ان میں فی نفسہ کوئی مضرت نہیں ہے لیکن وسیلہ و مقدمۂ مضرات و مفاسد ضرور ہیں۔ اسلام کی حقیقت بینی نے اعمال انسانیہ کو صرف اسی نظر سے نہیں دیکھا کہ ان میں مضرت بالفعل ہے یا نہیں؟ بلکہ ہمیشہ اس پر نظر رکھی کہ وہ موصّل الی الفساد تو نہیں ہیں؟ اور دنیا اپنی اصلاح آخری کے لیے صرف اسی نظر کی منتظر تھی۔

جب یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی تو اب آپ دیکھیں گے کہ بہت سے امور

ایسے ہیں جن میں فی نفسہٖ شرک وفساد کو کوئی دخل نہیں لیکن شارع سے ان کی نسبتِ الٰہی منقول ہے اور علتِ نہی کی یہی ہے بزرگوں اور پیشواؤں کی تعظیم میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہ تھی لیکن یہی تعظیمِ مفرط ہے۔ جو پہلوں کے لیے وسیلہ ہوئی ہے۔ لہٰذا قیام تعظیمی سے بھی روک دیا کہ ''لا تقوموا کالاعاجم'' بادشاہوں اور بزرگوں کے آگے زمین بوس کورنش بجالاتے تھے، اور مقصود بجز احترام کے اور کچھ نہ تھا، مگر شارع نے سجدۂ تحیہ کو بھی روک دیا۔ قیس بن سعد نے جب کہا کہ ''أتیت الحیرۃ فرأیتھم یسجدون طرزبان لَھُمْ فَانت احق بان یسجد لك فقال لا تفعلوا.''

زیارتِ قبور میں فی نفسہٖ کیا مضرت ہے۔ بلکہ ذریعۂ عبرت ودفع غفلت مگر زوارات قبور پر لعنت بھیجی اور ابتدا میں بالعموم روک دیا جیسا کہ حدیث بخاری ''کنت نھیتکم عن زیارت القبور'' رسول کی محبّت وطاعت عین طاعت ومحبّت حق ہے اور خود قرآن ناطق ہے کہ رسول اللہؐ کی تعظیم وتکریم میں غفلت نہ کرو ''تُعزِّروہ وَتوَقِّرُوہ'' اور ''لَاتَرفَعُوا اَصواتکُم فَوقَ صَوتِ النَّبیِّ'' اور ''اِنَّ الَّذِینَ یُنَادُونكَ مِن وَرَاءِ الحُجرات'' اور النَّبِیُّ اَولٰی بِالمؤمِنینَ الخ اور حدیث عمر کہ لَایُؤمِن احدکم الخ بایں ہمہ فرمایا کہ ''لَاتُطرونی'' اور حدیث انس کہ انی لا أریدان ترفعونی فوق منزلتی، انا محمد بن عبداللہ الخ آنحضرت صلعم کے سیّدِ اخلاق وامم ہونے میں کیا شک ہے اور اس تمام کرۂ ارضی میں بجز اس وجود کے کون ہے جس کو سیادتِ عالم پہنچتی ہو؟ بایں ہمہ جب وفد بنی عامر آیا اور لوگوں نے کہا کہ ''انت سیدنا'' تو آپ نے فرمایا ''السیّد اللہ'' اور قولو لاقولکم او بعض قولکم'' انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے ''فضَّلنَا بَعضھُم عَلیٰ بعض'' اور خیر الامم اور آخر الادیان کے داعی کے افضل الرسل ہونے میں کس کو تامل ہوسکتا ہے۔ تاہم فرمایا کہ: لَا تفضلونی علیٰ یونس بن متی الخ اور ان تمام باتوں سے مقصود یہی تھا کہ گو فی نفسہٖ ان امور میں کوئی فساد نہیں بلکہ بعض بحالت صحتِ نیت و

فکر و جمع شروط، مستحسن و مامور بہ لیکن آگے چل کر یہی چیزیں وسیلہ شرک وفساد ہو جاتی ہیں اور پچھلی قوموں نے اسی تعظیم و مدح و اطراء کے غلو سے انبیاء کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا ہے اسی طرح منع حلف لغیر اللہ پر غور کیجیے کہ "لا تحلفو بالطواغی ولا بابائکم" کہ حدیث مسلم ہے اور حدیث حذیفہ کہ "لا تقولوا ماشاء اللہ وشاء فلان ولکن قولوا ماشاء اللہ ثم شاء فلان" (ای لمافیہ من التسویۃ بین اللہ و بین عبادہ) اور روایت فتیلہ مندرجہ نسائی کہ اعتراض یہود کے بعد کعبہ کی قسم سے روکنا اور فرمانا کہ "قولوا ورب الکعبۃ اور اسی طرح حکم لا یقولن احد کم عبدی وامتی ولکن یعقل غلامی و جاریتی الخ بھی اسی علت پر مبنی کہ اس قسم کی نسبتیں انسانوں کو اربابا من دون اللہ بنا دیا کرتی ہیں۔ حدیث تابیر نخل بھی اس پر شاہد ہے کہ ممانعت کی بنیاد یہی علت تھی اور یہ جو مداحین کی مذمت کی اور تمدح و توصیف سے روکا تو اس کا سبب بھی بجز اس کے کچھ نہ تھا۔

اب اصل مسئلے پر غور کیجیے۔ تصویر و تماثیل کا مسئلہ بھی دراصل اسی سلسلے میں داخل ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت آلات و وسایل بت پرستی و شرک میں سے ایک موثر ترین آلہ فن مصوری و تماثیل سازی بھی تھا۔ دنیا کی تمام بت پرست قوموں نے جب بت پرستی کی ابتدائی منزلوں سے ترقی کی یعنی ان ابتدائی منزلوں سے جب کہ محض غیر مصنوع مظاہر فطرت کی پرستش کی جاتی تھی تو یہی چیز (مصوری) آلۂ بت پرستی بنی اور جب آپ مصوری کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بت پرستی ہی کی وجہ سے یہ فن دنیا میں شایع و مقبول ہوا۔ مصوری میں ایک چیز تو خطی ہے اور ایک تجسم و تمثل ہے۔ یعنی یا تو کپڑوں اور چمڑوں پر تصویر بنائی جاتی تھی اور یا پتھر اور مٹی کے مجسمے اور بت بنائے جاتے تھے، لیکن اُس عہد میں یہ دونوں طریقے صرف بت پرستی اور اس کے اقسام و وسایل کے لیے مخصوص تھے جس قدر تصویریں کھینچی جاتی تھیں ور مجسموں کی شکل میں بنائی جاتی تھیں سب کی سب یا تو ان دیوتاؤں اور اوتاروں کی

ہوتی تھیں جن کی پرستش کی جاتی تھی یا قومی پیشواؤں اور مقدس ومحترم انسانوں کی جن کو مثل دیوتاؤں کے پوجا جاتا تھا یا کم سے کم ان کی تصویروں کو تعظیم وتکریم سے رکھنا اور دیکھنا موجب برکت وسعادت سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی لیقربونا الی اللہ زلفی میں داخل ہے۔ دجلہ وفرات کے کناروں کی تمام متمدن آبادیاں (بابل وغیرہ) میں فنِ تصویر کو بت پرستی ہی سے ترقی ہوئی۔ یونان اور روم کی بت پرستی نے مجسّمہ سازی کو منتہاے ترقی تک پہنچا دیا، ایران کے کھنڈر مصریوں کے قدیم آثار اور ہندستان کی زندہ بت پرستی، ان سب کے اندر اس فن کا آلۂ بت پرستی ہونا دیکھا جا سکتا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت مریم اور حضرت مسیح کے بت بنا کر گرجوں میں سجائے اور ان تصویروں کو تبرک وسعادت کے لیے اپنے گھروں کے اونچے طاقوں میں رکھا۔ رومن کیتھولک چرچ اب تک یہی کر رہا ہے۔ عرب جاہلیت نے حضرت ابراہیم واسماعیل کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔ غرضے کہ ظہورِ اسلام کے وقت فنِ مصوری صرف بت پرستی کا ایک آلہ تھا اور اس کے سوا اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

علاوہ بریں غور کیجیے تو فنِ مصوری ویسے بھی بہر حال وسیلۂ اصنام پرستی ہے۔ انسان کو قدرتی طور پر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اپنے بزرگوں اور محبوبوں سے جدا ہونے کے بعد ان کی تصویروں کے نظارے سے اپنے جی کو تسلی دے۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں تبرک وتقدس کا خیال شامل ہو جاتا ہے، تبرک وتقدس کا اعتقاد پرستش تک پہنچتا ہے۔ اور اس کے بعد وہی حال ہو جاتا ہے جو قوم نوح کا ہوا تھا کہ ”وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا“ (۳) ابن عباس نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ سُواع اور یغُوث ان کے قومی پیشوا تھے تعظیم واحترام و یادآوری وتذکار کے لیے ان کے بت بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کو دیوتا سمجھ کر پرستش کرنے لگے۔

ایسی حالت میں ناگزیر تھا کہ اس سب سے بڑے موثر وعامل وسیلہ ومقدمۂ شرک

کا انسداد کیا جائے، اور یہی سبب ہے کہ شارع نے نہایت سختی کے ساتھ مصوروں اور تصویروں کی مذمت کی، ان کو لعن و غضب کا مورد قرار دیا۔ اور ان گھروں کو سعادت و برکت سے محروم بتلایا، جن میں پرستش کے صور و اصنام موجود ہوں، اور امید ہے کہ وہ تمام احادیث آپ کے پیش نظر ہوں گی۔

پس تصویر و تماثیل کی ممانعت کو بھی اسی سلسلے میں لانا چاہیے جس سلسلے میں تمام ایسی چیزوں کو روک دیا گیا ہے جو گو خود کوئی برائی نہیں رکھتیں لیکن برائیوں کا وسیلہ و مقدمہ ہیں۔ جس طرح قیام تعظیمی سے روکا۔ جس طرح عورتوں کو زیارتِ قبور سے روکا اور جس طرح مداحوں کی نسبت وعید آئی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح تصویر سازی کو بھی ممنوع قرار دیا، فی نفسہٖ تصویر بنانے میں کوئی مضرت نہیں ہے۔ یہ بھی ایک شکل خطی ہے، جس طرح صور الفاظ و معانی، اشکال خطیہ میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن چوں کہ یہ ایک قوی و عام تر وسیلۂ اصنام پرستی ثابت ہوئی ہے، اس لیے سد بابِ شرک و بت پرستی و قیام توحید کامل و خالص و محفوظ کے لیے ضرور تھا کہ اس کو بھی سختی کے ساتھ روک دیا جائے۔

یہاں یہ بات بھی ضمناً آپ پر ظاہر ہوگئی ہوگی کہ اِس نہی کی جو تعلیل بعض فقہا نے کی ہے اور یہ سببِ حرمت بیان کیا ہے کہ تصویر بنانے میں خدائے تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کی نقل اتاری جاتی ہے اور بوجہ اشتراک فعل ایسا کرنا ناجائز ہوا تو یہ کسی طرح درست نہیں۔ اگر مصوری کی ممانعت میں فقہ یہی ہے تو کون سی وجہ ہے کہ یہی فقہا غیر حیوانات کی تصویروں کو ناجائز نہیں قرار دیتے؟ کیا صرف انسان و حیوان ہی اللہ کی خالقیت کا ظہور ہیں؟ درخت اور پہاڑ اس کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہیں؟ اگر یہ تمام کائنات اسی کی مخلوق ہے تو جس طرح ایک حیوان کی شکل بنانے سے خدا کی خالقیت کی نقالی ہوتی ہے، اسی طرح ایک درخت کے بنانے سے بھی اور ایک پہاڑ کے نقشے سے بھی! یہ کہنا کہ حیوانات میں روح ہے اور ان میں نہیں، بالکل فضول ہے، کیوں کہ

اول تو اشتراکِ تخلیق وجود جسم میں ہے، نہ کہ روح میں۔ مصور جسم کی صورت کھینچتا ہے نہ کہ روح کی اور جسم جیسا انسان کا ہے ویسا ہی پتھر کا اور ثانیاً یہ کون کہتا ہے کہ نباتات میں روح نہیں ہے؟ قرآن حکیم نے جابجا ارواح نباتیہ کی خبر دی ہے اور علم بھی اس کی تصدیق کر چکا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ فقہا کو بعض احادیث و آثار صحابہ سے دھوکا ہوا ہے، جن میں مصورین سے مطالبہ نفخ روح کا ذکر ہے، حال آں کہ ان کا مطلب دوسرا ہے، چوں کہ مصوروں سے مقصود وہ مصور تھے، جو پرستش کے لیے تصویریں اور بت بنایا کرتے تھے اس نے فرمایا کہ ان سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اگر واقعی یہ اصنام وصور تمھارے لیے وسیلہ رزق ورفع حوائج ودفع مشکلات تھے اور صاحب ارادہ وقوت وصفاتِ الوہیت، تو جہاں تم نے اُن کے جسم بنائے ہیں، وہاں ان میں روح بھی پیدا کرو، اگر ایسا نہیں ہے تو کیا ایک بے جان صورت مستحق عبادت و پرستش ہو سکتی ہے؟ پس ان روایات میں مطالبۂ نفخ روح کی اصلی علت بھی وہی پرستش و شرک ہے نہ کہ تسویۂ تخلیق!

ممکن ہے کہ ان فقہا کو یہ خیال، بخاری و مسلم کی روایت ابو ہریرہ سے ہوا ہو جس کے الفاظ غالباً یہ ہیں کہ سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول قال اللّٰہ تعالی ومن اظلم ممن ذهب یخلق کخلقی فیخلقوا ذرة اولیخلقوا حبة أو شعیرة الخ لیکن اس حدیث سے بھی علت وہ نہیں نکلتی، جو ان فقہا نے سمجھی ہے۔ اصلی علت وہی شرک و پرستشِ طواغیت ہے۔

چناں چہ شاہ ولی اللہ نے بھی اصلی علت منع تصاویر کی یہی قرار دی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

ومنها صناعة التصاویر فی الثیاب والجدران والا نماط فنهی عنها النبی صلعم و مدار النهی شیبان

احدهما انها أحد وجوه الا رفاه و الزينة فانهم كانوا يتفاخرون بها ويبذلون اموالا خطيرة فيها فكانت كالحرير وهذا المعنى موجود في صورة الشجر وغيرها وثانيهما ان المخامرة بالصور و اتخاذها وجويان الرسم بالرغبة فيها يفتح عبادة باب الاصنام وينوه امرها ويذ كرها لا هلها وما نشأت عبادة الاصنام في اكثر الطوائف الا من هذه وهذا المعنى يختص بصورة الحيوان و الذلك امر بقطع راس التماثيل لتصير كهية الشجر الخ

شاہ صاحب نے عمومِ منع کی علت، اسراف وتبذیر وتزئین بیجا ومفرط کو قرار دیا ہے، اور صور حیوانات کی نہی کا سبب سد باب شرک وعبادۃ اصنام بتلاتے ہیں۔ یہ ان کے کمال فقہ کی دلیل ہے۔

جب یہ مراتب واضح ہو چکے، تو اب اصلی سوال کی جانب توجہ کیجیے۔ جب حرمتِ تصویر کا مسئلہ بھی ان نواہی میں داخل ہے۔ جو وسیلۂ مفاسد ہونے کی وجہ سے ممنوع قرار پائے، تو بلا شبہ اس کے احکام بھی وہی ہوں گے جو اس قسم کے نواہی کے ثابت ہو چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس بارے میں شارع کا طریق کار یہ رہا ہے کہ علتِ حکم کے رفع کے بعد حکم بھی اٹھ گیا ہے یعنی ان امور کو جن اسباب کی بنا پر روکا جاتا ہے جب ان میں تغیّر ہو جاتا ہے تو اس تغیّر کا اثر، نفس حکم پر بھی پڑتا ہے کیوں کہ حکم انھی اسباب کا نتیجہ تھا۔ مثال میں انھی چیزوں کو دیکھیے، جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ایک طرف ”لاتقوموا كما يقوم الا عاجم يعظم بعضها بعضا“ ہے تو دوسری طرف واقعۂ بنی قریظہ میں ”قوموا الى سيد كم“ بھی ہے اگر آغاز اسلام میں بالعموم زیارت قبور سے روک دیا گیا کہ نهيتكم من زيارة القبور “تو پھر یہ بھی ہے

کہ "زوروها فانها تذكركم الموت" ترمذی میں ہے کہ "قال رجل يا رسول الله" الرجل منا يلقى أخاه أو صديقه أيخني له؟ قال لا افيلنه ويقبله؟ قال لا قال أفيا خذه بيده ويصافحه؟ قال نعم! [۴] لیکن ساتھ ہی اسی ترمذی کے اسی باب میں حدیث صفوان بن عال بھی ہے کہ "فقبلوا ايديه ورجليه" اور ابوداؤد میں روایت زارع وفد عبدالقیس کہ "فجعلنا نتبادر من رواحلنا فنقبل يدرسول الله صلى الله عليه وسلم ورجله اور حدیث ابن ماجہ عن ابن عمر کہ "قبلنا يده الخ" اگر ایک موقعے پر فرمایا کہ "لا تفضلو نی علی یونس بن متی" تو دوسرے موقعے پر یہ بھی ہے کہ "لو كان موسىٰ حيا لما وسعه الا اتباعي" اور "ادم ومن دونه تحت لوائي" وفد بنی عامر کی روایت میں اس سے روکا کہ مجھے "سيدنا" نہ کہو "السيد الله" لیکن پھر خود ہی فرمایا "انا سيد ولد آدم ولا فخر" رقی وتمائم کے متعلق کس قدر شدت کے ساتھ نہیں آئی ہے ابوداؤد اور احمد کی روایت ابن مسعود میں ہے کہ "ان الرقي والتمائم والتولة شرك" اور امراۃ عبداللہ بن مسعود کا واقعہ کہ "ان عبدالله راى في عنقي خيطا فقال ما هذا؟ قلت خيط رقي لي فيه قالت فاخذه ثم قطعه ثم قال سمعت رسول الله الخ" لیکن ساتھ ہی مسلم کی روایت عوف بن مالک کو دیکھیے کہ "اعرضوا علىٰ رقاكم مالم يكن فيه شرك" اور بکثرت احادیث موجود ہیں کہ اس کی اجازت دی اور صحابہ نے کیا۔ واقعۂ تابیر نخل بھی اسی سلسلے میں داخل کہ ابتدا میں بخوف شرک روکا، مگر پھر اجازت دی اور فرمایا "انتم اعلم بامور دنيا كم" اسی طرح وجوہ مداحین کے لیے "احثوا التراب" فرمایا اور نہایت شدت کے ساتھ خود اپنی مدح وتوصیف کے اغراق سے روکا، مگر ساتھ ہی بکثرت احادیث وآثار موجود ہیں، جن میں صحابۂ کرام کے مدح وتوصیف کرنے اور آپ کے سننے اور نہ روکنے کا ذکر ہے اور اس بارے میں صحابۂ کرامؓ کے استغراق واستہلاک کا قولاً وعملاً جو

حال تھا وہ محتاج بیان نہیں شعرائے اہل اسلام کی تمدیح وتوصیف اور آپ کا تحسین فرمانا معلوم ہے۔ حضرت عمر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ لقد بلغ من فضیلتك عند الله ان اقسم بتراب قدميك، فقال :لا اُقْسِمُ بِهٰذَا البلد و انتَ حِل بِهٰذا البلد".

بظاہر دیکھیے تو ایک ہی چیز کے متعلق ایک موقع پر نہی ہے اور دوسرے موقع پر نہ صرف جواز بلکہ امر وتحسین!۔ اہل علم نے ان اختلافاتِ احکام پر مختلف پہلوؤں سے بحثیں کی ہیں۔ مگر فی الحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں اور اختلاف حکم کی علت، اختلاف حالت اور وجود وعدم وجود علتِ نہی ہے۔ دنیا میں انسانی پرستش کا ایک بڑا وسیلہ "يعظم بَعضُها بعضا" رہا ہے کہ تعظیم مفرط پرستش تک پہنچ گئی ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ پیشوایانِ ملّت ورؤسائے دینی کی جائے! اس لیے انسدادِ شرک کے لیے اس سے روکا، مگر "قوموا الیٰ سيدكم" کا موقع دوسرا تھا اور تواضع وادب ومراعاتِ حقوق میں داخل، لہٰذا خود حکم دیا۔

دنیا میں فتنۂ قبور شرک کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ اس لیے زیارتِ قبور سے روکا گیا، لیکن جب توحیدِ اسلامی دلوں میں راسخ ہوگئی تو "فزوروها" فرما کر حکم دے دیا کہ اب وسیلۂ شرک ہونے کی جگہ تذکرۂ موت وعبرت کا ذریعہ تھا۔ گزشتہ قوموں کی ایک بڑی ضلالت مرتبۂ نبوت والوہیت کا اختلاط واتحاد تھا۔ مسیحی تحریک اسی گمراہی کی بدولت رائگاں گئی۔ اس لیے شارع نے ہمیشہ اپنی "تعظیم مفرط ومدح واطرا وغلو واغراق" سے روکا: "لا تطروني" اور "لا تفضلوني" اور "السيد الله" وغیرہ ارشادات واحکام اسی علت پر مبنی تھے، لیکن جن جن مواقع میں یہ علت نہی باقی نہ رہی وہاں منع ونہی کا بھی وجود نہ رہا اور کبھی "انا سيد ولد آدم" فرمایا اور کبھی آدم ومن دونہ تحت لوائی اور کبھی "لو كان موسىٰ حيا لما وسعه الا اتباعي" اور مرتبہ شناسانِ رسالت نے بھی جو کچھ کہا اس کو بسمع رضا واستحسان کے ساتھ قبول فرمایا ولنعم

ما قیل:

ماشئت قل فیہ فانت مصدق
فالحب یقضیٰ والمحاسن تُشُھدُ

پس یہ حالت دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ تصویر کا معاملہ بھی اسی سلسلے میں داخل ہے دراصل علتِ نہی شرک واصنام پرستی تھی۔ اگر یہ علت باقی نہ رہے تو کیوں تصویر ممنوع ہو؟ اگر زیارتِ قبور [جو وسیلۂ مفاسد ہونے کے لحاظ سے کم از تصویر نہیں) بحالتِ تذکرۂ موت ورفع خوف شرک جائز ہوگئی اور اسی طرح اور بہت سی چیزیں تو بحالتِ عدمِ خوفِ پرستش وباغراض مستحسنۂ علمیّہ واخلاقیہ تصویر کشی کیوں جایز نہ ہو؟ (انتھیٰ)

حواشی:

(۱) مصر والوں کے جیسے دیوتا ہیں، ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنادو۔

(۲) آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو تمھارے لیے دین پسند کر لیا۔

(۳) خبردار! اپنے دیوتاؤں سے دست بردار نہ ہونا، نہ وُدے نہ سُواع سے نہ یغوث ویعوق اور نسر سے [۷۱:۲۳]

(۴) ''ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے دوست یا بھائی سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھکے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا اس سے معانقہ کرے اور چومے؟ فرمایا نہیں! فرمایا: تو کیا اس کے ہاتھ چومے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا: ہاں!

(۵۳) ﴿۲۶۹﴾

قادیانی

کچھ مدت کے بعد مولانا نے اپنے حالات قلم بند کرانا شروع کیے، اور جب سفر قادیان اور مرزا صاحب سے ملاقات کا تذکرہ آیا تو میں نے سوال کیا کہ قادیانی فرقے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جواب کے دوران رک کر فرمایا یاد پڑتا ہے، اس بارے میں کسی کے استفتاء کا جواب لکھ کر میں نے تمھیں گرفتاری سے پہلے نقل کرنے کو دیا تھا۔ مجھے بھی یاد آ گیا۔ موجودہ کتاب کی تالیف کے وقت پھر یہ چیز مجھے یاد آئی پرانے کاغذ الٹے پلٹے تو مولانا کا یہ فتویٰ انھیں کے قلم سے لکھا ہوا مل گیا یہاں پوری تحریر نقل کرتا ہوں:

[سوال] مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں کی نسبت حکم شرعی کیا ہے؟ وہ مثل دیگر مبتدع فرقوں کے گمراہ ہیں یا قطعاً کافر ہیں؟ ان کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھنا جایز ہے یا نہیں؟ کیا ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنا چاہیے؟ جواب دیتے ہوئے یہ بات بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ ان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ ختم نبوت کے منکر ہیں مرزا غلام احمد کو نبی تسلیم کرتے ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کلمات توہین ان کی کتب میں مرقوم ہیں نیز ان میں سے قادیانی فرقہ مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے!۔

الجواب

بسم اللہ الرحمان الرحیم

الحمد للہ وحدہ! جواب سے پہلے چند امور کا ذہن نشین ہو جانا ضروری ہے:

[۱] ہر مدعی اسلام کی نسبت اصل اثبات ہے کہ نفی!

[۲] سلف و اہل علم نے اس پر اجماع کیا کہ مئول کا حکم منکر کا نہیں ہے۔

[۳] لزوم و التزام میں فرق ہے۔

[۴] سلف کی اصطلاح میں کفر کا اطلاق مختلف مراتب ضلالت پر بھی ہوا ہے، جیسا کہ امام بخاری نے باب باندھا "کفر دون کفر" لیکن وہ کفر جو مُخرج عن الملۃ ہے ان سے مختلف ہے۔

اب جواب سنیے! اگر آپ کا سوال یہ ہوتا کہ ختم نبوت کا انکار اور انبیاے کرام کی توہین کفر ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک سے زیادہ حکم لگانے کی گنجایش نہیں یعنی وہ قطعاً کفر ہے لیکن آپ کا سوال یہ نہیں ہے۔ آپ ایک معین جماعت کی نسبت دریافت کرتے ہیں، جس کے عقاید مسطور و مشہور ہیں۔ اب یہ ضروری ہوا کہ تحقیق کیا جائے کہ واقعی وہ ختم نبوت کی منکر ہے یا نہیں؟

مجھے جہاں تک ان لوگوں کی کتابیں دیکھنے اور ان کی زبانی ان کے عقاید سننے کا اتفاق ہوا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ گو ان کی تاویلات باطلہ سے ہمارے نزدیک قریب قریب انکار لازم آ جاتا ہو لیکن اُنھیں اس کے التزام سے قطعاً انکار ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کا اقرار نہیں کرتے کہ انھیں آیۂ ختم نبوت یا اس کے مسلم منطوق سے انکار ہے۔ البتہ وہ تاویلات کرتے ہیں ہمارے نزدیک وہ تمام تاویلات باطل ہیں اور بدع وضلالت پر مبنی ہیں تاہم جب کفر و اسلام کا سوال آئے گا تو ہم ان پر منکر کا حکم نہیں لگائیں گے اور اس میں احتیاط کریں گے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی نسبت مرزا صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اسے وہ اس معنی میں تسلیم نہیں کرتے جو ہمارے نزدیک لازم آ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقصود اس سے اس رسول کی توہین نہیں ہے جس کا قرآن مصدق ہے بلکہ اس یسوع کی نسبت بطور حجّت الزامی کے عیسائیوں سے معارضہ مقصود ہے جس کا حال ان کی بائبل میں مرقوم ہے۔ ان کا یہ بیان اہلِ حق وعلم کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے۔ تاہم اس بیان کے بعد ہم ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کا الزام نہیں لگا سکتے۔

باقی رہا عامۂ اہل اسلام کی تکفیر تو بلاشبہ یہ اشد شدید ضلالت ہے لیکن اس کی بنا پر بھی انھیں ملّت سے خارج نہیں کر سکتے، وھذہ لیست اول قارورۃ کسرت فی الاسلام. خوارج بھی تمام مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ مشہور و معلوم ہے، انھوں نے جمعہ کے دن خطبے میں فرمایا کہ گو تمھارے عقاید اس اس طرح کے ہیں لیکن جب تک تم قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے ہو، میں تمھیں مسلمانوں سے خارج نہیں کروں گا [حکاہ الذہبی فی التاریخ]

علاوہ بریں خود اس جماعت میں دو گروہ ہو گئے ہیں اور دونوں مرزا صاحب کے اقوال و عقاید کے تعین میں باہم دگر معارض ہیں۔ لاہوری جماعت ان تمام باتوں کا کچھ دوسرا مطلب بتلاتی ہے۔ ایسی حالت میں کیوں کر یہ جایز ہوگا کہ ان پر ملّت سے خارج ہو جانے کا حکم دے دیا جائے۔

میرے نزدیک ان کا شمار اسلام کے گمراہ فرقوں میں ہے اور جو ان میں غالی ہیں، ان کی گمراہی کمال مرتبہ ضلالت تک پہنچی ہوئی ہے۔ تاہم میں کسی ایسے فرد یا جماعت کو جو شہادتین کا اقرار کرتی ہو، یوم آخرۃ پر ایمان رکھتی ہو اور قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی ہو، اس معنی میں کافر نہیں کہہ سکتا، جس سے مقصود ملۃ اسلامیہ سے خارج ہو جانا ہے۔

میرے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا جائے، ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ بیجا تشدد ہوگا بلکہ ان کی جماعتی تقویت کا موجب ہوگا۔

(۵۴) ﴿۲۷۰﴾

نماز جمعہ فی القریہ

پرانے کاغذوں میں مولانا کا ایک اور فتویٰ انھیں کے قلم سے لکھا ہوا مل گیا ہے۔

کسی نے سوال کیا تھا کہ نماز جمعہ کس قسم کی آبادی میں پڑھنا چاہیے؟ مولانا لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کے اقوال، مصر وقریہ کبیری کی تعریف میں حد درجہ مختلف ہیں۔ اور کتب متداولۂ فقہیہ میں کوئی متفق تعریف موجود نہیں۔ بعض کا قول ہے کہ مصر وہ ہے جہاں ہر پیشہ ور سال بھر تک بلا احتیاج تغیّر اپنے پیشے کو جاری رکھ سکے "ان یعیش کل محترف بحرفته فیه من سنته الی سند من غیر ان یحتاج الی حرفة اخری (مقصرات) بعض نے صرف اس کو کافی سمجھا ہے کہ وہاں ہر پیشے کے لوگ زندگی بسر کرتے ہوں۔

اور ہر پیشے سے مقصود ضروری پیشے ہیں ان یعیش فیه کل صنائع بصنعة [ابو المکارم] بعض نے کہا کہ دس ہزار آدمی ہوں [ابوالمکارم] بعض نے کہا کہ وہاں قاضی ومفتی ہو اور امیر ہو، جو احکام وحدود قایم رکھ سکے اور امام کرخی نے اسی کو اختیار کیا ہے [ہدایہ] ایک روایت یہ بھی ہے کہ اگر تمام آبادی کے وہ لوگ جن پر جمعہ فرض ہے اکٹھے ہوں تو وہاں کی بڑی مسجد ان کے لیے کافی نہ ہو۔ مما لایسع اکبر مساجده اهله (برخندی) پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اکبر مساجد سے کیا مقصود ہے؟ بعض نے کہا کہ وہاں کی جامع مسجد، لیکن زیادہ پسندیدہ تفسیر اس کی یہ سمجھی گئی کہ جو مسجدیں پانچ وقت کی جماعت کے لیے ہوں، ان میں سے بڑی مسجد کافی نہ ہو اور ایک جامع مسجد بنانے کی ضرورت پیش آئے لو اجتمعوا فی اکبر مساجد هم لا یسعهم حتی احتاجوا الی بناء المسجد الجامع (برخندی)، بعض نے کہا کہ اتنے لوگ ہوں کہ اگر دشمن چڑھ آئے تو دفاع کر سکیں "ان یکون بحال لو قصد هم عدو یمکنهم دفعه" (برخندی) سب سے زیادہ صاف اور سلجھی ہوئی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہاں انسان کے حوائج ضروریہ کے پورا کرنے اور حاصل

کرنے کا سامان ملتا ہو، مثلاً کپڑا اور غلّہ وغیرہ۔

غرضے کہ کہاں تک اقوال نقل کیے جائیں! مقصود یہ ہے کہ اس بارے میں سخت اختلاف واقع اور خود قدماء محققین حنفیہ کا مسلک متاخرین کی قیاس آفرینیوں میں مستور و مفقود۔ اسی اختلاف کو دیکھ کر بالآخر حضرت شاہ عبدالعزیز کو لکھنا پڑا کہ در بحث جمعہ روایات فتاویٰ فی الواقع الخ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصلی حقیقت اس مسئلے کی کیا ہے؟ تو اس بحث کو سر دست نہ چھیڑیے! یہ بہت تفصیل طلب اور آپ کے لیے چنداں سود مند نہیں مقصود اصلی ایک خاص موضع کے متعلق فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کا حکم معلوم کرنا ہے۔ سر دست تعریف مصر کے طے کرنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ فقیر نے حال میں ایک رسالہ مقاصد جمعہ پر لکھا ہے اور اس میں یہ بحث بہ تفصیل مرقوم اور الحمد للہ کہ تمام نزاعات و اختلافات کے لیے فیصلہ کن وجوہ و غوامض اجتہاد ائمہ کے لیے کاشف و مبیں! اگر اشاعت کی نوبت آئی تو ان شاء اللہ تمام ردوکد کے لیے تسلّی بخش ہوگی۔

جس موضع کریم چک کا حال آپ نے لکھا ہے وہاں مطابق احکام فقہ حنفی نماز جمعہ ضرور ہونی چاہیے اور ہرگز ہرگز اس عظیم ترین عبادت اسلامی و اہم ترین اجتماع دینی کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ آپ لکھتے ہیں کہ سو گھر مسلمانوں کے ہیں علماء موجود ہیں، ضروریات و احتیاجات کے لیے دکانیں موجود، حتیٰ کہ دوا دو یہ فروش تک وہاں موجود ہے۔ یہ تمام باتیں اس کے لیے کافی ہیں کہ جس قریہ کبیرہ کا ہونا جمعہ کے لیے حنفیہ نے شرط قرار دیا ہے اس کا اس پر پورے اطمینان کے ساتھ اطلاق کیا جائے۔

مولانا ضیاء اللہ خان (رام پور):

﴿۲۷۱﴾

مولانا ضیاء اللہ خاں کے نام مولانا ابوالکلام کا یہ علمی تفسیری خط محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار [رام پور] نے غالباً پہلے ''نیا خواب''۔ رام پور میں شایع کیا تھا۔ پھر اسے اپنی تالیف ''مولانا ابوالکلام آزاد''، ۱۹۶۸ء، (رام پور) میں شامل کیا تھا۔ میں نے یہ خط اس کے اولین ماخذ سے لے کر اپنے مرتبہ مجموعے ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' [۱۹۶۸ء، کراچی] میں شامل کیا اور مولانا ابوالکلام کے ایک تفسیری شہ پارے سے شایقین کو متعارف کرانے کے لیے پاکستان کے متعدد رسایل میں شایع کرایا تھا۔

اس وقت تک مجھ میں تالیف و تدوین کا سلیقہ نہ تھا اور یہ بات معلوم نہ تھی کہ کوئی نادر چیز کسی شخص یا ماخذ سے لے کر استعمال کی جائے تو اس کا شکریہ ادا کرنا اور حوالہ دینا لازم ہوتا ہے۔ اس لیے مجموعۂ خطوط میں نہ تو محترم ڈاکٹر بیدار صاحب کے شکریے کا فرض ادا کر سکا اور نہ ماخذ کے حوالوں کا اصول برت سکا۔ حال آں کہ گذشتہ چالیس پینتالیس برسوں میں آں موصوف کی بیسیوں عنایات کا مورد رہا ہوں اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا اور کبھی اس کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعا گو رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب میں آں موصوف سے استفادے کے اعتراف اور عنایات کے شکریے کی ادائیگی میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کروں۔

مولانا ابوالکلام کے مکتوب الیہ مولانا ضیاء اللہ خاں رام پوری عابد رضا بیدار کے استاد تھے اور یہ خط انھی سے لے کر ڈاکٹر صاحب نے شایع کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں جب ڈاکٹر صاحب اپنی تالیف مولانا ابوالکلام آزاد شایع کرنے والے تھے اس وقت فاضل مکتوب الیہ صولت پبلک لائبریری۔ رام پور کے صدر تھے اور ان کی عمر نوے برس کے لگ بھگ تھی ان کی تاریخ پیدایش کی طرح تاریخ وفات کا بھی علم نہیں۔

مولانا ابوالکلام سے ان کا تعارف ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے۔ مولانا رام پور

تشریف لائے تھے۔ جامع مسجد رام پور میں ان کا خطاب، ان کے تعارف کا سبب بنا تھا۔ مکتوب الیہ کے بہ قول اس وقت ان کے داڑھی مونچھیں کچھ نہ تھیں۔ اُن کے چند سوالات کے جواب میں مولانا کا یہ خط یادگار ہے۔ ڈاکٹر بیدار صاحب اس خط کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

''یہ خط بہت اہم ہے۔ ایک لحاظ سے مولانا کے جو دو چار اہم ترین خط ہو سکتے ہیں ان میں سے ہے۔ اس خط میں کئی جگہ مولانا کے مخصوص طرزِ انشا کے بڑے دل کش نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ شہابِ ثاقب کی بحث کے دوران جو نکات جس لطیف پیرائے میں بیان کیے ہیں، اسے مولانا کی تحریر کی اہم خصوصیات میں سمجھا جانا چاہیے۔ مولانا کے بہ قول مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے، اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے''۔ یہ خط ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے''۔ [مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ص ۲۸۵]

مکتوب الیہ کے سوالات میں پہلا سوال عربی سیکھنے کے لیے چند مفید کتابوں کی دریافت کے بارے میں تھا۔ سب سے پہلے اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ اب مولانا ابوالکلام کا یہ فکر انگیز اور ایمان افروز خط ملاحظہ فرمائیں۔ خط یہ ہے:

(ا۔س۔ش)

۱۱۔ بالی گنج، سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۲ راگست ۱۹۲۰ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا۔ جن تعلیمی رسایل کے متعلق دہلی میں ذکر کیا تھا، وہ حسبِ ذیل ہیں:

''القراۃ الرشیدہ'' جزو اول سے جزو چہارم تک۔ مطبوعہ قاہرہ

فوائد الانشاء: اول و ثانی // //

ہدایۃ الطالب الی قواعد العربیہ۔ اول و ثانی // //

مبادیات کے لیے یہ سلسلہ مفید ہوگا۔ آپ نے یہ لکھا ہے کہ میں یہ رسالے بھیج

دوں! اگر میں بھیج سکتا تو تحفتاً بھیج دیتا۔ لیکن میرے کتب خانے میں ان کا ایک ایک نسخہ ہے۔ ایک سے زیادہ نسخے نہیں ہیں۔ آپ مولوی شرف الدین تاجرانِ کتب عربیہ۔ بھنڈی بازار [بمبئی] کو لکھیے۔ وہ آپ کو بھیج دیں گے۔ میں بھی کتابیں آج کل انھیں کے یہاں سے منگواتا ہوں۔

۲۔ شہاب ثاقب کے متعلق ''رجوماً للشیاطین'' ہونے کی نسبت دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہییں؛

اولاً: کاینات ہستی کے جس قدر حوادث و اعمال ہیں ان کے علل و مقاصد کے بارے میں ہماری معلومات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں یعنی اس حد سے جو ہمارے حواس کے تفحّص و تعمق کی آخری حد ہے۔ اس حد سے آگے جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے غیر معلوم و مجہول ہے اور جو غیر معلوم و مجہول ہے، اس کے لیے ہماری حیثیت یہی ہوسکتی ہے کہ ہم عدم علم کا اعتراف کریں منع و نفی کے مدعی نہیں ہوسکتے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھیے کہ ایک خاص حد تک ہماری نظر و ادراک کے لیے روشنی ہے۔ اس کے بعد تاریکی ہے۔ جہاں سے تاریکی شروع ہوتی ہے ہماری سیرِ نظری کے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہے؟ اور کیا کچھ نہیں ہے؟ اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور اس لیے ہماری حیثیت صرف یہ ہے کہ عدمِ علم کا اعتراف کریں۔ کسی بات کے لیے نہ تو مثبت ہوسکتے ہیں، نہ مانع و منکر! قدیم و جدید کے تمام اکابرِ علم و نظر نے صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ علم و بیان کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک انسان وحیِ الٰہی کے ساتھ آتا ہے اور کہتا ہے جس حد کے بعد سے تمھارے لیے تاریکی ہے، میرے لیے روشنی ہے۔ جس کے بعد سے تمھارے لیے عدمِ علم ہے، میرے لیے بصیرت و برہان ہے، جس حد کے بعد سے تمھارا سرمایۂ یقین ختم ہوجاتا ہے میری یقینیات شروع ہوتی

ہیں۔ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱) پس ایسی حالت میں ہمارے لیے علم وراستی کی دو ہی راہیں ہوسکتی ہیں۔ اگر وہ شخص اپنے تمام اقوال واعمال میں صادق ہے تو اسے قبول کریں، کاذب ہے تو انکار کردیں۔ لیکن وہ [یعنی صادق] جو کچھ بیان کرتا ہے، ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ کیوں کہ وہ جن حدود کے معاملات بیان کرتا ہے ان کے لیے ہمارا موقف عدم علم کا ہے۔ اور اس کا دعویٰ علم و بصیرت کا ہے۔ ہم وہاں کے لیے جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہہ سکے ہیں وہ شک سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی بنیاد علم و یقین پر ہے۔ ہم شک کی بنا پر علم و یقین کو جھٹلا نہیں سکتے!

مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔

ثانیاً: انبیاے کرام اور کتب سماویہ کے تمام بیانات جو ماوراے محسوسات سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اسی قسم میں داخل ہیں۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ یہ حقیقت فراموش کردی جائے اور غلط طریقوں سے تطبیق عقل ونقل کی کوشش کی جائے۔ یہاں تطبیق کی گنجایش ہی نہیں اور عقل اپنی حدود سے باہر سرے سے معلومات رکھتی ہی نہیں کہ معارف نقلیہ کے موافق ہوں یا مخالف ہوں۔ عقل لاعلمی کے سکوت میں ہے۔ نقل علم ویقین کے ساتھ متکلّم ہے۔ پس تعارض کب ہے کہ تطبیق کا سوال پیدا ہو؟

شہاب ثاقب وغیرہ کے متعلق بھی جس قدر امور بہ طریق صحیح کتاب وسنت سے ثابت ہیں، اِسی قسم کے معارف میں داخل ہیں۔ بلا شبہ عقل انسانی نے ایک خاص حد تک پہنچ کر یہ بات معلوم کرلی ہے کہ شہابِ ثاقب کس طرح ٹوٹتے ہیں اور فضا میں کیا کیا محرکات ان کے سقوط کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کے لیے علم انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد بھی کچھ ہے یا نہیں؟ اور تمام تغیّرات وحوادثِ عالم کی طرح اس حادثے میں بھی ماوراے نظرِ علم، افعال وخواص معنویہ پوشیدہ ہیں یا نہیں؟ پھر اگر

وحی الٰہی نے اس بارے میں کچھ بتلایا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اسے تسلیم کریں کیوں کہ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی علم و یقین موجود ہی نہیں ہے۔

یہ اصلِ عظیم پیش نظر رکھیے گا تو اس راہ کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ یہ علم کلام، متکلمین کا علم کلام نہیں ہے، کتاب و سنت کا علم کلام ہے۔

۳۔ باقی رہی یہ بات کہ بعض احادیث میں نجوم کی پیدائش کا مقصد بعض خاص امور بیان کیے گئے ہیں اور بقیہ کی نفی کی گئی ہے۔ تو اس بارے میں بھی ایک اصل پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ حدیث پر موقوف نہیں قرآن میں بھی جا بجا اس طرح کی تصریحات موجود ہیں، جن میں بعض اشیاء و مصنوعات کے مقاصدِ تخلیق بیان کیے گئے ہیں اور اسلوب بیان بظاہر مقید بحصر ہے۔ مثلاً یہی تخلیق نجوم مثلاً چاند کا گھٹنا بڑھنا، يَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ ......(۲) تو اگرچہ ان مقامات میں حصر پایا جاتا ہے لیکن وہ علی الاطلاق نہیں ہے۔ خاص حالات میں مقید ہے اور یہ بات خود کتاب و سنت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ نزول قرآن کے وقت طرح طرح کے توہماتِ باطلہ مخالفین میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اِس وقت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہل و اصنام پرستی کی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ اجرام سماویہ دیوتا ہیں اور باشندگان کرۂ ارض کے تمام نتائج و تاثرات کا سررشتہ انھی کے ہاتھ میں ہے۔ بابل، یونان، مصر اور ہندستان کا فن نجوم [جوتش] انھی عقاید باطلہ کا ایک مدون مجموعہ ہے۔ عرب جاہلیہ میں بھی یہ اوہام پھیلے ہوئے تھے۔ پس جہاں کہیں اجرامِ سماویہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی تخلیق کا کوئی ایسا مقصد بیان کر دیا گیا ہے، جو زیادہ واضح اور اقرب الی العقول ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ جو کچھ سمجھا جاتا ہے بے اصل ہے۔ یعنی جو خرافات لوگوں میں مشہور ہیں، ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کی تخلیق کے حقیقی مقاصد اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ اھلّۃ کی نسبت فرمایا هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ کیوں کہ یہ سب سے زیادہ واضح اور اوفی بالنفس بات تھی۔ مقصود یہ تھا کہ تم

نے چاند کے گھٹنے بڑھنے اور مہینوں کی چاندرات کی نسبت جس قدر اوہام وخرافات بنا رکھے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، یہ تو اوقات معلوم کرنے کا سامان ہے اور بس!

حضرت ابراہیم کی وفات اور کسوف مدینہ والی حدیث پر نظر ڈالیے (۳)۔ صرف اتنی بات پر کسوف کا معاملہ ختم کر دیا گیا کہ یہ آیاتِ الٰہیہ میں سے ایک آیت ہے اور تمام تر زور عوام کے بے اصل خیالات کے ازالے پر دیا گیا۔ کیوں کہ انبیاے کرام کا مقصود اصلاح عقاید ہوتا ہے، نہ کہ خواص وفوائد اجسام کی شرح وتنقید؟

بہ ہر حال جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس میں نفی مطلق نہیں مقید ہے!

۴۔ سماء الدنیا سے مقصود بلندی کا وہ نظارہ ہے جو ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آتا ہے یعنی فضا جسے یونانی اور اب اس کی وجہ سے انگریزی میں [Atmosphere] کہتے ہیں۔ عربی میں سما کے معنی اوپر کی چیز کے ہیں۔ مثل السائر میں آپ نے پڑھا ہوگا۔

واحمر کالدیباج اما سماؤہ
فریا و اما ارضہ فمخمول

پس سماء الدنیا کے معنی ہوئے زمین کے اوپر کی فضا۔

مولوی افضال الحق صاحب کو اور اگر ملاقات ہو تو ان کے والد بزرگوار کو میرا سلام شوق پہنچا دیں (۴)۔

ابوالکلام

حواشی:

(۱) [اے پیغمبر] تم کہہ دو! میری راہ تو یہ ہے، میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور اس راہ میں جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی اس طرف بلاتے ہیں۔ [۱۲:۱۰۸]

(۲) [اے پیغمبر!] لوگ تم سے [مہینوں کی] چاندرات کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہہ دو یہ انسان کے لیے وقت کا حساب ہے۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام من جملہ امہات المومنین حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت نبی اعظم وکرم علیہ

الصلوٰۃ والتسلیمات کے صاحب زادے تھے۔حضرت ماریہ جنگ خیبر کے بعد حضرت نبی کریم علیہ السلام کے عقد میں آئی تھیں، ذی الحجہ ۸ھ میں حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی۔ روایات کے مطابق زیادہ سے زیادہ سترہ اٹھارہ ماہ کی عمر پائی۔ جس روز حضرت ابراہیمؑ نے انتقال فرمایا۔ اتفاق سے اسی روز چاند کو گہن لگا، لوگ یہ سمجھے کہ یہ حضرت ابراہیم کی وفات کی وجہ سے ہوا۔ چوں کہ یہ خیال خام تھا۔ نبی کریم علیہ السلام کو معلوم ہوا تو فرمایا: چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں۔ کسی کی موت سے ان کے گہن کا کوئی تعلق نہیں۔

[سیرت النبی صلعم: شبلی نعمانی، جلد دوم]

(۴) مولانا افضال الحق اور ان کے والد گرامی مرتبت پر یہ نوٹ محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے قلم سے ہے:

''مولوی افضال الحق صاحب اور ان کے والد مولانا فضل حق صاحب (۱۸۶۲ء۔ ۷؍جنوری ۱۹۴۰ء) رام پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا فضل حق صاحب ایک زمانے میں رام پور کی مشہور عالم علوم مشرقی کی درس گاہ اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے بعد میں افضال الحق صاحب بھی اس کالج میں استاد ہو گئے تھے۔ مولانا فضل حق صاحب منطق اور فلسفے کے جید عالم تھے اور اپنے عہد کے ہندستان میں ان کا نام سند کا درجہ رکھتا تھا۔ متعدد اہم کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ وہ ان دیوزاد عالموں کے سلسلے کی آخری کڑی تھے جس میں عبدالحق، ان کے والد فضل حق خیر آبادی اور ان سے اوپر شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان دونوں بزرگوں کے والد گرامی شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی جیسے لوگ گزر چکے تھے''۔

شیخ قمر الدین (لاہور):

﴿۲۷۲﴾

مکتوب الیہ نے مولانا آزاد کو لکھا تھا میرا دماغ کمزور ہے قرآن مجید حفظ کرنا چاہتا ہوں کوئی دعا تعلیم فرماویں۔ نیز بھائی کے حق میں دعا فرمائیں۔(۱)

السلام علیکم

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے لفظ و معنی اور عمل دونوں کے لیے آپ کا سینہ کھول دے۔ یہ دعا پڑھا کریں:

”رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ٥ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ ٥ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ٥“ (۲)

یہ دعا سورۂ طٰہٰ کے دوسرے رکوع میں ہے۔ وہاں سے دیکھ کر یاد کرلیں اور اپنے بھائی کو بھی تعلیم کریں۔

فقیر ابوالکلام

حواشی:

[۱] شیخ قمر الدین مرحوم نے ۲۳ راگست ۱۹۲۰ء بروز شنبہ لاہور میں مشہور بیرسٹر لیگ کے رہنما میاں عبدالعزیز کے مکان پر مولانا سے بیعت کی تھی۔

[۲] سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۲۵ تا ۲۸ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

”[موسیٰ نے عرض کیا] اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دے کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤں اور میرا کام میرے لیے آسان کردے کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آسکے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جاؤں اور میری بات لوگوں کے دل میں اتر جائے“۔

تحریکِ اتحادِ بین المسلمین

اور

جمعیتِ علماے ہند

تالیف

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ ۔ پاکستان
کراچی



ابو الکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔ کراچی